صاحبِ الرحیق المختوم کی سوانح پر پہلی اور منفرد کتاب

علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ

یادوں کے سفر میں

اعداد و ترتیب

رضوان اللہ ریاضی

باہتمام

عبد الحلیم محمد بلال

مرکز الامام البخاري الإسلامي

من المؤمنين رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه

صاحب 'الرحیق المختوم' کی سوانح پر پہلی کتاب

شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ

یادوں کے سفر میں

اعداد و ترتیب

رضوان اللہ ریاضی

ناشر
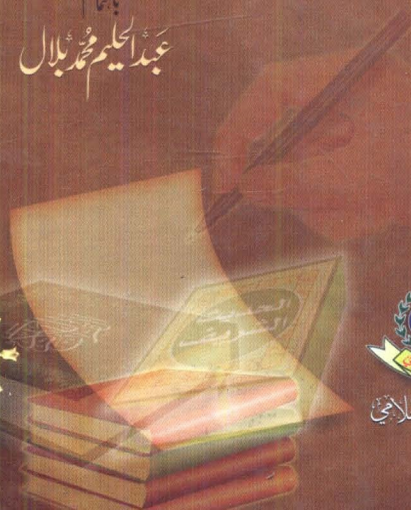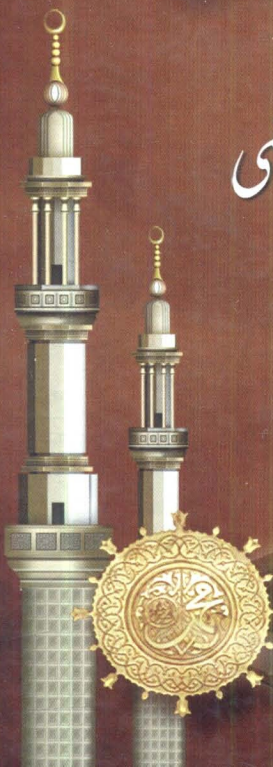
مرکز الإمام البخاری الإسلامی

لاہور، پاکستان

ح رضوان الله الرياضي، ١٤٢٨هـ

فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر

الرياضي، رضوان الله

الشيخ صفي الرحمن المباركفوري: حياته وجهوده باللغة الأردية./

رضوان الله الرياضي.- الرياض، ١٤٢٨هـ

٥٤٤ ص؛ ١٤×٢١ سم

ردمك: ٣ - ٨٠٠ - ٥٧ - ٩٩٦٠

١- المباركفوري، صفي الرحمن ٢- الدعوة السلفية أ- العنوان

ديوي ٢١٧،٢ ١٤٢٨/٣١١٠

رقم الإيداع: ١٤٢٨/٣١١٠

ردمك: ٣ - ٨٠٠ - ٥٧ - ٩٩٦٠

پہلا ایڈیشن

جمادی الآخرہ ۱۴۲۸ھ - جون ۲۰۰۷ء

درج ذیل ایڈریس سے کتاب طلب کی جاسکتی ہے

1- پاکستان:

أ- مرکز امام بخاری، کوٹ لکھپت، لاہور.

فون: 5832325، فیکس: (0092-42)5864269

ب- مرکز سلمان الفارسی 180 ڈی ون، جوہر ٹاون، لاہور.

فون: 5186131، فیکس: (0092-42)5186132

موبائل: 03004464313

2- سعودی عرب:

أ- موبائل: 0506469862

ب- دار الفرقان، ریاض.

فون: (00966-1)4358646

اِنتساب

میں اپنی یہ کتاب اپنے والد محترم سے منسوب کرتا ہوں جنھوں نے اَن پڑھ ہونے کے باوجود ایک مرتبہ ایک شخص سے اس موقع پر کہا تھا جب اس نے میرے بارے میں شکایت کی تھی کہ رضوان دینی تعلیم کے حصول میں بہت زیادہ روپیہ خرچ کرتا ہے جبکہ دینی تعلیم پڑھنے والوں کا خرچہ بہت ہی کم ہوتا ہے؛ بلکہ مفت میں بھی یہ علم مل جاتا ہے اور اس وقت میں دہلی کے علاقہ پہاڑی بھوجلہ میں واقع مقیت گیسٹ ہاؤس میں رہائش اختیار کر کے جامعہ ریاض العلوم دہلی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا؟!:

''جب میرا بیٹا اللہ کا کلام پڑھ رہا ہے تو میں کلام اللہ سے متعلق ایک ایک حرف پر بے دریغ پیسہ خرچ کر سکتا ہوں!! لوگ دنیاوی تعلیم پر لاکھوں خرچ کرتے ہیں تو اللہ کا کلام اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کے حصول میں زیادہ سے زیادہ خرچ کیا جائے اور دینی تعلیم و تربیت سے اپنی اولاد کو آراستہ کیا جائے۔ مجھے خوشی ہے کہ میرا بیٹا میرے خاندان کی روایت سے ہٹ کر دینی علوم حاصل کر رہا ہے!!''۔

اے کاش! سارے مسلم والدین کا نظریہ بھی اسی جیسا ہوتا؟!!

رضوان اللہ ریاضی

فہرست مضامین

مولانا مرحوم کے رشحاتِ قلم سے

مولانا مرحوم کے بارے میں لکھے ہوئے چند حضرات کے اشعار

متفرقات

عرضِ ناشر

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على أشرف الأنبياء وسيد المرسلين، نبينا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد:

علم ایک ایسی دولت ہے کہ جو بھی اس سے آراستہ ہوتا ہے اس کا شمار اللہ تعالیٰ کے ان برگزیدہ بندوں میں ہوتا ہے جو صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہوتے ہیں ﴿إنما يخشى الله من عباده العلماء﴾ اس کو طلب کرنا اور سیکھنا عبادت، اس کا مذاکرہ تسبیح، اس کی جستجو کرنا جہاد اور اسے جاہل کو سکھانا صدقہ ہے، اسی علم ہی کے ذریعے حلال اور حرام کے درمیان تمیز کرنا ممکن ہوتی ہے، یہی وحشت میں انیس اور خلوت کا ساتھی ہے، اسی کی بدولت اللہ تعالیٰ قوموں کو عروج بخشتا ہے اور اس کے حاملین کو لوگوں کی رہبری اور امامت عطا فرماتا ہے اور یہی مرجع الخلائق ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے فرشتے ان سے خصوصی محبت کرتے ہیں، اور ان کے لیے اپنے پر بچھاتے ہیں، تمام رطب و یابس، سمندروں کی مچھلیاں، کیڑے مکوڑے اور جانور خشکی کے تمام درندے اور جانور اُن کے لیے استغفار کرتے ہیں۔

علم دلوں کی زندگی، آنکھوں کا نور اور جسموں کی طاقت ہے۔ اسی علم کی بدولت بندہ دنیا و آخرت کے بلند و بالا درجات تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

(أخلاق العلماء للآجري، ص ٣٤، ٣٥)

قارئین کرام: دنیا میں آنا درحقیقت یہاں سے رخت سفر باندھنے کی تمہید ہے۔ ہر فرد بشر نے ایک نہ ایک دن موت کے جام کو پینا ہے ﴿كل نفس ذائقة الموت﴾ اس سے کسی کو فرار نہیں، مگر دنیا کے اس پل سے گزر کر آخرت کی طرف جانے والے کچھ ایسے بھی خوش نصیب راہی

ہوتے ہیں، جن کا نام تا قیامت باقی رہتا ہے اور دنیا ان کو یاد کرتی رہتی ہے، اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہمارے ممدوح علامہ شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری (رحمه الله رحمة واسعة وأدخله فسيح جناته) ہیں جو ایک نامور مدرس، بلند پایہ مؤلف، عظیم الشان عالم، علامۃ، ادیب اور محدث تھے۔ ہندستان کے اس مردم خیز علاقے سے ان کا تعلق تھا جس نے صاحب تحفۃ الأحوذی مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ اور صاحب مرعاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح مولانا عبیداللہ رحمانی رحمہ اللہ وغیرہ جیسے کبار علماء، نامور محدثین، اور مشہور ادباء پیدا کیے ہے۔ اس علاقے کو لوگ مبارکپور کے نام سے یاد کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہر دور میں اپنے دین اور میراث انبیاء کے تحفظ کے لیے ایسے اصحاب علم وفضل اور خدام دین حنیف کا انتخاب کرتے ہیں جو اس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کرتے ہیں اور اپنے قلم وزباں کے ذریعے میراث انبیاء کی حفاظت کرتے ہیں، اور چمنستان کتاب وسنت کی آبیاری کرتے ہیں اور دین حق میں ہر قسم کی تحریفات فاسدہ اور تاویلات باطلہ کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں انہیں جیسے نابغہ روزگار شخصیات، بلند پایہ علماء نامور محققین اور اہل قلم کے بارے میں ایک عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

يلوح الخط في القرطاس دهراً　　وكاتبه رميم في التراب

اور ایسے ہی علمائے ربانیین کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"يَحْمِلُ هَذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عَدُولُهُ، يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيفَ الغَالِينَ، وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِينَ".

"اس علم کو اپنے پچھلوں سے وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جو عادل اور امانتدار ہوتے ہیں جو دین میں غلو کرنے والوں اور باطل لوگوں کے رطب ویابس کو دور کرتے ہیں"۔

(مسند البزار، حديث رقم ١٤٣، قال الألباني في تحقيق مشكاة المصابيح: ١/٨٢، حديث: ٢٤٨، رواه الحاكم في المستدرك وصححه ووافقه الذهبي، وصححه الإمام أحمد بن حنبل رحمه الله)

نیز فرمایا:

" ... وَفَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ عَلَى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ ، إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ ، إِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَلَا دِرْهَمًا، وَإِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ ، فَمَنْ أَخَذَ بِهِ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ".

"...عالم کی فضیلت عابد کے اوپر ویسے ہی ہے جیسے چاند کی فضیلت سارے ستاروں پر، بلاشبہ علماء نبیوں کے وارث ہیں، انبیاء وراثت میں درہم ودینار نہیں؛ بلکہ علم چھوڑتے ہیں، لہٰذا جس نے علم کو اپنایا اس نے وافر حصہ پالیا"۔

(سنن الترمذی، حدیث : ۲٦٨٢ واللفظ له، سنن أبي داود، حدیث : ۳٦٤١، ومسند أحمد ۲/ ۲٥۲ ، ۳۲٥، وصححه الألباني)

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ ان چند علماء میں سے ایک ہیں جنہوں نے اس دور میں بہت شہرت پائی، مثلاً صاحب عون المعبود علامہ محدث شمس الحق العظیم آبادی، صاحب تحفۃ الأحوذی علامۃ محدث عبدالرحمٰن مبارکپوری، علامہ نواب صدیق حسن خان قنوجی، شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری، حافظ عبداللہ محدث روپڑی، حافظ محمد گوندلوی، مولانا عبیداللہ رحمانی اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہم اللہ وغیرہم، اور مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کی کتاب (الرحیق المختوم) جو سیرت نگاری کے عالمی مقابلہ میں اول انعام یافتہ ہے، کو عصر حاضر میں جو شہرت حاصل ہوئی ہے شاید ہی کسی کتاب کو حاصل ہو۔

﴿ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم﴾

ایسے ہی جہابذۃ العلم، محققین، ادباء اور قلم کاروں کے محاسن ومناقب، مآثر ومناشط اور دینی خدمات کو اجاگر کرنا اور کتابی شکل میں جمع کرکے لوگوں کے سامنے پیش کرنا ہمارا اخلاقی اور دینی فریضہ ہے تاکہ لوگ ان کی عظیم خدمات سے مستفید ہوسکیں اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نئے ولولہ کے ساتھ دین حنیف کی خدمت کے لیے میدان میں اتریں۔

قارئین کرام: اسی جذبہ سے سرشار ہو کر مرکز امام بخاری، کوٹ لکھپت، لاہور، پاکستان، جو دعوتی، تعلیمی، تعمیراتی اور رفاہی خدمات میں اللہ کے فضل سے کامیابی سے ہمکنار ہو کر، اب اسلامی کتب کی طباعت اور نشر و اشاعت کے میدان میں اتر رہا ہے۔ فاضل دوست رضوان اللہ ریاضی کی جمع کردہ کتاب:

"شیخ صفی الرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ یادوں کے سفر میں"

اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، اس کے بعد کئی ایک کتب زیر غور ہیں، جبکہ بعض کتابوں پر کام چل رہا ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ ہمیں کامیابیوں سے ہمکنار فرمائے اور ہر قسم کی ریا کاری اور شہرت سے محفوظ فرمائے۔ آمین

وصلى الله عليه وسلم على نبينا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين

عبدالحلیم محمد بلال

مدیر

مركز الإمام البخاري الإسلامي

لاہور، پاکستان

۱۴۲۸/۳/۵ھ

تاثراتی کلمات

[استاذِ گرامی علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری]

(از: مولانا اصغر علی امام مہدی سلفی)

علامۂ وقت مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری کی جامع وہمہ گیر شخصیت سے متعلق یہ چند سطور بطور خریداران یوسف کی صف میں ایک قلاش وتہی دست بڑھیا کے کھڑے ہونے کے مانند ہے۔ ورنہ اس بھر پور علمی شخصیت پر کچھ لکھنے کے لیے وقت اور مطالعہ چاہیئے۔ عزیزم رضوان اللہ ریاضی سلمہ الله ووفقه نے علامۂ زماں کی شخصیت اور کارناموں پر مشتمل مجموعۂ مقالات کی ترتیب واشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے اور میرے علم کی حد تک وہ مقالات سیکڑوں صفحات پر مشتمل ہیں اور مجھے امید ہے کہ مقالہ نگار حضرات نے حقیقی طور پر مولانا کو ان کی شخصیت اور کارناموں کو سمجھ کر علمی مقالات سپردِ قلم کیے ہوں گے۔ میری طرح صرف تاثراتی کلمات نہ ہوں گے۔

مولانائے مکرم کی جامع شخصیت اس بات کی متقاضی ہے کہ اس پر وقیع وگراں قدر مقالات لکھے جائیں اور ان کی سوانح عمری ان کے علمی ودعوتی مقام کے شایانِ شان ہو۔ کیونکہ مولانا بہت سے علوم وفنون کے ماہر اور اتھارٹی تھے۔ بعض فنون میں تو یکتائے روزگار تھے۔ میں نے ایک خاص بات یہ دیکھی کہ بعض اہم مسائل میں مولانا بڑی جچی تلی رائے رکھتے تھے۔ اور اکثر مسائل میں بڑے وثوق سے گفتگو کرتے تھے۔ کبھی کوئی مسئلہ موضوع بحث ہوتا تو پورے اطمینان ووثوق سے مدلل کلام کرتے تھے۔ آپ کی تصنیفات وتالیفات کا ایک ذخیرہ ہے اور سب اپنے موضوع ومواد کے حساب سے اچھوتا، محقق ومدلل اور مرکز ہیں۔ آپ کے لہجہ وقلم میں اعتماد ومتانت کے ساتھ صحت وثقاہت کا ایک ایسا وصف ہے جو قاری وسامع کو متاثر کرتا ہے۔ اور

افادہ کے ساتھ ایقان واذعان کے درجہ پر فائز کر دیتا ہے۔

علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ کو میں نے ذاتی طور پر پڑھا، برتا اوران کی صحبت کی اثر سے متاثر بھی ہوا، اورانہوں نے ایک لمبی مدت تک درس وتدریس کا کام بھی انجام دیا ہے۔اوران کے ہزاروں شاگردوں میں سے مجھے بھی ایک طالب علم وتلمیذ بننے کا شرف بھی حاصل ہوا ہے۔ مجھے ان سے "الهداية للإمام مرغيناني"، "تاريخ التشريع الإسلامي لخضری بک" اور امیر المومنین فی الحدیث کی اَصح واَدق الکتب صحیح البخاری جلد ثانی کے چند اسباق پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔اور بھر پور استفادہ کیا تھا۔ایک سب سے اہم بات جس کا ذکر میں ہمیشہ کرتا ہوں وہ یہ کہ مولانا کے درس میں دنیا جہاں کی مفید باتیں درآتی تھیں مگر سبق میں اتنی برکت ہوتی تھی جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا،شاید ہی کوئی درس ہو جس میں غیر درسی بات نہ آئی ہو مگر اس کا برمحل ہونا اور درس سے متعلق ہوکر تفہیم درس کا ایک باب بن جانا مولانا کا ایسا کمال تھا جو آپ کا ہی حصہ تھا۔ اکتاہٹ، جھلاہٹ اور عدم فہم کا شکوہ شاید کبھی کسی طالب علم کو ہوا ہو۔مولانا اپنی علمی ہیبت، رعب داب اور قدر ومنزلت کے باوجود اپنے شاگردوں کے ساتھ ایسا برتاؤ رکھتے تھے کہ کبھی کسی نے کوئی سوال کرنے میں جھجک محسوس نہیں کی۔اور مولانا کے نورانی چہرے پر اس کے خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہوئے بارہا کا مشاہدہ ہے۔

درس کے علاوہ خارجی اوقات میں مولانا ایک ادنی طالب علم کے ساتھ بھی ایک دوست اور ساتھی کی طرح رہتے تھے۔اور مختلف ناحیوں سے طلبہ کو مستفید کرتے تھے۔اہم علمی مباحث پر عالمانہ کلام کے ساتھ ساتھ ادنیٰ معاملات میں بھی رہنمائی اور افادہ سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔عالمی حالات وواقعات پر گہری نظر تھی اور مختلف نظامہائے حیات اور اِزموں پر مولانا ناقدانہ وماہرانہ نظر رکھتے اور اسلامی اور سلفی بنیادوں پر بحث وتبصرہ فرماتے تھے۔ایسا لگتا تھا کہ مولانا نے اسے مشاہدہ کیا ہے اوران افکار وخیالات اور نظریات اور جماعات واحزاب کو قریب سے دیکھا اور برتا ہے۔

اور اسلام کی صحیح تعلیمات کی روشنی میں اس کے حسن وقبح کا جائزہ لیا ہے۔ ایسا قوی اور عمیق مشاہدہ اور اس پر مومنانہ وعالمانہ رائے وتبصرہ خال خال ہی کسی نے لکھا ہوگا، اور مدتوں تجربوں سے گزرنے کے بعد کسی مفکر اور مورخ کے قلم سے دیکھنے کو ملا ہوگا۔ غالباً یہ سب نتیجہ تھا مولانا کی کتاب وسنت پر بابصیرت نظر واستدلال اور عمیق مطالعہ اور پختہ یقین وایمان کا؛ ورنہ تدلیسات وتلبیسات، زرق برق اور چمک دمک کی ماری اس دنیا میں جہاں پر ہر چمکتی چیز کو دیکھ کر سونا باور کر لینے اور کرا لینے کا خبط سوار ہے اور ظاہر بینی نے انسان کو حقائق سے اتنا دور کر دیا ہے کہ باوجود اس طرح کامیابی کے ساتھ کسی اہم بات کی تہ تک پہنچ جانا ناممکن نہیں تو دشوار تر ضرور ہے۔ **وذلک فضل الله یؤتیه من یشاء**

مولانا مکرم نے سیرت طیبہ پر جو گرانقدر کتاب تالیف فرما کر عالمی شہرت حاصل کی، وہ بڑی سعادت ہے۔ مگر ذاتی طور پر بھی آپ بہت باکردار انسان تھے۔ چنانچہ سیرت طیبہ کے سیرت نگار سے جو بھی ملتا وہ ان کی شخصیت اور علمیت سے متاثر ہوتا تھا۔ میں نے جامعہ سلفیہ بنارس کے پانچ سالہ دور طالبعلمی میں مولانا کو جس طرح سے پروقار زندگی گزارتے دیکھا ہے اس سے بے حد متاثر ہوا۔ ۱۹۸۴ء کے آخری ایام میں جب مجھے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ ملا اور مولانا مکرم سے وہاں ملاقات ہوئی تو فرمایا:

”آپ جامعہ سلفیہ بنارس کے طالب علمی کے زمانہ میں محدث کے لیے کچھ نہ کچھ لکھتے تھے یہاں آ کر خاموش ہو گئے اس سفر میں امید ہے کہ آپ کا مقالہ مجھے ملے گا“۔

واضح ہو کہ مولانا رحمہ اللہ ماہنامہ محدث کے ایڈیٹر تھے اور لکھنے والوں کی ہمت افزائی فرماتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے ایک طالب علمانہ مضمون غالباً عالمیت کی دوسری جماعت میں پڑھتے ہوئے لکھ کر شیخ عبدالمعید مدنی حفظہ اللہ کی خدمت میں پیش کیا تھا تو انہوں نے تشجیع فرمائی تھی اور اسے جریدہ ترجمان دہلی کو ارسال کرنے کی تاکید کی تھی۔ یہ ہمت افزائی میرے لیے بڑی چیز تھی،

مگر مولانا کے یہاں سے لوٹتے ہوئے راستے میں علامہ مبارکپوری سے ملاقات ہوگئی اور انہوں نے اسے ماہنامہ محدث کے لیے اسی وقت لے لیا اور من وعن شائع فرمادیا۔ یہ میرا پہلا مضمون تھا جو کسی مشہور مجلّہ میں بطور اشاعت باریاب ہورہا تھا۔ البتہ اس سے قبل بعض مقالات مجلّہ المنار ندوۃ الطلبہ سے شائع ہوچکے تھے۔ بعد کے ایام میں شعور وعلم کی جب قدرے ہوا لگی تو احساس ہوا کہ مولانا نے یہ مضمون محض خاطرداری، ہمت افزائی اور رہنمائی کے طور پر شائع کردیا تھا ورنہ میں کہاں ان قدردانیوں کے لائق۔ یہ مولانا کا اپنے شاگردوں کے تئیں مشفقانہ ومشجعانہ سلوک جہاں بہت سے اساتذہ کے لیے نصیحت وموعظت اور سبق ہے وہیں لائق اتباع وتقلید بھی۔

الغرض مدینہ منورہ کے زمانہ میں میں نے حسب ارشاد یہودیت اور تشیع پر ایک تقابلی مطالعہ حضرۃ الاستاذ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی اور انہوں نے اسے پذیرائی بخشتے ہوئے شائع فرمادیا۔

مولانائے مکرم نے مجھے کبھی خط لکھا ہو مجھے یاد نہیں۔ مگر ایک خط جو انہوں نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے مرکز خدمۃ السنۃ والسیرۃ النبویۃ کی طلب پر باحث کی حیثیت سے مدینہ منورہ کے لیے روانگی سے قبل مجھے لکھا تھا۔ وہ میرے پاس محفوظ ہے۔ مولانا نے اپنے چھوٹے بڑے وسیوں شاگردوں اور متعلقین کے بیچ اپنے استقبال اور ضروری مسائل سے متعلق مجھے شرف بخشا تھا، وہ میرے لیے بڑی سعادت وشرف کی بات تھی۔ مدینہ منورہ میں مولانا کے ورود کے بعد تقریباً تین ماہ تک اکثر مولانائے مکرم کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا۔ اور اس مدت میں مولانا نے جس طرح کی فیاضی وفراخدلی کا مظاہرہ فرمایا میں ذاتی طور پر بہت متاثر ہوا، اسی طرح تواضع وانکساری کے ساتھ جس طرح ادنی کام میں بھی شیئر کرنے اور حصہ داری نبھانے میں سیرت طیبہ کی روشنی میں عملی نمونہ پیش کیا اس سے میرے دل میں آپ کی قدر ومنزلت اور فزوں تر ہوگئی۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے مولانا مختلف علوم وفنون کے ماہر تھے، شعر وسخن کا بھی اچھا ذوق تھا۔ برجستگی اور حاضر جوابی میں یکتا تھے۔ فی البدیہہ مصرعے، اشعار اور چست درست جملے

عام حالات میں بھی ایسا کہہ ڈالتے تھے کہ اس سے برمحل کوئی اور بات نہیں ہو سکتی تھی۔ یہی بات میں نے استدلال کے باب میں قرآن کریم کے سلسلہ میں بھی بارہا ملاحظہ کیا، اور استحضار و استناد پر راسخ فی العلم ہونے کا یقین ہونے لگا۔ موقع و موضوع کی مناسبت سے آیات قرآنی سے استدلال اور متعلقہ آیات کا ذکر و احضار آپ کا ایسا ملکہ تھا جو کسی کے اندر کم ہی دیکھنے میں آیا ہوگا۔

آپ کے علمی مقالات، ملکی و جماعتی اور عالمی تناظر میں شائع شدہ اخبار، تبصرے و تجزیے کے علاوہ تصنیفات و تراجم کی لمبی فہرست ہے۔ بعض عالمی ایوارڈ یافتہ اور بین الاقوامی شہرت کی حامل تصانیف و تالیفات ہیں۔ اور اس پر مختلف علمی و دینی حلقوں سے آپ کو زبردست مبارکباد اور خراج تحسین پیش کیا جا چکا ہے۔ مگر اس کا اصل اجر و ثواب اور قدر دانی عنداللہ ہے ان شاء اللہ۔ مگر بعض ایسی تحریریں بھی ہیں جو شہرت کے اس درجہ پر فائز نہیں مگر اپنے مواد و محتوی کے حساب سے بڑی سے بڑی تالیفات پر بھاری ہیں۔ "الأحزاب السياسية في الإسلام" آپ کی معرکۃ الآراء کتاب ہے۔ جو رابطة الجامعات العربية کی طلب پر آپ نے تالیف کی تھی اور جسے اسی ادارہ نے شائع بھی کیا ہے۔ اپنے موضوع پر بھرپور اور باکمال کتاب ہے۔ جو موجودہ دور کے بے شمار راسمالی سرمایہ داری اور کمیونزم، اسلامی اسٹیٹ، سیکولرزم، جمہوریت ڈیموکریٹک اور شہنشاہیت اور آمریت اور بھانت بھانت کے سیاسی جتھ بندیوں، حزب مخالف اور دایاں بازو، بایاں بازو وغیرہ جیسے بھول بھلیوں اور طریقوں کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہے جس میں آپ نے اعتدال کی راہ دکھائی ہے اور آپ کے اسلامی و غیر اسلامی سیاست پر گہرے مطالعہ اور بابصیرت نظر و فکر پر غماز ہے۔

آپ کی دیگر تصنیفات بھی اعلیٰ علمی و تحقیقی معیار و مقام پر فائز ہیں۔ اتحاف الکرام شرح بلوغ المرام در نظر کہتر بقیمت بہتر کا نمونہ ہے۔ طالب علم، استاذ اور شیخ سب کے لیے یکساں طور پر مفید ہے اور ان میں سے کوئی بھی اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

انہی مختصر سے کلمات پر میں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ ویسے تو استاذِ محترم سے متعلق بہت سی باتیں

ہیں جو قابلِ ذکر ہیں، مگر یہاں انھیں قلمبند کرنے کی گنجائش نہیں۔ قابلِ قدر ہیں عزیزم رضوان اللہ ریاضی سلمہ جنھوں نے اس عظیم شخصیت پر ان مقالات کو جمع کر کے ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ استاذ مکرم کے محبین کی خدمت میں ان کی یہ پیشکش انتہائی خوشی اور شکریے کے ساتھ قبول کی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ اس مجموعہ کو مفید عام بنائے۔ مقالہ نگاران حضرات کو جزائے خیر دے اور مرتب و ناشر کو بھی اجر و ثواب کے ساتھ مزید توفیقات سے نوازے اور علامہ مرحوم کے حسنات کو قبول فرمائے اور سیئات سے درگزر فرمائے (1)۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اللھم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه وأدخله فسيح جناته۔

کتبہ

أصغر علی إمام مهدی سلفی

(ناظم عمومی مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند)

۱۵/صفر ۱۴۲۸ھ، مطابق ۵/مارچ ۲۰۰۷ء

(1) مولانا اصغر علی امام مہدی سلفی ؒ کا یہ تاثر پندرہ روزہ ترجمان دہلی (15 مارچ 2007ء) کے شمارے میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

مقدمہ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين،

ومن تبعه بإحسان إلى يوم الدين، وبعد:

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کے انتقال کو ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ 7 دسمبر 2006ء بروز جمعرات صبح 10 بجے جامعہ ریاض العلوم دہلی کے ناظمِ اعلیٰ مولانا عبدالرشید بن عبدالسلام از ہری بستوی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ایک ہفتے کے درمیان دو جلیل القدر اور معروفِ زمانہ علماء کے سانحۂ ارتحال سے ہندستان کے علمی طبقہ میں اور خاص کر اہلحدیثوں میں کہرام مچ گیا۔

اس حادثے کے ہفتہ دو ہفتہ بعد میں نے مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے ناظمِ اعلیٰ جناب مولانا اصغرعلی بن امام مہدی سلفی حفظہ اللہ کو سعودی عرب سے فون پر تعزیت کی اور گزارشانہ انداز میں یہ تجویز دی کہ ان دونوں صاحبان پر پندرہ روزہ ترجمان کا خصوصی نمبر شائع ہونا چاہیے اور اس میں ان دونوں بزرگان کی علمی ودعوتی سرگرمیوں کے بارے میں مواد فراہم کیا جانا چاہیے۔ نیز مستقبل میں ان کی سوانح حیات الگ الگ کتاب کی شکل میں شائع ہونی چاہیے۔

مولانا اصغرعلی حفظہ اللہ نے مجھ سے کہا:

”یہ کام کون انجام دے گا؟“۔

میں نے عرض کیا:

”جمعیت کے اتنے سارے افراد ہیں جن میں ماشاء اللہ قابلیت وصلاحیت کی کوئی کمی نہیں۔ جو ذرہ جہاں ہے وہیں آفتاب ہے۔اس لیے انہیں میں سے کسی کو مکلّف کر دیں۔

پھر مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کا تو ہر اہلحدیث پر احسان بھی ہے کہ ان کی مایہ ناز

کتاب کے ذریعے پوری دنیا میں سلفیوں کی ناک اونچی ہوئی ہے۔ ویسے ہی مولانا عبدالرشید ازہری رحمہ اللہ بھی ہماری دعاؤں کے مستحق ہیں۔ کیونکہ وہ بھی سفارش کے ذریعے نہ جانے کتنے طالبانِ علومِ نبوت کے تاریک مستقبل کو نور میں تبدیل کرنے کا ذریعہ بنے اور نہ جانے کتنے مجبور لوگوں کا سہارا!!''۔

مولانا اصغر علی رحمہ اللہ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے:

''عزیزم رضوان! ہم اہلحدیثوں کا دعویٰ ہے کہ کم وبیش ہماری تعداد تین کروڑ ہے۔ مگر ابھی تک بقول ایک روزنامہ کے اہلحدیث ایڈیٹر کہ اتنی بڑی شخصیت کی وفات پر اہلحدیثوں کی طرف سے چند تعزیتی کلمات بھی نہیں آئے، مقالات تو دور کی بات ہے۔ چہ جائیکہ تم مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ اور مولانا عبدالرشید ازہری رحمہ اللہ کی زندگی کے بارے میں خصوصی نمبر شائع کرنے کی بات کر رہے ہو۔ قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ کانگریس کی صدر سونیا گاندھی کی طرف سے تعزیت نامہ پہنچا اور بعض دیوبندی اِخوان کی طرف سے بھی تعزیت نامے پہنچے ہیں مگر ہمارے اہلحدیثوں پر غبار چھایا ہوا ہے کہ تعزیت کے دو الفاظ بھی نہیں کہہ سکتے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ جو لوگ اپنے بزرگوں کی تعزیت میں مفت کے چند الفاظ نہیں کہہ سکتے؛ بھلا وہ ان کے حالاتِ زندگی پر کتابیں کیونکر شائع کر سکتے ہیں؟! ویسے ہم لوگ ترجمان میں مسلسل شائع کر رہے ہیں''۔

میں نے عرض کیا:

''مولانا صاحب! اس موقع پر لکھنے والے نہ لکھیں گے تب کب لکھیں گے۔ ابھی یہ موضوع تازہ ہے، لکھنے والوں کو توجہ دلائی گئی تو لکھ سکتے ہیں، اس لیے جماعت کے افراد کو اس جانب توجہ دلانی چاہیے۔ مرورِ ایام کے ساتھ ان دونوں بزرگوں کے بارے میں لوگوں کی معلومات بھی پرانی ہو جائے گی اور ایک دن ان کا نام بھی دفن ہو جائے گا''۔

مولانا اصغر علی سلفی رحمہ اللہ نے کہا:

’’بھئی! آپ بھی تو اہلحدیث فرد ہیں، آپ ہی اس کام کو کر ڈالیں‘‘۔

میری یہ ساری گفتگو مکتبہ دارالسلام ریاض کے شعبۂ تحقیق وتالیف کے مدیر قاری محمد اقبال عبدالعزیز اور جناب حافظ عبدالحلیم بلال صاحبان کے علاوہ میرے کئی ساتھی سن رہے تھے۔ شیخ اصغر علی سلفی حفظہ اللہ کی بات سے مجھے یقین ہوگیا کہ اگر کوئی حساس طبیعت آدمی وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس وقت تیار نہیں ہوا تو پھر آیندہ کبھی نہیں لکھا جائے گا۔ چنانچہ میں نے اسی وقت عزم کر لیا کہ میں ان دونوں بزرگوں کے بارے میں جو بھی معلومات میرے پاس ہے، اس کی بنیاد پر ان شاء اللہ ضرور لکھوں گا۔ جبکہ ڈیوٹی کے اوقات کے بعد جو بھی وقت بچ رہتا ہے، اس میں میرے پاس اتنے سارے لکھنے پڑھنے کے کام ہیں کہ ایسی صورت میں میرے موضوع سے ہٹ کر کچھ لکھنا انتہائی مشکل ترین کام ہے۔ عربی واردو اور ہندی زبان میں میری کئی ایک کتابوں کے مسودے کمپوزنگ کے مراحل سے گزر کر تیار ہیں مگر ان کے دُم کی سیٹنگ کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔ وقت کی قلت کے باعث ان کتابوں کی تکمیل نہیں ہو پا رہی ہے۔ میں اسی کشمکش میں تھا کہ یہ نیا موضوع نکل پڑا اور میرا مشورہ میرے ہی سر آ لگا۔

اسی دوران میں نے مورخہ 13 دسمبر 2006ء کو جامعہ ریاض العلوم میں اپنے استاد گرامی شیخ علی اختر بن امان اللہ مکی حفظہ اللہ کی خدمت میں شیخ عبدالرشید ازہری رحمہ اللہ سے متعلق بنیادی معلومات طلب کرنے کے لیے سوالیہ انداز میں لکھ کر دہلی فیکس کیا اور پھر اپنی یومیہ ڈائری کے حوالے سے ان کے بارے میں لکھنا شروع کیا۔ ابھی چند ہی صفحات لکھے تھے اور فیکس کا جواب آنا ابھی باقی تھا کہ مجھے باوثوق ذرائع سے معلوم ہوگیا کہ جامعہ ریاض العلوم دہلی کے ذمہ داران نے مولانا عبدالرشید ازہری رحمہ اللہ کی سوانح پر قلمکاروں سے مضامین لکھانے اور ان کے بارے میں کتاب شائع کرنے کا مختلف میگزین میں اعلان کر دیا ہے۔ اس سے مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ چلو اب مجھے صرف شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ کے بارے میں ہی لکھنا پڑے گا اور انہی کے بارے میں مواد اکٹھا کرنا پڑے گا۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ سے متعلق جو معلومات میرے پاس تھی، وہ ان کی زندگی کے تقریباً سارے گوشے کو محیط ہو سکتی تھی اور ان کی حیات پر ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی تھی۔ مگر میں نے اس کتاب کو صرف اپنی حد تک محدود نہ رکھ کر مولانا کے دوسرے عقیدتمندوں کو بھی اس میں شریک رکھا۔ کیونکہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ پوری دنیا میں مولانا کے چاہنے والوں کی تعداد ہزاروں بلکہ لاکھوں کی سرحد سے بھی پار کر چکی ہے۔ اس لیے پوری دنیا میں پھیلے مولانا کے عقیدت مندوں کی قدردانی بھی ہمارا فرض ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی اس کتاب میں ان کے لیے بھی گنجائش رکھی اور اس کے لیے میں نے مختلف حضرات کی خدمت میں ٹیلی فون بھی کیا۔

سعودی عرب میں اس سلسلے میں جن حضرات سے بات ہوئی اور جن سے میں نے مولانا کے بارے میں مضامین لکھنے کی گزارش کی ان میں: ڈاکٹر عبدالقدوس مدنی صاحب، شیخ عزیر شمس صاحب، شیخ غازی عزیر صاحب، حافظ محمد الیاس مدنی صاحب، شیخ محمد طاہر حنیف سلفی صاحب، مولانا کے صاحبزادے طارق صفی الرحمٰن صاحب، مولانا کے داماد جناب فاروق صاحب اور ان کی اہلیہ صاحبہ، مولانا کے چھوٹے داماد انعام الحق رحمانی صاحب اور ان کی اہلیہ صاحبہ، قاری محمد اقبال عبدالعزیز صاحب، شیخ عبدالسلام عمری و مدنی صاحب، حافظ عبدالمتین راشد صاحب، قاری عبدالحلیم بلال صاحب، شکیل احمد سلفی صاحب اور نیاز احمد سلفی وغیرہ ہیں جن سے میں نے موبائل اور ٹیلی فون پر متعدد بار مولانا کے متعلق کچھ لکھنے کو کہا۔

پاکستان میں بھی مختلف علمائے کرام سے مولانا کے بارے میں لکھنے کی گزارش کی جن میں مولانا اسحاق بھٹی حفظہ اللہ اور جناب حافظ حسن مدنی حفظہ اللہ (ایڈیٹر ماہنامہ محدث) قابلِ ذکر ہیں۔ ہندستان میں بھی میں نے مختلف حضرات سے متعدد بار اس موضوع پر لکھنے کی گزارش کی۔ شیخ اصغر علی بن امام مہدی سلفی حفظہ اللہ (ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند)، مولانا جنید مکی بنارسی حفظہ اللہ، اور مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر فیض الرحمٰن سلفی حفظہ اللہ سے تو میں نے کئی دفعہ اس بارے میں ٹیلی فون پر بات کی۔ بلکہ مولانا مرحوم کے صاحبزادے ڈاکٹر فیض الرحمٰن سلفی کو کم وبیش 20 دفعہ انٹرنیشنل کال کی

اور انہوں نے ہر مرتبہ اپنا مضمون فیکس کرنے کا وعدہ کیا اور اب تک ان کا فیکس نہیں پہنچا۔ جبکہ اس مدت میں میں نے تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل یہ سارا مواد جمع کر لیا جو آپ کے ہاتھ میں موجود ہے[1]۔

مذکورہ صاحبان میں سے جن لوگوں نے جو کچھ لکھ کر میرے پاس بھیجا، میں نے اسے شامل کتاب کر لیا اور اس کے علاوہ مختلف میگزین میں مختلف لوگوں کے شائع شدہ مضامین جو میرے ہاتھ لگے میں نے بطور استفادہ انہیں بھی شامل کر لیا۔ جو مضامین میں نے میگزین سے لیے، ان میں سے اکثر میں تکرار تھا۔ اور اکثر لوگوں نے مولانا کی سوانح میں ان کی ولادت سے ان کی عملی زندگی تک کے حالات انہی کی لکھی ہوئی تحریر سے اخذ کیا تھا۔ اس لیے میں نے چند کے سوا سبھوں کے مضامین سے یہ باتیں تقریباً حذف کر دیں تاکہ کتاب ضخیم نہ ہو جائے۔ البتہ میں نے جن حضرات سے

---

(1) میں نے بہت کوشش کی کہ مولانا صاحب کے صاحبزادے ڈاکٹر فیض الرحمٰن سلفی کا مضمون بھی اپنی اس کتاب میں شامل کروں۔ اسی لیے میں نے سعودی عرب سے انڈیا بار بار ٹیلی فون کیا۔ ڈاکٹر صاحب وعدہ کرتے رہے کہ آج کل میں بھیج دیتا ہوں۔ میں مضمون لکھ کر رکھا ہوں۔ مگر کتاب تیار ہوگئی اور ڈاکٹر صاحب کا مضمون نہیں آیا۔ جب کتاب بالکل مکمل ہوگئی تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب سعودی عرب آچکے ہیں اور جدہ میں مقیم ہیں۔ میں نے جدہ فون کر کے رابطہ کیا تو انھوں نے کہا: رضوان صاحب! میں اپنا مضمون ساتھ لایا ہوں، ویسے میرا یہ مضمون ہماری ویب سائٹ پر بھی نشر کیا جا چکا ہے۔ میں نے کہا: پھر تو اور اچھا ہے۔ آپ اپنی سائٹ ہی بتا دیں میں وہاں سے حاصل کر لوں گا۔ انھوں نے کہا: بعد میں فون کریں، ڈائری میں لکھا ہوا ہے جو کہ رہائش پر ہے، میں جب رہائش پر پہنچوں گا تو دے دوں گا۔ اس کے بعد میں نے ان کے بھائی جناب طارق صفی الرحمٰن صاحب کو مدینہ فون کیا تو معلوم ہوا کہ ان کی کوئی ویب سائٹ نہیں ہے۔ پھر میں نے ان کے چھوٹے بھائی جناب عامر صفی الرحمٰن صاحب کو انڈیا ٹیلی فون کیا تو ان سے بھی معلوم ہوا کہ ہماری کوئی ویب سائٹ نہیں ہے۔ جبکہ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ عامر ہی یہ ویب سائٹ چلاتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی میں ڈاکٹر صاحب کو فون کرتا رہا مگر نہ جانے کس وجہ سے اس کے بعد فون ہی ریسیو کرنا چھوڑ دیا۔ شاید انھوں نے مضمون ہی نہ لکھا ہو اور پہلے دن ہی میرے ساتھ سبقت لسانی ہوگئی ہو جس کے تدارک میں انہیں معہودِ ذہنی کی ویب سائٹ کا حوالہ دینا پڑا!!!

گزارش کر کے مضامین لکھوائے ہیں انھوں نے اپنی تحریروں کا رخ میرے بتانے کے مطابق ہے۔
اللہ ان سب کو جزائے خیر دے۔ آمین

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ سے متعلق اس کتاب کے مواد کی فراہمی میں میں نے اس قدر برق رفتاری اور محنت سے کام لیا ہے کہ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں ایسے وقت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یومیہ 9، 10 گھنٹہ آفس کی ڈیوٹی کے علاوہ اہلخانہ اور بچوں کے حقوق نبھانا اور پھر اس کے بعد لکھنے پڑھنے کا کام کرنا؛ یہ ایک ایسا کٹھن مرحلہ ہے جس کی حقیقت وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اپنے گھروں میں کچھ لکھنے پڑھنے کے عادی ہوں۔ ہم نے تاریخ کی کتابوں میں اسلاف کے بارے میں پڑھا تھا کہ ان کے مطالعے اور پڑھنے لکھنے سے ان کی بیویاں کس قدر حسد کی آگ میں جلتی تھیں؛ بلکہ امام زہری رحمہ اللہ کی بیوی کے بارے میں آتا ہے کہ وہ ان کے کتب خانہ کو کہتی تھیں:

"یہ مکتبہ میرے اوپر تین سوکنوں سے بھاری ہے"۔

کیونکہ امام زہری پڑھنے لکھنے کے دھن میں بیوی کو وقت نہیں دے پاتے تھے۔ آج اس تجربہ سے بھی میرے جیسے کئی لکھنے پڑھنے والے گزر رہے ہیں جن کے ہاتھوں سے کتابیں اور کاپیاں پھینک پھینک کر ان کی بیویوں نے ان کے ساتھ طاقت آزمائی اور غیرت کا بار بار اظہار کیا ہے۔
اللہ ہدایت دے ان عقل کی کچی مہ وشوں کو!!

اللہ گواہ ہے۔ آج ہی کی بات ہے کہ شام میں پاکستان سے ماہنامہ محدث لاہور کے ایڈیٹر حافظ حسن مدنی حفظہ اللہ کا فون آیا کہ محدث کا شمارہ دو چار روز میں نکلنے والا ہے۔ آپ نے شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کے بارے میں جو مضمون تیار کیا ہے اسے ای میل کر دیں۔ میں نے ان سے کہا کہ اب تک میں نے اپنے مضمون پر نظر ثانی نہیں کی ہے۔ انھوں نے کہا: نظر ثانی کے بغیر ہی بھیج دیں۔ چنانچہ میں رات میں اپنا مضمون بھیجنے کے لیے کمپیوٹر پر بیٹھ کر اس کے مختلف ضروری مقامات کا مراجعہ کر رہا تھا؛ جبکہ میری عادت ہے کہ اپنی تحریر خود کمپوز نہیں کرتا۔ اسی میں مگن تھا کہ میرا بچہ فیصل رضوان جس کی عمر آج تقریباً پونے تین سال کی ہے، آ کر میری کرسی کے پاس کھڑا ہو کر مجھ سے ابا ابا

کہہ کر کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کافی دیر تک ابا ابا کہتا رہا۔ مجھے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں تھا۔ آخر کار اس نے جب میری طرف سے اپنی آواز کا کوئی جواب نہیں پایا تو کہنے لگا:

''کیسا ابا ہے بات نا کر!!''۔

اس ننھے بچے کی زبان سے اتنا طویل جملہ آج پہلی دفعہ نکلا تھا۔ یہ سن کر میرے تعجب کی انتہا نہیں رہی۔ میں زور سے ہنسا بھی۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ چونکہ میں اپنے مضمون میں مگن تھا اور اس دوران وہ مجھے اپنی طرف مخاطب کرنے کی کوشش کرتا رہا اور جب میں نے اس کا جواب نہیں دیا تو تنگ آ کر اس نے مجھے یہ بات سنائی ہے۔ دراصل میرے بچے کا میری طرف سے جواب نہ ملنے کی وجہ یہی تھی کہ اِس کتاب کی تیاری میں میں پورے لگن کے ساتھ مشغول تھا۔ اور اسے جلد منظر عام پر لانے کا میرے اوپر بھوت سوار تھا!!

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کی شخصیت اتنی عظیم تھی کہ ان کی زندگی کے ہر ہر گوشے پر لکھا جانا چاہیے تھا تاکہ امت مسلمہ کے افراد میں اس کے تناظر میں کچھ کرنے کرانے کا جذبہ بیدار ہوتا۔ مگر اتنی ترتیب وتنسیق کے ساتھ ان کی سوانح تیار کرنا ایک مشکل ترین کام تھا، کیونکہ اب امت کے افراد میں اپنے اسلاف کی تاریخ سے سروکار کہاں؟!...... اسی لیے ایک قلیل سی مدت میں مولانا مرحوم سے متعلق جو کچھ بھی بن پڑا ہے میں نے لکھنے لکھانے اور جمع وترتیب کی کوشش کی ہے۔ تاکہ مولانا مرحوم سے متعلق ان کے چاہنے والوں کو جس قدر ہو سکے معلومات فراہم کر سکوں۔ چونکہ مولانا کے عقیدتمندوں کا پوری دنیا سے ان کی سیرت وسوانح پر کسی تحریر کی فرمائش بار بار آ رہی ہے۔

میں نے جو کچھ لکھا ہے یا جمع کیا ہے، بہت جلد بازی میں کیا ہے۔ اگر اس میں کوئی تشنگی ہے تو شاید کوئی اللہ کا بندہ بعد میں پوری کرنے کی کوشش کرے۔ البتہ اگر اس میں کوئی خامی نظر آئے تو یہ نقص میری طرف سے ہوگا کہ یہ بشری تقاضا ہے اور اگر خوبی نظر آئے تو یہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

اللہ قسم! اگر تعلیم و تعلم اور قلم و قرطاس سے سچی محبت اور مولانا مرحوم سے گہری عقیدت نہ ہوتی تو شاید میں یہ کتاب تیار نہیں کر پاتا۔ میں نے کتنی محنت اور کیسے کیسے وقت کا استعمال کر کے اور کن کن مشکل ترین مراحل سے گزر کر یہ کتاب تیار کی ہے، اس کا اندازہ شاید میرے قارئین کو نہ ہو سکے۔

"دراصل یہ کتاب ثمرہ ہے اس آنکھ کی قربانی کا جس نے راتوں کی نیندیں اپنے اوپر حرام ٹھہرالیا۔ یہ کتاب نتیجہ ہے دس گیارہ گھنٹہ یومیہ ڈیوٹی کے بعد ان خارجی اوقات کے استعمال کا جو بیوی بچوں کے لیے ریزرو تھے۔ گھر میں، صحرا میں، پارٹی میں، راستے میں، گاڑی میں۔ غرض جس جگہ اور جہاں بھی چند لمحہ مل گیا اس کتاب میں لگا دیا گیا۔ حتیٰ کہ روڈ پر متعین سگنلوں کے پاس کے چند منٹ کا وقفہ بھی اس کتاب کی تیاری میں شامل ہے"۔

اللہ اللہ کر کے انتہائی برق رفتاری کے ساتھ کام کر کے اس کتاب کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کی سوانح پر قلم چل چکا تھا اور چلتا ہی جا رہا تھا۔ مجبوراً روکنا پڑا۔ اور کیوں نہ روکنا پڑے؟! جبکہ لکھنے والا بھی میں اور لکھوانے والا بھی میں، مواد اکٹھا کرنے والا بھی میں اور فون پر لوگوں کو توجہ دلانے والا بھی میں، تصحیح کرنے والا بھی میں اور مراجعہ کی ذمہ داری نبھانے والا بھی میں۔ حالانکہ یہ کام امت کے ان افراد کا تھا جو جمعیت و جماعت کی خدمت میں ہی لگے ہوئے ہیں یا جن کا مولانا سے بہت زیادہ تعلق رہا ہے!!

کم وقت میں جو کچھ بھی مولانا مرحوم سے متعلق مواد اکٹھا ہو سکا ہے، اگر آپ قارئین کو پسند آئے تو دعاؤں میں یاد رکھنا نہ بھولیں اور اگر کوئی بات ناپسند آئے تو توفیق کی دعا کریں۔

میں ان تمام حضرات کا تہِ دل سے شکرگزار ہوں جنھوں نے میری اس کتاب میں کسی بھی

طرح کا کوئی تعاون پیش کیا ہے؛ خواہ ایک کلمۂ تشجیع ہی کے ذریعے کیوں نہ ہو۔ خاص کر میں اس موقع پر جمعیت اہلحدیث کے ناظمِ اعلیٰ جناب مولانا علی اصغر امام مہدی سلفی ﷾ کا شکر بجالاؤں گا جن کے ایک ہی جملے نے ایک حساس طبیعت کو اس کتاب کی تالیف کا سبب بنادیا، جس کی تفصیل اس مقدمہ کے شروع ہی میں بیان کردی گئی ہے۔

ہم آخر میں بدست دعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے درجات بلند کرے اور جنت الفردوس میں انہیں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کی تالیف کو رہتی دنیا تک ان کے حق میں صدقہ جاریہ بنائے اور ہماری اس کوشش کو قبول فرمائے۔

﴿يوم لا ينفع مال ولا بنون إلا من أتى الله بقلب سليم﴾ [الشعراء:88،89]

آمین یارب العالمین۔

وصلى الله على نبينا محمد وآله وصحبه أجمعين.

کتبہ

رضوان اللہ ریاضی

(ریاض، سعودی عرب)

27-02-2007

(1) میری یہ کتاب مکمل ہو چکی تھی کہ طباعت سے قبل کسی ضروری کام سے مجھے 2/اپریل 2007ء کو اچانک سعودی عرب سے انڈیا جانے کی نوبت آگئی اور میں بیس دنوں کے لیے اپنے وطن چلا گیا۔ واپسی پر 18/ اپریل کو جامعہ سلفیہ بنارس بھی گیا؛ تاکہ اگر مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کے بارے میں مزید معلومات ملے تو اسے شاملِ کتاب کروں۔ وہاں مولانا محمد حنیف مدنی اور شیخ الجامعہ مولانا محمد یونس سلفی سے مولانا مرحوم کے بارے میں بہت ساری معلومات ملی۔ نیز مولانا محمد حنیف مدنی کا مضمون بھی مجھے شامل کرنے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے مولانا مرحوم کے لکھے ہوئے چند خطوط بھی مجھے عطا کیے۔

شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ۔یادوں کے سفر میں

(از: رضوان اللہ ریاضی، ریاض)

کلیوں کو میں سینے کا لہو دے کے چلا ہوں
صدیوں مجھے گلشن کی فضا یاد کرے گی

حساس طبیعت کو صدمہ:

یکم دسمبر 2006ء مطابق ۹ ذوالقعدہ ۱۴۲۷ھ کو جمعہ کے دن 10 بجے میں گہری نیند سے سو رہا تھا۔عموماً سعودی عرب میں اگر کسی کو سونے کی فرصت ملتی ہے تو وہ جمعہ کا دن ہی ہوتا ہے۔ ہفتہ بھر کی محنت اور شب بیداری کی تھکاوٹ جمعہ کے روز ہی دور کی جاتی ہے۔ کیونکہ ہر آدمی ہفتہ کے دیگر ایام میں طویل ڈیوٹی میں اس قدر مشغول رہتا ہے کہ اسے یومیہ آرام کا مناسب وقت نہیں مل پاتا اور اس لیے اس کی آنکھیں فطری نیند کو ہمہ وقت ترستی رہتی ہیں۔ ساڑھے دس بجے مؤذن کی اذان سنائی دی، اور میں جمعہ کی تیاری میں لگ گیا۔ اتنے میں موبائل کی میسج والی گھنٹی بجی۔ میں نے جو میسج کا باکس کھولا تو اس کے اندر یہ غمناک خبر تھی:

"ابھی چند لمحے قبل شیخ صفی الرحمٰن صاحب مبارکپوری انتقال فرما گئے"۔

یہ خبر میرے بزرگ ساتھی شیخ منصور عالم ریاضی صاحب کی طرف سے تھی جو کہ سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض کے علاقہ صناعیہ قدیمہ کی جالیات (دینی دعوت وتبلیغ کا مرکز) میں کئی سالوں سے بحیثیت داعی ومترجم خدمات انجام دے رہے ہیں۔

میں نے جونہی مولانا موصوف کی وفات حسرت آیات کی خبر پڑھی، سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا جیسے مجھے سانپ سونگھ گیا ہو۔ مجھے کافی دیر تک اس کا صدمہ رہا اور اس وقفے میں مجھے پوری دنیا کا وجود کالعدم محسوس ہونے لگا تھا۔ زبانِ قال سے نہیں تو زبانِ حال سے یہ سوال خود سے کر رہا تھا:

''کیا واقعی شہرۂ آفاق کتاب 'الرحیق المختوم' کے مؤلف کا انتقال ہو گیا!! کیا واقعی وہ ہستی ہمیں داغ مفارقت دے گئی جس کو دنیا نے سیرت نبوی ﷺ کے حوالے سے اپنا امام تسلیم کر لیا تھا!! کیا واقعی اس باوقار عالمِ دین کی وفات ہو گئی جس کے ذکرِ خیر سے دنیا کا خطہ خطہ، گوشہ گوشہ معطر ہو چکا تھا!! کیا واقعی اس عالمِ ربانی کی رحلت ہو گئی جس نے اپنے اعلیٰ کردار سے دشمنوں کے بھی دل جیت لیے تھے!! کیا واقعی اس مناظرِ اسلام کا وجود ختم ہو گیا جس نے مخالف گروہ کو دلائل و براہین سے عاجز کر دیا تھا!! کیا واقعی وہ مؤلف اپنے قلم و قرطاس کے ساتھ ہم سے غائب ہو گیا جس کی نوکِ قلم سے نکلا ہوا ہر ہر جملہ بلکہ ہر ہر لفظ، لفظ ہی نہیں بلکہ ہر ہر حرف انسانیت کی فلاح و بہبودی کے لیے مشعلِ راہ ہوا کرتا تھا!! کیا واقعی وہ عظیم مترجم ہم سے ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا جس کے ترجمہ و ترجمانی کی مثال دور دور تک نہیں ملتی !! کیا واقعی وہ عظیم سیرت نگار ہمیں داغ مفارقت دے گیا جس کی کتاب کے بغیر کوئی بھی لائبریری ادھوری ہے!! کیا واقعی اس مجاہد کا سایہ ہم سے اٹھ گیا جس کے نام کے ساتھ ہم حفظہ اللہ ایک بار لکھتے مگر زبان کئی دفعہ اس کلمہ کا ورد کرتی !! کیا واقعی اب اس محبِ رسول کے نام کے آگے حفظہ اللہ کی بجائے رحمہ اللہ لکھنے کا وقت آن پہنچا ہے!!...... کیا واقعی......!! کیا واقعی......!!''۔

میں ابھی اسی سوچ میں تھا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی یاد آیا:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾

''ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے''۔ (آل عمران:185)

پھر رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی نگاہوں کے سامنے گردش کرنے لگا:

﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ﴾ (سورۃ الزمر:30)

''(اے نبی!) آپ بھی مر جائیں گے اور سارے لوگ بھی مر جائیں گے''۔

پھر میں نے اپنے جذبات کو کنٹرول میں کیا اور آج سے تقریباً پندرہ سو سال قبل اس حادثے کی

سرحد میں پہنچ گیا جو کہ صحابہ کرام کی زندگی میں ان کو پہنچنے والے غم واندوہ اور مصائب ومشکلات میں سب سے عظیم حادثہ تھا۔اور وہ حادثہ تھا نبی کریم ﷺ کے انتقال پر ملال کا۔

اس سے قبل صحابہ کرام نے سیکڑوں اقسام کے مصائب دیکھے تھے، انہیں مکہ کی گلیوں میں سنگلاخ چٹانوں پر گھسیٹا گیا تھا،انہیں مکہ کی گھاٹیوں میں تپتی ریت پر سلایا گیا تھا،انہیں پتھروں سے مار مار کر لہولہان کر دیا گیا تھا،ان کے پاؤں اونٹوں اور گھوڑوں کے زین سے کس دیے گئے تھے۔ بلکہ حضرت سمیہؓ کی تکلیف دہ وغمناک شہادت بھی وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے،مگر وہ ساری تکلیفیں رسول اکرم ﷺ کی وفات کے صدمے کے آگے ہیچ تھیں!!

ادھر رسول اکرم ﷺ کی وفات کی اطلاع حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو آپ ننگی تلوار لے کر مسجد نبوی میں حاضر ہوئے۔علی الاعلان کہنے لگے:

''جس کسی نے بھی رسول اکرم ﷺ کی شان میں یہ گستاخ آمیز جملہ کہنے کی جرأت کی کہ آپ ﷺ انتقال فرما گئے تو میں اس کا سرتن سے جدا کر دوں گا!!''۔

مشہور مؤرخ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی مایہ ناز تاریخ ''البدایۃ والنہایۃ'' کے الفاظ ہیں:

"وَقَامَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يَخْطُبُ النَّاسَ وَيَتَوَعَّدُ مَنْ قَالَ مَاتَ بِالْقَتْلِ وَالْقَطْعِ".

''یعنی نبی کریم ﷺ کے انتقال کے بعد سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ لوگوں کے سامنے (مسجد نبوی میں) خطاب فرمانے لگے کہ جو کوئی کہے گا کہ محمد ﷺ وفات پا گئے، میں اسے کاٹ ڈالوں گا، اسے قتل کر دوں گا''(1)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھے کہ رسول اکرم ﷺ وفات پا چکے ہیں۔لیکن اسی اثنا میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو خطاب کرنا شروع کر دیا اور کہنے لگے:

''يَا أَيُّهَا النَّاسُ! مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ، وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ

(1) تفصیل کے لیے دیکھیے: البدایۃ والنہایۃ، فصل: احتضارہ ووفاتہ علیہ السلام۔

اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ"

"اے لوگو! جو کوئی محمد کی عبادت کرتا تھا تو (اسے معلوم ہونا چاہیے کہ) محمد ﷺ وفات پا چکے ہیں، اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا، تو اللہ زندہ ہے کبھی مرے گا نہیں"۔

پھر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَ فَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ﴾ (آل عمران:144)

"محمد ﷺ صرف رسول ہی ہیں، ان سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے ہیں، کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا یہ شہید ہو جائیں، تو تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟"۔

اس طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ہوش آیا اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دلائل و براہین سن کر وہ قدرے مطمئن ہوئے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر بڑے آدمی کے انتقال پر اس کے عقیدتمندوں پر کچھ زیادہ ہی اثر ہوتا ہے۔ میں نے بھی خود کو سنبھالا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا وہ جملہ میرے سامنے آ گیا:

"فَيَالَهَا مِنْ مُصِيبَةٍ مَا أُصِبْنَا بَعْدَهَا بِمُصِيبَةٍ إِلَّا هَانَتْ إِذْ ذَكَرْنَا مُصِيبَتَنَا بِهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ"۔

"یعنی رسول اکرم ﷺ کے انتقال پر کتنی عظیم مصیبت (تکلیف) کا ہمیں سامنا کرنا پڑا تھا۔ آپ کے انتقال کے بعد ہمیں کوئی بھی مصیبت لاحق ہوتی تو آپ ﷺ کی وفات سے ہونے والی تکلیف کو ہم یاد کر لیتے جس سے ہماری مصیبت ہلکی ہو جاتی"(1)۔

مولانا صفی الرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ کے انتقال پر ملال کی اندوہناک خبر گرچہ سنگین بلکہ ایک حساس طبیعت کے لیے انتہائی سنگین وغمناک تھی۔ مگر عزیمت اور رضا بالقدر کا تقاضا بھی یہ تھا کہ واویلا اور رنجیدہ خاطر ہونے کی بجائے صبر وتحمل سے کام لیا جائے اور قضائے الٰہی کے سامنے اُف

(1) دیکھیے: البدایۃ والنہایۃ: فصل متی وقع دفنہ علیہ الصلاۃ والسلام۔

تک نہ کہا جائے۔ کیونکہ اصل صبر تو اندوہناک خبر کے سنتے ہی کر لینے میں ہے۔ بعد میں تو کسی نہ کسی طرح سے صبر ہو ہی جاتا ہے۔ اس کے بغیر چارہ ہی کیا ہے!!! اس سلسلے میں ایک حدیث حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک خاتون کے پاس سے ہوا جو اپنے بچے کی وفات پر رو رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اتَّقِي اللَّهَ وَاصْبِرِي".

"اللہ کا خوف کھاؤ اور صبر وشکیب سے کام لو"۔

خاتون نے کہا: بھلا تمھیں میری مصیبت کا اندازہ کیا ہوگا۔ بیٹا میں نے کھویا ہے، میں جانتی ہوں ایک ماں کا درد کیا ہوتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتون کا کوئی جواب دیے بغیر وہاں سے گزر گئے۔ آپ کے جانے کے بعد اس خاتون سے بتایا گیا کہ جس آدمی کو تم نے جواب دیا ہے وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ یہ سنتے ہی خاتون کو جیسے موت آ گئی۔ وہ بہت پریشان ہوئی۔ اپنے آپ کو کوسنے لگی کہ میں نے کیوں کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب دے دیا۔ پھر وہ تیزی کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر پہنچی اور عرض کرنے لگی: اے اللہ کے رسول! میں آپ کو نہیں پہچان سکی تھی۔ میں نے نادانستگی میں آپ کا جواب دے دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"إِنَّمَا الصَّبْرُ عِنْدَ أَوَّلِ الصَّدْمَةِ".

"اصل صبر تو وہی ہے جو مصیبت کے شروع میں کیا جائے"(1)۔

مولانا مرحوم سے پہلی ملاقات اور علماء سے شوقِ ملاقات کا ایک عکس:

مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ سے میری پہلی ملاقات کس تاریخ کو ہوئی۔ غالباً 1421ھ کا کوئی دن تھا۔ میرے ایک دوست جناب محمد جلال قادری محمدی نے مجھے اور ایک ساتھی شیخ عبدالمنان مدنی کو دعوت دی کہ ریاض کے علاقہ حی الوزارات (حارۃ) میں شیخ صفی

(1) مسلم (926)۔

الرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ کا ایک گھر میں پروگرام ہے جہاں مختلف مکاتب فکر کے لوگ اکٹھے ہوں گے اور شیخ صاحب ان کے شکوک وشبہات کا جواب دیں گے۔ میں اس وقت ایک ایسے ادارہ میں کام کر رہا تھا جہاں یومیہ بارہ، تیرہ گھنٹہ ڈیوٹی انجام دینی پڑتی تھی۔ اور اس پر بھی طرہ یہ کہ جمعہ کو بھی چھٹی نہیں ملتی تھی۔ جس کے سبب کہیں آنے جانے اور مشائخ وعلمائے کرام سے ملنے جلنے کا وقت مل پانا محال تھا۔ حالانکہ علمائے کرام سے ملنے کا شوق مجھے بچپن ہی سے بہت زیادہ ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میری بستی میں ایک عظیم الشان اجتماع ہوا تھا۔ یہ غالباً 1993ء کی بات ہے۔ میں اس وقت جامعہ دارالسلام عمرآباد میں دوسری جماعت کا طالب علم تھا۔ اس اجتماع میں مجاہد آزادیٔ ہند، مفسر قرآن مولانا عبدالقیوم رحمانی بستوی رحمہ اللہ تشریف لائے تھے۔ میں اساتذۂ کرام سے ان کا نام اور ان کی تعریف سن چکا تھا۔ ایک کاغذ اور قلم لے کر ان کی خدمت میں پہنچ گیا اور ان سے آٹو گراف طلب کیا۔ میرے بچپن کے استاد گرامی مولانا عبدالحق اثری رحمہ اللہ نے اس کاغذ پر چند کلمات لکھ دیے اور مولانا سے ترجمانی کر کے بتایا:

''یہ بچہ بطور عقیدت آپ کے دستخط رکھنے کا متمنی ہے''۔

چنانچہ مولانا نے استاد گرامی کے لکھے ہوئے جملوں کے نیچے اپنے دستخط ثبت کیے اور اس کے ساتھ ہی ''مجاہد آزادیٔ ہند'' بھی لکھا۔ اسی طرح جب میں چوتھی یا پانچویں جماعت میں پڑھنے لگا تو مولانا وحید الدین خان سے خط وکتابت شروع کر دی۔ ایک خط مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی خدمت میں بھی لکھا تھا مگر ان کے پاس سے جواب نہیں مل سکا تھا۔ البتہ مولانا وحید الدین خان نے میرے ہر خط کا جواب دیا؛ چنانچہ ان سے کافی وقت تک رابطہ رہا۔

1995ء میں ''جمعية البر الإسلامية'' علی گڑھ کی جانب سے کل ہند تحریری انعامی مقابلہ کا اعلان ہوا تھا جس کا عنوان تھا:

''حجیت حدیث پر شکوک وشبہات، ایک تنقیدی جائزہ''

میں اس وقت جامعہ دارالسلام عمرآباد میں عالمیت سال دوم کا طالبعلم تھا۔ میں نے بھی اس

مقابلے میں حصہ لیا اور مقالہ تیار کر کے ڈاک کے حوالے کر دیا۔ الحمد للہ مجھے اس مقابلے میں پورے ہندستان میں اول پوزیشن حاصل ہوا۔ اس موقعے سے میں نے مولانا وحید الدین خان کو اپنی خوشخبری سناتے ہوئے خط لکھا تھا۔ مولانا نے میری تشجیع کرتے ہوئے ہمت افزا جواب دیا تھا۔

مولانا مرحوم سے ملاقات اور سوال:

علمائے کرام سے ملاقات اور ان سے تعلق قائم کرنے کا یہی شوق تھا، جو بار بار میں نے مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ سے ملنے کی کوشش کی۔ مگر ایک طرف تو طویل ڈیوٹی اور دوسری جانب چھٹی کا عدمِ امکان۔ دراصل یہاں سعودی عرب میں غیر سرکاری ڈیوٹی کا نظام کچھ اس طرح ہے کہ انسانی زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس دفعہ مولانا کے ساتھ ایک مجلس میں شرکت کی دعوت ملی تو میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور فرصت نکال کر شریک ہوا۔ اس مجلس میں مولانا سے میں نے ایک سوال بھی پوچھا تھا۔ سوال کا تعلق رسول اکرم ﷺ کی طرف منسوب اس حدیث سے تھا:

"مَا مِنْ أَحَدٍ يُسَلِّمُ عَلَيَّ إِلَّا رَدَّ اللَّهُ عَلَيَّ رُوحِي حَتَّى أَرُدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ".

''کوئی بھی آدمی جب مجھ پر درود بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ میرے اوپر میری روح لوٹا دیتا ہے یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دے دیتا ہوں''۔

مولانا رحمہ اللہ نے اس حدیث کی تردید کی اور کہا: یہ حدیث صحیح نہیں ہے(1)۔

(1) یہ حدیث مسند احمد (527/2)، ابوداود (2041)، بیہقی (245/5)، المعجم الأوسط للطبرانی (3116) وغیرہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ابن قیم رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح اور شیخ البانی اور شعیب أرنؤوط نے حسن قرار دیا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر کئی محدثین نے بھی حسن یا صحیح کہا ہے۔ مگر شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری ا نے کہا تھا: اس حدیث کے معنی ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ حالانکہ اگر ہم اس حدیث کو عالمِ برزخ کی کیفیت پر محمول کریں تو یہ معنی بھی صحیح ہوگی۔ کیونکہ عالمِ برزخ کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ اس لیے اگر رسول اکرم ﷺ کی روح لوٹائی جاتی ہے تو کیسے لوٹائی جاتی ہے اور آپ کے جواب دینے کی کیفیت کیا ہوتی ہے، ہمیں اس کا قطعی علم نہیں۔ البتہ حدیث صحیح ہے۔

میں نے علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب "قاعدة جليلة في التوسل والوسيلة" کے حوالے (1) سے بتایا کہ علامہ ابن تیمیہؒ نے تو اس سے استدلال کیا ہے؟

مولانا نے کہا: گرچہ ابن تیمیہؒ نے استدلال کیا ہے۔

مولانا مرحوم کا انداز بیان:

مولانا کی زبان اس وقت تک صاف ستھری تھی، بڑے دوٹوک الفاظ میں کسی سوال کا جواب دیتے تھے۔ میں نے مجلس میں دیکھا کہ لوگ بہت غور سے مولانا کی باتیں سن رہے تھے۔ آپ کا بیان انتہائی مدلل اور موثر تھا۔ سامعین کے سوالات کا خوبصورت سا جواب دینا گو آپ کا فن تھا۔ چنانچہ کوئی بھی آپ سے جب سوال کرتا تو ایسا لگتا جیسے جواب پہلے سے حاضر ہے۔

غرض وہ پہلا دن تھا جب مولانا صاحب سے میری ملاقات ہوئی تھی (2)۔ شاید مولانا مرحوم

---

(1) یہ مسئلہ علامہ ابن تیمیہ کی مذکورہ کتاب کے صفحہ 117 پر دیکھا جاسکتا ہے۔ طبع ادارۃ البحوث العلمیۃ والإفتاء، ریاض 2002۔ دوسرا ایڈیشن

(2) جہاں تک مولانا مرحوم کو پہلی دفعہ دیکھنے کی بات ہے تو 11/اکتوبر 1998ء کو میں نے ان کو دہلی میں دیکھا تھا۔ میں اس وقت جامعہ ریاض العلوم دہلی میں زیر تعلیم تھا۔ جمعیت اہلحدیث ہند کی جانب سے کل ہند انعامی مسابقے کا اعلان ہوا تھا۔ میں نے بھی اس مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ یہ مقابلہ دہلی کے علاقہ دریا گنج میں "بچوں کے گھر" میں تھا۔ انعامی مقابلے کے اختتام پر مولانا کی صدارت میں اس کے ہال میں ایک پروگرام رکھا ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے، اس پروگرام میں ایک مولانا صاحب جن کا نام مجھے یاد نہیں، دھواں دار تقریر کر رہے تھے۔ وہ اپنی تقریر میں عربی زبان کی اہمیت بتاتے ہوئے کہہ رہے تھے:

"عربی زبان کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ جنتیوں کی زبان عربی ہوگی"۔

گو وہ منظر آج بھی میں دیکھ رہا ہوں۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری اُس مولوی کی اس بات پر مسکرانے لگے۔ مجھے لگا شاید مولانا مرحوم مولوی صاحب کی اس بات پر اس لیے مسکرا رہے ہیں کہ جب جنتیوں کی زبان عربی ہوگی تو جہنمیوں کی زبان بھی تو عربی ہی ہوگی!!! اس سے یہ استدلال تو کوئی زیادہ اہم نہیں!!

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس موقع پر مولانا نے صدارتی کلمات میں اپنے بارے میں بتایا تھا کہ ایک مرتبہ میں چند اصحاب کے ساتھ مل کر بی جے پی کے نیتا (مجھے یاد نہیں کہ واجپئی کا نام لیا تھا یا لال کرشن ایڈوانی کا، یا کسی =

سے اس پہلی ملاقات کی روداد میں نے اپنی شب و روز ڈائری میں کہیں لکھی ہو۔ کیونکہ ان دنوں میں پابندی کے ساتھ روزانہ رات کو سوتے وقت اپنی ڈائری ضرور لکھا کرتا تھا۔ اگر عمرِ مستعار نے وفا کی اور اس کی ضرورت محسوس کی گئی تو ''بچپن کی ڈائری'' کے نام سے وہ ساری خامہ فرسائیاں بھی منظر عام پر آ ہی جائیں گی جو ایک ناتجربہ کار طالبعلم نے لکھا تھا۔ ان شاء اللہ

ایک خواب، جو مولانا مرحوم سے عقیدت و محبت کا سبب بنا:

البتہ مولانا سے بہ نسبت دیگر علمائے کرام کے زیادہ عقیدت و محبت اس لیے تھی کہ مجھے ان کی کتاب کے مطالعہ کے دوران ایک ایسا شرف حاصل ہوا تھا جس کے لیے دنیا کا ہر مسلمان تمنا کرتا ہے مگر بہت کم لوگوں کو یہ نصیب ہوتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ میں دوسری جماعت کے سالانہ امتحان کے بعد رمضان کی چھٹیوں میں جامعہ دارالسلام عمرآباد سے اپنے گھر آیا ہوا تھا۔ بچپن سے میری یہ عادت رہی ہے کہ سفر میں ہو یا حضر میں، کوئی نہ کوئی کتاب یا میگزین ضرور زیرِ مطالعہ رہتا ہے اور بچپن ہی سے کتابیں خریدنے کا بہت زیادہ شوق ہے۔ حتی کہ تیسری جماعت میں جبکہ طلبہ میں مطالعہ کا شوق ہو بھی تو مطالعے کی کتابیں خریدنے کا شوق نہیں ہوا کرتا، کہ اس عمر میں کتابوں کی افادیت و اہمیت کا کما حقہ اندازہ نہیں ہوا کرتا، میں نے اتنی زیادہ کتابیں خرید لی تھیں کہ اتنی کتابیں جامعہ کے چھ سات سو طلبہ میں سے کسی کے پاس نہیں تھیں اور وہی عادت آج تک چلی آ رہی ہے کہ جب بھی کسی مکتبہ میں جانا ہوتا ہے، ضرور ہی کچھ نہ کچھ کتابیں خرید لیتا ہوں۔ میں نے اُنہی دنوں میں مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ کی

= اور نیتا کا) کے پاس دعوتِ اسلام دینے کے لیے گیا تھا۔ غرض ہندؤں میں اور ان کے بڑے لوگوں کی خدمت میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے حوالے سے آپ کی بات ہو رہی تھی!!

اس وقت میں نے مولانا مرحوم کو پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہاتھ بھی ملایا تھا یا نہیں۔ میں بھی مقابلے کے نتائج کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا، شاید اسی لیے مجھے مولانا سے ہاتھ ملانے اور ان سے کچھ کلمات کہنے سننے کا موقع نہیں مل سکا۔ جیسا کہ امتحان کے بعد ریزلٹ کے لیے نفسی نفسی کا عالم ہوتا ہے!!

'الرحیق المختوم' کے علاوہ ان کی کتاب ''فتنہ قادیانیت اور مولانا ثناء اللہ امرتسری ؒ'' بھی خریدی تھی۔ اس کتاب کا مطالعہ کر کے میں اپنے کمرہ میں نمازِ فجر کے بعد سو رہا تھا کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا جس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

''میں نے دیکھا کہ میری بستی کی جامع مسجد کے دروازے کے سامنے قریب ہی میں ایک لحدی قبر کھودی گئی ہے۔ بہت سارے لوگ سفید اور لمبے جبے میں ملبوس ہیں۔ ان کے چہروں پر لمبی لمبی داڑھیاں ہیں۔ ان کے درمیان رسول اکرم ﷺ کھڑے ہیں۔ آپ ﷺ ان کو اپنی موت کے بارے میں بتلا رہے ہیں کہ اللہ کا حکم آ چکا ہے، میں اب تم میں نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اس قبر میں مجھے دفن ہونا ہے۔ لوگ آپ کی بات سے بہت افسردہ اور غمزدہ ہیں۔ آپ کی وفات کی خبر سن کر سارے لوگ اصرار پہ اصرار کیے جا رہے ہیں کہ اے اللہ کے رسول! آپ ہمیں چھوڑ کر نہیں جا سکتے، آپ ہمارے درمیان ہی رہیں۔ ہم آپ کے انتقال کا صدمہ برداشت نہیں کر سکتے، آپ ہمیں چھوڑ کر مت جایئے!!...... اس جماعت میں میرے والد محترم بھی ہیں اور میں یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ اس پوری جماعت میں میں ہی ایک بچہ ہوں، کوئی دوسرا بچہ نہیں ہے۔ میں بھی یہ منظر دیکھ کر بہت افسردہ ہوں۔ اتنے میں رسول کریم ﷺ حاضرین کی طرف مخاطب ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں: اگر تم واقعی مجھے اس دنیا سے جانے کی اجازت نہیں دیتے اور تمہاری خواہش ہے کہ میں تمہارے درمیان ہی رہوں مروں نہیں، تو ایک طریقہ استعمال کرو۔ رسی لاؤ اور اسے میرے پورے جسم سے باندھ دو، پھر تم سب مل کر اس رسی کو پکڑے رہو۔ اگر میں اس قبر میں داخل ہو گیا تو سمجھ لو کہ میں اب تمہارے درمیان نہیں رہ سکتا۔ اور اگر تم مجھے اس قبر میں داخل ہونے سے روک لو گے تو میں تمہارے درمیان ہی رہوں گا۔ اتنا فرما کر آپ ﷺ نے ''لا الہ الا اللہ واللہ اکبر'' کا باآواز بلند نعرہ لگایا۔ لوگ مضبوطی سے رسی کو پکڑے رہے۔ رسی پکڑنے والوں میں میں بھی تھا اور میرے والد بھی

تھے، مگر آپ ﷺ قبر میں داخل ہو گئے اور قبر خود بخود بند ہو گئی۔ اس بات سے لوگ بہت زیادہ غمزدہ تھے اور میں بھی بہت اُداس تھا۔

اتنے میں میری آنکھ کھل گئی اور جاگنے کے بعد مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ میں اپنے کمرے میں اکیلا سویا ہوا تھا۔ فوراً اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ سردی کا وقت تھا۔ میرے والدین آگ تاپ رہے تھے۔ میں جب ان کے پاس پہنچا تو غالباً میرے والد محترم خوف کی کیفیت بھانپ گئے۔ پوچھا: بیٹا! کیا بات ہے؟! میں نے ان سے اپنا خواب بیان کیا۔ ابو نے کہا: خواب تو بہت اچھا ہے اور امی جان نے کہا: اس خواب کا تذکرہ کسی سے مت کرنا ورنہ حاسدین پیدا ہو جائیں گے۔ میں نے ان کی بات گٹھری سے باندھ لی اور کئی سالوں تک میں نے اس خواب سے کسی کو آگاہ نہیں کیا۔ چونکہ میری والدہ نے اسے بیان کرنے سے منع کیا تھا''۔

خواب کی صداقت کے آثار اور سچی تعبیر:

رمضان کی چھٹیوں کے بعد میں جامعہ دارالسلام عمر آباد پہنچا۔ ممتاز ڈویژن سے میری کامیابی ہوئی تھی اور الحمد للہ تعلیمی زندگی میں شروع سے اخیر تک ہر امتحان میں مجھے امتیازی نمبرات سے کامیابی ہوئی ہے۔ میں دوسری جماعت سے تیسری جماعت میں پہنچا۔ یہ درسِ حدیث کا پہلا سال تھا۔ اس سے قبل حدیث کی کوئی کتاب نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ بلوغ المرام پڑھتے وقت کسی حدیث کی تشریح میں استاذ گرامی مولانا عبدالصمد صاحب عمری جعفری رحمہ اللہ وزید مجدہ نے بتلایا کہ رسول اکرم ﷺ لحدی قبر میں مدفون ہوئے تھے۔ اس وقت میں نے لحدی قبر اور شقی قبر میں فرق جانا۔ اس سے پہلے میں نے صرف شقی قبر ہی دیکھی تھی اور اسی ایک قسم کے بارے میں جانتا تھا۔ کبھی لحدی قبر دیکھی بھی نہیں تھی اور نہ ہی اس بارے میں کچھ معلومات تھی۔ صرف خواب ہی میں رسول اکرم ﷺ کو لحدی قبر میں دفن ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ چنانچہ جب بلوغ المرام کی حدیث میں لحدی قبر کے اوصاف سے استاذ گرامی نے آگاہ کیا تو پھر میرے خواب کی صداقت سامنے آ گئی۔ کیونکہ میری بستی

میں صرف شقی قبر ہی کھودی جاتی ہے، لحدی قبر کا تصور بھی نہیں ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ جب تک میرے والد کی طاقت بحال تھی، بستی میں قبر کی کھدائی کے لیے لوگ انھی سے گزارش کرتے تھے اور وہ بہت پیاری اور خوبصورت قبر کھودا کرتے تھے۔ آج بھی والد محترم اس ضعیف العمری میں قبر کھودنے والوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔

جب لحدی قبر کا وصف پڑھا تو مجھے میرا خواب یاد آیا۔ مگر پھر بھی میں نے اس کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا۔ کیونکہ والدہ محترمہ کی نصیحت یاد تھی کہ کسی سے مت بیان کرنا۔ اس خواب کو دیکھے کئی سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ایک مرتبہ رات کے وقت بعد نمازِ عشاء ہم چند ساتھی جامعہ دارالسلام عمر آباد کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سب مجھ سے سینئر تھے۔ ہمارے درمیان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے متعلق گفتگو چل نکلی۔ اس میں کسی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب میں دیکھنے کی بھی بات کہی۔ اب مجھے بھی برداشت نہیں ہوا اور بالآخر میں نے ان سے اپنا یہ خواب بیان کر ہی دیا!! ایک ساتھی نے کہا: یار! تمہارا خواب تو بہت اچھا ہے، تمہیں مولانا ابوالبیان عبدالرحمٰن حماد عمری حفظہ اللہ سے اس خواب کی تعبیر ضرور پوچھنی چاہیے۔ مولانا ابوالبیان حماد عمری عمر آباد میں استاذ الاساتذہ ہیں، برگزیدہ اور تہجد گزار ہیں۔ ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی (جامعہ اسلامیہ مدینہ) جیسی عظیم شخصیات ہیں۔ خواب کی تعبیر بتلانے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔

غالباً 1995ء کی کوئی صبح تھی (1)۔ میں نے صبح کی نماز ادا کی اور کچھ ہی لمحے بعد جناب مولانا ابوالبیان حماد عمری کے دروازے پر تھا۔ دروازے پر دستک دی۔ مولانا نے ہاتھ میں

---

(1) لفظ "غالباً" لکھنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی، کیونکہ میں نے جس دن مولانا ابوالبیان حماد عمری حفظہ اللہ سے اپنے خواب کی تعبیر پوچھی تھی۔ وہ دن اور تاریخ اپنی ڈائری میں لکھ لی تھی۔ وہ ڈائری تو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے جس کے پہلے صفحے پر میں نے یہ دن اور تاریخ لکھی تھی۔ مگر سوئے اتفاق سے ایک دن وہ ڈائری کسی طرح میرے بچے کے ہاتھ لگ گئی اور اس نے میری عدمِ موجودگی میں اس کے شروع کے چند صفحات پھاڑ ڈالے۔ البتہ میں نے آپ بیتی سے متعلق کسی تحریر میں لکھا تھا۔ جو ابھی مجھے نہیں مل سکا۔ ممکن ہے انڈیا میں میرے فائلوں میں کہیں وہ تحریر دبی پڑی ہو۔

دودھ کا گلاس پکڑے دروازہ کھولا۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے دریافت فرمایا: عزیزم! کیا بات ہے، کیسے آنا ہوا؟ میں نے عرض کیا: دراصل آج سے چند سال قبل میں نے رسول اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا تھا اور پھر پورا خواب ان سے بیان کیا۔ آج اتنے دنوں کے بعد میں آپ سے اس کی تعبیر پوچھنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ مولانا ابوالبیان حماد نے میرا خواب سننے کے بعد فرمایا: آپ کا خواب بہت اچھا ہے۔ پھر انہوں نے فوراً اس کی تعبیر بتائی، فرمایا: آپ کے خواب کی دو تعبیر ہو سکتی ہے؛ اَیا آپ مدینہ ئی تعبیر تاریخ کے ساتھ اپنی ڈائری میں لکھ لی۔ اور اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ ان کی بتائی ہوئی تعبیر بالکل درست ثابت ہوئی۔

سچ فرمایا صادق ومصدوق ﷺ نے:

"مَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَسَيَرَانِي فِي الْيَقْظَةِ وَلَا يَتَمَثَّلُ الشَّيْطَانُ بِي"

"جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو کسی دن مجھے بیداری میں بھی دیکھے گا اور شیطان میری صورت میں نہیں آ سکتا"(1)۔

الحمدللہ میں نے 1421ھ میں بیت اللہ شریف کا حج کر لیا۔ **فللہ الحمد والمنۃ.**

اس حج کی پوری تفصیل میں نے اپنے سفرنامۂ حج بعنوان "ریاض سے مکہ تک۔ سفرنامۂ حج" میں لکھی ہے۔ ممکن ہے کبھی کمپوزنگ کے مرحلے سے گزر کر کتابی شکل میں شائع ہو جائے۔ **وما ھو علی اللہ بعزیز**

شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری سے عقیدت ومحبت کے لیے میرے لیے یہ خواب کافی تھا۔ جبکہ مولانا موصوف کی سیرت نبوی سے متعلق جو کارکردگی ہے اس کو دیکھ کر دنیا کا کون ایسا مسلمان ہوگا جسے ان کی ذات یونیورسٹی میں پڑھنے جائیں گے، یانہیں تو آپ کو حج نصیب ہوگا۔ میں نے مولانا کی بتائی ہو گرامی سے محبت نہیں ہوگی!!

---

(1) بخاری:6993، مسلم:2266۔

آغازِ زندگی سے فراغت تک:

شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ نے 6 جون 1942ء کو اس عالم رنگ و بو میں آنکھیں کھولیں۔ آپ کی کنیت ابو ہشام تھی۔ آپ کا شجرۂ نسب یہ ہے:

''صفی الرحمٰن بن عبداللہ بن محمد اکبر بن محمد علی بن عبدالمؤمن بن فقیر اللہ مبارکپوری اعظمی''۔

آپ کی بستی کا نام ''حسین آباد'' ہے جو کہ قصبہ مبارک پور کے شمال میں تقریباً 2 کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اعظم گڑھ کی سرزمین بھی کس قدر خوش نصیب ہے کہ اس میں بہت ساری عظیم ہستیاں پیدا ہوئیں اور جن سے خلقِ کثیر نے استفادہ کیا۔ مولانا موصوف کا تعلق بھی اسی سرزمین سے تھا جہاں کا ہر ذرہ اقبال سہیل کی زبان میں ''نیّر اعظم کی حیثیت رکھتا ہے''۔

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضانِ تجلی ہے یکسر
جو ذرّہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیّر اعظم ہوتا ہے

اعظم گڑھ، مبارک پور کی سرزمین نے عظیم سے عظیم اور نامور علمائے کرام کو جنم دیا ہے۔ اس مردم خیز خطہ میں ایسی ایسی منتخباتِ روزگار قسم کی شخصیات پیدا ہوئیں کہ انہوں نے اپنے علم وعمل سے پورے بقعۂ ارض کو منور کر دیا اور جہاں جہاں ان کے علم وعمل کی برکات پہنچیں، مستحکم عقیدہ کی بنیاد پڑتی گئی، جس کی تعلیم رسول اکرم ﷺ نے نبوت کے پہلے ہی دن دی تھی۔ "سیرة البخاری" جیسی مایہ ناز تصنیف کے مؤلف مولانا عبدالسلام رحمانی اسی سرزمین کے چشم و چراغ تھے۔ "مرعاة المفاتیح" جیسی مشکاۃ کی عظیم الشان شرح کے مؤلف مولانا عبیداللہ رحمانی رحمہ اللہ کا تعلق بھی اسی سرزمین سے تھا۔ سنن ترمذی کی مایہ ناز شرح "تحفة الأحوذی" کے مصنف شیخ عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ بھی اسی خطہ کے سپوت تھے، کہ دنیا کی کوئی بھی اسلامی لائبریری اس شرح کے بغیر نامکمل ہے اور عجم تو عجم عربوں کو بھی اس شرح پر ناز ہے۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک بیش قیمت کڑی تھے جن کو قدرت کی طرف سے بے شمار صلاحیتیں ملی تھیں۔ انہی خداداد صلاحیتوں کا اثر تھا کہ مولانا مرحوم اپنی

تعلیم کے ابتدائی مرحلے سے لے کر آخری مرحلے تک امتیازی نمبرات سے امتحانات میں کامیابی حاصل کرتے رہے۔آپ نے اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز اپنے گھر سے کیا۔قرآنِ مجید کا کچھ حصہ اپنے دادا اور چچا سے پڑھا اور اپنے گاؤں ہی کے مدرسہ میں تھوڑی سی تعلیم حاصل کی۔ پھر مبارکپور کے مدرسہ دار التعلیم میں 1948ء میں داخلہ لیا۔وہاں سے آپ نے ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم کے ساتھ عربی کی بنیادی تعلیم حاصل کی۔جون 1954ء میں مبارکپور کے مدرسہ احیاء العلوم میں داخلہ لیا اور وہاں نحو،صرف اور عربی قواعد کی کتابیں پڑھیں۔پھر دو سال کے بعد مئی 1956ء میں جامعہ اسلامیہ فیض عام مئو میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے گئے۔وہاں آپ نے پانچ سالوں تک علمی سلسلہ جاری رکھا اور انتہائی محنت و جانفشانی سے اپنی تعلیم مکمل کی۔وہاں آپ نے عربی زبان،تفسیر، علومِ تفسیر،حدیث،علومِ حدیث،اصولِ حدیث،فقہ،اصولِ فقہ اور منطق کی تعلیم حاصل کی۔فیض عام سے آپ نے جنوری 1961ء میں فضیلت کی ڈگری حاصل کی۔

مولانا مرحوم کے اساتذۂ کرام:

مولانا مرحوم نے جن اساتذۂ کرام سے کسبِ فیض کیا ان میں سے چند معروف علمائے کرام یہ ہیں:

(1) مولانا عبداللہ شائق (م ۱۳۹۴ھ)

(2) مولانا عبدالمعید بنارسی (1980ء)

(3) محدث کبیر حضرت مولانا شمس الحق سلفی (م 1986ء)

(4) مفتی حبیب الرحمٰن فیضی (م 1996ء)

صاحب مرعاۃ المفاتیح شیخ الحدیث عبیداللہ رحمانی (م ۱۴۱۴ھ) سے آپ نے سندِ اجازہ لیا تھا۔ مولانا شمس الحق سلفی اور مفتی حبیب الرحمٰن فیضی سے بھی آپ نے سندِ اجازہ حاصل کیا تھا۔

مولانا مرحوم کی عملی زندگی:

فراغت کے وقت آپ کی عمر تقریباً 18 سال کی تھی۔آپ کا عنفوانِ شباب تھا۔فراغت کے بعد آپ نے عملی زندگی میں قدم رکھا اور پھر دعوت و تبلیغ اور درس و تدریس میں جٹ گئے۔

زمانۂ قدیم سے علمائے کرام کی یہ تاریخ رہی ہے کہ انہوں نے فقہ اسلامی، علومِ تفسیر، علومِ حدیث اور دیگر شرعی علوم میں تمکن واستعداد پیدا کرنے کے بعد دعوت وتبلیغ کے لیے درس وتدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ شاید علماء واسلاف کرام نے دعوت وارشاد کے لیے درس وتدریس کا پیشہ اس لیے اختیار کیا کیونکہ اس میں علم کی بقا اور استحکام ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہر زمانہ میں مسندِ درس وتدریس کی نوعیت الگ الگ رہی ہے۔ کسی نے اپنے گھر کو مسندِ درس بنایا تھا تو کسی نے مسجد کو، کسی نے مکتب ومدرسہ کو مسندِ درس بنایا تو کسی نے تجارتی منڈی میں اپنی دکان کے سامنے چبوترہ بنا لیا تھا اور تشنگانِ علوم شریعت اپنی پیاس بجھانے کے لیے ان کے دروازوں پر دستک دیا کرتے تھے۔ مگر رفتارِ زمانہ کے ساتھ درس وتدریس کا مزاج صرف مدرسہ ومسجد تک سمٹ کر رہ گیا اور اب دین کی تعلیم وتشریح کسی کو تلاش کرنی ہو تو اسے صرف مدرسہ کا ہی رخ کرنا پڑے گا۔

اللہ جزائے خیر دے مملکت سعودی عرب کو کہ اس کی تشجیع اور تعاون سے یہاں علمائے کرام اپنے گھروں میں بھی درس وتدریس کا اہتمام کرتے ہیں اور طالبانِ علومِ نبوت دور دور سے ان کے گھروں کا رخ کرتے ہیں۔ ہمارے ملکوں میں اس قسم کی مثال تو ڈھونڈنے سے نہیں ملے گی۔ اور درس وتدریس کے لیے مدرسہ کی صورت میں ایک جگہ باقی بھی ہے تو وہاں علمائے کرام کے لیے سرزمین ناہموار ہی ہوا کرتی ہے۔ اکثر مدارسِ اسلامیہ میں ذمہ داران کی داداگیری کا راج ہوتا ہے اور اساتذۂ کرام کو فکری آزادی مہیا نہیں ہوا کرتی جس کے سبب درس وتدریس بھی اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔ اب درس وتدریس میں وہ لطف اور مزہ کہاں جو پہلے کبھی ہوا کرتا تھا!!

شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ نے بھی اپنی دعوت وتبلیغ کا آغاز بصورت درس وتدریس ہی سے کیا۔ آپ مختلف مقامات پر متعدد مدارس میں درس وتدریس کے ساتھ دعوتی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ جس کی مختصر تفصیل یہ ہے:

☆ 1961ء تا 1963ء: آپ نے الٰہ آباد اور ناگپور کے مضافات کے مدارس میں درس وتدریس اور دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیا۔

☆ 1963ء تا 1965ء: اپنے مادرِ علمی جامعہ اسلامیہ فیض عام مئو میں تعلیم وتدریس کا کام کرتے رہے۔

☆ 1965ء تا 1966ء: اعظم گڑھ میں جامعہ الرشاد میں تعلیمی خدمات انجام دیں۔

☆ فروری 1966ء تا 1968ء: مدرسہ دارالحدیث مئو میں پڑھایا۔

☆ 1969ء تا 1972ء: مدرسہ فیض العلوم سیونی (مدھیہ پردیش) میں پڑھایا۔ اور دعوت وتبلیغ کی سرگرمیوں میں کھل کر حصہ لیتے رہے۔

☆ 1973ء تا 1974ء: مدرسہ دارالتعلیم مبارکپور میں پڑھایا۔

مولانا مرحوم جامعہ سلفیہ بنارس میں:

باوجودیکہ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ نے اتنے سارے مدارس میں اپنی زندگی کا شبابی وقت گزارا مگر یہ مدارسِ اسلامیہ وعربیہ اپنی وسعت وکشادگی کے باوجود مولانا صاحب کا بھاری علم برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ اکتوبر 1974ء مطابق شوال ۱۳۹۴ھ میں مولانا ہندستان کے سب سے بڑے سلفی ادارہ مرکزی دارالعلوم "الجامعة السلفية" بنارس میں منتقل ہو گئے۔ وہاں مولانا نے 1988ء تک اپنے علم کے دریا بہائے۔

بتانے والوں کی روایت ہے اور ان راویوں میں میرے دوست شکیل احمد عبدالحفیظ سلفی بھی ہیں، جنہوں نے جامعہ سلفیہ سے فراغت کے بعد ام القری یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی ہے اور پچھلے بارہ چودہ سالوں سے ایک بین الاقوامی ادارہ مکتبہ دارالسلام ریاض میں بحیثیت باحث ومترجم ومحقق خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے جامعہ سلفیہ بنارس میں مولانا صاحب کی عظمت وشان کی عکاسی کرتے ہوئے کہا:

> "استاذِ گرامی مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ جب جامعہ سلفیہ بنارس میں پڑھاتے تھے تو سارے اساتذہ میں ان کا ایک عظیم مقام ہوا کرتا تھا۔ کیا اساتذۂ کرام اور کیا طلبہ، سب ہی ان کی از حد عزت واحترام کرتے تھے۔ مولانا کے اردگرد طالبانِ علومِ

نبوت کا ازدحام ہوتا۔ وہ تشنگی علم بجھانے کے لیے حاضر ہوتے اور آپ ان کی بروقت رہنمائی کیا کرتے تھے۔ واقعی وہ منظر جب یاد آتا ہے تو میں مولانا کی زندگی پر ...... وغیرہ''۔

ایک سوال، جس کا جواب درکار تھا:

مولانا مرحوم کی فراغت سے لے کر جامعہ سلفیہ بنارس آنے تک کی درمیانی مدت کوئی بارہ تیرہ سال بنتی ہے۔ اس مدت میں مولانا مرحوم نے چھ سے زائد مدارس میں تعلیمی، تدریسی، دعوتی اور سماجی خدمات میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ مدرسہ فیض العلوم سیونی (مدھیہ پردیش) میں آپ نے درس وتدریس کے ساتھ باضابطہ خطابت کا فریضہ بھی بخوبی انجام دیا۔ اس کے علاوہ بھی جہاں گئے وہاں دعوت وارشاد کا کام جاری رکھا۔ اس سلسلے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

یہاں ہر صاحبِ فکر ونظر کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ جیسے سنجیدہ انسان، داعی الی اللہ، بہترین مربی ومدرس، زبان وقلم کے قابل شہسوار، فکر ونظر میں اپنی مثال آپ، سیرت وتاریخ دانی میں مرجعِ خلائق، عربی واردو زبان میں ماہر، جہادِ اسلامی کے مؤید ومعاون اور ہر طبقہ میں ہر دل عزیز اور محبوب شخص نے آخر کس وجہ سے بارہ تیرہ سال کی قلیل سی مدت میں چھ سے زائد مدارسِ اسلامیہ میں تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دیں؟! ایسا کیوں نہ ہوا کہ کہیں ایک دو جگہ پر استقرار پکڑ لیتے اور وہیں استقلال کے ساتھ درس وتدریس اور دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیتے؟! بار بار جگہ بدلنا بھی کوئی اچھی بات نہیں، اس طرح کرنے سے لوگوں کا تاثر اچھا نہیں رہتا اور ایک باوقار آدمی کی شان بھی اس سے مجروح ہوتی ہے؟!!

میں نے اس سوال کا جواب جاننے کے لیے متعدد حضرات سے دبے الفاظ میں دریافت کیا مگر کسی طرف سے کوئی معقول جواب نہیں مل پایا۔ البتہ مولانا کے سب سے چھوٹے داماد جناب انعام الحق رحمانی صاحب نے مجھے بتایا کہ بار بار جگہ بدلنے کا سبب:

''مولانا سے ذمہ داران کا اور ذمہ داران سے مولانا کا اختلاف ہے''۔

جناب انعام الحق رحمانی صاحب کا جواب قدرے اطمینان بخش اور درست تھا۔ ان کے جواب سے قبل میرے دل میں بھی وہی جواب تھا جو انہوں نے دیا۔ کیونکہ جہاں تک مولانا مرحوم سے میرا تعلق ہے، کوئی زیادہ دنوں سے نہیں ہے۔ مکتبہ دارالسلام میں میری بحالی بحیثیت باحث ومترجم 11 / اکتوبر 2003ء کو ہفتہ کے دن ہوئی۔ ان دنوں شیخ بغرضِ علاج ہندستان تشریف لے جا چکے تھے۔ رمضان میں مولانا تشریف لائے تو ان سے ملاقات ہوئی۔ مجھے مولانا کو دیکھ کر بہت خوشی تھی۔ کیونکہ مجھے آپ سے خصوصی طور سے غائبانہ عقیدت تھی۔ اور آج میں ان کے ساتھ بیٹھ کر ان کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ میں نے اس وقت جو کچھ احساس کیا اسے اس کتاب کے آخر میں ''شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ سے میرا تعلق'' کے عنوان سے قلمبند کیا ہے۔ یہ احساسات وہاں مطالعہ کیے جا سکتے ہیں۔

مولانا کے ساتھ مختصر سی ملاقات اور ان کے ساتھ برسوں کام کرنے والوں کے ذریعہ سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ مولانا مرحوم ایک خوددار اور اصول پرست عالم دین تھے۔ چنانچہ جناب انعام الحق صاحب کا جواب بہت صحیح اور درست ہے کہ مولانا مرحوم بار بار ایک مدرسہ سے دوسرے میں اس لیے منتقل ہوتے رہے، کیونکہ اہلِ مدارس سے ان کا تال میل نہیں ہو رہا تھا، اختلاف ہو جایا کرتا تھا۔ نتیجتاً مولانا کو مدرسہ بدلنا پڑتا۔

ذمہ دارانِ مدارس کے بارے میں مولانا مرحوم کا نظریہ:

اگر میری طرح آپ بھی تسلیم کر لیں کہ مولانا مرحوم ایک خوددار اور اصول پرست عالم دین تھے تو شاید آپ کو بھی مذکورہ بالا سوال کا جواب مل جائے گا۔ کیونکہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی آدمی خوددار اور اصول پرست ہو اور ذمہ دارانِ مدارس سے اس کے اختلافات نہ ہوں۔ مولانا مرحوم کو ان مدارس کے ذمہ داران سے برابر شکوہ رہا۔ چونکہ اس بارے میں ان کو خاصا تجربہ تھا۔ چنانچہ وہ فرمایا کرتے تھے:

''ذمہ دارانِ مدارس، آمرِ مطلق اور ڈکٹیٹرِ بے لگام ہوتے ہیں''۔

یہ ان کا بڑا مشہور جملہ تھا۔ میں نے تو ان کی زبان سے یہ جملہ نہیں سنا مگر مجھ سے ان حضرات نے یہ جملہ لکھوایا جو ان کے ساتھ دس بارہ سال تک بحث وتحقیق کا کام کرتے رہے ہیں۔ جن لوگوں کو ذمہ دارانِ مدارس سے واسطہ بلکہ پالا پڑا ہے انہیں یقین ہوگا کہ مولانا مرحوم کو اس بارے میں تلخ تجربہ تھا اور انہوں نے انتہائی حقیقت پسندانہ جملہ کہا تھا۔ وہ اپنے قول میں باستثنائے چند صد فیصد برحق ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کی بتلائی ہوئی اپنی امت کی عمر میں سے تقریباً نصف حصہ میں نے مکمل کرلیا ہے۔ اس مدت کا بیشتر حصہ مدارس اور ذمہ دارانِ مدارس کے ساتھ گزرا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مجھے کسی مدرسہ میں پڑھانے یا کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ چونکہ فروری 1999ء میں جامعہ ریاض العلوم دہلی سے فراغت ہوئی اور 17 رجون 1999ء کو سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض کے ایک علمی ادارہ ''مرکز علامہ ابن باز اسلامک اسٹڈیز سنٹر'' میں چلا آیا۔ گرچہ مجھے مدارس میں پڑھانے یا کام کرنے کا موقع نہیں مل سکا، مگر کئی حضرات کے ساتھ رہنے کا موقع ضرور ملا جو مدارس کے ذمہ داران ہیں۔ میری زندگی کی اس عمر میں میرا ابھی وہی نظریہ ہے جو شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ کا تھا۔ خوددار اور اصول پرست عالم اپنے ضمیر کو مار کر ذمہ دارانِ مدارس کے ساتھ تال میل تو کرسکتا ہے، زندہ ضمیر کے لیے ان کے ساتھ سمجھوتہ مشکل سے مشکل ترین کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا مرحوم کو ذمہ دارانِ مدارس سے ہمیشہ اختلاف رہا، یا ذمہ دارانِ مدارس کو ان سے نہیں بن پڑی!! کہ ایک طرف خودداری واصول پسندی تھی اور دوسری طرف داداگیری اور ڈکٹیٹر بے لگام (1)!!

---

(1) اس سلسلے میں اگر کوئی برصغیر کے عرض وطول میں پھیلے مدارسِ اسلامیہ کی دو چار میٹنگوں میں شرکت کرے گا تو اسے خود احساس ہو جائے گا کہ مدارسِ اسلامیہ کے اکثر ذمہ داران کس طرح کے ہوتے ہیں۔ میں ایک مدرسہ کی میٹنگ میں شریک تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ساری کارروائی دیکھی۔ ہر ممبر اور ذمہ دار مدرسین پر اپنا رعب داب جماتے جا رہا تھا، جس کے منہ میں جو آتا بکتا تھا۔ میٹنگ کے دوران ہی نماز ظہر کا وقت آن پہنچا اور جب نماز کے لیے اذان دی گئی تو اکثر ذمہ داران وممبران وہاں سے اِدھر اُدھر کھسک گئے۔ پھر نماز =

بلکہ آپ کو اس پر کافی تعجب ہوگا کہ ایک مدرسہ کا ذمہ دار ایک شرابی اور بددین آدمی کو بنا دیا گیا تھا۔ وہ نماز و روزہ تو دور، نمازیوں اور اہلِ دین کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اسی طرح میں اپنے تئیں بہت سارے مدارس کے ذمہ داران کو جانتا ہوں جو دین اور دینداروں کی کوئی عزت واحترام نہیں کرتے مگر ہیں وہ مدارس ومساجد کے ذمے داران!!

کیا مدارسِ اسلامیہ کی باگ دوڑ ایسے ہی بداخلاق وبدکردار اور بے دین لوگوں کے ہاتھ میں رہے گی؟! آخر امت مسلمہ کے غیور افراد کہاں گئے۔ فإلی اللہ المشتکی۔

1974ء میں جب مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ جامعہ سلفیہ بنارس میں درس وتدریس کی مسند پر فائز ہوئے تو پھر انہیں قدرے استقرار نصیب ہوا اور انہوں نے اپنے علم کا دریا بہانا شروع کر دیا۔ پھر مولانا مرحوم کی مثال اس پہاڑی چشمے کی مانند تھی جو کسی کا سہارا لیے بغیر اپنا راستہ خود بناتا ہے، اس کا تیز بہاؤ اس بات کا ضامن ہے کہ زمین خود بخود اس کو راہ دیتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے اپنے علمی سفر کا باضابطہ آغاز جامعہ سلفیہ ہی سے کیا۔ اس سے قبل ان کی شخصیت ان گمنام افراد میں تھی جن کو ماحول نے پلنے بڑھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ورنہ مولانا مرحوم جامعہ سلفیہ میں وہی صفی الرحمٰن تھے جو دو سال قبل کسی مقام پر تھے!!......

ایک المیہ:

یہ بھی اس دور میں خاص کر علمائے کرام کے لیے ایک المیہ ہے کہ انھیں اپنے ماحول میں وہ مقام نہیں مل پاتا جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔ ان کی کماحقہ قدر نہیں کی جاتی اور وہ بالکل دب کر رہ

= کے بعد جب میٹنگ کی دوسری نشست ہوئی تو غائب ہونے والے بے نمازی ذمہ داران وممبران دوبارہ مجلس کی رونق بن گئے اور ان کی زبان رفتاری کے ساتھ چلنے لگی۔ میں اس میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ یا اللہ! آج تیرے دین کے ساتھ اس قدر بے وفائی اور غداری ہونے لگی کہ جو تیرے دینی ادارے کا ذمہ دار ہے وہی دین کا مذاق کرنے والا ہے!! دین کی بنیاد یہ مدارس ومساجد ہی تو ہیں، یہاں اسلام اور اصولِ اسلام کی پابندی کی بات ہوتی ہے اور انہی کے ممبران وذمہ داران تیری پکار سے نالاں ہیں!!

جاتے ہیں۔ان کی ساری صلاحیتیں یونہی ختم ہو جاتی ہیں،ان کا خاطر خواہ استعمال نہیں ہو پاتا۔ مجھے بھی اس بارے میں خاصا تجربہ ہے۔ میں ایک ایسے دینی ادارے کو اچھی طرح جانتا ہوں جہاں کے موظفین کے ذہن ودماغ پر اتنا شدید ذہنی دباؤ تھا کہ وہ باہری دنیا کی حقیقت تک رسائی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ وہ باہر ہونے والے دینی وثقافتی پروگراموں میں بھی شرکت نہیں کر سکتے تھے؛ چہ جائیکہ وہ امت کے مسائل پر بحث وتمحیص کر سکیں۔مگر اللہ کے فضل سے وہی افراد جب اس ادارے سے کسی وجہ سے نکلے تو ان کی قدر میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور ان کی صلاحیتیں ابھر کر منظر عام پر آئیں۔ مولانا مرحوم کا بھی یہی حشر ہوا تھا، کہ جامعہ سلفیہ بنارس سے قبل کی زندگی میں ان کی صلاحیتوں کا صحیح استعمال نہ ہو سکا تھا۔

معاصرانہ چشمک:

مولانا مرحوم کے بعض شاگردوں کے ذریعے مجھے معلوم ہوا کہ مولانا جب جامعہ سلفیہ میں منتقل ہو گئے تو کافی دنوں تک آپ معاصرانہ چشمک کا شکار رہے۔خیر یہ کوئی قابل گرفت بات نہیں کیونکہ معاصرانہ حسد علمائے کرام میں گو ایک فطری شئی ہے۔آج بھی آپ معاصرین کے درمیان اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ بلکہ اسلاف کرام باوجودیکہ متاخرین سے زیادہ علم وعمل کے حامل تھے مگر ان کی زندگیوں میں بھی ہمیں معاصرانہ حسد اور چشمک کا ثبوت ملتا ہے۔قرآن کریم کے بعد سب سے زیادہ معتبر اور صحیح کتاب دنیا نے امام بخاریؒ کی مایہ ناز تصنیف صحیح بخاری کو تسلیم کیا ہے اور ہر مکتب فکر کے علماء وعوام الناس نے اسے سر آنکھوں پر رکھا ہے، مگر اس کے باوجود امام بخاری زندگی بھر حاسدین کی نگاہوں میں کانٹا بن کر چبھتے رہے۔

حافظ ابن تیمیہ نے امت مسلمہ کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ دنیائے علم میں انہوں نے علومِ عقلیہ ونقلیہ کے اس قدر خزانے لٹائے کہ ان کے معاصرین نے بھی اور بعد کے علماء ومناظرین نے بھی یکساں طور پر استفادہ کیا۔ بلکہ آج بھی کوئی عالمِ دین ان کے علم سے بے نیازی برتنے کی جرأت

نہیں کرسکتا۔ کوئی بھی لائبریری ان کی کتابوں کے بغیر ادھوری تسلیم کی جائے گی۔ نت نئے دن ان کی پوشیدہ تحریریں منظر عام پر آرہی ہیں اوران کے علوم وفنون کے راز آج بھی علمائے عظام پر وا ہو رہے ہیں۔ آج کے دور میں امام ابن تیمیہؒ کے علومِ متروکہ کی تحقیق وتلاش میں جو حصہ وافر میرے متعارفین میں سے شیخ عزیر شمس کو ملا ہے، پوری دنیا میں بہت کم افراد کو ملا ہوگا۔

گزشتہ سال عید کے موقع سے میں عمرہ کی غرض سے مکہ مکرمہ گیا ہوا تھا۔ میں جہاں کہیں بھی جاتا ہوں، میری دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہاں کے علمائے کرام سے ملاقات کر کے حتی الامکان استفادہ کروں۔ چنانچہ میں شیخ عزیر شمس کی زیارت کے لیے بھی ان کے گھر پہنچا۔ انہوں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے متروکہ مخطوطات اوران کے علوم سے ایسے ایسے مواد مجھے دکھلائے کہ ان میں سے کچھ بھی پہلے کبھی شائع نہیں ہوا تھا!! اسی سے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی قابلیت اوران کے علم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آج ان کے دنیا سے رخصت ہوئے تقریباً 700 سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے مگر آج بھی ان کی ایسی ایسی بیش قیمت اور علمی تحریریں منظر عام پر آرہی ہیں جو پہلے کبھی شائع نہیں ہو سکی تھیں!! اللہ اکبر! اسی لیے بعض علماء نے لکھا ہے کہ ابن تیمیہ کا علم ائمہ اربعہ کے علم پر بھاری تھا، مگر ایسے عظیم الشان اور عالی المرتبت عالم کی زندگی بھی معاصرین کی چپقلش اوران کے حسد سے نہیں بچ سکی!!

اس لیے اگر جامعہ سلفیہ میں مولانا مرحوم معاصرانہ چشمک کے شکار تھے تو اس میں ہمیں زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

مولانا مرحوم معاصرین کے شکنجے میں:

یہ عجب تماشہ ہے کہ وہی لوگ بالعموم اپنے معاصرین سے حسد کرنے لگتے ہیں جنہیں رسول اکرم ﷺ کی طرف سے وارثین انبیاء کی ڈگری ملی ہے۔ پہلے بھی اور آج بھی ہمیں معاصرین کی چپقلش اور باہمی حسد کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ بھی معاصرین کی چپقلش کا شکار رہے۔ اگر بات صرف چپقلش کی حد تک ہوتی تو اس میں کوئی زیادہ حرج کی بات

نہیں تھی۔ مگر تکلیف دہ بات تو یہ ہے کہ بہت سارے معاصرین نے مولانا کو اپنی بے جا تنقید بلکہ تنقیص کا موضوع بنالیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا ایک حق گو، بے باک اور خوددار عالم دین تھے۔ اور اس حقیقت سے سارے ہی لوگ واقف ہیں کہ ایک حق گو، بے باک اور خوددار شخص کو اس دنیا میں لوگ وہ مقام نہیں دیتے جو اس کا حق ہے۔ بلکہ اسے گاہے بگاہے تکلیف پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے، حاسدین کی طرف سے اس کی شان میں گستاخ آمیز کلمات کہے جاتے ہیں۔ پیٹھ پیچھے اس کی غیبت کی جاتی ہے، اس کے کردار پر انگشت نمائی کی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

مولانا کو بھی سخت سے سخت الفاظ کا سامنا کرنا پڑا۔ کسی اجتماع میں اگر کسی عالم نے کوئی نظریہ پیش کیا، یا کوئی بات کہی جو مولانا کی سمجھ کے مطابق صحیح نہیں تھی اور مولانا نے اس عالم کے کلام یا نظریہ کا پوسٹ مارٹم کر دیا تو پھر زندگی بھر کے لیے مولانا اس کے دشمن ہو گئے! ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مولانا مرحوم نے اگر قوی دلیل کے ساتھ کسی کی بات کی تردید کی تو ان کی بات سرِ عام تسلیم کی جاتی اور اپنے مفروضہ سے دست برداری کا اعلان کیا جاتا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہی بنیادی غلطی ہے جس پر اکثر لوگ دھیان نہیں دیتے۔

جناب غازی عزیر نے درست لکھا ہے کہ عرب دنیا میں جو مقبولیت شیخ صفی الرحمٰن کو ہوئی، موجودہ وقت میں کسی اور کو نہیں ہوئی۔ اور واقعی مولانا مرحوم اس مقبولیت کے حقدار بھی تھے۔ انہوں نے کوئی انسٹی ٹیوٹ کھول کر لوگوں کو یرغمال بنانے کی کبھی کوشش نہیں کی، کسی ادارے کے جنم داتا بن کر اپنے اسٹاف پر بے جا دھونس جمانے کی کوشش نہیں کی، عربوں کے آگے کبھی ہاتھ نہیں پھیلایا۔ مگر پھر بھی مولانا عربوں کے علاوہ پوری دنیا کے محبین رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر دل عزیز رہے۔ کسی مجلس میں جب کبھی علمائے ہند کا تذکرہ ہوتا تو ان کا نام بھی ضرور آتا۔ ایسی صورت میں ان حضرات کے دل پر چرغے چل جاتے جو مولانا کے حاسدین تھے۔

کیا ہی اچھا ہوتا کہ معاصرین علماء کسی کی فضیلت وقابلیت کو شرحِ صدر کے ساتھ قبول کرتے

اور اپنے اوپر دوسروں کو فوقیت دینے کا جذبہ رکھتے!!

جامعہ سلفیہ میں مولانا مرحوم کی مقبولیت:

مولانا مرحوم جب تک جامعہ سلفیہ بنارس میں رہے۔ پوری شان وشوکت کے ساتھ رہے۔ جامعہ سلفیہ میں مولانا کی مدتِ اقامت کوئی چودہ (14) برس بنتی ہے۔اس مدت میں مولانا نے اپنے علم وکردار سے پورے طلبہ اور اساتذۂ کرام کے دلوں میں اپنا ایک منفرد مقام بنالیا تھا۔مولانا جو کتابیں بھی طلبہ کو پڑھاتے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ پڑھاتے۔یہی وجہ ہے کہ طلبہ آپ کے درس میں ضرور حاضر ہوتے تھے۔چونکہ آپ پرانی ڈگر سے ہٹ کر طلبہ کو پڑھاتے تھے اور آپ کے درس میں درسی کتابوں کی معلومات کے ساتھ ساتھ جنرل معلومات بھی بہت ہوا کرتی تھی،اس لیے طلبہ بڑے شوق سے آپ کا درس سنتے تھے۔

میں یہ ساری باتیں مولانا مرحوم کے شاگردوں کے حوالے سے لکھ رہا ہوں۔ورنہ میں نے کبھی مولانا سے تعلیم حاصل نہیں کی ہے جو وہ منظر اپنے قارئین کے سامنے بیان کروں۔ہاں البتہ ان کے شاگردوں نے مولانا کا جو طرزِ تدریس بیان کیا ہے وہ طلبہ کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔بعض اساتذہ پڑھانے میں اتنے خشک مزاج ہوتے ہیں کہ جو کتاب میں لکھا ہوتا ہے اسی کو حل کرنے میں پوری گھنٹی ختم کردیتے ہیں۔جبکہ طلبہ کا مزاج زمانۂ طالبعلمی میں کچھ زیادہ ہی تنوع پسند ہوا کرتا ہے۔طلبہ کی خواہش ہوتی ہے کہ استاذ انھیں کتابی درس کے ساتھ ساتھ خارجی دلچسپ معلومات بھی فراہم کرے؛ تاکہ پڑھنے میں دل لگے۔گو مولانا مرحوم کا طریقۂ تدریس طلبہ کے مزاج سے ہم آہنگ تھا اور یہ طرز کامیاب اساتذہ کی علامت بھی ہے۔

مولانا مرحوم جن دنوں بخاری کا درس دیتے،طلبہ انتہائی ذوق وشوق سے اس درس میں حصہ لیتے تھے۔صحیح بخاری کا درس آپ کلاس کی بجائے بالعموم جامعہ کی مسجد میں بعد نمازِ فجر لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے دیا کرتے تھے۔

آپ سے قبل بھی طلبہ نے بخاری اور دیگر درسی کتابوں کا درس دیگر اساتذہ سے لیا تھا۔مگر جس

شوق سے وہ آپ کے درس سے محظوظ ہوتے تھے، کسی اور کے درس سے نہیں ہوتے تھے۔ کشاں کشاں آپ کی محبت طلبہ کے علاوہ وہاں کے ذمہ داران کے دلوں میں بیٹھ گئی اور آپ کی علمی قابلیت کے قائل ہونے لگے۔

مولانا رحمت اللہ سلفی حفظہ اللہ (حالیہ استاذ جامعہ امام ابن تیمیہ بہار) مولانا مرحوم کے شاگرد رہ چکے ہیں، جامعہ سلفیہ میں مولانا کے طریقۂ تدریس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''دنیا میں پھیلے ہوئے آپ کے فیض یافتگان اس بات کے شاہدِ عدل ہیں کہ آپ کا طریقۂ تدریس نہایت دل پذیر وشگفتہ ہوتا۔ جب آپ کلاس میں تشریف لاتے تو طلبہ آپ کی مہارتِ تدریس وکمال لطافت کا خوب خوب مزہ لیتے۔ افہام وتفہیم کا انداز غایت درجہ سہل اور جاذب ہوتا۔ عبارت کی تشریح ایسے منفرد انداز میں کرتے کہ درس کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہتا۔ اگر کوئی طالب علم سوال کرتا تو خندہ پیشانی سے تشفی بخش جواب دیتے۔ کسی طرح کی بوکھلاہٹ یا چہرے پر شکن نہیں ہوتی اور ہوتی بھی کیسے جبکہ آپ کی طبیعت ہی کچھ ایسی تھی کہ روشن دماغی وحاضر جوابی کی بنا پر سوال کے مالہ وماعلیہ کو فوراً بھانپ لیتے۔ آپ غضب کے ذہین وفطین تھے۔ اس لیے تمام سوالوں کا جواب جچا تلا دیتے۔ آپ کے درس کی خوبی یہی تھی کہ ہر طرح کے ذہن ودماغ والے طلبہ برابر شریکِ درس ہوتے۔ غبی قسم کا طالبعلم بھی پیش پیش رہتا۔ دورانِ درس علمی وادبی لطیفے وچٹکلے سناتے جو سب کے دل کو موہ لیتے۔ جس سال میں نے آپ سے صحیح بخاری جلد ثانی پڑھی طلبہ کثیر تعداد میں تھے۔ اس لیے آپ کے درس میں لاؤڈ اسپیکر لگا دیا جاتا۔ پھر بھی اگلی صف میں جگہ لینے کے لیے ہم تمام ساتھی ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے اور کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ کسی قریبی ساتھی کو سیٹ ریزرو کرنے کے لیے کہہ دیا جاتا تھا''(1)۔

جو استاذ کسی ادارے میں اس طرح محنت اور اخلاص کے ساتھ تعلیم وتدریس کا فریضہ انجام

(1) بحوالہ ماہنامہ طوبیٰ، فروری 2007، صفحہ 33۔

دے، اس کی مقبولیت یقینی ہے۔ اور مولانا مرحوم کی یہی وہ خوبی ہے جو جامعہ سلفیہ میں ان کی مقبولیت کا سبب بنی۔

طلبہ سے محبت ولگاؤ:

سچی بات تو یہ ہے کہ مولانا کی یہ ایسی عظیم خوبی تھی جو بہت سارے علماء میں مفقود ہے۔ میں وہ دن بھول نہیں پاتا ہوں جب میں ایک عالم دین کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور چند دنوں تک اس کی رفاقت میں کسی وجہ سے رہنے کا موقع ملا تھا۔ یہ عالم برصغیر کے علماء میں اپنی ایک شان اور عظمت کا مدعی تھا۔ میں بھی اسے ایک مخلص اور باصلاحیت عالم تسلیم کرتا تھا۔ مگر اس روز سے مجھے اس سے قدرے نفرت ہونے لگی جب چند طالبانِ علومِ نبوت جو برصغیر کے معروف اداروں کے فارغ التحصیل تھے، اس سے ملنے آئے۔ چونکہ ان طلبہ کو معلوم تھا کہ میں اس عالم کے پاس ہوں اس لیے انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ان کی آمد کی اسے اطلاع دے دوں۔ جب میں نے طلبہ کے شوقِ ملاقات سے عالم صاحب کو آگاہ کیا تو کہنے لگے:

''یار! میں کمپاؤنڈ سے نکل کر ان طلبہ سے ملنے جاؤں یہ میری شایانِ شان نہیں''۔

واللہ! جب میں نے اس عالم دین کی زبان سے یہ کلمات سنے، مجھے تب ہی سے اس سے نفرت ہوگئی اور بعد میں اس کی حقیقت بھی منظر عام پر آگئی کہ وہ انتہائی نچلی سطح سے کسی اعلیٰ منصب پر پہنچنے کے بعد خود کو عظیم سے عظیم تر سمجھنے لگا ہے۔ مگر مولانا مرحوم کو اللہ جزائے خیر دے کہ آپ طالبانِ علوم نبوت کو ان اوقات میں بھی ملنے کی اجازت دیتے تھے، جبکہ بالعموم آرام کرنے یا سونے کا وقت ہوا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ سلفیہ بنارس سے لے کر مدینہ منورہ تک طلبہ کا ایک جم غفیر آپ کے اردگرد رہا کرتا تھا۔ جامعہ سلفیہ بنارس میں جب مولانا بعد نمازِ عصر ٹہلنے کے لیے نکلتے تو آپ کے ساتھ طلبہ بھی لگ جاتے۔ آپ طلبہ سے بسا اوقات خوش گپیاں بھی کرلیا کرتے تھے۔ طلبہ طرح طرح کے سوالات پوچھتے اور آپ حاضر دماغی سے ان کا بروقت جواب دے دیتے۔ برادر ابو اسامہ نیاز احمد سلفی (داعی جالیات حوطہ بنی تمیم، سعودی عرب) نے مجھے بتایا کہ ہم لوگ عصر کے بعد

جامعہ سلفیہ سے باہر ٹہلنے کے لیے نکلتے تو مولانا بھی ہمارے ساتھ ہوتے۔ مولانا ہمیں قسم قسم کے واقعات سنایا کرتے اور بعد میں فرماتے:

''یہ بے صفحات واقعات ہیں''۔

جامعہ سلفیہ کے بعد جب مولانا مرحوم جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں بھی مولانا کے اردگرد طالبانِ علوم نبوت کا مجمع منڈلانے لگا۔ گاہے بگاہے طلبہ مولانا کے کمرہ میں بھی حاضر ہوتے اور ان سے خوب خوب استفادہ کرتے۔ عصر یا مغرب کے بعد مولانا مسجد نبوی کے باب الرحمۃ کے پاس جا بیٹھتے تو جامعہ اسلامیہ کے طلبہ آپ کے پاس آکر بیٹھ جایا کرتے اور مختلف موضوعات پر مولانا سے بحث وتمحیص کرتے اور مولانا مختلف دلائل سے ان کو مطمئن کرتے۔ کہتے ہیں کہ طلبہ میں مولانا کی مقبولیت کا عالم وہی تھا جو کبھی محدث عصر امام المحدثین علامہ ابوعبدالرحمٰن محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کا تھا۔

مولانا طلبہ سے ملنے جلنے میں ان اساتذہ سے یکسر مختلف تھے، جو اپنے طلبہ کے ساتھ کلاس میں بھی ایک خوفناک ودہشتناک آدمی کے روپ میں رہتے ہیں اور کلاس کے باہر بھی!!...... مولانا شروع سے ہی طلبہ سے مل جل کر رہتے تھے۔ کلاس میں بحیثیت ایک استاد اور کلاس کے باہر بحیثیت ایک دوست!! جیسا کہ عرب ممالک کی جامعات میں اساتذہ کا اپنے طلبہ کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ طلبہ سے ملنے جلنے، ان کو کس طرح پڑھایا جائے، پڑھائی کے وقت طلبہ کے ساتھ کس روپ میں رہا جائے اور فارغ اوقات میں کس روپ میں، غرض یہ سارے سلیقہ وآداب برصغیر کے علماء واساتذہ کو عربی اساتذہ سے سیکھنے چاہئیں۔ کیونکہ عرب اساتذہ اپنے طلبہ کے ساتھ جو طرز عمل اپناتے ہیں واقعی وہ قابل قدر اور بہت عمدہ ہے۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے گرچہ عربی مدارس وجامعات میں تعلیم حاصل نہیں کی اور نہ ہی عربی اساتذہ سے کبھی آداب سیکھنے کا موقع ملا، مگر ان کا طرز عمل بھی اپنے طلبہ کے ساتھ ویسا ہی تھا جو عرب اساتذہ کا اپنے شاگردوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ جبکہ ہم نے دیکھا ہے کہ بہت سارے وہ اساتذہ جو عربوں کی تربیت میں کئی سال پڑھ کر اپنے

وطن گئے مگر وہاں ان کا اپنے شاگردوں کے ساتھ رویہ کچھ اچھا نہ رہا؛ بلکہ خود کو نمایاں کر کے ترفع کی چادر اوڑھے رہے!!

مولانا مرحوم کی شہرت کا آغاز اور ترقی:

مولانا مرحوم نے 1976ء میں رابطہ عالمِ اسلامی مکہ مکرمہ کے بین الاقوامی انعامی مقابلے میں حصہ لیا اور سیرت نبوی کے موضوع پر آپ کا مقالہ پوری دنیا میں فرسٹ آیا تو پھر اس کے بعد آپ کی مقبولیت میں بے تحاشا اضافہ ہوا، اور آپ کی شہرت آفاقِ عالم میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

انہی دنوں 1978ء میں بنارس کے علاقہ بجرڈیہہ میں بریلویوں سے مولانا کا مناظرہ ہوا۔ اس مناظرہ کے لیے مولانا نے اساتذہ اور طلبہ کو اپنے ساتھ تیار کیا۔ طلبہ میں شیخ محمد طاہر حنیف سلفی (داعی جالیات بطحاء ریاض) بھی شامل تھے۔ اس مناظرہ میں بریلویوں کو شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا اور مولانا کے مضبوط دلائل سے متاثر ہو کر اس مجلس میں ایک ہی خاندان کے 49 آدمیوں نے اہل حدیث ہونے کا اعلان کیا۔ (اس تعداد کے تعین میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ میں نے حافظ محمد طاہر حنیف سلفی کے حوالے سے یہ لکھا ہے)۔ یہ مناظرہ مسلسل چار دنوں تک ہوا تھا۔ اس کی قدرے تفصیل آگے آرہی ہے۔

یہی وہ چند اسباب ہیں جو مولانا مرحوم کی شہرت کا ذریعہ بنے۔ اور اس کے بعد تو مولانا شہرت کی بلندیوں پر چڑھتے چلے گئے اور آج جبکہ مولانا ہم میں نہیں ہیں، پھر بھی آپ کا ذکرِ خیر دنیا کے چہار سو ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔

شاہ سعود بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی بنارس میں آمد:

1975ء میں جب فرمانروائے مملکت سعودی عرب شاہ فیصل شہید ہوئے تو جامعہ سلفیہ بنارس میں ایک تعزیتی پروگرام منعقد کیا گیا تھا۔ اس پروگرام میں مولانا مرحوم بھی تھے۔ اس میں شیخ عزیر شمس حفظہ اللہ نے طلبہ کی نمایندگی کی تھی اور اردو زبان میں اپنی طرف سے اور طلبہ کی طرف سے تعزیتی

تاثرات پیش کیے تھے۔ جبکہ عربی زبان میں یہ ذمہ داری شیخ صلاح الدین مقبول احمد حفظہ اللہ نے نبھائی تھی۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے اس تعزیتی اجلاس میں شاہ سعود، امیر فیصل، امیر سلطان بن عبدالعزیز اور سعودی خاندان کے حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی تھی۔ آلِ شیخ اور آلِ سعود میں جو ربط وتعلق تھا اور فتحِ ریاض میں جو واقعات پیش آئے تھے، ان کی تفصیلات حاضرین کے سامنے پیش کرتے ہوئے اس خاندان کی شجاعت، تدبر اور دینی خدمات؛ نیز عہدِ فیصل میں حجازِ مقدس کی ترقی اور سعودی عرب کی پیش قدمی کو بڑی وضاحت سے بیان کیا تھا۔ (دیکھیے: صوت الجامعہ، مئی ۱۹۷۵ء، جامعہ سلفیہ بنارس)

اسی پروگرام میں نذیر بنارسی نے شاہ فیصل کی شہادت پر یہ شعر کہا تھا:

فیصل کی موت عالمِ اسلام کے لیے
وہ حادثہ ہے جس کی تلافی محال ہے

یہی نذیر بنارسی ہیں جنہوں نے 1954ء میں شاہ سعود بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی بنارس آمد پر یہ شعر کہا تھا:

ادنیٰ سا غلام ان کا گزرا تھا بنارس سے
منہ اپنا چھپاتے تھے کاشی کے صنم خانے

اس شعر کا پس منظر یہ ہے کہ ابھی ہندستان کی آزادی کے تقریباً سات سال کا عرصہ گزرا تھا۔ انگریزوں کی استعماریت کا حال ہی میں سرزمین ہندستان سے جنازہ اٹھا تھا۔ ہندستان کے پہلے وزیراعظم جواہر لال نہرو تھے۔ انہوں نے شاہ سعود بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو ہندستان آنے کی دعوت دی تھی۔ اس وقت سعودی عرب میں سفیر ہند جدہ قونصلیٹ میں عبدالمجید حریری بنارسی تھے جو کہ سات زبانوں کے ماہر تھے۔ عربی زبان کے بہت بڑے ادیب تھے۔ ماہنامہ برہان دہلی کے مدیر سعید اکبر آبادی جو کہ مسلکاً دیوبندی تھے، نے ایک مرتبہ کہا تھا:

''اس وقت پورے ہندستان میں عرب کے تین بڑے ادیب ہیں، اور تینوں وہابی ہیں''۔

ان تینوں ادیبوں میں سے ایک عبدالمجید حریری بنارسی بھی تھے۔ اور ان کی انگریزی زبان میں مہارت کا اندازہ لگانے کے لیے یہی ایک دلیل کافی ہے کہ انہوں نے جواہر لال نہرو کی انگریزی کتاب Discovery of India کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ نہرو کی دعوت شاہ سعود ابن عبدالعزیز رحمہ اللہ تک انہوں نے ہی پہنچائی تھی اور انہیں ہندستان لے جانے میں ان کا بہت اہم کردار تھا۔ غرض شاہ سعود رحمہ اللہ نے ہندستانی وزیراعظم کی دعوت تو قبول کر لی مگر انہوں نے ایک شرط رکھی کہ ان کے راستے میں کوئی بھی صنم خانہ نظر نہیں آنا چاہیے۔ نہرو نے ان کی شرط منظور کر لی۔ چنانچہ شاہ سعود رحمہ اللہ ہندستان تشریف لائے اور دہلی کے اسی حیدرآباد ہاؤس میں انہیں ٹھہرایا گیا۔ جس میں سعودی عرب کے موجودہ شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز آل سعود رحمہ اللہ کو ٹھہرایا گیا تھا۔ جب شاہ سعود رحمہ اللہ نے بنارس کا دورہ کیا تو حسبِ وعدہ ان کے راستے میں پڑنے والے سارے مندروں پر پردہ ڈال دیا گیا تھا۔ اسی پس منظر میں نذیر بنارسی نے مذکورہ شعر کہا تھا۔

ہائے! کیا اسلامی شان تھی، کیا اسلامی غیرت تھی، صنم خانوں کی کتنی بے عزتی ہوئی تھی، عظمت اسلام کا کتنا پاس ولحاظ تھا، کیا اسلامی محبت تھی!! اے کاش! آج بھی مسلم حکمرانوں کے پاس یہی غیرتِ ایمانی ہوتی!!

یہ باتیں تو بنارس کے حوالے سے جملہ معترضہ کے طور پر معرضِ تحریر میں آگئیں؛ ورنہ ان کی اس مضمون میں قطعاً ضرورت نہ تھی۔ مگر ان کا بیان بھی انشاءاللہ فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

مولانا مرحوم ماہنامہ ''محدث'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے:

جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ مولانا مرحوم اکتوبر 1974ء مطابق شوال ۱۳۹۴ھ میں جامعہ سلفیہ بنارس میں بحیثیت مدرس تشریف لائے۔ وہاں آتے ہی آپ کی علمی وتحقیقی توانائی شباب پر آگئی۔ طلبہ واساتذۂ کرام میں آپ کے علم اور صلاحیت کا چرچا ہونے لگا۔ درس وتدریس، دعوت وتبلیغ، تحریر وتقریر، تحقیق وتخریج، تصنیف وتالیف، صحافت اور گوناگوں خدمات میں گو آپ ہراول دستہ تھے۔ چنانچہ جامعہ سلفیہ کے ذمہ داران نے آپ کی صلاحیت وقابلیت کو سراہتے ہوئے آپ کو

ماہنامہ ''محدث'' کا ایڈیٹر بنا دیا۔ چونکہ محدث سے تعلق پیدا ہونے سے قبل بھی آپ کی علمی وتحقیقی تحریریں شائع ہوا کرتی تھیں اور صحافت میں آپ کو خاصا تجربہ ہو چکا تھا اس لیے آپ کے لیے یہ کام کوئی کٹھن اور مشکل نہ تھا۔ اور اگر مشکل بھی ہوتا تو آپ کسی ذمہ داری سے پیچھے رہنے والے کہاں تھے! چنانچہ آپ نے فروری 1982ء میں ماہنامہ ''محدث'' کی ادارت وایڈیٹنگ کی ذمہ داری قبول کرلی اور ستمبر 1988ء تک ایڈیٹر کے فرائض انجام دیتے رہے۔

مجھے یاد ہے میرے استاذ مکرم مولانا عبدالسلام عمری ومدنی ﷾ نے عمرآباد میں دورانِ تدریس شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ کے زمانہ ادارت میں نکلنے والے محدث کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا:

''جب تک مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری محدث کے ایڈیٹر رہے، محدث کی شان ہی کچھ اور تھی۔ محدث جہاں جہاں جاتا اس کے شیدائیوں میں اضافہ ہوتا جاتا۔ جو ایک مرتبہ پڑھ لیتا اس کا خریدار بن جاتا، یا بننے کی کوشش کرتا۔ اور یہ سب مولانا مبارکپوری کی سنجیدہ اور انقلابی تحریروں کی آمیزش کے اثرات کا نتیجہ تھا!!''۔

مولانا مرحوم نے ماہنامہ محدث کے زمانۂ ایڈیٹنگ میں سیاسی، سماجی، اصلاحی، ملکی اور دینی موضوعات پر سیکڑوں مضامین تحریر کیے اور ہر طبقے کو خیرخواہانہ پند ونصائح پیش کیے۔ عالم اسلام اور حالاتِ حاضرہ پر آپ نے ہزاروں صفحات تحریر کیے۔ اور اس میدان میں اپنی جولانی قلم کے خوب سے خوب تر جوہر دکھائے۔

محدث میں آپ کا اداریہ، کسی حساس موضوع پر بے لاگ تبصرہ، سفرنامے، سوال وجواب، انقلابِ ایران، جہادِ افغانستان اور فلسطین پر آپ کی فیصلہ کن تحریر آپ کی دینی حمیت پر شاہد ہے۔ آپ کی تحریر میں وہ روحانی طاقت پنہاں تھی کہ جو پڑھتا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ مجھے افسوس ہے کہ وقت کی قلت اور ساتھیوں کے عدم تعاون کے سبب میں مولانا مرحوم کے زمانۂ ادارت میں شائع ہونے والے محدث کے تمام اشاریے اپنے قارئین کی خدمت میں پیش نہیں کر سکا۔ ورنہ خواہش تھی کہ کم ازکم ان کی نشاندہی ہی کردی جائے۔ بلکہ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے

پوتے جناب حماد شاکر پاکستانی نے مجھ سے کئی بار اس کا ذکر بھی کیا کہ میں کم از کم ماہنامہ محدث میں شائع شدہ مولانا مرحوم کے مضامین کا اشاریہ[1] ہی لکھ دوں تاکہ شائقین حضرات کے لیے یہ چیز منظر عام پر آجائے۔ مگر سعودی عرب کی اس مصروف زندگی میں اتنی فرصت کہاں سے لاؤں جبکہ ڈیوٹی کے بعد گاڑی میں، صحرا میں، پارٹی میں، اور سفر وحضر میں جلدی جلدی مولانا مرحوم سے متعلق یہ مواد بڑی کٹھنائی سے حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکا ہوں!! اگر اللہ تعالیٰ نے وسائل فراہم کیے تو شاید یہ کام بھی مستقبل میں ہو جائے۔ ان شاء اللہ

بجرڈیہہ بنارس میں مناظرہ:

یہ 17، 18 جون 1978ء کی بات ہے کہ بنارس کے معروف علاقہ بجرڈیہہ میں مدرسہ احیاء السنہ کے عربی شعبہ کی تاسیس اور ایک علمی لائبریری کے افتتاح کے سلسلے میں وہاں کی مقامی جمعیت اہلحدیث نے دو روزہ جلسہ کا انعقاد کیا۔ اس جلسہ میں جو مقررین حاضر تھے، انہوں نے اصلاحی وسماجی موضوعات پر مدلل اور کامیاب تقریریں کیں۔ دوسرے دن کے جلسہ میں مولانا عبدالسلام اسلم کانپوری نے قبر والوں سے دعا مانگنے اور مصیبت کے وقت ان سے فریاد کرنے کی شرعی حیثیت پر مدلل اور سنجیدگی کے ساتھ روشنی ڈالی اور قرآن وسنت نبوی کی روشنی میں سامعین کے سامنے اس بارے میں حق بات بتلائی۔ مگر بریلوی مکتبِ فکر کے شکم پرور علماء کے لیے یہ تقریر کسی ہولناک ایٹم بم سے کم نہ تھی، کیونکہ عوام الناس کو برسوں سے جو احمق بنا کر ان کے مال وجائداد کو ہڑپنے اور ناجائز نذر ونیاز وصول کرنے کا رواج ان کے ہاں چلا آرہا تھا۔ انہیں اس خطاب سے شدید جھٹکا لگا اور پھر وہ جوابی کارروائی پر تُل گئے۔ چنانچہ 25، 26 جون 1978ء کو انہوں نے خم ٹھونک کر اہلحدیثوں کو مناظرہ کی دعوت اور جواب کے لیے للکارا اور اپنے مکتب فکر کے لوگوں کو اکٹھا کر کے فحش گفتاری، بد

(1) کتاب چھپنے کے لیے بالکل تیار تھی کہ مجلّہ نور توحید (جنوری، فروری، مارچ 2006ء) کا شمارہ مل گیا جو مولانا مرحوم کے بارے میں نمبر خاص ہے۔ اس میں جناب مسعود عالم عبدالقیوم سلفی کا مضمون نظر سے گزرا جس سے میرا مقصد حاصل ہو گیا اور میں نے اسے اپنی کتاب میں شامل کرلیا۔

کلامی اور یاوہ گوئی کا وہ طوفان بپا کیا کہ انسان تو انسان شیطان بھی شرما جائے!!

اور ویسے بھی بریلوی علماء جب دلیل سے عاجز آجاتے ہیں تو بہت جلد ان کا گیئر بدل جاتا ہے اور کچھ دیر قبل رسول اکرم ﷺ سے جھوٹی محبت کا دم بھرنے والی زبان یاوہ گوئی اور گالی گلوچ پر اتر آتی ہے۔ افسوس ہے کہ عوام بھی اس پر گرفت نہیں کرتے اور اندھی عقیدت میں ان کی بات مانتے چلے جاتے ہیں!

اہلحدیثوں نے جب بریلویوں کی یہ حرکت دیکھی تو 29 جون 1978ء کو پھر ایک جلسے کا انعقاد کیا۔ جس میں شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ اور جناب عزیر شمس کے والد محترم مولانا شمس الحق سلفی رحمہ اللہ نے عوام الناس سے انتہائی جامع اور مدلل خطاب کیا۔ یہ دونوں حضرات جامعہ سلفیہ بنارس کے نامور اساتذہ میں سے تھے۔ مولانا مبارکپوری نے قرآن اور سنت صحیحہ کی روشنی میں بریلوی خرافات کا اس طرح بخیہ ادھیڑ کر رکھ دیا کہ ان کے ایوانِ ضلالت میں شدید سونامی زلزلہ آگیا۔ اور وہاں پر موجود اہلِ عقل وخرد بریلویوں نے مذہب اہلحدیث کی حقانیت اور اپنے مذہب کا باطل ہونا تسلیم کرلیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس جلسہ میں جو مدلل اور جامع تقریر ہوئی تھی، اسے ٹیپ کے ذریعہ سن کر 9 بریلوی اہلحدیث ہوگئے جن میں سے تین اشخاص نے اپنے پورے خاندان سمیت اہلحدیث ہونے کا اعلان کیا۔

مناظرہ کا چیلنج:

30 جون 1978ء کی صبح بریلویوں کے سربرآوردہ حضرات نے ایک میٹنگ کی۔ چونکہ یہ اپنے بریلوی علماء کے بلند بانگ دعوؤں سے فریب خوردہ تھے۔ چنانچہ ایک تجویز پاس کر کے اہلحدیثوں کے سربرآوردہ حضرات کو بلایا اور انہیں مناظرے کا چیلنج دے دیا۔ اس قسم کے چیلنج سے اہلحدیث کب پیچھے رہ سکتے تھے۔ جبکہ پوری دنیا میں جتنی بھی مسلم جماعتیں ہیں، ان میں سب سے زیادہ ٹھوس، مستحکم اور خالص اسلام اگر کسی کے پاس ہے تو وہ اہلحدیث ہی ہیں۔ اہلحدیثوں کے پاس نہ تو جمود وتقلید کی تعلیم ہے اور نہ ہی غلو کا کوئی تصور۔ یہ تو صرف قال اللہ وقال الرسول کے اصولوں پر

گامزن ہیں۔ بقول شیخ عبداللہ ناصر رحمانی (امیر جمعیت اہلحدیث سندھ، پاکستان):

''آسمان کی نیلی چھت کے نیچے اہلحدیث مذہب سے اچھا کوئی مذہب نہیں''(1)۔

ائمہ عظام واسلاف کرام کی توقیر اور عزت ان کے ہاں واجب ہے مگر اندھی تقلید میں وہ ائمہ کے اقوال کو قولِ رسول پر ہرگز ہرگز مقدم نہیں کرسکتے جیسا کہ اسلام سے محبت کے دعویدار دوسرے لوگ کرتے ہیں، چاہے مقلدین انہیں گستاخ کہیں یا کوئی اور لقب دیں۔

بریلویوں کے چیلنج کو اہلحدیثوں نے بغیر کسی پس وپیش کے قبول کیا اور کہا کہ جب اور جس جگہ ہمیں مناظرہ کے لیے کہا جائے گا ہم اس چیلنج کو 24 گھنٹہ قبول کرنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ چنانچہ اس وقت طے پایا کہ 7 جولائی 1978ء کو فریقین کے علماء جمع ہو کر مناظرہ کی شرائط طے کریں اور مناظرہ رمضان سے پہلے ہی ہو جائے۔ مگر مذکورہ تاریخ کو کوئی بریلوی عالم بجرڈیہہ نہیں پہنچ سکا۔ اور یہ وعدہ خلافی ہمارے بریلوی علماء میں معروف ہے۔ اپنے جلسوں میں تو پبلک کے سامنے اتنے بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں، جیسے ان کے علاوہ کسی کے پاس کوئی صحیح دلیل ہے ہی نہیں۔ مگر جب عوام کے سامنے کسی اہلحدیث عالم سے ٹکراؤ کی نوبت آتی ہے تو عوام کو بیوقوف بنانے کے لیے چیلنج تو ضرور کردیتے ہیں لیکن موقع سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں یا بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ برصغیر ہندوپاک میں عموماً صدیوں سے یہ مناظرے ہوتے آئے ہیں اور آج بھی ہوتے رہتے ہیں۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی اہلحدیثوں سے جیت کر گیا ہو!! آخر حق جو اہلحدیثوں کے پاس ہے!!

غرض بریلویوں نے مزید ایک ہفتہ کی مہلت لی۔ 14 جولائی 1978ء کو جامعہ اشرفیہ مبارکپور کے مدرس مولوی ضیاء المصطفیٰ صاحب تشریف لائے مگر انہوں نے براہِ راست گفتگو کرنے کی بجائے بریلوی مناظرہ کمیٹی کو نشیب وفراز سمجھا کر اہلحدیث مناظرہ کمیٹی کے ساتھ شرائط طے کرنے کے لیے بھیج دیا اور ان لوگوں نے سہ پہر تک چند شرطیں طے کیں۔

(1) بحوالہ جناب مولانا قاری عبدالحلیم بلال صاحب۔

نزاع چونکہ اہلِ قبور کو وسیلہ بنانے کے مسئلہ پر شروع ہوئی تھی اس لیے اس مسئلہ کو موضوع مناظرہ قرار دینا ضروری تھا۔ مگر ان حضرات نے اپنے اراکینِ مناظرہ کمیٹی کو ایک بالکل ہی غیر متعلق اور مفسدانہ موضوعِ مناظرہ طے کرنے کا حکم دے رکھا تھا۔ اس پر سخت لے دے کے باوجود جب فریقین کسی متفقہ نتیجہ پر نہ پہنچ سکے تو فریقین کے علماء جمع کیے گئے۔ مولوی ضیاء المصطفیٰ صاحب یہ طے کیے بیٹھے تھے کہ وہ وسیلہ مروجہ کو مناظرہ نہ بننے دیں گے، مگر اہلحدیث عالم مولانا صفی الرحمٰن صاحب اعظمی نے انھیں اس طرح اپنی گرفت میں لیا کہ بھاگنے کی راہیں بند ہوگئیں اور وسیلہ کے مسئلہ پر انھیں مناظرہ منظور کرتے ہی بنی۔ بریلوی مناظر صاحب شرائط کا ایک ایسا پشتارہ بھی لکھ کرلائے تھے جو مناظرہ کے دوران موضوع سے بھاگنے اور عوام کو بھڑکا کر فساد مچانے کا کام دے سکے۔ مگر اہلحدیث عالم کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور یہ پشتارہ انھیں لپیٹ کر واپس لے جانا پڑا۔ چونکہ بریلوی علماء اس صورتحال سے مطمئن نہ تھے اور انھیں دوبارہ گفتگو کرنے کی جرأت بھی نہ تھی اس لیے انھوں نے اپنے اراکینِ مناظرہ کے ذریعے 22 جولائی کو پھر شرطیں طے کرائیں (1)۔

اس مناظرے کا خلاصہ یہ ہے کہ اہلحدیثوں کو اس میں زبردست جیت ہوئی اور بریلویوں کو شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا۔

اس مناظرے کی جیت کا سہرا مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کے سر جاتا ہے۔ جبکہ میں نے سنا ہے کہ مولانا کو بعض لوگ اس مناظرے میں شرکت کی اجازت دینے کو تیار نہ تھے۔ بلکہ ایک روایت جو کہ خود مولانا مرحوم ہی کی بیان کردہ ہے، کے مطابق جامعہ سلفیہ کے شیخ الحدیث مولانا شمس الحق سلفی رحمہ اللہ بھی اس مناظرے میں مولانا مرحوم کو شریک کرنے کے موڈ میں نہیں تھے!! مگر جب انھوں نے مناظرے میں مولانا کی حاضر جوابی اور علمی قابلیت دیکھی تو آپ کی خداداد صلاحیت کے قائل ہوگئے۔ اللہ ان دونوں بزرگوں پر اپنی خصوصی رحمت کی بارش کرے۔

(1) یہ معلومات میں نے اس مناظرے کی شائع شدہ رپورٹ بنام ''رزمِ حق و باطل'' سے لی ہے۔

مولانا کی اقتصادی حالت:

مولانا مرحوم کے والد کی اقتصادی حالت قدرے غنیمت تھی۔ مولانا مرحوم جب جامعہ سلفیہ بنارس میں بحیثیت استاد آئے تو آپ کی اقتصادی حالت کوئی اچھی نہیں تھی۔ مگر یہ حق ہے کہ آپ کی تعلیم وترقی میں اس اقتصادی ضعف سے کچھ فرق نہیں آیا۔ آپ انتہائی خوددار آدمی تھے۔ کم خرچ سے اپنا کام نکال لیتے مگر کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ وہ دن آپ کبھی بھلا نہیں پاتے تھے جب آپ نے اپنے دوستوں یاروں سے صرف دس روپے کا تقاضا کیا تھا۔ اس وقت آپ کو اِس روپے کی شدید ضرورت تھی۔ آپ نے اپنے متعارفین سے بطورِ قرض مانگا۔ مگر آپ کو کسی نے یہ قرض نہیں دیا۔ اس کے بیان سے آپ کا مقصود دوستوں یاروں اور اپنے متعارفین کی تنقیص وتنقید نہیں تھا؛ بلکہ آپ اپنی اقتصادی حالت کی حقیقت کا اس واقعے سے اظہار کیا کرتے تھے۔ آپ اس بات کا تذکرہ بڑے افسوس کے ساتھ کرتے تھے۔

18 /اپریل 2007ء کو جب میں مولانا مرحوم کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامہ محدث کے شماروں کی جستجو میں جامعہ سلفیہ بنارس گیا ہوا تھا تو مولانا محمد حنیف مدنی نے مجھے بتایا کہ فیض عام کے تدریسی زمانے میں مولانا مرحوم نے علامہ سیوطی کی کتاب ''المصابیح فی مسئلۃ التراویح'' کا ترجمہ کیا تھا۔ مولانا نے اس کی طباعت کے لیے ہم طلبہ سے تعاون کا تقاضا کیا تھا۔ کلاس ساتھیوں نے چار چار آنے اکٹھا کیا اور میں نے پانچ روپے دیے تھے۔ انھی پیسوں سے اس کتاب کی طباعت عمل میں آئی تھی۔ مجھے طباعت کے بعد اس کے پچاس نسخے ہدیہ ملے تھے۔

اسی طرح مولانا جب کوئی کتاب تصنیف فرماتے یا ترجمہ کرتے تو اس کی طباعت کے لیے اپنے بعض تعلقاتی لوگوں یا اپنے طلبہ کے پاس خطوط بھیجتے کہ میری کتاب کی طباعت کے بارے میں کوئی راستہ دیکھیں۔

مگر جب سے مولانا نے 'الرحیق المختوم' لکھی اور آپ کی تالیف رابطہ عالمِ اسلامی کے بین الاقوامی مقابلے میں اول انعام کی مستحق قرار پائی تو پھر مولانا کی علمی ترقی کے ساتھ دنیوی ترقی کے

بھی راستے کھل گئے۔ چنانچہ اس کے بعد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی فیکلٹی "خدمة السنة النبوية" میں آپ کو سروس مل گئی اور پھر آپ جامعہ سلفیہ بنارس سے مدینہ منورہ چلے آئے جہاں آپ کو اچھی تنخواہ ملنے لگی اور پھر اس کے بعد آپ کی اقتصادی حالت مضبوط ہوگئی۔

میں نے مولانا مرحوم کے بارے میں اس عنوان کا اضافہ اس لیے کیا ہے تاکہ وہ لوگ اپنے آپ کو کسی سے کم تر نہ سمجھیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے دنیوی ناز ونعم سے نہیں نوازا ہے۔ کسی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے نہیں لگایا جاتا کہ وہ کتنا مالدار ہے، یا کتنے بڑے مالدار باپ کا سپوت ہے۔ بلکہ کسی کی کامیابی اور اہمیت کا اندازہ خود اس کی ذات میں پنہاں ہے۔ اب چاہے تو کوئی اپنی اہمیت کا اندازہ خود کر کے اپنی خوبیوں سے دنیا کو روشناس کرائے۔ یا چاہے تو اپنی خوبیوں کو خامیوں میں تبدیل کردے۔

میں اس موقع پر خاص کر طالبانِ علومِ نبوت کو جو دینی مدارس میں زیر تعلیم ہیں، مخاطب کروں گا اور ان کی توجہ اس جانب مبذول کراؤں گا کہ آپ مالدار طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں یا غریب طبقہ سے، آپ کی شرافت اور کامیابی صرف آپ کی ذاتی محنت میں پوشیدہ ہے۔ آپ کو اگر کامیابی کی منزلیں طے کرنی ہیں، تو آپ رات دن اسی طرح محنت ومشقت سے اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں جس طرح مولانا مرحوم نے آپ کے لیے اپنی زندگی میں نمونہ چھوڑا ہے۔ انھوں نے مادی ومعنوی سہارا کے بغیر صرف اللہ پر بھروسہ کر کے اور پھر اپنی بے انتہا محنت سے دنیا کے سامنے اپنی قابلیت اور اہمیت منوالی۔ آپ بھی ان کی زندگی کو اپنے لیے اسوہ تسلیم کرلیں اور آج ہی سے محنت شروع کردیں۔ جس رفتار سے آپ کی محنت ہوگی، کامیابی کی منزلیں اسی رفتار سے قریب سے قریب تر آتی چلی جائیں گی۔

'الرحیق المختوم' کی تالیف:

اردو شعر کا یہ مصرع لوگوں میں بہت مشہور ہے:

"دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے"۔

'الرحیق المختوم' کے مؤلف نے انتہائی محبت والفت اور رسول اکرم ﷺ سے گہری عقیدت

کے پیش نظر یہ کتاب لکھی تھی اور رسول اکرم ﷺ سے جوان کا قلبی لگاؤ تھا، قلمی لگاؤ کا بھی بالآخر اظہار ہو ہی گیا کہ دنیا کے ایک سے بڑھ کر ایک اہلِ قلم نے محبتِ رسول سے سرشار ہو کر سیرت نبوی کے موضوع پر رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی جانب سے منعقد ہونے والے بین الاقوامی انعامی مقابلے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور سبھوں نے عقیدت ومحبت کے الفاظ سے رسول اکرم ﷺ کی مبارک زندگی کے بارے میں خامہ فرسائی کرنے میں اپنے ذخیرۂ الفاظ کا آخری حرف تک بھی استعمال کر دیا۔ اس میں رسول اکرم ﷺ کی حیات سعیدہ کے مختلف گوشوں پر قلمکاروں نے قلم آرائی کی۔ نامور ادیب زماں اور اردو وعربی میں اپنی مثال آپ معروف قلمکار سید ابوالحسن علی ندوی بھی اس مقابلے میں شریک تھے جن کی عربی وارد و کتابیں بین الاقوامی ادیبوں سے دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سارے معروف مصنفین، مؤلفین اور ادیبوں نے حصہ لیا جن کی تعداد کا صحیح علم اللہ ہی کو ہے۔ البتہ رابطہ عالم اسلامی مکہ کی رپورٹ کے مطابق اس انعامی مقابلے کے لیے گیارہ سو بیاسی (1182) مقالات موصول ہوئے۔

یہ مقالات دنیا کی زندہ ومعروف زبانوں میں لکھے گئے تھے۔ رابطہ نے ماہرین فن وزبان کی ایک علمی کمیٹی تشکیل دی جنھوں نے بڑی باریک بینی سے ان مقالات کا علمی جائزہ لیا اور بالآخر یہ طے ہوا کہ ان تمام مقالات میں اول پوزیشن کا مستحق مقالہ شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری کا ہے جس کا عنوان 'الرحیق المختوم' ہے (1)۔

(1) مولانا مبارکپوری رحمہ اللہ کے انتقال کے بعد میں نے ایک روز آپ کی مایہ ناز تالیف 'الرحیق المختوم' کے حوالے سے چند باتیں لکھی تھیں جو اتفاق سے میرے قائم کردہ مذکورہ موضوع سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ اس لیے میں نے اس تحریر کو بھی یہاں شامل کر دینا مناسب سمجھا۔ اس موقع پر میں نے لکھا تھا:

"یہ بالکل درست اور حق ہے کہ شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری کی زندگی میں جو سب سے بڑا انقلاب آیا، اس کا سبب ان کی مایہ ناز کتاب 'الرحیق المختوم' ہے۔ رابطہ عالم اسلامی نے 1396ھ میں سیرتِ نبوی ﷺ کے موضوع پر ایک انعامی مقابلے کا اعلان کیا۔ یہ اعلان ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے پوری دنیا میں نشر کیا گیا اور دنیا کی مختلف معروف اور زندہ زبانوں میں مقالہ لکھنے کی اجازت دی گئی۔ ساری دنیا کے مصنفوں، =

چنانچہ رابطہ نے ۱۲ ربیع الآخر ۱۳۹۹ھ کو اپنے انعقاد کردہ جلسہ میں مولانا کو 50 ہزار ریال کا جائزہ پیش کیا۔ اس مقابلے کا اعلان ربیع الاول ۱۳۹۶ھ موافق مارچ 1976ء میں پاکستان کے معروف شہر کراچی میں پہلی عالمی سیرت کانفرنس میں ہوا تھا، جس میں رابطہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس کی مکمل تفصیل آپ مولانا کی تحریر میں پڑھ سکتے ہیں دیکھیے صفحہ...... پر۔

'الرحیق المختوم' کی مقبولیت:

اگر کسی مصنف ومؤلف کے پاس اس دنیا میں کوئی شان وشرف اور عزت وکرم کی بات ہوسکتی

مؤلفوں اور ادیبوں نے اس مقابلے میں شرکت کے لیے کمر کس لیے اور جس کسی نے بھی لکھا، بڑی محنت سے لکھا اور خوب لکھا۔ چونکہ یہ مقابلہ اس ہستی کی حیاتِ مبارکہ پر تھا جس کی زبانِ مبارک سے نکلا ہوا ہر ہر لفظ قانون اور اصول کی حیثیت رکھتا ہے اور جس سے محبت اتنی زیادہ، اتنی زیادہ کرنے کا حکم ہے، جتنی کسی سے بھی نہ ہو۔ چنانچہ مصنفوں نے بھی، مؤلفوں نے بھی اور ادیبوں نے بھی اپنے اقلام کی نوکیں توڑ دیں۔ اپنی محبت کے کاغذ پر عقیدت کی روشنائی سے رسول اکرم ﷺ کی زندگی کے ہر ہر گوشے پر خامہ فرسائی کی اور جتنا ممکن ہو سکا لکھا اور خوب خوب لکھا۔

پوری دنیا کی معروف زندہ زبانوں میں (171) مقالے لکھے گئے اور خوبصورت سے خوبصورت نام کے ساتھ انھیں مطلوبہ مقام تک بھیجا گیا۔ مولانا مرحوم نے بھی دیر ہی سے سہی، اس مقابلے میں بعض مخلص ساتھیوں کے پیہم اصرار پر حصہ لیا اور سیرتِ نبوی ﷺ کے تعلق سے کتابوں کی چھان بین کرنے لگے اور جو کچھ حق اور مناسب سمجھا، لکھتے گئے۔ اسے الہام کہیے کہ مولانا مرحوم کو اپنے مقالے کے لیے 'الرحیق المختوم' کا نام مل گیا۔ اللہ قسم! یہ الفاظ قرآن کریم میں دنیا کے سارے ہی مسلمان پڑھتے اور سنتے چلے آئے ہیں۔ مگر اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی دریغ نہیں کہ اس دنیا میں اگر کسی کو اس نام کو مناسب جگہ پر استعمال کرنے کی توفیق ملی ہے تو مولانا مرحوم ہی ہیں۔ اگر رابطہ عالم اسلامی نے سیرتِ نبوی کے اس مقابلے میں مقالات کے نام کے انتخاب پر بھی کچھ نمبرات رکھا ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ اس میں اول پوزیشن کا مستحق مولانا مرحوم کا انتخاب کردہ یہ نام ہی ہوتا جس کے معنی مہر بند شراب کے ہیں اور جو ہر مومن کو قیامت کے دن جنت میں نصیب ہوگی۔ جنتی یہ شراب پی کر مستی کے ساتھ جنت میں گھومیں گے پھریں گے، موج کریں گے۔ بڑی بڑی آنکھوں والی، دل لبھانے والی، ناز ونخرے والی ہم عمر حوریں ان کا ہر وقت استقبال کریں گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی یہ شراب پلائے''۔ آمین

ہے تو وہ اس کی تحریر کی مقبولیت ہے۔ افسانہ نگار حضرات اپنے حسین جملوں میں یہ بات بار بار دہراتے ہیں کہ

''اپنے حسن کے نکھار اور اپنے علم کی تعریف بھلا کسے پسند نہیں !!''

واللہ! اگر مولانا مرحوم کے علم کی تعریف مقصود ہو تو ان کی بیسیوں کتابوں میں سے صرف ایک ہی کتاب کافی ہے جس کو دنیا 'الرحیق المختوم' کے نام سے جانتی ہے۔ چہار دانگ عالم میں شاید ہی کوئی صاحبِ ثقافت مسلمان ہوگا جو 'الرحیق المختوم' اور اس کے مؤلف کو نہیں جانتا ہوگا۔ سیرت نبوی پر لکھی جانے والی کتابوں میں جو مقبولیت اس کتاب کو ہوئی، پچھلی چند صدیوں میں اس کی مثال نظر نہیں آتی۔ مولانا مرحوم کی اس کتاب نے سیرت نبوی کی تاریخ میں ایک انقلابی روح کو وجود بخشا۔ چنانچہ ہر مکتبِ فکر کے لوگوں کے اندر رسول اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا تجسس ہوا اور کشاں کشاں یہ کتاب دنیا کے طول وعرض میں لاکھوں، کروڑوں گھرانوں میں پڑھی جانے لگی۔

بہت سارے لوگوں نے رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ سے متعلق مختلف انداز میں کتابیں لکھیں۔ اردو زبان میں جس عقیدت ومحبت میں قاضی سلمان منصور پوری نے اپنی کتاب ''رحمۃ للعالمین'' لکھی، ویسی محبت وعقیدت میں شاید ہی کسی مؤلف نے خامہ فرسائی کی ہو۔ جن دنوں ''رحمۃ للعالمین'' لکھی جا رہی تھی انہی دنوں میں علامہ سید شبلی نعمانیؒ نے بھی سیرۃ النبی ﷺ پر ایک مفصل کتاب لکھنے کا اعلان کیا جس میں رسول اکرم ﷺ کے متعلق تمام پہلوؤں پر تفصیلی بحث کا خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ ۱۳۳۰ھ میں جب علامہ شبلی نعمان رحمہ اللہ نے عوام میں پچاس ہزار روپے کے سرمایہ کے لیے مرافعہ پیش کیا تاکہ پورے اطمینان کے ساتھ یکسو ہو کر یہ خدمت انجام دی جا سکے تو الحمدللہ سیکڑوں مسلمانوں نے اس خدمت کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ان میں فقرائے امت بھی تھے اور امرائے ملت بھی۔ لیکن یہ سعادتِ اخروی ازل ہی سے خادمة الملة النبوية مخدومة الأمة المحمدية نواب سلطان جہاں بیگم تاج الہند، فرمانروائے بھوپال اور زوجہ محترمہ علامہ نواب صدیق حسن خان قنوجی کے لیے مقدر تھی۔ چنانچہ وہ سب سے آگے بڑھیں اور سوانحِ نگارِ

نبوت کو دوسرے آستانوں سے بے نیاز کر کے اس سرمایۂ سعادت کو اپنے خزانۂ عامرہ میں شامل کر لیا۔ فرمانروا خواتینِ اسلام نے جو مذہبی کارنامے انجام دیے ہیں ان کارناموں میں ملکۂ بھوپال کا نہایت ہی نمایاں کردار ہے۔ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگردِ رشید علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے مل کر یہ عظیم خدمت انجام دی جو بلاشبہ سیرتِ نبوی کے تقریباً تمام گوشوں کو محیط ہے۔

مگر ان دونوں کتابوں میں جو تشنگی باقی تھی اس کا تتمہ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ نے مکمل کر دیا اور عربی زبان میں لکھی ہوئی اپنی کتاب کو اسی نام سے اردو ترجمہ کر کے دنیائے اردو میں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے شائقین میں عقیدتِ رسول کی لہر دوڑا دی۔

بعض لوگوں نے مولانا مرحوم کے بعد بھی سیرتِ رسول پر کتابیں لکھنے کی کوشش کیں اور عربی و اردو میں اپنی کتابوں کی مقبولیت کے خواہاں رہے، مگر وہ مقبولیت انہیں کب مل سکتی تھی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے صفی الرحمٰن کے حق میں لکھ دی تھی!! دراصل دوسروں کی زمین سے مٹی چوری کر کے اینٹ بنا کر کسی بلڈنگ کی تعمیر کرنے والے اس شخص کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں جس نے اپنی بلڈنگ کی تعمیر میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیا ہو؟!!

مولانا مرحوم کی کتاب 'الرحیق المختوم' جس قدر عربی زبان میں مقبول ہوئی، اسی طرح دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی ہوئی۔ عربی زبان میں 'الرحیق المختوم' کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ میں بارہا سعودی عرب کے مکتبات میں جایا کرتا ہوں، کوئی بھی مکتبہ ایسا نہیں ملا جس میں اس کے مختلف ایڈیشن نہ ہوں۔ بلکہ یہاں سعودی عرب میں بسا اوقات مسجدوں کے پاس نماز کے اوقات میں بعض افراد کتابوں کا اسٹال لگاتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا اسٹال ہوگا جس میں 'الرحیق المختوم' نہ ہوتی ہوگی۔

مکتبہ دارالسلام ریاض (سعودی عرب) کے جنرل منیجر جناب عبدالمالک مجاہد کی رپورٹ کے مطابق عربی زبان میں 'الرحیق المختوم' کو شائع کرنے والے مکتبات کی تعداد پوری دنیا میں بائیس سے بھی زیادہ ہے۔ اس سے 'الرحیق المختوم' کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف عربی زبان میں 'الرحیق المختوم' کے سیکڑوں ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ جہاں تک اردو زبان کی بات ہے تو میں نے پاکستان کے معروف ادارہ المکتبۃ السلفیہ کے ذمہ دار جناب حماد

شاکر حفظہ اللہ سے اس بارے میں معلومات چاہی جو کہ جناب احمد شاکر حفظہ اللہ کے صاحبزادے اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کے پوتے ہیں۔تو انہوں نے بتایا:

''والد محترم احمد شاکر صاحب حفظہ اللہ سے صاحبِ 'الرحیق المختوم' جناب مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ سے مکہ مکرمہ میں ملاقات ہوئی تو 'الرحیق المختوم' کو اردو زبان میں چھاپنے کی بات چلی۔ مولانا کی خواہش تھی کہ کتاب کی شایانِ شان اس کی کتابت وطباعت ہو۔ چنانچہ مولانا کی خواہش کے مطابق والد محترم نے 'الرحیق المختوم' کی کتابت وطباعت میں کافی محنت کی۔ بلکہ پاکستان کے سب سے زیادہ معروف اور اچھے کاتب سے کتاب کی کتابت کرائی گئی اور اس کی طباعت اور ٹائٹل میں حتی الامکان فنکاری کا مظاہرہ کیا گیا۔ 'الرحیق المختوم' کی کتابت وطباعت میں جو بھاری رقم خرچ ہوئی وہ رقم گیارہویں ایڈیشن میں مکمل ہوئی تھی۔ 'الرحیق المختوم' کا پہلا ایڈیشن 1988ء میں منظرعام پر آیا تھا، جس کی تقریب رونمائی میں اس وقت پنجاب کے وزیراعلیٰ اور پاکستان کے صدر میاں محمد نواز شریف بطورمہمان خصوصی شریک تھے اور صدارت شیخ جمیل الرحمٰن رحمہ اللہ کی تھی''۔

'الرحیق المختوم' کی اردو زبان میں مقبولیت اور پذیرائی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حماد شاکر کے بقول صرف ''المکتبة السلفية'' 'الرحیق المختوم' کے پچاس سے زائد ایڈیشن شائع کر چکا ہے۔ جبکہ دوسرے مکتبات اور خود مولانا نے بھی کئی ایڈیشن شائع کیے ہیں۔

کسی بھی کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس کی اشاعت سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو کتاب جس قدر زیادہ مقبول ہوگی، اسی قدر زیادہ تعداد میں اس کی اشاعت بھی ہوگی۔ اور 'الرحیق المختوم' کی صرف ایک مکتبہ میں 1988ء سے 2006ء تک یعنی اٹھارہ سال میں 50 سے زائد ایڈیشن کی اشاعت اس کی عظیم مقبولیت کا بین ثبوت ہے۔ عربی زبان میں تو نہ جانے اس کے کتنے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ اس کا علم اللہ ہی کو بہتر ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس نے 'الرحیق المختوم' کو جس مقبولیت سے نوازا ہے اس کے مؤلف کو بھی میدانِ حشر میں وہ مقبولیت عطا کرے۔ آمین۔

'الرحیق المختوم' کے ساتھ ناانصافی:

دنیا کے کسی بھی ملک میں مؤلفین ومصنفین کی کتابوں کے حقوق انہی کے ہوا کرتے ہیں تا آنکہ وہ اپنی کتابوں کے حقوق کسی پبلشر وغیرہ سے فروخت نہ کردیں۔ اور یہ یقینی بات ہے کہ کسی رائٹر کا سرمایہ اس کی لکھی ہوئی کتابیں ہی ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ بین الاقوامی قوانین میں مؤلفین ومصنفین کے لیے اسپیشل قانون ہے اور انتہائی سخت قانون ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک پبلشر نے ایک مصنف کی کتاب اس کی اجازت سے شائع کی مگر اس کی تحریر میں جابجا تصرف سے کام لیا۔ جب کتاب چھپ چکی تو پبلشر نے کتاب کا ایک نسخہ اور اس کے ساتھ چند ہزار روپے کا ڈرافٹ بنوا کر مؤلف کے پاس بھیجا۔ مؤلف نے جب اپنی کتاب میں پبلشر کا تصرف دیکھا تو اسے خاصی تکلیف ہوئی اور یہ تھی بھی تکلیف دہ بات۔ کیونکہ ایک مؤلف کوئی بات انتہائی ذمے داری کے ساتھ خونِ جگر سے قلمبند کرتا ہے جبکہ چند نام نہاد لوگوں نے مؤلفین کے کلام میں ردوبدل اور بے جا تصرف کا نام نظرثانی ومراجعہ اور تصحیح وتنقیح رکھ لیا ہے، جو کہ مصنف کے ساتھ سراسر ناانصافی اور ظلم وزیادتی ہے۔ مؤلف نے غصہ میں آکر پبلشر کو خط لکھا کہ میری کتاب کا دوسرا ایڈیشن چھاپنے کی کوشش مت کرنا اور ہاں! بین الاقوامی قانون کے مطابق میری کتاب کے جو حقوق بنتے ہیں وہ مجھے چاہئیں۔ یہ چند روپے دے کر بہلانے کی کوشش نہ کریں!! چنانچہ پبلشر کو ناکوں چنے چبانے پڑے اور اس کے حقوق دینے پڑے۔

یہ واقعہ تو اس مصنف کا ہے جو قانون سے لڑ رہا تھا مگر آج اکثر پبلشرز کا حال یہ ہے کہ وہ مصنفین کی کتابیں چھاپ کر فائدے پر فائدہ کمانا تو جانتے ہیں مگر مصنفین کے حقوق کی ادائیگی کا ان کے پاس کوئی تصور نہیں۔ تعجب اور حیرت تو اس وقت ہوتی ہے جب دینی کتابیں شائع کرنے والے پبلشرز بھی مؤلفین کے حقوق کی حق تلفی کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف تو ان کا دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ دینی کتابیں شائع کرکے اسلام کی خدمت کررہے ہیں، دوسری طرف وہ مؤلفین کے حقوق کی کھلی حق تلفی کررہے ہوتے ہیں۔ نہ معلوم ظلم وزیادتی اور حرام کام کا ارتکاب کرکے وہ دین کی کونسی خدمت انجام دیتے ہیں!!

شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کی مایہ ناز تصنیف 'الرحیق المختوم' کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ دنیا کے بائیس سے زیادہ پبلشرز 'الرحیق المختوم' کی صرف عربی نسخہ چھاپتے ہیں مگر ان میں سے اکثر کا حال یہ ہے کہ مولانا مرحوم کو 'الرحیق المختوم' کا جوحق بنتا ہے نہیں دیا۔ جبکہ مولانا سے تحریری طور پر پبلشروں نے چھاپنے کی اجازت لی اور اس کے جو حقوق بن سکتے تھے، دینے کا بھی اتفاق کیا مگر اکثروں نے مولانا کے ساتھ دھوکہ کیا۔ بلکہ بعض پبلشرز نے تو مولانا کی اجازت کے بغیر ہی ان کی یہ کتاب چھاپ لی اور مارکیٹ میں کھلے عام بیچنے لگے۔ نہ معلوم قیامت کے روز اس دھوکہ اور چوری کا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے۔

جن دنوں میں مولانا کو مکتبہ دارالسلام ریاض سے ڈیوٹی کے اوقات ختم ہونے کے بعد ان کے داماد کے گھر لے جایا اور وہاں سے آفس لایا کرتا تھا۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ آفس میں مولانا صاحب نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ چونکہ مولانا کی آواز اب برائے نام رہ گئی تھی اور زیادہ تر باتیں اشارہ اور مختصر کلام ہی سے کر سکتے تھے۔ اس لیے مجھے ان کی بات سنائی نہیں دی۔ میں اپنے کام میں مشغول رہا۔ ساتھیوں نے مجھے بتایا کہ مولانا آپ کو بلا رہے ہیں۔ میں مولانا کے قریب ہوا تو مولانا نے کہا: کاغذ اور قلم لے کر میرے پاس بیٹھیں، مجھے کچھ لکھوانا ہے۔ پھر انہوں نے مجھ سے کئی ناشران کے نام دھمکی آمیز خطوط تحریر کروائے جن میں انہیں 'الرحیق المختوم' کے حقوق کی عدم ادائیگی پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے شیخ نے الٹی میٹم دیا تھا کہ آپ ناشران 'الرحیق المختوم' شائع کرنے کا معاوضہ دیتے ہیں تو ٹھیک؛ ورنہ اس کے بعد اسے شائع نہ کریں۔ آج کے بعد پچھلا معاہدہ منسوخ کیا جاتا ہے۔ بصورت دیگر یہ معاملہ عدالت کے حوالے کر دیا جائے گا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ غالباً فی نسخہ 2 ریال کا شیخ صاحب نے تقاضا کیا تھا۔ میں یہ خط قلمبند کر رہا تھا اور اندر ہی اندر مسکرا بھی رہا تھا۔ میں نے دورانِ تحریر شیخ مرحوم سے کہا بھی کہ اس خط کے الفاظ میں سے دھمکی آمیز الفاظ میں تھوڑی سی تخفیف کر دی جائے تو بہتر ہوگا۔ مگر شیخ صاحب نے اصرار کے ساتھ سخت جملے برقرار رکھوائے۔ جب خط کا مضمون مکمل ہوا تو مولانا صاحب نے مجھے ہر ناشر کا ایڈریس اور فیکس نمبر دیا تاکہ میں فیکس کر دوں، یا پوسٹ آفس سے ارسال کر دوں۔ میں نے چند کو پوسٹ کر دیا اور چند کو

فیکس کے ذریعے بھیج دیا۔

مولانا مرحوم کے اس دھمکی آمیز خط سے پبلشروں کے کان کھڑے ہو گئے اور انہوں نے فوراً مملکت سعودی عرب اور بیرونِ ممالک سے مولانا کے ساتھ رابطہ شروع کر دیا۔ چنانچہ دوسرے ہی روز ایک مصر کے پبلشر نے اپنے نمایندے کو مولانا کی خدمت میں بھیجا۔ مصری نمائندہ جب مولانا کے پاس پہنچا تو میں بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے مولانا کے سامنے 'الرحیق المختوم' کے شائع شدہ نسخوں کا حساب کر کے ساڑھے اٹھارہ ہزار ریال نقد دیا اور مولانا سے اتفاقی کاغذات پر دستخط لے کر چلا گیا۔ مولانا چونکہ فالج کے مرض میں مبتلا تھے، اس لیے وہ اچھے ڈھنگ سے روپے گن بھی نہیں سکتے تھے۔ ایک ایک نوٹ کو الگ الگ کر کے انہوں نے گنا اور اپنی جیب میں رکھ لیا۔ میں نے دیکھا کہ مولانا کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا تھا۔ قاری محمد اقبال عبدالعزیز نے بھی اس موقع پر مولانا مرحوم سے ایک دولطیف سا مذاق کر لیا۔ مولانا نے مجھے بھی پچاس ریال مٹھائی کے لیے دیا مگر میں نے لینے سے انکار کر دیا اور معذرت کر دی۔

اس کے علاوہ بھی کئی ناشران نے مولانا سے رابطہ کر کے اپنے معاہدے کی تجدید کی اور شرائط کے مطابق اتفاق کیا۔ مگر اکثر ناشران نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور مولانا کی کتاب چھاپتے رہے۔ یہ وہ ناشران ہیں جنہیں عہد و پیمان اور حقوق و واجبات کی پامالی میں ذرا سی بھی جھجک نہیں ہوتی اور کھلے عالم دوسروں کے حقوق ہڑپ کر جاتے ہیں۔

اس دور میں مؤلفین کے حقوق پامال کرنا ناشران نے اپنا حق سمجھ رکھا ہے۔ چند سال قبل سعودی عرب سے شائع ہونے والے انگلش اخبار (Arab News) میں میں نے ایک کارٹون دیکھا تھا جس میں دو آدمیوں کی تصویریں تھیں۔ ان میں سے ایک آدمی دوسرے کے سر میں ایک پائپ لگا کر اپنے منہ سے اس کا مغز کھینچ رہا تھا اور اس کے آگے چند روپے رکھا ہوا تھا، جبکہ پائپ جس نے لگایا تھا اس کے آگے کافی ڈالرز رکھے ہوئے تھے۔ اس کارٹون میں پہلے آدمی کو پبلشر اور دوسرے کو مؤلف دکھایا گیا تھا۔ گو مؤلف کو چند ٹکے دیکر پبلشر لاکھوں ڈالرز سمیٹتا ہے!!

وہ پبلشرز جو ناجائز حیلہ بنا کر مؤلفین کی اجازت کے بغیر ان کی کتابیں شائع کرتے ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سراسر ناجائز اور حرام ہے۔ یہ دوسروں کی حق تلفی ہے۔ ایسی کمائی کو ہرگز پاک اور حلال کمائی نہیں کہا جا سکتا؛ خواہ شیطان جو بھی حیلہ بہانہ ان کے دل میں ڈالے۔

علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کو جب معلوم ہوا کہ ان کی کتابیں بھی مارکیٹ میں ان کی اجازت کے بغیر ہی آ رہی ہیں تو انہوں نے اس بات پر پبلشروں کا سخت نوٹس لی اور کسی مؤلف کی کتاب بغیر اس کی اجازت کے شائع کرنے کو قطعاً حرام قرار دیا۔ چنانچہ علامہ رحمہ اللہ "تلخيص أحكام الجنائز" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"فإن الكثيرين من الناشرين والطابعين أخذوا يسرقون مؤلفاتي ويطبعونها ليتاجروا بها،ويأكلوا ربحها سُحتًا...... ولقد بلغني أن بعضهم أفتى بجواز سرقة الكتاب وطبعها والتجارة بها دون إذن من مؤلفها وناشرها! وهذا ظلم فاضح واستغلال غير شريف لجهود الآخرين من المؤلفين والناشرين، الذين اتخذوا التأليف والنشر وسيلة من أشرف وسائل لكسب الرزق الحلال، فكيف يليق بمسلم بل بكافر أن يقطع عن هؤلاء أرزاقهم، ويأكل هو ربح جهودهم وأتعابهم، بله الإفتاء بجوازه؟ تالله! إنها لإحدى الكبر".

"بہت سارے پبلشرز و ناشرینِ کتب بغرضِ تجارت میری تالیفات چوری چھپے شائع کرنے لگے ہیں۔ اور میری کتابوں سے فائدہ کما کر حرام کھا رہے ہیں...... بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کسی عالم نے فتویٰ دیا ہے کہ کتابوں کو ان کے مولفین اور ناشرین کی اجازت کے بغیر چوری چھپے شائع کر کے ان کی تجارت کرنا جائز ہے۔ جبکہ یہ سراسر ظلم اور ان مولفین اور ناشرین کی محنت کو حرام طریقے سے کھانا ہوا، جنھوں نے تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کو رزقِ حلال کا بہترین وسیلہ بنایا ہے۔ بھلا ایسی صورت میں کسی مسلمان؛ بلکہ کسی کافر کو بھی کیوں کر زیب دیتا ہے کہ وہ ان (مؤلفین و ناشرین) کی روزی روک

دیں اور ان کی اور ان کے بعد والوں کی محنت کا فائدہ (حرام طریقے سے) کھائیں۔ بھلا اس کے جواز کا فتویٰ کیوں کر دیا جا سکتا ہے؟! اللہ کی قسم! یہ بہت ہی بڑا گناہ ہے"۔

ایسی صورت میں ان لوگوں کو آخرت کا تصور کرنا چاہیے جو مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کی تصنیفات پر حقوق کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرتے رہے اور ان کے انتقال کے بعد بھی ان کی کتابیں چھاپنے کا عزم رکھتے ہیں۔ ان کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ مولانا مرحوم کی کتابوں کے حقوق ان کی عدم موجودگی میں ان کی اولاد تک پہنچائیں۔ اسی میں ان کا اللہ کے ہاں چھٹکارا ہے۔

'الرحیق المختوم' کے حقوق کا مسئلہ:

ایک روز مولانا مرحوم میری گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے، وہ میرے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ میری عادت ہے کہ اپنے بزرگوں سے طرح طرح کے سوالات کرتا ہوں تاکہ ان کی تجرباتی زندگی کے بارے میں کچھ معلومات ہو جائے۔

ایک مرتبہ میں 4/اگست 1996ء کو مولانا وحید الدین خان صاحب سے ملاقات کی غرض سے ان کی رہائش C29 نظام الدین نئی دہلی گیا ہوا تھا۔ دورانِ گفتگو میں نے ان سے کچھ مشورہ طلب کیا اور پوچھا کہ آخر وہ کونسی اہم بات ہے جو آپ کی زندگی میں تحریک کا باعث بنی؟ انھوں نے مجھے مشورہ دینے سے گریز کیا؛ البتہ میری ڈائری پر آٹوگراف دیتے ہوئے علامہ اقبال کا یہ شعر لکھ دیا:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

مولانا نے فرمایا: یہی وہ شعر ہے جو میری زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کا ذریعہ بنا۔ انسان کی ذاتی محنت ہی وہ عظیم درسگاہ ہے، جو انسان کو ہر مقام پر کامیاب و کامران کرتی ہے۔ آپ بھی اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔

میری یہی عادت تھی کہ جب تک مولانا میری گاڑی میں سوار رہتے میں ڈرائیونگ کے دوران ان سے مختلف قسم کے سوالات کرتا رہتا۔ ایک مرتبہ اتفاق سے میں نے پوچھ لیا:

''مولانا صاحب! آپ کی مایہ ناز کتاب 'الرحیق المختوم' کو دنیا میں جو مقبولیت ہوئی ہے، یہ آپ پر بھی مخفی نہیں۔ دنیا کے دو درجن سے زائد ناشرین اس کتاب کو شائع کرتے ہیں اور اس سے کافی مالی فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ مگر کیا آپ کو وہ ناشران 'الرحیق المختوم' کے حقوق کی ادائیگی کرتے ہیں؟''۔

مولانا نے جواب دیا:

''ان میں سے اکثر ناشران چوری اور غش کے مرتکب ہیں۔ میں نے بہت سارے ناشران کو اس کی طباعت کی اجازت نہیں دی ہے۔ اور نہ ہی انہیں میری اجازت طلب کرنے کی کبھی زحمت ہوئی ہے، ان کو میں نے خطوط بھی لکھے مگر اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا، وہ کتاب چھاپتے رہے۔ البتہ اب تک جس آدمی نے 'الرحیق المختوم' کے ساتھ انصاف کیا ہے اور جس نے میرا حق ادا کیا ہے وہ مکتبہ بیت السلام ہے جس کے مالک علامہ احسان الٰہی ظہیر کے چھوٹے بھائی حافظ عابد الٰہی ہیں۔ وہ جب بھی میری کتاب کا نیا ایڈیشن شائع کرتے ہیں اس کے جو حقوق بنتے ہیں، جن پر میرا اور ان کا تحریری اتفاق ہے، ادا کر دیتے ہیں''۔

مذکورہ سوال صرف 'الرحیق المختوم' کے حوالے سے تھا، اس لیے مولانا نے 'الرحیق المختوم' کے حوالے سے ہی جواب دیا؛ البتہ معاملات میں سب سے زیادہ تعریف وہ مکتبہ دارالسلام کی کرتے تھے۔

یہ بات مولانا مرحوم نے مجھ سے اپنی زندگی کے آخری ایام میں کہی اور کئی بار کہی۔ مولانا کو اس بات سے بڑی تکلیف تھی کہ ناشران حضرات بغیر ان کی اجازت کے ان کی کتاب شائع کرتے ہیں۔

'الرحیق المختوم' کے جملہ حقوق مولانا مرحوم اور ان کی اولاد کے پاس محفوظ تھے، بلکہ رابطہ عالم اسلامی جس کے بین الاقوامی انعامی مقابلے میں یہ کتاب اول آئی تھی۔ وہ بھی قانوناً مولانا سے ان کی کتاب کے حقوق صرف اپنی حد تک محدود نہیں رکھ سکا۔ چونکہ رابطہ نے اخبارات و جرائد میں انعامی مقابلے کے کسی شق میں، حتی کہ اپنے اجتماع کے پروگرام میں بھی کوئی اظہار نہیں کیا تھا کہ اس مقابلے میں لکھے گئے مقالات پر اس کا حق ہوگا۔ چنانچہ مولانا نے اس کتاب پر اپنا حق برقرار رکھا

اور کسی ایک کو مکمل حق نہیں دیا۔

مرکز خدمۃ السنۃ والسیرۃ النبویۃ میں مولانا کی آمد:

'الرحیق المختوم' کی تالیف کے بعد پوری دنیا میں سیرت نبوی ﷺ کے باب میں مولانا مرحوم کو ایک اتھارٹی کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا۔ چنانچہ مملکت سعودی عرب میں علماء کی کمیٹی نے یہ طے کیا کہ ایسی عظیم شخصیت کو جس نے رسول اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ پر مقالہ لکھ کر بین الاقوامی سطح پر اول پوزیشن سے کامیابی حاصل کی ہے، رسول اکرم ﷺ کے شہر مبارک میں جگہ ملنی چاہیے تاکہ محبت رسول ﷺ سے سرشار اس عظیم ہستی کی پذیرائی کے ساتھ اس کے علم سے استفادہ کیا جاسکے اور شہر رسول سے رسول اللہ ﷺ کی پاکیزہ سیرت کی پاکیزہ تعلیمات پوری دنیا میں روشناس کرائی جاسکیں۔

چنانچہ سعودی عرب کے فرمانروائے مملکت شاہ فہد بن عبدالعزیز آل سعود رحمہ اللہ کے قائم کردہ ادارہ "مجمع الملک فهد بن عبدالعزيز لطباعة القرآن الكريم" مدینہ منورہ کے شعبہ "مركز خدمة السنة والسيرة النبوية" کی طرف سے مولانا مرحوم کو دعوت دی گئی کہ آپ اس ادارے سے منسلک ہو کر سیرت نبوی ﷺ کے بارے میں اپنی گراں قدر معلومات سے اہل دنیا کو آگاہ کرائیں اور اس ادارے کی سروس قبول فرمائیں۔

مولانا مرحوم کو جب مرکز خدمۃ السنۃ کی طرف سے سروس کی پیشکش ہوئی تو آپ نے جامعہ سلفیہ بنارس کے اساتذۂ کرام اور اپنے دیگر ساتھیوں سے رائے و مشورہ کیا۔ اس سلسلے میں آپ کے مخلص ساتھیوں کی طرف سے دو طرح کے مشورے سامنے آئے۔ ایک گروہ کا کہنا تھا کہ ہندستان کی سرزمین زرخیز ہے اور یہاں کے لوگ دعوت و تبلیغ اور اسلامی تعلیمات کے زیادہ مستحق ہیں، اور پھر یہاں کے لوگ مولانا کے علم اور ان کی شخصیت سے اچھی طرح واقف ہیں، نیز ماہنامہ محدث کے ذریعے مولانا پورے ہندستان کے مسلمانوں بالخصوص اہلحدیثوں میں اپنا مقام بنا چکے ہیں اور ایک خلقِ کثیر آپ کی باتوں پر کامل اعتماد کرتی ہے۔ اس لیے مولانا کی دعوت اور ان کے علم

سے فائدہ اٹھانے کا زیادہ حق ہندستانی مسلمان ہی رکھتے ہیں، لہٰذا مولانا کو سعودی عرب کی نوکری قبول نہ کر کے ہندستان ہی میں مسلمانوں کی خدمت کرنی چاہیے!!

دوسرے گروہ کا خیال اس کے برعکس تھا۔ ان کے خیال میں مولانا نے اپنے علم وآگہی سے ہندستان کی زرخیز مٹی میں آب آوری کی ہے، اس کی سینچائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں چھوڑا ہے، اس لیے مولانا اگر ہندستان ہی میں رہیں تو ٹھیک اور اگر مملکت سعودی عرب میں اور وہ بھی شہر رسول میں سروس کی پیشکش ہوئی ہے تو اسے قبول کرنے میں ایک طرح کا شرف ہی ہے۔

مگر دونوں گروہوں میں سے پہلے گروہ کا استدلال قوی تھا اور اسی کے حمایتی کثیر تعداد میں تھے۔ لیکن مولانا مرحوم نے اس قضیے کے مختلف زاویے پر غور وخوض کیا اور بالآخران کا فیصلہ یہی ہوا کہ مرکز خدمۃ السنۃ مدینہ کی سروس قبول کر لی جائے۔ اور یوں آپ محرم الحرام ۱۴۰۹ھ مطابق اگست 1988ء کو اس ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ آپ ہندستان سے مدینہ منورہ پہنچے۔ وہاں آپ کا خیر مقدم ہوا۔ ائیر پورٹ پر جو دو صاحبان آپ کے استقبال کے لیے آئے تھے ان میں سے ایک مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند کے موجودہ ناظم اعلیٰ مولانا اصغر علی بن امام مھدی سلفی اور دوسرے حافظ عبدالحلیم بلال پاکستانی تھے۔

یہ دونوں صاحبان سلفیت کی تبلیغ واشاعت میں بڑے معروف ہیں۔ اور سلفیت ہی کی خدمت میں ان کا شب وروز گزرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کا معاون ومددگار رہو۔ آمین۔

مرکز خدمۃ السنۃ مدینہ میں پہنچنے کے بعد مولانا مرحوم نے اسی رفتار سے کام کرنا چاہا جس رفتار سے وہ ہندستان میں کام کرنے کے عادی تھے۔ مگر یہاں پہنچ کر انہیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ غربت وافلاس اور مجبوری میں گزری ہوئی زندگی اس زندگی سے زیادہ بیش قیمت اور قابل مبارک باد ہوتی ہے جو آرام وآسائش کی گود میں گزرتی ہے۔ اسی لیے جب کوئی مولانا سے مرکز خدمۃ السنۃ میں ان کی کارکردگی کے بارے میں سوال کرتا تو اپنے مخصوص انداز میں اس کا کچھ مزاحیہ سا جواب دیتے جیسا کہ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ کے جواب میں مولانا نے کہا تھا:

"یہ ادارہ دراصل علماء کو نوازنے کے لیے وجود میں آیا ہے وغیرہ"۔

مرکز خدمۃ السنۃ مدینہ میں مولانا مرحوم نے جو علمی خدمات انجام دیں ان میں:

☆ حرمین شریفین کی انسائیکلوپیڈیا کے لیے خطے کی تیاری۔

☆ "البشارة بمحمد ﷺ عند البوذيين". (محمد ﷺ بدھسٹوں کی کتابوں میں)، "البشارة بمحمد ﷺ عند الهندوس" (محمد ﷺ ہندوؤں کی کتابوں میں) اور "البشارة بمحمد ﷺ عند الفرس" (محمد ﷺ اہل فارس کی کتابوں میں) کی تالیف کو تکمیلی شکل دینا شامل ہے۔

ان کے علاوہ بھی آپ نے کئی ایک کام انجام دیے مگر حق بات یہی ہے کہ مولانا سے جو توقعات وابستہ تھیں کہ وسائل کی فراہمی کے سبب آپ مرکز خدمۃ السنۃ میں عظیم الشان علمی و تحقیقی خدمات انجام دیں گے، وہ پوری نہ ہوئیں۔

مولانا نے کئی دفعہ یہاں اپنے تیار کردہ نئے خطے کے مطابق نئے مشروع کی تنفیذ کی کوشش کی مگر چونکہ ذمہ دار کوئی مصری تھا جس کا مزاج مملکت سعودی عرب کے علماء کی طرح خیرخواہانہ نہ تھا، اس لیے جب بھی کوئی مشروع لے کر مولانا اس کی خدمت میں حاضر ہوتے، وہ ٹال مٹول کر دیتا۔ چنانچہ مولانا نے بھی کئی ایک کوشش کے بعد اپنے مشروع کو دبا کر رکھ دیا۔ اور پھر جب دسمبر 1997ء کو آپ کا ایگریمنٹ اس مرکز سے ختم ہو گیا تو اس کے بعد مکتبہ دارالسلام ریاض چلے آئے۔

دراصل اس دور میں نہیں بلکہ شروع ہی سے قابل اور صلاحیت مند افراد کے لیے ایک المیہ ہے کہ ان کی قابلیت بھی بسا اوقات ان کی ترقی میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ وہ اس طرح کہ حاسدین ان کو آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتے، ان کی ترقی کی راہوں میں حائل ہو جاتے ہیں اور ان کی کارکردگی کو حقیر بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

دینی علوم کی ترقی کے لیے بہی خواہ حضرات وہی ہیں جو اپنے علماء کی قدر کرنا سیکھیں اور ان کے علم سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کی راہیں ہموار کریں۔ حسد اور انا کی خاطر کسی کی قابلیت کو

دبانے کی کوشش کرنا اور اس کے علم سے خلقِ کثیر کو محروم رکھنا قانوناً بھی جرم ہے اور شرعاً بھی!!

ایسی صورت میں ان لوگوں کو ہوش کے ناخن لینے چاہئیں جو کسی کی قابلیت کو ابھرنے کا موقع فراہم کرنے کی بجائے اسے دبانے کی کوشش کرتے ہیں اور خاص کر اگر دین سے ان کا تعلق ہو تب تو ان کا جرم کئی درجہ بڑھ جاتا ہے!!

مکتبہ دارالسلام میں مولانا مرحوم کی آمد:

دسمبر 1997ء میں مرکز خدمۃ السنۃ میں سے مولانا کا ایک اگریمنٹ ختم ہو گیا تو آپ کو مکتبہ دارالسلام ریاض کی طرف سے وہاں کی علمی و تحقیقی کمیٹی میں باحث و محقق اور مشرف کی حیثیت سے کام کرنے کی پیشکش ہوئی۔ چونکہ مولانا مرحوم پر سن 1994ء میں مدینہ منورہ میں پہلی بار فالج کا حملہ ہو چکا تھا اور باوجودیکہ آپ کچھ دنوں کے بعد صحت یاب ہو گئے مگر روزمرہ کے معمولات میں اس کا اثر عیاں تھا۔ لیکن آپ کا علمی و تحقیقی شغل بدستور جاری تھا۔ اس لیے دارالسلام کی مناسب پیشکش کو آپ نے انشراحِ صدر کے ساتھ قبول فرمالیا اور مرکز خدمۃ السنۃ مدینہ سے دارالسلام کے ہیڈ آفس ریاض میں علمی و تحقیقی کمیٹی کے مشرف و مسئول کی حیثیت سے منتقل ہو گئے۔

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے جس کا اظہار مناسب ہے۔ وہ یہ ہے کہ مرکز خدمۃ السنۃ سے جب مولانا کا اگریمنٹ ختم ہوا تو اس وقت تک مولانا مرحوم کا چرچا دنیا کے طول و عرض میں ہو چکا تھا۔ بالخصوص ان کی مایہ ناز تالیف 'الرحیق المختوم' کے توسط سے چہار دانگِ عالم میں ان کا ذکر خیر تھا۔ جو آدمی مولانا کو قریب سے نہیں دیکھ سکا تھا وہ عقیدت میں دور دراز ممالک سے خط و کتابت اور ٹیلیفون کے ذریعہ مولانا سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کرتا۔ مولانا سے دعاؤں کی درخواست کرتا۔ اپنی بے پناہ الفت اور قلبی لگاؤ کا اظہار کرتا تھا۔ گو مولانا ہزاروں، لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں چاہنے والوں کے دلوں میں رہتے تھے۔ مگر جب مولانا کا اگریمنٹ مرکز خدمۃ السنۃ سے ختم ہوا تو سب سے پہلا ہاتھ جو مولانا کی طرف بڑھا وہ مکتبہ دارالسلام کا ہاتھ تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ مکتبہ دارالسلام کے علاوہ کہاں کہاں سے مولانا کے لیے آفر آیا تھا، مگر اتنا ضرور ہے کہ کئی مسئولین و ذمہ

داران نے مولانا سے اپنے ہاں اشراف وسرپرستی کی ذمہ داری سونپنے کی پیشکش کی تھی۔لیکن مولانا مرحوم نے مکتبہ دارالسلام کا انتخاب کیا اور وہیں علمی وتحقیقی اور دینی کتابوں پر اشراف کرنے لگے۔ البتہ اس سے پہلے زلفی (سعودی عرب) میں چند دنوں تک کام کیا۔مگر وہ جگہ مولانا کو راس نہ آئی۔

مذکورہ باتوں کے بیان کی یہاں قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی مگر تملق وچاپلوسی جیسی گھٹیا صفات سے بالاتر اس حقیقت کا اظہار کر دینے میں کوئی تردد نہیں کہ موجودہ وقت میں اگر کسی کو اس کا صحیح مقام دینے اور کسی کی صلاحیت سے کماحقہ استفادہ کرنے کا ہنر سیکھنا ہو تو پھر اسے اسی قسم کے باذوق قدردان افراد کا اسوہ اپنانا چاہیے جنہوں نے مولانا مرحوم جیسی عظیم شخصیات کی عظمت کو بھانپ کر ان کی شایانِ شان تکریم کی، انہیں نوازا، ان کی قدر کی، انہیں فائدہ دیا اور ان سے استفادہ کیا۔ایسی باعظمت وباوقار شخصیات کے لیے سامانِ راحت بہم پہنچانا، ان کی خدمت خود کرنا اور اپنے سکریٹری سے کرانا، ان کی دیکھ بھال کرنا، ان کا ہمہ وقت خیال رکھنا، ان کے کھانے پینے کا معقول بندوبست کرنا، ان کی شایانِ شان ان سے کام لینا، ان کی عزت وتکریم کرنا، ان کی کماحقہ قدر کرنا۔یہ ایک ایسی خوبی ہے جس سے اکثر ذمہ داران نابلد ہیں۔مجھے یہ لکھتے ہوئے کوئی باک نہیں کہ مرکز خدمۃ السنۃ مدینہ کے بعد مولانا مرحوم کو اگر ان کا صحیح مقام کسی نے سمجھا تو وہ وہی لوگ ہیں، جنہوں نے مولانا کے علم وتحقیق کا سیل رواں جاری رکھنے کی خاطر ان کے لیے معتدل راہیں فراہم کیں اور ان کی قدردانی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

کسی بھی ادارے کے لیے باصلاحیت اور محنتی کارکنان ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے بغیر کوئی بھی ادارہ کامیابی وکامرانی کی راہ پر گامزن نہیں ہوسکتا۔کارکنان کی خوشیوں میں ہی ادارے کے مالک کی خوشی کا راز مضمر ہے۔جس ادارے کو قابل اور ایماندار ملازمین مہیا نہ ہوں وہ ادارہ انفرادی طور پر خواہ کتنی بھی کوشش کرے، کتنا بھی روپیہ خرچ کرے، کتنا بھی دُم مارے، کامیاب نہیں ہوسکتا۔اس کے لیے لازم ہے کہ پہلے وہ محنتی اور باصلاحیت افراد کو جمع کرے اور پھر اپنے مشروع کی تنفیذ کا پلان کرے۔اور یہ بالکل سچ اور درست ہے کہ کسی بھی ادارے کو محنتی

وقابل، لائق وفائق اور باصلاحیت افراد اُسی وقت مل سکتے ہیں جبکہ ادارے کا مالک پورے اخلاص سے ان کے ساتھ انصاف کے تقاضے کو پورا کرے۔اور محنتی ملازمین کے ساتھ انصاف کا تقاضا اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ان کے حقوق کی پامالی نہ ہو، ان کی عزت وتوقیر میں کسی قسم کی کمی نہ کی جائے۔ان کی محنت پر ہمت افزا الفاظ میں بخل سے کام نہ لیا جائے، ان کے خلاف غیبت اور حسد کا کلی طور پر بائیکاٹ کیا جائے۔گاہے بگاہے ان کے اعمال وکردار پر نظر رکھی جائے اور اپنے مشروع کی تنفیذ میں ان کا مشورہ بھی شامل کیا جائے۔

جن اداروں کے مالکان کو اپنے مذکورہ تقاضوں سے سمجھوتہ کرنا نہیں آتا تو وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی ناکامی ونامرادی کی راہ پر رواں دواں ہیں۔انہیں اپنے بعد اپنے کاموں کی پائیداری کی قطعاً امید نہیں رکھنی چاہیے۔اصول وضوابط سے مربوط اداروں کی عمر زیادہ ہونے کی توقع اسی طرح ہے جیسے کسی ٹرین کو اسٹیشن تک پہنچنے کی امید ہے جو پٹری پر جانب اسٹیشن جارہی ہے۔مگر ان اداروں کی مرادیں کیوں کر بر آئیں گی جو بے اصولی اور عدمِ ضوابط سے اپنی گاڑی اس پٹری پر کھینچنے کی کوشش کررہے ہیں جس کا اگلا حصہ ٹوٹ چکا ہے۔محنتی اور ایماندار کارکنان کے فقدان کے باعث اگلا حصہ مُتقن ومستحکم نہیں ہوسکتا!!

مذکورہ باتیں تو میں نے اس دور کے ان ذمہ داران کے نام بطور پیغام قلمبند کی ہیں جو دینی مشاریع میں لگے ہوئے ہیں تاکہ ان کے مزاج میں دینی علماء کی توقیر کا جذبہ پیدا ہو۔شاید کہ اتر جائے ان کے دل میں میری بات!!

مولانا مرحوم کو مکتبہ دارالسلام میں کم وبیش آٹھ سال بحث وتحقیق اور تصحیح ومراجعہ کا کام کرنے اور علمی وتحقیقی کاموں پر اشراف کرنے کا موقع ملا۔اس مدت میں مولانا نے دارالسلام کے لیے انتہائی اخلاص سے کام کیا۔دارالسلام نے جو توقعات ان سے وابستہ رکھی تھیں، مولانا نے ان کی توقعات پوری کیں۔چونکہ مولانا مرحوم جو کام بھی کرتے اس میں اِتقان اور حسن کے ساتھ ساتھ اخلاص اور محبت کا عنصر غالب رہتا، اس لیے ان کاموں کی پذیرائی بہت جلد ہو جاتی۔کوئی بھی نیا کام ہوتا اس

کا مولانا مرحوم مراجعہ کر دیتے یا اس کا اشراف فرما دیتے تو پھر اس کی اہمیت دوبالا ہو جاتی اور اس میں چار چاند لگ جاتا۔

مکتبہ دارالسلام دنیا کی مختلف معروف اور زندہ زبانوں میں دینی کتابوں کی نشر واشاعت میں اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ ہے۔ دنیا بھر میں مختلف زبانوں میں دینی کتابیں شائع کرنے والا یہ واحد بین الاقوامی ادارہ ہے جس کا معیار اب ایک زندہ جاوید حقیقت بن چکا ہے۔ اس کی کتابیں جہاں ظاہری زیب وزینت کی حامل ہوتی ہیں وہیں اندرونی مواد کے اعتبار سے بھی ایک مرجع اور اتھارٹی ہوا کرتی ہیں۔ مولانا مرحوم کے قلم کو امت مسلمہ کے لیے جنبش دینے میں جو دارالسلام کا کردار ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ مولانا مرحوم نے مکتبہ دارالسلام میں رہ کر دینی وعلمی تحقیق میں جو کام بھی کیا، دارالسلام نے بھی ان کا دل کھول کر ساتھ دیا اور مولانا کی شایانِ شان ان کی پذیرائی کی۔ مادی ومعنوی اعتبار سے مولانا کو کبھی دارالسلام سے شکوہ نہ ہوا، بلکہ مولانا صاحب بسا اوقات اپنی نجی محفلوں میں کہا کرتے تھے:

> ''اس ادارے نے جو وعدہ مجھ سے کیا تھا، مکمل کیا۔ اور سروس میں اب تک مجھے جو تجربہ ہوا ہے میرے نزدیک یہ وہ واحد ادارہ ہے جو میرے معیار پر پورا اترا...... وغیرہ''۔

ان باتوں کو قلمزد کرتے ہوئے میں نے اپنے کئی ساتھیوں سے اس سلسلے میں استفسار کیا اور انتہائی ذمہ داری کی بنیاد پر میں نے یہ باتیں سپردِ قلم کی ہیں۔

میں انتہائی محبت واخلاص کے ساتھ ان تمام اداروں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں جنھوں نے مولانا مرحوم کے علم وتحقیق سے محبانِ علم ودین کو استفادہ کرنے کا موقع فراہم کیا اور ساتھ ہی انتہائی افسوس اور ادب کے ساتھ ان ذمہ داران سے گزارش کرتا ہوں کہ مولانا مرحوم اور ان جیسی دیگر عظیم شخصیات کی قدر دانی اور عزت واکرام ان سے سیکھیں جنھوں نے ایسی عظیم شخصیات کی قدر کی، ان کو فائدہ دیا اور ان سے استفادہ کیا!!

جو آدمی کسی کی ترقی کو ترقی نہیں کہتا، کسی کی صلاحیت تسلیم نہیں کرتا، کسی کی قابلیت نہیں مانتا، وہ

تکبر وغرور کی ایسی وادی میں ہے جس میں ذلت ورسوائی کے سوا کچھ نہیں!!

مولانا مرحوم کے اوصاف:

مولانا مرحوم کو جس نے دیکھا ہے اسے اچھی طرح معلوم ہوگا کہ علم جس قدر بھاری تھا، مولانا جسمانی اعتبار سے بھی ایک بارعب شخصیت لگتے تھے۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ نور چمکتا رہتا۔ گول پررونق چہرہ، گندمی رنگ، متوسط قد، گول چہرے پر خوبصورت اور گھنی سفید داڑھی، اونچی ناک، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، چوڑا چکلا سینہ، گٹھیلا بدن، چہرے پر تبسم کا ہمیشہ اظہار۔

یہ مولانا کی شخصی بناوٹ تھی۔ میں نے جن دنوں مولانا کو دیکھا تھا۔ آپ کی داڑھی اور سر کے سارے بال ماسوائے چند کے سفید ہو چکے تھے۔ سر پر گول اور سفید ٹوپی رکھتے، سعودی عرب کا معروف لباس جبہ پہنتے، جس کو یہاں ثوب کہا جاتا ہے اور تارکین وطن لوگوں نے اسے بگاڑ کر 'توپ' کا نام دے دیا ہے۔ ازار بند کے طور پر مئو اور بنارس والوں کی طرح سفید لنگی کا استعمال کرتے۔

یہ تو مولانا مرحوم کی جسمانی بناوٹ اور اس کے اوصاف تھے۔ مگر ان کے اندر جو خصوصیات نمایاں تھیں وہ ان کی عظیم ہستی کو مزید نکھارتی ہیں۔ مولانا مرحوم علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے اوصاف نمایاں بھی اپنے اندر سموئے ہوئے تھے کہ دوسروں کے مقابلے میں ان کی شخصیت نکھر کر سامنے آتی تھی۔ مولانا مرحوم کی ساری خصوصیات اور ان کے جملہ اوصاف حمیدہ بیان کرنے کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔ اس لیے میں نے مولانا مرحوم کے چند ہی اوصاف، جنھیں بیان کرنا میں نے مناسب سمجھا ہے، آگے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

مولانا متواضع وخاکسار تھے:

تواضع وخاکساری ایک ایسی عظیم صفت ہے جس کو دنیا کے ہر مذہب نے سراہا ہے۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ کے مطابق جو مومن بندہ اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے درجات بلند کرتے ہیں اور اس کی نیک نامی ہوتی ہے۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔

"وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ".

"جوکوئی اللہ کی خاطر تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ اسے بلندی عطا فرماتے ہیں"(1)۔

مولانا کو جس کسی نے دیکھا ہے اسے یہ بات قبول کرنے میں ذرا بھی جھجک نہ ہوگا کہ مولانا اپنے کلام سے بھی متواضع ومنکسر المزاج تھے اور اپنے انداز سے بھی۔ آپ کی چال میں بھی تواضع تھی اور بات سے بھی آپ کی تواضع کا اظہار ہوتا تھا۔

میں نے بہت سارے علماء کو دیکھا اور ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ مگر اکثر کی حالت یہ ہے کہ وہ تواضع کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں بلکہ اگر کوئی حق بات ان کے سامنے کہہ دے تو گویا ان کی شان میں گستاخی ہوتی ہے۔ مگر مولانا ان جیسے علماء سے الگ مزاج رکھتے تھے۔ مولانا کی تواضع وخاکساری کی ایک مثال دیکھیے کہ ایک مرتبہ ایامِ رمضان میں ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد آفس سے اپنے داماد کے گھر جارہے تھے۔ مولانا میری گاڑی پر سوار تھے۔ عصر کا وقت قریب تھا، مجھے عصر کی نماز ایک جگہ پڑھ کر ایک صاحب سے ملاقات کرنی تھی۔ میں نے مولانا سے گذارش کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کا وقت استعمال کرلوں اور فلاں جگہ اپنے مطلوبہ شخص سے ملنے چلوں۔ مولانا نے انتہائی شرحِ صدر کے ساتھ کہا: کوئی حرج نہیں۔ جبکہ آفس سے مولانا کے داماد کا گھر بہت قریب تھا اور مجھے دور جانا تھا۔ چنانچہ میں مولانا کے ساتھ جائے مطلوبہ پر گیا اور مولانا نے میرے ساتھ کافی دیر تک گاڑی میں بیٹھنے کی زحمت کی۔ اس سے مولانا کی تواضع وانکساری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

دراصل مولانا مرحوم تواضع وخاکساری کی اہمیت جانتے تھے۔ انھیں خوب اچھی طرح معلوم تھا کہ تواضع ہی ایک ایسی عظیم صفت ہے جس سے انسان اخلاق وکردار کی بلندیوں کا سیر کرسکتا ہے۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے سعادت وکامرانی اور فلاح وبہبودی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مِنْ عَلَامَاتِ السَّعَادَةِ وَالْفَلَاحِ أَنَّ الْعَبْدَ كُلَّمَا زِيدَ فِي عِلْمِهِ زِيدَ فِي تَوَاضُعِهِ وَرَحْمَتِهِ، وَكُلَّمَا زِيدَ فِي عَمَلِهِ زِيدَ فِي خَوْفِهِ وَحَذَرِهِ، وَكُلَّمَا زِيدَ

(1) مسلم: 2588۔

فِي عُمُرِهِ نَقَصَ مِنْ حِرْصِهِ، وَكُلَّمَا زِيدَ فِي مَالِهِ زِيدَ فِي سَخَائِهِ وَبَذْلِهِ، وَكُلَّمَا زِيدَ فِي قَدْرِهِ وَجَاهِهِ زِيدَ فِي قُرْبِهِ مِنَ النَّاسِ وَقَضَاءِ حَوَائِجِهِمْ وَالتَّوَاضُعِ لَهُمْ".

"سعادت وکامرانی کی علامت میں سے یہ ہے کہ جب کسی بندے کے علم میں اضافہ ہوتا ہے تو اس کی تواضع اور رحمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور جب اس کا عمل زیادہ ہوتا ہے تو اس کے خوف الٰہی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور جب اس کی عمر بڑھتی ہے تو اس کا حرص کم ہوتا ہے۔ اور جب اس کے مال میں اضافہ ہوتا ہے تو اس کی سخاوت کا ہاتھ مزید لمبا ہو جاتا ہے۔ اور عزت وجاہ میں اضافہ ہوتا ہے تو لوگوں سے وہ زیادہ قریب ہو جاتا ہے، ان کی ضروریات پوری کرتا ہے اور ان کے ساتھ نرمی اختیار کرتا ہے"۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کے مذکورہ کلام کی سچی تعبیر تھے۔ اس کے برعکس کبر وغرور جیسی صفات مولانا سے کوسوں دور تھیں۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اسی کے آگے لکھا ہے:

"وَمِنْ عَلَامَاتِ الشَّقَاوَةِ أَنَّهُ كُلَّمَا زِيدَ فِي عَمَلِهِ زِيدَ فِي فَخْرِهِ وَاحْتِقَارِهِ لِلنَّاسِ وَحُسْنِ ظَنِّهِ بِنَفْسِهِ، وَكُلَّمَا زِيدَ فِي عُمُرِهِ زِيدَ فِي حِرْصِهِ، وَكُلَّمَا زِيدَ فِي قَدْرِهِ وَجَاهِهِ زِيدَ فِي كِبْرِهِ وَتِيهِهِ".

"اور شقاوت وبدبختی کی علامت یہ ہے کہ جب کسی بندے کا علم بڑھتا ہے تو وہ فخر کرنے لگتا ہے، لوگوں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے، اپنے بارے میں اچھا گمان کرنے لگتا ہے۔ اور جوں جوں اس کی عمر ڈھلتی جاتی ہے اس کے حرص ولالچ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اور جب اس کی عزت وجاہ میں اضافہ ہوتا ہے تو اس کے تکبر وغرور اور اس کی گمراہی بھی بڑھتی جاتی ہے"۔

مولانا مرحوم اس قبیح صفت سے کوسوں دور تھے۔

مولانا مرحوم ماحول کو خوشگوار رکھتے تھے:

مولانا مرحوم کی ایک عظیم خوبی یہ تھی کہ وہ دوران ڈیوٹی بھی اور فارغ کے اوقات میں بھی حاضرین مجلس کو گاہے بگاہے لطیفے اور چٹکلے سنا کر ماحول کو خوشگوار رکھتے تھے۔ مکتبہ دارالسلام ریاض

میں جن ساتھیوں نے مولانا کے ساتھ کام کیا ہے، انہوں نے بتلایا کہ جب شیخ کے ساتھ ہم لوگ کام میں مگن ہوتے تو گھنٹہ آدھ گھنٹہ کا وقفہ گزرنے کے بعد مولانا کی آواز فضا میں گونجتی:

''سکوتِ مرگ چھا رہا ہے۔ کچھ بات ہونی چاہیے''۔

اور پھر مولانا کوئی واقعہ یا لطیفہ وغیرہ سنا ڈالتے۔

یہ مولانا کی خوش مزاجی اور ظرافت تھی کہ اتنے عظیم آدمی ہونے کے باوجود خود کو نمایاں ظاہر کرنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ جن لوگوں کو مولانا کی مجالس میں کبھی بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے انہیں اس بات کا ضرور اندازہ ہوگا۔ مولانا کی حاضر دماغی کی داد دینی چاہیے کہ ہر وقت کوئی واقعہ یا لطیفہ سنا کر مجلس میں خوشی کی لہر دوڑا دیتے تھے!!

مولانا مرحوم ایک ظریف انسان تھے:

مولانا مرحوم کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ بسا اوقات لطیف سا مذاق بھی کر لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ہمارے سیکشن کے باحث و محقق جناب حافظ عبدالمتین راشدی حفظہ اللہ نے مولانا سے دفتر میں دریافت فرمایا:

مولانا! کیا میں آپ کی خدمت میں چائے کا آرڈر کروں؟

چونکہ حافظ صاحب چائے پینے کے حق میں نہیں ہیں اور چائے کے بارے میں ان کا نظریہ عام لوگوں سے مختلف ہے، اس لیے وہ کبھی چائے نوشی نہیں کرتے۔ مولانا مرحوم نے ان کی زبانی چائے کی فرمائش سن کر فرمایا:

''جس چیز کو آپ اپنے لیے پسند نہیں کرتے دوسروں کے لیے کیوں پسند کرتے ہیں؟ چائے آپ خود نہیں پیتے، پلاتے کیوں ہیں؟!''۔

مولانا کا اشارہ اس حدیث کی طرف تھا جس میں رسول اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

''لا يُؤمِنُ أَحَدُكُم حَتّٰى يُحِبَّ لأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ''.

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے

وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے“(1)۔

اس قسم کا مذاق کرتے وقت مولانا کے چہرے پر خوش نما تبسم ہوتا جو آج بھی میری نگاہ کے سامنے جھلک رہا ہے۔اس ایک واقعہ سے مولانا مرحوم کی ظرافت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔مولانا ان لوگوں سے یکسر مختلف تھے جو علم دین پڑھ کر جب کچھ نام ونمود حاصل کر لیتے ہیں اور لوگوں میں ان کا ذکر ہونے لگتا ہے تو وہ خود کو عوام سے الگ تھلگ کر لیتے ہیں۔مولانا کا مزاج ان سے بالکل الگ تھا،وہ سماج میں مل جل کر ان کے ساتھ رہتے تھے۔

مولانا مرحوم سفارش کے معاملے میں اعلیٰ مزاج رکھتے تھے:

میں نے مولانا مرحوم کو دیکھا کہ وہ سفارش کے جو اصول ہیں ان کو مدنظر رکھتے ہوئے سفارش کے لیے آنے والے کے لیے سفارش کرنے میں پس وپیش نہیں کرتے تھے۔اگر کوئی صاحب مدرسہ یا مسجد یا شخصی سفارش کے لیے آتا اور مولانا کو اپنے تزکیات اور معروف لوگوں کے سفارشی خطوط دکھلاتا تو آپ ان کی بنیاد پر اس کے لیے سفارشی لیٹر جاری کر دیا کرتے تھے۔جب آپ پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا اور عمر کے آخری ایام میں تھے تب بھی میں نے دیکھا کہ آپ اپنے نام کی مہر اپنی جیب میں رکھا کرتے تھے اور اپنے لیٹر پیڈ پر سفارش کتابت کروا کے ایک خاص انداز سے جیب سے مہر نکالتے جسے دیکھ کر ہم دوست بڑا محظوظ ہوا کرتے اور ہمیں ہنسی بھی آتی۔

آخری مرتبہ جب مولانا سعودی عرب تشریف لائے تو صیہ وتزکیہ کے لیے آنے والوں کے لیے بالعموم مضمون میں ہی بناتا تھا اور مولانا اسے پڑھ کر قابلِ اصلاح مقامات کی اصلاح فرما دیتے تھے۔پھر مولانا اس پر دستخط کر کے اپنی مہر ثبت کر دیتے تھے۔کئی دفعہ ایسا ہوا کہ بعض لوگ مولانا کی خدمت میں بڑی عقیدت سے تزکیہ لکھوانے آئے مگر مولانا نے انکار کر دیا۔میں نے جب مولانا سے ان کا تزکیہ کیا تو پھر انھوں نے آنے والے کے لیے تزکیہ جاری کر دیا۔یہ مولانا کی بڑی خوبی تھی۔تزکیہ وتوصیہ جاری کرنے میں مولانا ان لوگوں کی طرح کنجوس اور بخیل نہ تھے جو اپنا سفارشی

(1) بخاری:13۔

لیٹر کسی کو دینے میں ہچکچاتے ہیں۔

رسول اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

"اِشْفَعُوا تُؤْجَرُوا".

''سفارش کرو اور اجر و ثواب پاؤ''(1)۔

مولانا مرحوم اس حدیث کی سچی تعبیر تھے۔ میں نے بہت سے علماء کو دیکھا ہے جو سفارش کے معاملے میں بہت محتاط رہا کرتے ہیں۔ جب کوئی ان کی خدمت میں سفارش کے لیے پہنچتا ہے تو اس کے جذبات کی قدر نہیں کرتے اور سفارش کرنے سے باز رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ خود کسی کی سفارش ہی کے بل بوتے پر کچھ نام و نمود حاصل کیے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ رحمتِ الٰہی کو صرف اپنے لیے خاص کرنے والوں کی فہرست میں ہیں۔ ایسے لوگوں کو اپنی حقیقت کی طرف بھی دیکھنی چاہیے کہ پہلے وہ کیا تھے اور اب کیا ہیں۔ آخر شروع میں ان کے لیے بھی تو کسی نے سفارش کی ہوگی یا سفارش کا لیٹر لکھا ہوگا؟! مگر ایسوں کو سمجھائے کون جو مروت بھلا بیٹھے ہیں!!

مولانا مرحوم ہمت افزائی میں بڑے فراخ دل تھے:

مولانا مرحوم کی جہاں بے شمار خوبیاں تھیں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ آپ کسی کی ہمت افزائی میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ نئے لکھنے والوں کی خواہش یہ رہتی ہے کہ کوئی قابل عالم اس کی تالیف پر تقدیم یا تاثر لکھ دے جس کی وجہ سے اس کی کتاب کی اہمیت واضح ہو جائے۔ مگر بڑے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ اکثر لوگ ایسے موقع پر کسی کی ہمت افزائی کی بجائے اس کی دل شکنی کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر ان کو دین اور شریعت سے محبت ہوتی اور کوئی دینی کتاب لکھنے والا ان کے پاس اپنی تحریر لے کر حاضر ہوتا تو ان کو چاہیے تھا کہ وہ اس طالب علم کی ہمت افزائی کرتے اور اس کی تحریر کی اصلاح کرتے۔

میں نے مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ کی خدمت میں ایک مرتبہ اپنی کتاب ''غیرت کا فقدان

(1) بخاری:1432 و مسلم:2627۔

اور اس کا علاج'' کے دوسرے ایڈیشن کے لیے تاثرات کے چند کلمات لکھنے کی گزارش کی تو آپ نے فرمایا:

''کتاب کا ایک نسخہ مجھے دے دیں، میں اس کے مطالعہ کے بعد اس پر کچھ لکھ دوں گا''۔

میں نے ایک نسخہ مولانا کے حوالے کر دیا۔ چند دنوں بعد مولانا نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا:

''کاغذ قلم بھی اپنے ساتھ لائیں''۔

اور پھر مولانا نے کتاب کے بارے میں اپنا بہترین تاثر لکھوا دیا۔ جو دوسرے اور تیسرے ایڈیشن میں شائع ہو چکا ہے۔ نیز مولانا نے میری کتاب ''رسول اکرم ﷺ کا طرز عمل کس کے ساتھ کیسا؟'' پر بھی تاثر لکھا ہے۔

اللہ جزائے خیر دے مولانا کو، کہ انہوں نے میری ایک ہی مرتبہ کی گزارش قبول فرمالی اور میری ہمت افزائی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مجھے اس سے بہت خوشی ہوئی۔ کیونکہ میری کتاب کے بارے میں یہ تاثر ایک ایسے عالم دین کا تھا جو بین الاقوامی سطح پر اپنی مثال آپ تھا۔ اور پھر ایسی ہستی کا تاثر، جو کہ پوری دنیا میں معروف ومشہور تھی، میرے لیے واقعی خوشی کا باعث ہونا بھی چاہیے تھا۔ مجھے اس موقع پر میرے ماضی کا ایک دن یاد آ گیا جو کہ میری زندگی کا ایک تاریخی دن ہے اور انتہائی افسوسناک بھی!!

میں نے اپنی اس کتاب (غیرت کا فقدان اور اس کا علاج) کو ایک عالمِ دین کی خدمت میں پیش کر کے گزارش کی تھی کہ آپ اس بارے میں چند الفاظ تاثر کے لکھ دیں۔ چونکہ میں جس عالم کی خدمت میں اپنی کتاب کا مسوّدہ تقدیم یا تاثر کے لیے پیش کیا تھا، اس کا ایک گونہ میرے اوپر کسی تعلق سے احسان بھی تھا، اس لیے میری خواہش تھی کہ اس سے اپنی کتاب پر کچھ لکھوالوں۔ حالانکہ مجھے اس سے قبل احساس تھا کہ وہ صاحب اتنا فراخدل نہیں ہیں کہ کسی کے بارے میں کچھ ہی سہی تعریفی کلمات کہہ دیں۔ غرض جب میں نے اپنی کتاب کا مسودہ ان کو دیا تو انہوں نے کہا: میں پڑھوں گا اور پھر لکھوں گا۔ میں ان کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ دو تین ہفتہ بعد میں نے ان کے پاس

فون کیا اور پوچھا: مولانا صاحب! میری کتاب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیسی لگی؟ کیا اس لائق ہے کہ عوام الناس کی خدمت میں اسے پیش کیا جائے؟ وہ صاحب کہنے لگے: واللہ! تمہاری کتاب میری ٹیبل پر رکھی ہوئی ہے، میں نے مختلف جگہوں سے دیکھا ہے، مگر میں اس کتاب کو اپنے مکتبہ سے شائع نہیں کروں گا۔ میں نے کہا: مولانا صاحب! میں نے یہ نہیں کہا ہے کہ آپ میری کتاب اپنے مکتبہ سے شائع کریں بلکہ میں نے تو اتنا کہا ہے کہ آپ میری کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات کے چند کلمات لکھ دیں۔ کہنے لگے: یار رضوان! کیا لکھوں، تعریف لکھوں یا......؟! میں نے کہا: وہی لکھیں جو کتاب میں ہے۔ کہنے لگے: کسی اور سے لکھوالو۔ چنانچہ میں نے اپنے دو اساتذۂ کرام کی خدمت میں اس کا مسودہ بھیجا۔ وہ دونوں لکھ کر بھیج دیے۔ سچ فرمایا تھا ایک مرتبہ میرے استاذ گرامی جناب مولانا عبدالصمد جعفری عمری رحمہ اللہ نے کہ

''کسی کی ترقی سے حقیقی خوشی دو آدمی کو ہی ہوتی ہے، ایک حقیقی ماں باپ کو اور دوسرے روحانی ماں باپ کو، یعنی اساتذہ کو''۔

اس کے بعد لطف کی بات ہے، وہ بھی سنیں۔ میری کتاب کا پہلا ایڈیشن ڈاکٹر عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی (استاد حدیث امام محمد بن سعود یونیورسٹی، ریاض) نے اپنے قائم کردہ ادارہ دارالدعوہ دہلی سے اپریل 2003ء میں شائع کر دیا اور جب میں نے ایک نسخہ کتاب لا کر مذکورہ صاحب کو دی (جس سے میں نے تاثر لکھنے کی گزارش کی تھی) تو انھوں نے کہا: اف! کتاب کے شایانِ شان ٹائٹل نہیں ہے۔ پھر وہ میری کتاب ساتھ لے گئے اور دو چار روز کے بعد مجھے اپنے آفس میں بلوایا اور کہنے لگے:

''رضوان! میں نے تمہاری کتاب ''غیرت کا فقدان اور اس کا علاج'' کا مختلف مقامات سے مطالعہ کیا ہے۔ ماشاء اللہ مواد تم نے بہت اچھا اکٹھا کیا ہے اور یہ کتاب عوام کے لیے مفید ہے۔ مگر اس کا ٹائٹل اچھا نہیں بنا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے ادارے سے اس کو خوبصورت ٹائٹل اور عمدہ طباعت کے ساتھ شائع کروں۔ اگر تم اجازت دو تو اس کو چھپوا کر

صرف ایک ہفتہ کے اندر مارکیٹ میں اتروا دوں!......"۔

قارئین کو معلوم ہوگا کہ یہ کلام انہیں صاحب کا ہے جنہوں نے میری کتاب پر چند کلمات لکھنے سے انکار کیا تھا اور اس کے بارے میں دوسروں سے ایسے نازیبا الفاظ بھی کہے تھے جن سے ایک مؤلف کی دل شکنی ہوتی ہے۔ مگر آج کتاب چھپنے کے بعد وہی صاحب اپنے مکتبہ سے اسے شائع کرنے کو کہہ رہے تھے!!

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا میں کسی کا فائدہ چاہنے والے لوگ کتنے ہیں؟!!

اللہ جزائے خیر دے مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ کو جنہوں نے میری ایک پر میری دو تین کتابوں پر اپنا تاثر لکھ کر میری ہمت افزائی فرمائی۔ میں اس موقع پر ان حضرات سے بھی گزارش کروں گا جن کو اللہ تعالیٰ نے کچھ علم وفن سے نوازا ہے، کہ اگر کوئی طالب علم بطور تشجیع کچھ لکھوانا چاہے تو اس سلسلہ میں بخل سے کام نہ لیں بلکہ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ کی طرح فراخدلی کا مظاہرہ کریں۔

مولانا مرحوم حق بات بلا چون و چرا قبول کرتے تھے:

علمائے حق کا یہ شیوہ رہا ہے کہ اگر کبھی ان سے اجتہادی غلطی ہو جاتی ہے، یا بھول چوک میں ان کی زبان سے کوئی غلط مسئلہ صادر ہو جاتا ہے اور جب ان کے سامنے قرآن وسنت سے دلائل پیش کیے جاتے ہیں تو بلا چون و چرا اپنی بات سے رجوع کر لیتے ہیں اور جو آدمی ان کی اجتہادی غلطی کی نشاندہی کرتا ہے اس کا شکریہ بھی ادا کرتے ہیں۔ ایسے موقع پر علمائے کرام کا اپنی غلطی تسلیم کر لینا اور مضبوط دلیل کے آگے اپنی کمزور دلیل سے رجوع کر لینا ان کی عظیم خوبی سمجھی جاتی ہے۔ اسلاف میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود تھی۔

مگر آج کے دور میں علمائے کرام کے اندر یہ صفت کم ہی پائی جاتی ہے۔ میں ایک عالم دین کے درس میں بیٹھا اس کا درس سن رہا تھا۔ درس کے اختتام پر ایک صاحب نے اس سے پوچھا: مولانا صاحب! ذرا مجھے یہ مسئلہ بتلائیں گے کہ داڑھی میں کالی خضاب لگانے کا شرعاً حکم کیا ہے اور کیا رسول اکرم ﷺ کی حدیث میں اس کی صریح دلیل موجود ہے؟

مولانا صاحب کی داڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے اور بڑھاپا چھپانے کے لیے داڑھی میں قینچی سے سیٹنگ سائنگ کے ساتھ کالی خضاب بھی لگاتے تھے۔ انہوں نے جب یہ سوال سنا تو جواب دینے کی بجائے بھڑک اٹھے۔ پھر کہنے لگے: حدیث میں جو کالی خضاب لگانے کی بات آئی ہے تو وہ حدیث ہی ضعیف ہے۔ حالانکہ یہ روایت صحیح مسلم کی ہے۔ مگر وہ عالمِ دین اپنی بات پر اڑا رہا اور الٹی سیدھی باتیں بنانے لگا۔

ایسے لوگ بھی امت کے علمائے کرام کی صف میں اپنا شمار کرتے ہیں جو الٹا سیدھا مسئلہ لوگوں کو بتلاتے ہیں اور کوئی حق بات کہہ دے تو ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتے۔ ایسے لوگوں کو عالم کہنے کی بجائے متکبر کہنا چاہیے۔

اللہ جزائے خیر دے مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ کو۔ اگر مولانا کچھ تحریر کرتے یا اپنی تقریر میں کوئی بات کہتے اور ان سے کوئی اجتہادی غلطی سرزد ہو جاتی تو غلطی کی نشاندہی کرنے والے کی دلیل فوراً مان لیتے، اسے دعائیں بھی دیتے تھے اور اس کی تشجیع بھی فرماتے تھے۔ اس کی ایک مثال جناب غازی عزیر صاحب کے مضمون میں بھی ہے۔ جب انہوں نے مولانا کی اجتہادی غلطی کی نشاندہی کی تو مولانا مرحوم نے نہایت فراخدلی سے قبول کیا اور ان کی تعریف بھی کی۔

اے کاش! آج علمائے کرام بھی مولانا مرحوم کی اس عظیم خصوصیت کو اپنے اندر نافذ کرنے کی کوشش کرتے!!

مولانا مرحوم جہادِ اسلامی کے زبردست حامی تھے:

جب کفر والحاد کی طاغوتی طاقتیں مسلمانوں کے حقوق پامال کریں۔ انھی کی زمین میں ان کا جینا دوبھر کر دیں۔ فساد فی الارض کے اصول اپنائیں۔ مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھائیں۔ ان کے دین وعقیدہ پر حملہ کریں اور ان کے وجود کو ختم کرنے کی کوشش کریں تو پھر اسلام نے مسلمانوں کو اجازت دی ہے کہ جوابی کارروائی کے طور پر ان کا ڈٹ کر مقابلہ کریں، جس کو جہاد کا نام دیا گیا ہے۔ جہادِ اسلامی سے زمین پر فتنہ وفساد کی بجائے امن وامان کا غلبہ ہوگا۔ مظلومین کو ظالموں

کے پنجے سے آزادی ملے گی۔ کمزور ولاچار لوگوں کو ان کے حقوق ملیں گے۔ زمین کے سارے باشندگان پیار ومحبت کی سانس لے سکیں گے۔ اگر جہاد کا تصور ختم ہو جائے تو پھر زمین میں فتنہ وفساد کا راج ہوگا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مسلمان کو جہاد اسلامی کا جھنڈا اٹھانے کے لیے تیار رہنے کی ترغیب دی ہے۔ چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

"مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ، وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهِ نَفْسَهُ،مَاتَ عَلَى شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقٍ"

''جس نے جہاد نہیں کیا اور نہ ہی اس کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا اور پھر مر گیا تو اس کی موت نفاق پر ہوئی''(1)۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری کا نظریۂ جہاد بھی عین اسلام کے مطابق تھا۔ آپ نے جہادِ اسلامی کے تصور کو مسخ نہ ہونے دیا۔ دیگر علمائے کرام کی طرح جہاد کی غلط تعبیر نہیں کی؛ بلکہ جہاد کی تائید کی اور مکمل حمایت بھی کی۔ علمائے ربانی کا یہ شیوہ رہا ہے کہ وہ کبھی حکومت کے خوف سے حق بات کہنے سے دریغ نہیں کرتے۔ چنانچہ مولانا بھی جہاد کے بارے میں حق بات کے اظہار میں علمائے سلف کا ایک نمونہ تھے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے عنفوانِ شباب میں جہاد کی جو تعبیر کی اور جہاد کے موضوع پر "الجہاد فی الاسلام" جیسی مایہ ناز کتاب لکھ کر جوامتِ اسلامیہ میں تحریک پیدا کی، مولانا مرحوم کی خدمات بھی اس سلسلہ میں کچھ کم نہیں۔ مولانا کی کتاب ''قادیانیت اپنے آئینے میں'' وقت کا عظیم جہاد شمار ہوگی۔ مولانا نے انتہائی بے باکی کے ساتھ قلم کو جنبش دی ہے اور دنیائے قادیانیت کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔

مولانا کو تیر وتفنگ اور تیغ وسنان کے ساتھ جہاد کرنے کا موقع نہیں ملا مگر انہوں نے دنیا کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے مجاہدینِ اسلام کی تائید میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اللہ کے حکم ﴿ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ کے مطابق جہاد میں حصہ ڈالا۔ یہ مولانا کی کمال ہمت اور جوانمردی تھی۔

بعض لوگ مولانا کے نظریۂ جہاد سے اختلاف رکھتے ہیں اور ان کے بارے میں لب کشائی

---

(1) مسلم:1910۔

کرتے ہیں۔ مگر ان کے اختلاف میں کچھ دَم نہیں۔ کیونکہ مولانا نے اس سلسلے میں جو حق سمجھا اس کی تائید وحمایت میں جس قدر ممکن ہو سکا، حصہ ڈالا۔ اگر اس سلسلے میں مولانا سے اجتہادی خطا ہوئی تو یہ ان کا اجتہاد تھا اور خطا کسی سے بعید نہیں۔ البتہ جو لوگ اِس زمانے میں جہاد کی جو غلط تعبیر کرتے ہیں ان کے نظریہ سے مولانا مرحوم کا نظریہ ضرور مختلف تھا، اور اہلِ حق کو اس سے اختلاف ہونا بھی چاہیے۔

اگر صحیح معنوں میں کوئی جماعت قرآن وسنت کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق جہاد کا علَم بلند کرتی ہے تو سارے ہی مسلمانوں کے اوپر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس جماعت کے لیے دامے درمے سخنے تعاون پیش کریں، اس کی ہر طرح سے تائید کریں، جتنا ہو سکے اس کے ساتھ اپنا بھی حصہ ڈالیں۔ اور اگر کوئی ایسے موقع پر منافقت کرتا ہے اور اس جماعت کی تائید کے بجائے دشمنوں کے ہاں میں ہاں ملاتا ہے تو وہ سچا مسلمان نہیں اور جہادِ اسلامی کی حقیقت اس نے ہرگز نہیں سمجھا!!

مولانا مرحوم دینی معاملے میں بڑا غیرت مند تھے:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری زندگی میں اپنی ذات کے لیے کبھی بھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ دینی شعائر کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، یا حدودِ الٰہیہ سے کھلواڑ کیا جا رہا ہے تو پھر آپ نے حرمات کی پامالی پر اللہ کے لیے انتقام لیا۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں ہے:

"مَا خُيِّرَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ أَمْرَيْنِ إِلَّا أَخَذَ أَيْسَرَهُمَا مَا لَمْ يَكُنْ إِثْمًا، فَإِنْ كَانَ إِثْمًا كَانَ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنْهُ، وَمَا انْتَقَمَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِنَفْسِهِ، إِلَّا أَنْ تُنْتَهَكَ حُرْمَةُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ".

''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی کسی دو معاملے میں اختیار دیا گیا تو آپ نے ان میں سے جو آسان ہوتا اسی کو انتخاب فرماتے، بشرطیکہ وہ گناہ کا کام نہ ہو۔ اگر وہ گناہ کا کام ہوتا تو آپ سارے لوگوں سے زیادہ گناہ سے بچنے والے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے لیے کبھی بھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ ہاں! اگر اللہ کی حرمت کو پامال کیا جاتا تو ایسی

صورت میں آپ اللہ کے لیے انتقام لیتے تھے‘‘(1)۔

رسول اکرم ﷺ کے بعد ہر دور میں آپ کی امت میں بھی ایسے افراد بکثرت پائے گئے جنھوں نے حرمات کی پامالی پر شدید غیرت کا اظہار کیا اور کرتے رہیں گے۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ ایک باوقار عالمِ دین تھے۔ سنجیدگی ومتانت ان کے جملہ اعمال وافعال سے عیاں تھی۔ انھوں نے اپنی ذات اور اَنا کے لیے کبھی بھی کسی سے انتقام نہیں لیا؛ بلکہ دشمنوں کو بھی معاف کر دینا ان کی عادت تھی۔ مگر جہاں دین وشریعت کی بات ہوتی، آپ اس سلسلے میں کسی طرح کی لچک برداشت نہیں فرماتے تھے۔ اور یہی علماء کا شیوہ رہا ہے کہ اپنی ذات پر کسی بھی قسم کے حملے تو برداشت کر لیتے ہیں مگر اسلام اور شانِ اسلام پر کسی قسم کا قدغن عائد نہیں ہونے دیتے۔ ایک دفعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے آڈیٹوریم میں کسی مناسبت سے آپ کا پروگرام رکھا گیا تھا، جس میں وہاں کے وائس چانسلر بھی موجود تھے۔ ان دنوں آپ کے بڑے صاحبزادے جامعہ سلفیہ بنارس سے فراغت کے بعد وہیں زیرِ تعلیم تھے۔ آپ کو جو موضوع ملا تھا، بہت ہی سنجیدگی اور خوبصورتی کے ساتھ اپنا بیان فرمایا۔ سامعین نے آپ کے پروگرام کو بہت سراہا۔

چونکہ مولانا مرحوم کو اس وقت ایک بین الاقوامی شہرت مل چکی تھی اور عقیدتمندوں کی تعداد علی گڑھ میں بھی کافی تھی۔ طلبہ اور طالبات نے جب مولانا کے بارے میں سنا کہ آپ اِس وقت یونیورسٹی ہی میں تشریف رکھتے ہیں تو آپ کی زیارت کے لیے ان کا تانتا بندھ گیا۔ آپ کو تلاش کرتے ہوئے وہ آپ کے صاحبزادے کے کمرہ میں پہنچے۔ وہاں شیخ صاحب نے دیکھا کہ ان کے اردگرد طلبہ وطالبات کا ازدحام ہے اور سب آپ سے ملنے کے لیے بے قرار ہیں۔ طالبات نے بھی مولانا سے ہاتھ ملانے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ وہ آپ سے مصافحہ کرنا چاہتی تھیں۔ مگر انھیں شرمندگی کے ساتھ نامراد واپس ہونا پڑا۔

دراصل یہ وہی طالبات ہیں جن کے پاس دین وایمان کا کوئی پاس ولحاظ نہیں ہوتا۔ سرسید احمد خان نے جو یونیورسٹی کی بنیاد رکھی تھی، شعائرِ اسلام سے کھلواڑ کرنے کے لیے نہیں؛ بلکہ مسلم امت کو

(1) مسلم:2327۔

اسلامی تعلیمات کے تناظر میں تسخیرِ کائنات کے لیے رکھی تھی۔ تاکہ مسلمان جو اُس وقت عصری تعلیم میں دوسری اقوام کے مقابلے میں بہت پیچھے تھے، آگے کی طرف ترقی کر سکیں۔ مگر آج طالبات کا یہ طریقہ اور خواہش دیکھ کر مولانا مرحوم کو خاصی تکلیف ہوئی۔

ایسی طالبات کو جو غیر محرموں کے ساتھ ہاتھ ملانے کی خواہش رکھتی ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ رسول اکرم ﷺ نے کبھی بھی کسی غیر محرم عورت کا ہاتھ نہیں چھوا ہے۔ اور کسی بھی مسلمان کے لیے یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ کسی ایسی جوان لڑکی یا عورت کا ہاتھ چھوئے جو اس کے لیے حلال نہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے:

"وَاللّٰهِ! مَا مَسَّتْ يَدُ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَ امْرَأَةٍ قَطُّ".

''اللہ کی قسم! رسول اکرم ﷺ کے ہاتھ نے کسی غیر محرم عورت کا ہاتھ نہیں چھوا''(1)۔

دنیا کے سارے مسلمانوں کے لیے صرف اور صرف رسول اکرم ﷺ ہی کا قول و فعل اسوہ اور نمونہ ہے۔ اس لیے اچھے مسلمان سے ایسی طالبات ہاتھ ملانے کا خواب چھوڑ دیں۔ ان کے ہاتھ ملانے کا خواب وہی پورا کر سکتے ہیں جو ماڈرن تہذیب سے فریب خوردہ اور مرعوب ہیں۔ جو کہ خود غیر محرم عورتوں سے ہاتھ ملاتے ہیں اور ان کی بیٹیاں اور بیویاں بھی ان کے نقشِ قدم پر چلتی ہیں مگر انھیں ذرہ برابر بھی غیرت نہیں آتی!!

بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ اسی موقع سے مجھے وہ طالبہ یاد آ گئی جس نے بھرے مجمع میں صدرِ ہند عبدالکلام کا بوسہ لینے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اخبار اردو نیوز (جدہ، سعودی عرب) کے مطابق بنارس ہندو یونیورسٹی میں ایک طالبہ نے صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام سے بوسہ لینے کی خواہش ظاہر کیا۔ اخبار نے اس واقعے کے لیے یہ سرخی لکھا:

''صدر محترم! کیا میں آپ کا بوسہ لے سکتی ہوں؟!''

اس سرخی کے تحت اخبار نے لکھا تھا کہ اس طالبہ نے بڑی بہادری سے صدر عبدالکلام کے گال اور بالوں کو چھوا۔ طالبہ صدر سے بہت قریب ہوگئی۔ اس پر صدر نے اس کی پیٹھ تھپ تھپا کر صرف

---

(1) مسلم: 1866۔

اس کو دعائیں دے کر رخصت کر دیا (1)۔

یہ بوسے، یہ معانقے، یہ مصافحے، یہ رنگینیاں، یہ رعنائیاں، یہ تہذیب، یہ ثقافت، یہ فیشن، یہ کلچر اِن طالبات کو، اِن کے گارجینوں کو، ان کے ذمے داران کو، ان کے اساتذہ کو، اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کو مبارک ہوں!!

مولانا مرحوم اس موقعے پر اپنے صاحبزادے کے کمرے میں ٹی وی دیکھ کر بہت ناراض بھی ہوئے تھے۔ آپ نے اس وقت شدید غیرت کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا:

''آج کے بعد میں کبھی بھی اس یونیورسٹی میں نہیں آؤں گا جہاں دین وشریعت کا مذاق اڑایا جاتا ہے''۔

اور واقعی اس کے بعد مولانا مرحوم علی گڑھ کبھی نہیں گئے (2)۔

مولانا مرحوم کی مہمان نوازی:

جامعہ سلفیہ بنارس میں مولانا کی بحالی معمولی تنخواہ پر ہوئی تھی۔ اس سے قبل مدرسہ دار التعلیم میں آپ کی تنخواہ قریباً دوسو روپے تھی۔ مگر اس کم تنخواہ میں بھی مولانا اپنی خدمت میں حاضر ہونے والوں کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے۔ رسول اکرم ﷺ کے بارے میں حدیث کی کتابوں میں آتا ہے کہ آپ ﷺ کے گھر میں جب کوئی مہمان آتا تو آپ اس کی خاطر تواضع بڑی توجہ سے کیا کرتے تھے۔ ان کے کھانے پینے کے ساتھ ان کے رہنے سہنے کا انتظام وانصرام بھی اچھے ڈھنگ سے کرتے۔ گھر کے ساز وسامان لانے اور مہمانوں کی دیکھ بھال کرنے کی ذمہ داری گرچہ آپ نے سیدنا بلال حبشیؓ کو دے رکھی تھی، مگر اس کے باوجود آپ بنفس نفیس مہمانوں کا خیال رکھا کرتے تھے۔ رات کو مہمان جب سو جایا کرتے تو رات کو اٹھ اٹھ کر گاہے بگاہے اپنے مہمانوں کو جا کر دیکھ لیا کرتے؛ تاکہ مہمانوں کی تواضع میں کوئی کسر نہ ہونے پائے (1)۔

مولانا مرحوم بھی اپنے مہمانوں کے ساتھ بہت محبت کے ساتھ پیش آتے اور ان کے طعام وقیام

(1) دیکھئے اخبار: اردو نیوز، جدہ، سعودی عرب، 6 مارچ 2006ء۔

(2) اس واقعے کے راوی مولانا مرحوم کے ایک قریبی ہیں جو میرے ساتھی بھی ہیں۔

کے ساتھ ان کی رہائش کا بھی خاطر خواہ بندوبست کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مکتبہ دارالسلام ریاض کی علمی کمیٹی کے حالیہ مسئول جناب قاری محمد اقبال عبدالعزیز مسجد نبوی کی زیارت کے لیے مدینہ منورہ گئے تھے۔ ان دنوں مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ مکتبہ دارالسلام ریاض میں منتقل ہو چکے تھے۔ قاری محمد اقبال مسجد نبوی کے باہر اپنی گاڑی کے پاس کسی انتظار میں تھے کہ اچانک وہاں سے مولانا کا گزر ہوا۔ مولانا مرحوم نے قاری محمد اقبال سے کہا: آج آپ کو میری دعوت قبول کرنی پڑے گی۔ چونکہ مولانا کے پاس مدینہ منورہ میں رہائش تھی۔ وقتاً فوقتاً مولانا مکتبہ دارالسلام ریاض سے وہاں کام لے کر چلے جاتے اور ہفتہ دو ہفتہ وہیں بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ قاری محمد اقبال فیملی کے ساتھ تھے، انہوں نے مولانا کی دعوت سے انکار کی کوشش کی مگر مولانا زبردستی ان کو بھی اور ان کی فیملی کو بھی اپنے گھر لے گئے۔ اچھی مہمان نوازی کی۔ شب گزاری کا بھی خاطر خواہ بندوبست کیا۔ قاری محمد اقبال اس واقعہ کے بعد مولانا کی مہمان نوازی کی بہت تعریف کرتے ہیں اور انہوں نے ہی مجھ سے مولانا مرحوم کی اس مہمان نوازی کی تفصیل بیان کی ہے۔

مہمانوں کی دیکھ ریکھ کرنا، ان کے آرام کا بندوبست کرنا اور انہیں ہر سہولیات مہیا کرنا مولانا کی خاص صفت تھی۔ آپ مہمان نوازی اور خاطر داری میں اپنی مثال آپ تھے۔ ایک مرتبہ ایک طالبعلم آپ کا مہمان بنا۔ وہ آپ کے ساتھ سفرِ حج پر آپ کے گھر آیا تھا۔ اس کے کپڑے سفر کے سبب گندے ہو چکے تھے۔ آپ نے اس کے سونے کے بعد اس کے کپڑے دھو کر سوکھنے کے لیے رکھ دیے۔ صبح ہوئی تو طالب نے اپنے کپڑے کو دھلا ہوا پایا۔

میرے ایک ساتھی جناب جلال محمدی قادری نے بتایا کہ جب میں شیخ مرحوم سے وقت لے کر اپنے ساتھی محمد رفیق (کلکتہ) کے ساتھ ان سے ملاقات کرنے گیا۔ اس وقت مولانا مکتبہ دارالسلام ریاض میں کام کرتے تھے۔ ہم مولانا کی خدمت میں پہنچے تو وہ ہم لوگوں کی خاطر تواضع کے لیے

(1) مہمانوں کے ساتھ رسول اکرم کا طرز عمل کیسا تھا؟ اس سلسلے میں میری کتاب ''رسول اکرم ﷺ کا طرز عمل کس کے ساتھ کیسا؟'' کے عنوان سے رسول اکرم ﷺ کا طرز عمل مہمانوں کے ساتھ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب ہندستان، پاکستان اور سعودی عرب سے اردو میں شائع ہو چکی ہے۔ جبکہ ہندستان میں اس کا ہندی ایڈیشن بھی چھپ چکا ہے۔

کھڑے ہوئے اور چائے بنانے لگے۔ جب ہم نے بتایا کہ ہم چائے نہیں پیتے اور اس پر اصرار بھی کیا تو مولانا کہنے لگے: آج آپ اپنی قسم توڑ کر ہماری چائے نوشی میں شریک ہو جائیں!! ہم نے کہا: مولانا! لائیں ہم ہی چائے بناتے ہیں مگر انھوں نے ہمیں اس کی ہرگز اجازت نہیں دی اور خود ہی چائے بنائی۔ اس دوران ہم نے اتنا کام کیا کہ چائے کی پیالی دھودی۔ یہ دیکھ کر مولانا ناراض ہو گئے اور فرمانے لگے: یہ کام میرا ہے آپ نے یہ کیوں کیا؟!!

جلال محمدی کا بیان ہے کہ مولانا کے اس سلوک سے ہم دونوں بہت متاثر ہوئے اور ہماری آنکھیں مولانا کی محبت میں اشکبار ہوگئیں۔ آج پہلی دفعہ ہم نے کسی عالمِ دین کو اِس تواضع میں دیکھا تھا۔

ان دونوں واقعات سے شیخ صاحب کا اپنے مہمانوں کے ساتھ طرزِ عمل کا اندازہ لگائیں اور آج کے علمائے کرام ذرا مولانا کے اِس سلوک سے اپنے سلوک کا موازنہ کریں!!

مولانا کی دعوتی وتبلیغی سرگرمیاں:

مولانا مرحوم دعوت وتبلیغ کے میدان میں شروع ہی سے بہت سرگرم تھے۔ 1961ء میں جامعہ اسلامیہ فیض عام سے فراغت کے بعد آپ نے دیگر طلبہ کی طرح دنیاوی معاش کی فکر میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔ بلکہ فراغت کے فوری بعد تدریسی ودعوتی خدمات میں اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ مدھیہ پردیش میں مدرسہ فیض العلوم سیونی میں جس وقت آپ تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے، مضافاتی علاقے میں دعوتی سرگرمیاں بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ قرب وجوار کی مساجد میں خطبۂ جمعہ دینا اور وقتاً فوقتاً لوگوں کو اکٹھا کر کے ان کے سامنے دینی واصلاحی تقاریر کرنا آپ کا معمول تھا۔

جامعہ سلفیہ بنارس میں آنے کے بعد آپ کا تبلیغی دورہ بدستور جاری رہا۔ دینی پروگراموں میں جہاں کہیں سے بھی آپ کو دعوت ملتی، وعدہ کے مطابق وہاں پہنچتے اور عوام الناس سے خطاب فرماتے۔

1988ء میں جب آپ وطن مالوف سے مرکز خدمۃ السنۃ مدینہ سعودی عرب میں چلے آئے تو یہاں بھی آپ نے دعوتی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ مدینہ منورہ میں قیام کے دوران بعض مکاتب جالیات نے اپنے دعوتی پروگراموں میں مولانا کو بحیثیت مقرر مدعو کیا۔ مولانا نے ان کی دعوت قبول

فرمائی اوران کے پروگراموں میں شریک ہوکرتارکین وطن بھائیوں کے سامنے خطاب فرمایا۔آپ کا خطاب انتہائی جامع اور مواد سے لبریز ہوا کرتا تھا۔

1998ء کی ابتدا میں مولانا مرحوم جب مرکز خدمة السنة مدینہ سے مکتبہ دارالسلام ریاض میں آئے تو یہاں بھی آپ نے دعوت وتبلیغ سے خود کو مربوط رکھا اور جہاں بھی دینی پروگراموں میں شرکت کی دعوت دی گئی تشریف لے گئے اوراپنے مخصوص انداز میں سامعین کے سامنے تقریر کی۔

سعودی عرب میں مکاتب جالیات کا جال بچھا ہوا ہے۔صحیح عقیدہ کی ترویج واشاعت میں ان مراکز کا بڑا نمایاں کردار ہے۔تارکین وطن کے لیے یہ مراکز کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔تقریباً پوری دنیا سے یہاں لوگ طلبِ معاش کے لیے آتے ہیں۔ان میں سے اکثروں کا عقیدہ اسلام کے منافی ہوتا ہے۔خاص کر برصغیر (ہندستان، پاکستان، بنگلہ دیش) اوراس کے قرب وجوار (افغانستان،ایران وغیرہ) میں صوفیاء نے اپنے باطل عقائد سے لوگوں کو گمراہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں چھوڑا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب ان ممالک سے مسلمان سعودی عرب میں طلبِ معاش کے لیے آتے ہیں تو انہیں یہاں پر رائج صحیح اسلامی عقیدے سے اپنے باطل عقیدے کا موازنہ ومقارنہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔چونکہ سعودی عرب میں علمائے کرام کو ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے اورادارہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا پورے ملک سے جرائم اور ہر طرح کی برائیوں کے دور کرنے میں حکومت کے افراد کے ساتھ بڑا تعاون ہے۔بلکہ مملکت سعودی عرب کے وجود میں لانے میں جن لوگوں نے سیاسی واصلاحی طور پرسب سے زیادہ مدد کا ہاتھ بڑھایا وہ علمائے کرام ہی تھے جو سلفی العقیدہ اوراہلحدیث تھے۔اس لیے سعودی عرب کی حکومت بھی اپنے علمائے کرام کی بے پناہ عزت وتوقیر کرتی ہے،ان کی ہمت افزائی کرتی ہے اوراپنے داخلی وخارجی اورسیاسی امور میں ان سے ہر وقت مشورہ لیتی ہے۔علماء کے ساتھ حکومت کا تعاون اوران کی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے کہ پورے سعودی عرب میں دینی ودعوتی مراکز کا جال بچھ چکا ہے۔ان مراکز میں انہی علمائے کرام کو جگہ ملتی ہے جو بنیادی طور پر صحیح اسلامی عقیدہ کے حامل ہوں۔ان مراکز کو یہاں جالیات کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اللہ جزائے خیر دے ان جالیات کے ذمہ داران کو کہ وہ وقتاً فوقتاً دینی ودعوتی پروگرام منعقد کرتے رہتے ہیں۔ اور جس زبان کا پروگرام ہوتا ہے اس کے داعی کو تقریر کے لیے بلاتے ہیں۔ دور سے آنے والے داعی کے جملہ اخراجات دعوت سنٹر ہی برداشت کرتا ہے۔ مولانا مرحوم کو جالیات کے ذمہ داران اپنا مرجع تصور کرتے تھے اور مملکت میں پھیلے دینی مراکز کے تقریباً سارے ہی ذمہ داران مولانا کی علمی قابلیت وصلاحیت اور ان کے مقام ومرتبہ کی عظمت کے قائل تھے، اس لیے ہر ایک کی خواہش ہوتی کہ مولانا مرحوم اس کے پروگراموں میں شرکت فرما کر شرف بخشیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے، سعودی عرب کی جتنی بھی جالیات ہیں ان میں جو دعاۃ ومبلغین دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، ان میں سے اکثر وبیشتر کا مولانا مرحوم سے اچھا تعلق رہا ہے۔

چنانچہ مولانا مرحوم دعاۃ ومبلغین کی بے حد عزت کرتے تھے اور ان کی ہمت افزائی بھی کرتے تھے۔ اس لیے دعاۃ بھی آپ سے قریب قریب رہتے تھے اور آپ کو اپنے پروگراموں میں شرکت کی دعوت دیا کرتے تھے۔ مولانا کا مزاج ان لوگوں سے بہت مختلف تھا جو دعاۃ کی دعوت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور ان کی معمولی باتوں پر بے جا تنقید کرتے رہتے ہیں۔ بہت سارے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دعاۃ ومبلغین پر طرح طرح کی نکتہ چینی کیا کرتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ دعاۃ اپنے پروگرام اپنی سہولت کے مطابق نہیں بلکہ ان کی سہولت کے مطابق رکھیں۔ لوگوں کی سہولت اور ان کے جذبات سے انہیں کوئی سروکار نہیں، انہیں تو اپنی سہولت چاہیے اور بس۔ ایسے لوگ اپنی رونمائی کے لیے محفلِ رونق بننے کی خواہش رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایسے وقت میں ان کا وعظ وبیان رکھا جائے جب سامعین بالکل چست اور حاضر دماغ ہوں۔ گو ایسے علماء کے اندر تبلیغ کی بجائے اپنی رونمائی اور مدح سرائی زیادہ محبوب ہوتی ہے۔ مولانا مرحوم اس قسم کی رونمائی اور اپنی تعریف سے بالاتر تھے۔ آپ کو جب بھی دعاۃ دعوت دیتے، بغیر کسی تکلف کے ان کی دعوت قبول فرماتے اور جب بھی خطاب کا وقت دیا جاتا بخوشی اسٹیج پر تشریف لے جاتے اور انتہائی سنجیدگی ومتانت سے خطاب فرماتے۔

جالیات کے پروگراموں میں جو لوگ بغیر کسی تکلف کے شرکت کرتے ہیں، کم از کم میں دو افراد کو

جانتا ہوں جن کی قربانیاں فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ ایک شیخ عبدالقدوس سلفی مدنی صاحب اور دوسرے حافظ الیاس سلفی ومدنی صاحب ۔ یہ دونوں حضرات ریاض جالیات کے پروگراموں میں حاضرین کے سوالات کے جوابات کے لیے ہر وقت اسٹیج کے مذبح میں اتار دیے جاتے ہیں۔مگر ان کی پیشانی پر بل تک نہیں آتی اور انتہائی امانت کے ساتھ یہ اپنے فرائض انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

مولانا مرحوم کے تعلق سے بات ہورہی تھی۔ دراصل مولانا کے اندر جوامت کا درد پنہاں تھا، دینی ودعوتی پروگراموں میں شریک ہوکر اس کا اظہار کرتے رہتے تھے اور امت مسلمہ کی اصلاح میں جس حد تک تبلیغی خدمات انجام دے سکتے تھے، انجام دیتے تھے۔ہم بعد کے علماء سے بھی مولانا کی طرح دینی ودعوتی سرگرمیوں میں حصہ کی توقع رکھتے ہیں۔

ہندستان سے باہر مولانا مرحوم کے دورے:

مولانا مرحوم نے جس طرح ہندستانی مسلمانوں کو اپنے علم سے استفادہ کرنے کا موقع دیا، دوسرے ممالک کے مسلمان بھی آپ کی معلومات سے بہت زیادہ مستفید ہوئے۔دسمبر 1985ء میں مولانا پاکستان کے دعوتی دورے پر تشریف لے گئے تھے جہاں پاکستانی مسلمانوں نے آپ کی بے حد عزت وتوقیر کی اور وہاں کی اہلحدیثوں نے یہ ثابت کردیا کہ ہندستان اور پاکستان کے درمیان پائے جانے والے نظریاتی اختلافات کے باوجود ہم عقیدتا پوری دنیا میں ایک ہی منزل کے راہی ہیں اور ہم جہاں بھی ہیں اپنے ایک عقیدے پر اتحاد کے سبب تمام فروعی ونظریاتی اختلافات سے بالاتر ہوکر ایک مسلمان ہیں۔مولانا کے اس دورے کی تفصیل دسمبر 1985ء کے ہفت روزہ الاعتصام لاہور کے شمارے میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اس سے قبل 1982ء میں رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے مولانا مرحوم کو امریکہ میں سیرتِ نبوی ﷺ کے موضوع پر منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس میں اپنا نمایندہ بنا کر کے بھیجا تھا۔ اس وقت مولانا جامعہ سلفیہ بنارس ہی میں تھے۔مولانا نے رابطہ کی طرف سے امریکہ کی اس کانفرنس میں شرکت کی اور اپنے موضوع کا حق اچھی طرح سے ادا کیا۔ نیز رابطہ نے جن توقعات کے پیش نظر مولانا کا انتخاب کیا تھا، مولانا ان کی توقعات پر پورا اترے۔دوسری دفعہ بھی مولانا

مرحوم کو امریکہ میں مقیم مسلمانوں کی طرف سے دعوت ملی تھی۔ مولانا نے ان کی دعوت قبول کر لی تھی اور ان کا ویزہ بھی دس سال کے لیے سعودی عرب امریکہ کے لیے لگ چکا تھا۔ مولانا امریکہ جانے کے لیے تیار ہی تھے کہ انہی ایام میں ان پر دوبارہ فالج کا حملہ ہو گیا اور آپ امریکہ نہیں جا سکے۔

برطانیہ کے لیے بھی مولانا مرحوم کا دعوتی دورہ ہوا تھا۔ غالباً وہاں کی کسی تنظیم کی طرف سے کانفرنس تھی۔ مولانا نے اس میں شرکت کی۔ اس کی روداد بھی انہوں نے اپنی ڈائری میں لکھی تھی۔ اس سفر میں ایک دلچسپ بات یہ تھی برطانیہ پہنچنے کے بعد مولانا نے اپنے گھر ایک خط لکھا تھا۔ جب مولانا برطانیہ سے ہندستان پہنچے تب کہیں جا کر ان کا بھیجا ہوا خط موصول ہوا۔ اس وقت فون کا استعمال کچھ کم تھا۔ مولانا مرحوم نے خلیجی ممالک کا بھی بارہا دعوتی دورہ کیا اور اپنے علم وفضل سے وہاں کے مسلمانوں کو مستفید ہونے کا موقع دیا۔ بلکہ دوسری مرتبہ جب فالج کا حملہ ہوا تھا تو اس سے دو ہی دن قبل آپ دعوتی سفر پر امریکہ جانے والے تھے۔ آپ کا ویزہ لگ چکا تھا، مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ آج بھی مولانا کے پاسپورٹ پر امریکہ کا ویزہ لگا ہوا ہے اور اس کی مدت باقی ہے!!

مولانا مرحوم عربی واردو زبان کے ماہر تھے:

مولانا کی مادری زبان اردو تھی۔ اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی کی بھی آپ نے تعلیم لی تھی۔ چنانچہ ہندی زبان کے مبادیات واصول سے آپ واقف تھے۔ اسی طرح انگریزی میں بھی آپ حسب ضرورت استفادہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ مگر جن زبانوں میں آپ کو ملکہ حاصل تھا وہ تین معروف زبانیں تھیں؛ اردو، عربی اور فارسی۔ ان تینوں زبانوں میں آپ لکھ پڑھ سکتے تھے۔ مگر آپ نے ان تین زبانوں میں سے صرف دو زبانوں عربی اور اردو میں خاطر خواہ طور پر کام کیا۔ فارسی زبان میں لکھنے لکھانے کا موقع نہیں ملا؛ البتہ فارسی کی کتابوں سے آپ نے بلاواسطہ اپنی تحریروں میں استفادہ کیا۔

اردو زبان میں مولانا کی لیاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب 1974ء میں جامعہ سلفیہ بنارس میں مولانا کا ورودِ مسعود ہوا تو جامعہ سلفیہ سے نکلنے والے ماہنامہ میگزین ''محدث'' کی ادارت کی ذمہ داری نبھانے کے لیے اس کے مسئولین نے مولانا مرحوم پر اپنی نگاہیں گاڑ لیں۔

چونکہ کسی بھی میگزین خواہ وہ کسی بھی زبان میں ہو، کی ادارت کے لیے اسی آدمی کا انتخاب عمل میں آتا ہے جو اس زبان میں مکمل طور پر مہارت رکھتا ہو۔ چنانچہ "محدث" کی ادارت کے لیے مولانا مرحوم کا انتخاب عمل میں آیا۔

جہاں تک عربی زبان میں مولانا مرحوم کی صلاحیت کی بات ہے تو اس سلسلے میں زیادہ کچھ دلیل دینے کی ضرورت نہیں، صرف 'الرحیق المختوم' کی تحریر ہی کافی ہے۔ 'الرحیق المختوم' کے علاوہ بھی شیخ کی دیگر عربی تالیفات میں جو کچھ انہوں نے اظہار خیال کیا ہے، اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم جس طرح اردو زبان سے واقف تھے اسی طرح عربی زبان بھی جانتے تھے۔ ایک مرتبہ شیخ صاحب سے جناب سعید الدین صاحب (مکتبہ دار السلام ریاض کے انگلش اسکالر) نے ان کی زباندانی کے بارے میں پوچھا تھا تو انھوں نے بتایا تھا:

"میرے لیے اردو اور عربی دونوں زبانیں یکساں ہیں"۔

میں کہتا ہوں: مولانا مرحوم کی مایہ ناز تالیف 'الرحیق المختوم' کا جس شخص نے عربی اور اردو میں مطالعہ کیا ہے، اس کو خوب اچھی طرح معلوم ہوگا کہ واقعی مولانا مرحوم ان دونوں زبانوں کے ماہر تھے۔ مولانا نے اس کتاب کی تالیف اس زمانے میں کی تھی جب آپ نے ہندستان سے باہر کسی عربی جامعہ کا منہ تک نہیں دیکھا تھا۔ مگر جب عربی میں لکھنا شروع کیا تو لکھتے چلے گئے۔ قلم کو جنبش دی اور عربی الفاظ ہاتھ باندھ کر مولانا کے سامنے کھڑے ہو گئے کہ مولانا جس قدر حسن انتخاب کرنا چاہیں، کریں۔ میں یہاں 'الرحیق المختوم' سے صرف ایک دو مثال دینا چاہوں گا۔ مولانا 'الرحیق المختوم' میں لکھتے ہیں:

"إذا نظرنا إلى غزوات النبي صلى الله عليه وسلم وبعوثه وسراياه؛ لا يمكن لنا ولا لأحد ممن ينظر في أوضاع الحروب وآثارها وخلفياتها۔ لا يمكن لنا إلا أن نقول: إن النبي صلى الله عليه وسلم كان أكبر قائد عسكري في الدنيا، وأشدهم وأعمقهم فراسةً وتيقظًا، إنه صاحب عبقرية فذة في هذا الوصف كما كان سيد الرسل وأعظمهم في صفة النبوة

والرسالة، فلم يخض معركة من المعارك إلا في الظرف ومن الجهة اللذين يقتضيهما الحزم والشجاعة والتدبير، ولذلك لم يفشل في أي معركة من المعارك التي خاضها لغلطة في الحكمة وما إليها من تعبئة الجيش، وتعيينه على المراكز الاستراتيجية، واحتلال أفضل المواضع وأوثقها للمجابهة واختيار أفضل خطة لإدارة دفة القتال، بل أثبت في كل ذلك أن له نوعاً آخر من القيادة غير ما عرفتها وتعرف الدنيا في القواد. ولم يقع ما وقع في أحد وحنين إلا من بعض الضعف في أفراد الجيش – في حنين – أو من جهة معصيتهم أوامره، وتركهم التقيد والالتزام بالحكمة والخطة اللتين كان أوجبهما عليهم من حيث الوجهة العسكرية".

یہ تو عربی زبان تھی۔ آیئے اس کا ترجمہ خود مولانا کی زبان میں پڑھتے ہیں:

"نبی ﷺ کے غزوات، سرایا اور فوجی مہمات پر ایک نظر ڈالنے کے بعد کوئی بھی شخص جو جنگ کے ماحول، پس منظر و پیش منظر اور آثار و نتائج کا علم رکھتا ہو یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ نبی ﷺ دنیا کے سب سے بڑے اور باکمال فوجی کمانڈر تھے۔ آپ ﷺ کی سوجھ بوجھ سب سے زیادہ درست اور آپ ﷺ کی فراست اور بیدار مغزی سب سے زیادہ گہری تھی، آپ ﷺ جس طرح نبوت و رسالت کے اوصاف میں سید الرسل اور اعظم الانبیاء تھے، اسی طرح فوجی قیادت کے وصف میں بھی آپ ﷺ یگانۂ روزگار اور نادر عبقریت کے مالک تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے جو بھی معرکہ آرائی کی اس کے لیے ایسے حالات و جہات کا انتخاب فرمایا جو حزم و تدبّر اور حکمت و شجاعت کے عین مطابق تھے۔ کسی معرکے میں حکمت عملی، لشکر کی ترتیب اور حساس مراکز پر اس کی تعیناتی، موزوں ترین مقام جنگ کے انتخاب اور جنگی پلاننگ وغیرہ میں آپ ﷺ سے کبھی کوئی چوک نہیں ہوئی اور اسی لیے اس بنیاد پر آپ ﷺ کو کبھی کوئی زِک نہیں اٹھانی پڑی، بلکہ ان تمام جنگی معاملات

ومسائل کے سلسلے میں آپ ﷺ نے اپنے عملی اقدامات سے ثابت کردیا کہ دُنیا بڑے بڑے کمانڈروں کے تعلق سے جس طرح کی قیادت کا علم رکھتی ہے آپ ﷺ اس سے بہت کچھ مختلف ایک نرالی ہی قسم کی کمانڈرانہ صلاحیت کے مالک تھے۔ جس کے ساتھ شکست کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ اس موقع پر یہ عرض کردینا بھی ضروری ہے کہ اُحد اور حنین میں جو کچھ پیش آیا اس کا سبب رسول اللہ ﷺ کی کسی حکمتِ عملی کی خامی نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے حنین میں کچھ افرادِ لشکر کی بعض کمزوریاں کارفرما تھیں اور اُحد میں آپ ﷺ کی نہایت اہم حکمت عملی اور لازمی ہدایات کو نہایت فیصلہ کن لمحات میں نظر انداز کردیا گیا تھا''۔

ایک دوسری مثال بھی ملاحظہ فرمائیں:

''هذه هي من ناحية القيادة العسكرية الخالصة. أما من نواح أخرى، فإنه استطاع بهذه الغزوات فرض الأمن وبسط السلام، وإطفاء نار الفتنة، وكسر شوكة الأعداء في صراع الإسلام والوثنية، وإلجائهم إلى المصالحة، وتخلية السبيل لنشر الدعوة، كما استطاع أن يتعرف على المخلصين من أصحابه ممن هو يبطن النفاق، ويضمر نوازع الغدر والخيانة.

وقد أنشأ طائفة كبيرة من القواد الذين لاقوا بعده الفرس والرومان في ميادين العراق والشام، ففاقوهم في تخطيط الحروب وإدارة دفة القتال، حتى استطاعوا إجلاء هم من أرضهم وديارهم وأموالهم من جنات وعيون، وزروع ومقام كريم، ونعمة كانوا فيها فاكهين(1).

''یہ گفتگو تو ان غزوات کے خالص فوجی اور جنگی پہلو سے تھی، باقی رہے دوسرے گوشے تو وہ بھی بے حد اہم ہیں، آپ ﷺ نے ان غزوات کے ذریعے امن وامان قائم کیا، فتنے کی

(1) دیکھئے: الرحیق المختوم، عربی ایڈیشن، دار العسل، ریاض 1998ء، ص: 444۔

آگ بجھائی اسلام وبُت پرستی کی کشمکش میں دشمن کی شوکت توڑ کر رکھ دی اورانہیں اسلامی دعوت وتبلیغ کی راہ آزاد چھوڑنے اور مصالحت کرنے پر مجبور کردیا۔اسی طرح آپ ﷺ نے ان جنگوں کی بدولت یہ بھی معلوم کرلیا کہ آپ ﷺ کا ساتھ دینے والوں میں کون سے لوگ مخلص ہیں اور کون سے لوگ منافق، جونہاں خانہ دل میں غدر وخیانت کے جذبات چھپائے ہوئے ہیں۔

پھر آپ ﷺ نے محاذ آرائی کے عملی نمونوں کے ذریعے مسلمان کمانڈروں کی ایک زبردست جماعت بھی تیار کردی جنہوں نے آپ ﷺ کے بعد عراق وشام کے میدانوں میں فارس وروم سے ٹکر لی، اور جنگی پلاننگ اور تکنیک میں ان کے بڑے بڑے کمانڈروں کو مات دے کرانہیں ان کے مکانات وسرزمین سے، اموال وباغات سے، چشموں اور کھیتوں سے، آرام دہ اور باعزت مقام سے اور مزے دار نعمتوں سے نکال باہر کیا" (1)۔

ان دومثالوں سے بالکل واضح ہے کہ مولانا مرحوم جہاں عربی واردوزبانوں میں مہارت رکھتے تھے وہیں ترجمہ وترجمانی کے فن سے بھی مکمل واقف تھے۔میں نے بہت سارے حضرات کو دیکھا ہے کہ وہ عربی اوراردوزبان میں اپنی مہارت کا ڈنکا پیٹتے ہیں، مگر جب ان کی تحریریں پڑھی جاتی ہیں تو بس، چونکہ، چنانچہ، اس لیے، ایسا اور ویسا کی تعبیر بھی کمزور ہوتی ہے؛ چہ جائیکہ ان کے ترجمہ وترجمانی پر تبصرہ کیا جائے!!

شعروشاعری سے مولانا مرحوم کی دلچسپی:

مولانا مرحوم عربی واردوزبانوں کی فصاحت سے بخوبی واقف تھے۔اردوزبان چونکہ ان کی مادری زبان تھی، بچپن سے لیکر جوانی تک آپ کی زندگی کے زیادہ تر ایام ان ہی لوگوں میں گزرے جن کا تعلق اردواوراردوادب سے تھا۔مؤاور بنارس کی اردومعروف ہے۔ایک زمانہ تھا جب لکھنؤ

(1) دیکھیے: الرحیق المختوم، اردوایڈیشن، مکتبہ سلفیہ لاہور، پاکستان

اور حیدر آباد کو بابائے اردو کا درجہ حاصل تھا۔لکھنؤ کا رکشہ چالک بھی اتنی فصیح و بلیغ اردو جانتا تھا کہ ہندستان کے دیگر علاقوں کا پڑھا لکھا طبقہ بھی اس پر سبقت نہیں لے جا سکتا تھا۔مگر آہستہ آہستہ لکھنؤ اپنی اردو ثقافت سے دور ہوتا چلا گیا اور آج اسے اردو میں وہ مقام حاصل نہیں جو کبھی تھا۔اسی طرح حیدر آباد دکن میں بھی اردو کی وہ چاشنی نہیں رہی جو کبھی نوابوں کے دور میں تھی۔اس دور میں پورے ہندستان میں جہاں جہاں اردو داں طبقے کا اضافہ ہوتا گیا وہاں اردو پروان چڑھتی رہی۔مگر اردو ادب سے محبت کا اظہار یوپی میں جو امروہہ، مراد آباد، بنارس، مئو اور مبارک پور کے علاقوں میں ہے، دیگر شہروں میں بہ نسبت کم پایا جاتا ہے۔

مولانا مرحوم کی زندگی کا بھی زیادہ تر وقت اردو دان طبقہ میں گزرا۔اس لیے اس کا مولانا کی زبان وادب پر بڑا اثر رہا۔اردو ادب کی بقا و تحفظ کے لیے اردو کے محبین نے جو طریقے ایجاد کیے ہیں ان میں مشاعروں کے انعقاد کا بڑا نمایاں کردار ہے۔اردو ادب، نثر و نظم اور شعر و شاعری کے مجموعے کا نام ہے جن کے بغیر اردو اپنی ثقافتی ادب سے محروم ہے۔مولانا کے بارے میں مجھے قطعیت کے ساتھ معلوم نہیں کہ انہوں نے اردو شعر و شاعری میں کتنا قلمی حصہ لیا۔البتہ بعض باوثوق ذرائع سے مجھے معلوم ہوا کہ مولانا گاہے بگاہے شعر و شاعری بھی کر لیا کرتے تھے۔نثر کے میدان میں تو ہمارے سامنے مولانا کی فصاحت و بلاغت کی بے شمار مثالیں موجود ہیں مگر شعر و شاعری میں اس کی مثال مفقود ہے۔

جہاں تک مولانا کے شعر و شاعری سننے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں مولانا بڑے باذوق تھے۔ میں جب بھی سعودی عرب سے اپنے وطن کو جاتا ہوں تو واپسی پر اردو کتابوں کے علاوہ مشہور شعرائے کرام کی کیسٹس ضرور لایا کرتا ہوں۔جن دنوں مولانا مرحوم میری گاڑی میں بیٹھ کر کہیں آیا جایا کرتے تھے، ان دنوں معراج فیض آبادی، رئیس انصاری، ندیم نیر، منظر بھوپالی، وسیم بریلوی، درپش درپن، ماجد دیوبندی، راحت اندوری، جمیل خیر آبادی، سکندر حیات گڑبڑ، انجم رہبر اور انا

دہلوی کی کیسٹس میری گاڑی میں موجود تھیں۔ میں گاہے بگاہے اپنی ذہنی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے بغرض تفریح ان شعرائے کرام کے اشعار سنا کرتا تھا۔ میں نے ملاحظہ کیا کہ مولانا مرحوم بھی بڑے غور سے ان کے اشعار سنتے تھے (1)۔

ایک دفعہ میری گاڑی میں منظر بھوپالی یا ندیم نیّر کی کیسٹ لگی ہوئی تھی۔ اس وقت مولانا مرحوم بھی میرے ساتھ تھے۔ راستے میں میں نے ٹیپ بند کر دیا۔ مولانا مرحوم کہنے لگے: ٹیپ کیوں بند کر دیا؟ میں نے کہا: کیا آپ اشعار سننے کی خواہش رکھتے ہیں؟ فرمانے لگے: ہاں! میں سننا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا: کیا آپ کو شعر و شاعری سے دلچسپی ہے؟ فرمایا: میں بڑے شوق سے اشعار سنا کرتا ہوں۔ چنانچہ میں نے ٹیپ کا بٹن آن کر دیا۔

---

(1) سچی بات یہ ہے کہ یہ کیسٹس گاڑی میں رکھنے اور سننے کی حد تک ہیں۔ چونکہ ڈیوٹی سے آتے جاتے راستے میں خاصا وقت مل جاتا ہے اور ان اوقات میں قرآن وحدیث اور دینی تقاریر سننے کے ساتھ ساتھ یہ اشعار بھی سننے کا وقت مل جاتا ہے۔ اسی لیے اتنی ساری کیسٹیں ہیں، ورنہ اشعار سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی میرے نزدیک یہ کوئی بڑا مستحسن شئی ہے۔ بلکہ شعر و شاعری تصوراتی عیاشی اور ذہنی تفریح کا سامان ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ میں شعراء کے دیوان اور کلیات بھی بڑے شوق سے خریدتا ہوں، اپنی لائبریری میں رکھتا ہوں اور گاہے بگاہے ان کا مطالعہ بھی کرتا ہوں۔ بلکہ سعودی عرب کی اس مقدس سرزمین پر جہاں اردو ادب کی کتابیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتیں، میرے پاس ادب و شاعری کی بہت ساری کتابیں موجود ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:

(۱) کلیاتِ اقبال (۲) کلیاتِ میر (۳) کلیاتِ مجروح سلطان پوری (۴) کلیاتِ فراق گورکھپوری (۵) کلیاتِ حسرت موہانی (۶) انتخابِ کلیاتِ سوا (۷) کلیاتِ ناصر (۸) کلیاتِ ساحر لدھیانوی (۹) کلیاتِ فیض (۱۰) کلیاتِ شکیل بدایونی (۱۱) کلیاتِ ذوق (۱۲) کلیاتِ غزلیاتِ جوش ملیح آبادی (۱۳) دیوان غالب (۱۴) شرح دیوانِ غالب (حسرت موہانی) (۱۵) دیوان حالی (۱۶) دیوانِ راسخ عظیم آبادی (۱۷) مسدسِ حالی (۱۸) کلام احمد فراز (۱۹) دیوان درد (۲۰) انتخاب کلام نظیر اکبر آبادی (۲۱) گل یہ کف ناز میں (۲۲) تنہا تنہا (۲۳) الجھا دو الجھاد (شورش کاشمیری) (۲۴) ڈوبتے ڈوبتے وغیرہ۔

جب میں نے مولانا مرحوم کو شعروشاعری میں خاصی دلچسپی دیکھی تو میں نے گا ہے بگا ہے آپ کو مختلف شعراء کا کلام سنایا اور آپ محظوظ ہوتے رہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مولانا عمر کے آخری حصے میں تھے اور ان پر فالج کا دومرتبہ حملہ ہو چکا تھا، اور ان کی زبان اس وقت صاف نہیں تھی۔ صاف صاف الفاظ نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مولانا مرحوم ایامِ شباب میں شعروشاعری سے کس قدر دلچسپی رکھتے ہوں گے۔

ویسے بھی مولانا کی اردو تحریر پڑھنے والوں کو اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں کوئی دریغ نہ ہوگا کہ مولانا اردو اور عربی ادب کے اعلیٰ قلمکار تھے۔ جب بھی اردو اور عربی ادب کی خدمت کی بات آئے گی، مولانا کی تحریروں کا بھی اس میں شمار ہوگا۔

مولانا مرحوم کا خوشخط (Handwriting):

بہت سارے لوگوں کا نظریہ ہے کہ جس آدمی کا خوش خط صاف ہوتا ہے اس کی فکر ونظر بھی صاف ہوا کرتی ہے۔ میں بہت دنوں سے یہ بات سنتا آرہا ہوں۔ مگر میرے نزدیک اس نظریے کی کوئی اہمیت نہیں اور نہ ہی اصولی طور پر اس کی کوئی حیثیت ہے۔ میں بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جن کی تحریر صاف ستھری نہیں ہوتی، بلکہ بعض لوگوں کا خوش خط تو اتنا گندہ ہوتا ہے کہ طبیعت ہی نہیں چاہتی کہ اسے پڑھا جائے، مگر فکر ونظر میں ان کی تحریر اعلیٰ معیار کی ہوا کرتی ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں کا خوش خط اتنا صاف ستھرا اور پیارا ہوتا ہے کہ تحریر دیکھتے ہی دل چاہتا ہے کہ اسے چوم لیں۔ مگر ان کی تحریر کوئی معیاری نہیں ہوا کرتی اور نہ ہی ان کا کوئی معقول نظریہ سامنے آتا ہے جو معیارِ زندگی میں کوئی بھاؤ دے سکے۔

خوشخط کی مثال بھی نام کے مانند ہے۔ کسی آدمی کا نام عبداللہ یا عبدالرحمٰن ہے۔ یہ دونوں نام رسول اکرم ﷺ کے ارشاد گرامی کے مطابق اللہ کے نزدیک زیادہ محبوب اور پیارے ہیں۔ مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی آدمی یہ نام رکھ کر بھی ایسی قبیح اور مجرمانہ حرکت کا عادی ہوتا ہے جس سے انسانیت بھی شرما جاتی ہے، شریعت کا کیا کہنا!!...... اسی طرح کسی آدمی کا نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن نہیں

بلکہ بھولا، منٹو، پپو ہوا کرتا ہے مگر اس کی نیک کارکردگی سے سماج و معاشرہ کی فضا معطر ہو جاتی ہے۔

کسی کا نام اگر عبدالحلیم ہے تو یہ ضروری نہیں کہ اس کے اندر حلم و بردباری اور صبر و تحمل جیسی پاکیزہ صفات موجود ہوں۔ اسی طرح اگر کسی کا نام اسلامی نہیں ہے تو یہ کوئی ضروری نہیں کہ اس کے جملہ کام غیر اسلامی ہوں۔ ہاں شرعی طور پر ہر مسلمان کے اوپر یہ لازم ہے کہ وہ اپنی اولاد کا نام اچھے سے اچھا رکھے اور اس کی تربیت روزِ اول ہی سے اسلامی منہج و طریقہ پر کرے۔

جہاں تک کسی کے خوش خط ہونے کی بات ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ اس آدمی کی ایک خوبی تسلیم کی جائے گی جس کا خط عمدہ ہو۔ اور اگر کسی کے خوش خط کے ساتھ ساتھ اس کی تحریر میں معنویت اور فکری انقلاب کا عنصر پایا جاتا ہو تو پھر یہ اس کے لیے ایک عظیم خوبی تسلیم کی جائے گی جس کو عربی زبان میں "نورٌ علی نور" کہا جاتا ہے۔

الحمدللہ مولانا مرحوم کے اندر یہ عظیم خوبی بدرجہ اتم موجود تھی۔ خوشخطی میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھے اور انقلابی و روحانی تحریر میں بھی ان کی انفرادیت تھی۔ خوش خط صاف ستھرا اور پیارا ہو، اور تحریر بھی فکر و نظر کے اعتبار سے معیاری ہو تو پھر کسی مؤلف و مصنف کی یہ خوش نصیبی ہے۔ مولانا اس اعتبار سے خوش نصیب تھے۔

مولانا مرحوم کی نوکِ قلم سے نکلی ہوئی تحریر اتنی پیاری ہے کہ اسے دیکھ کر طبیعت خوش اور دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی مولانا کے قلم سے لکھی ہوئی چند چیزیں مل جائیں۔ اللہ جزائے خیر دے جناب غازی عزیر حفظہ اللہ کو، جن سے میں نے اپنی اِس کتاب کے لیے چند صفحات لکھنے کی گزارش کی تھی مگر انھوں نے اپنے مضمون کے ساتھ وہ چند خطوط بھی بھیج دیے جو مولانا مرحوم نے ان کے پاس لکھے تھے۔ ان کے خطوط کا ایک عکس آپ اسی کتاب کے اخیر میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا ایک عکس:

مولانا مرحوم کے بارے میں یہ لکھنا کہ وہ سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے تھے، ان کی شان میں گستاخی شمار ہوگی۔ بنیادی طور پر آپ کا عقیدہ اہلحدیثوں کا تھا بلکہ ایک متحمس اہلحدیث تھے اور

اس روئے زمین پر اہلحدیث یا سلفی العقیدہ ہی وہ لوگ ہیں جن کے پاس سچا اور صحیح اسلام موجود ہے۔ اور وہی لوگ رسول اکرم ﷺ سے ویسی محبت کرتے ہیں جو محبت رسول کا تقاضا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی شان میں مبالغہ آمیز قصیدے کہہ دینا، آپ ﷺ کی وفات کے دن میں ماتم کرنا، آپ کی ولادت پر خوشیاں منانا، عید میلاد النبی کے نام سے محفل میلاد قائم کر کے حلوے کھالینا، آپ سے محبت کا نعرہ لگا دینا، یہ محبتِ رسول کا تقاضا ہرگز نہیں ہے۔ رسول اکرم ﷺ سے محبت کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ آپ کے فرمودات کے سامنے دنیا کے بڑے سے بڑے انسان کی بات تسلیم نہ کی جائے اور آپ ﷺ نے جو فرما دیا ہے اسی کو صدقِ دل سے قبول کر کے اصول اور قانون مان لیا جائے۔ اس فارمولے پر اگر کسی نے عمل کیا ہے تو وہ اہلحدیث ہیں، جنھوں نے بلا چون و چرا آپ ﷺ کے فرمان کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ اور انہی اہلحدیثوں کے بارے میں رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”لا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي ظَاهِرِينَ عَلَى الحَقِّ لا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ وَلا مَنْ خَذَلَهُمْ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ“.

”میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق پر غالب رہے گا، ان کے مخالفین اور انھیں رسوا کرنے والے قیامت تک انھیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گے“(1)۔

مولانا مرحوم اسی طائفہ ناجیہ کی ایک عظیم شخصیت تھے اور آپ اسی حق کی طرف لوگوں کو بلانے کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ پھر ویسی شخصیت کے لیے یہ کہنا کہ مولانا سنت نبوی ﷺ سے محبت کرتے تھے، کچھ ہلکا لگتا ہے۔ صحیح معنوں میں اگر کسی نے رسول اکرم ﷺ سے حقیقی محبت کا تقاضا پورا کیا ہے تو وہ بلا شبہ اہلحدیث ہیں جن کے ہاں تقلیدِ جامد کا تصور نہیں۔ توقیرِ علماء تو ان کے اخلاق کا اعلیٰ حصہ ہے مگر ان کے اندر اتنی ہمت ہرگز نہیں کہ وہ قولِ رسول پر قولِ امام کو ترجیح دینے لگیں۔ رسول اکرم ﷺ کی سیرت مبارکہ پر مولانا مرحوم نے ایک ایسی عظیم الشان کتاب تحریر فرمائی

(1) بخاری: 170، 176۔

کہ عرب وعجم کا کوئی بھی کتب خانہ اس کے بغیر سیرت کے باب میں ناقص تصور کیا جائے گا۔ یہ اس بات کا مسلم ثبوت ہے کہ آپ کا دل محبت رسول ﷺ سے سرشار تھا۔ اس لیے ہمارا ایمان ہے کہ مولانا مرحوم رسولِ اکرم ﷺ سے بے پناہ محبت کرتے ہوں گے۔ اہلحدیث اور سلفی عالم باعمل ہونا ہی محبتِ رسول کی اعلیٰ مثال ہے؛ چہ جائیکہ رسول اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ پر کوئی عظیم تحریر معرضِ وجود میں لائی جائے۔

میں نے ایک مرتبہ مولانا مرحوم کے داماد انعام الحق رحمانی سے دریافت کیا کہ مولانا کھانے پینے میں کیا کچھ پسند فرمایا کرتے تھے اور کیا چیز شوق سے کھایا کرتے تھے؟ انہوں نے میرے سوال کے جواب میں کہا کہ مولانا کدو بڑے شوق سے کھایا کرتے تھے اور اسے بہت پسند فرماتے تھے۔ مولانا اس بارے میں بتایا کرتے تھے کہ جب سے میں نے رسول اکرم ﷺ کے بارے میں یہ حدیث پڑھی ہے کہ آپ ﷺ کدو پسند فرماتے تھے، اسی روز سے میں بھی کدو پسند کرنے لگا(1)۔ انعام الحق صاحب نے یہ بھی بتایا کہ مولانا کھانے کے بعد میٹھا کھانا پسند کرتے تھے اور اس سلسلے میں وہی بات کہا کرتے تھے جو کدو کے بارے میں فرماتے تھے(2)۔

اس سے اندازہ کریں کہ مولانا کو رسول اکرم ﷺ سے کس درجہ محبت ہوگی!!

مولانا مرحوم کی تالیفات ان کی دینی حمیت کی علامت ہیں:

برتن سے وہی کچھ ٹپکتا ہے جو اس میں موجود ہو۔ تحریر کی بھی مثال کچھ ایسی ہی ہے۔ جس مؤلف کے ذہن ودماغ میں جس قدر مثبت مواد ہوگا اس کی تحریر بھی اسی کی غماز ہوگی۔ چونکہ میں بھی اس میدان میں گزشتہ کئی سالوں سے کام کر رہا ہوں اور کئی ایک موضوع پر قلم کو جنبش دینے کا موقع بھی ملا ہے، اس لیے میں اس میدان کے شہسواروں کو خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ جاسوسی ذہنیت کے

(1) یہ روایت صحیح مسلم میں ہے۔

(2) کھانے کے بعد میٹھا کھانے کے بارے میں مجھے کوئی روایت نہیں مل سکی۔ البتہ بخاری کی روایت میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو میٹھا پسند تھا۔ مگر اس میں کھانے کے بعد کا ذکر نہیں ہے۔

حامل شخص کو دنیا ابن صفی کے نام سے جانتی ہے جبکہ خرافاتی ذہن کے ناول نگار کو دنیا گلشن نندا کا بھائی تسلیم کرتی ہے۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ ایک منجھے ہوئے مؤلف تھے۔ان کے قلم اور زبان و بیان میں اتنی زبردست طاقت اور تاثیر تھی کہ اگر وہ سیاسی سرگرمیوں میں قلم کا رخ پھیر دیتے تو سیاسی دنیا میں ہلچل مچ جاتا۔اگر فوجیوں کی میزائلوں کی گڑگڑاہٹ کی دہشت کو جہادی مہم کا رخ دینے کی کوشش کرتے تو اپنے قلم سے دنیائے جہاد میں آگ لگا سکتے تھے۔اگر بزدل سپہ سالار کو کوئی پند و نصائح پر مبنی تحریر بھیج دیتے تو اس کی بزدلی، جوانمردی میں تبدیل ہو جاتی۔اگر کسی سلطنت کا تختہ الٹنے کی ٹھان لیتے تو اپنے قلم کے ذریعے عوام الناس کا دل جیت کر اس کی دھجیاں اڑا دیتے۔مگر دنیا جانتی ہے کہ مولانا مرحوم نے نہایت ہی عدل و انصاف کے ساتھ نوکِ قلم کو جنبش دی ہے۔جو کچھ بھی لکھا ہے حق لکھا ہے، حق کے سوا ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے۔انسانی کمزوریوں کے سبب قلمی لغزش ایک طبعی شئی ہے جس سے انکار ناممکن ہے۔اور اسی لیے حدیث شریف میں کہا گیا ہے:

"كُلُّ بَنِي آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ".

"آدم کی ہر اولاد غلطی کا ارتکاب کرنے والی ہے، اور غلطی کرنے والوں میں اچھا وہ ہے جو توبہ کر لیتا ہے"(1)۔

مگر مولانا کی تالیفات کا مطالعہ کرنے والا اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا کہ مولانا مرحوم نے جب بھی قلم اٹھایا دینی حمیت میں اٹھایا۔مولانا کی تالیف "قادیانیت اپنے آئینے میں" کا مطالعہ کریں، معلوم ہوگا کہ مولانا نے اسلام کے دفاع میں دینِ قادیانیت کو دلائل و براہین کی روشنی میں کس قدر عوام الناس کے سامنے برہنہ کیا ہے۔انہی کی کتابوں سے انہی کی مٹی پلید کر دی ہے۔اس کتاب کو مولانا مرحوم نے حوالہ جات سے اتنا مستحکم اور اصولی بنا دیا ہے کہ مخالفین چاہنے کے باوجود بھی تردیدی کلمات کے طور پر ایک لفظ نہیں بول سکتے، کیونکہ گھر میں موجود چور کو جب بھی کہا جائے گا

(1) ترمذی: 2499، ابن ماجہ: 4251۔

چور ہی کہا جائے گا اور یہ قادیانیت کا بانی ہی مذہب کا چور اور ڈکیت ہے۔

اسی طرح مولانا مرحوم کی تالیف "فتنۂ قادیانیت اور مولانا ثناء اللہ امرتسری" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے انتہائی غیرت وحمیت میں حق کے بول بالا کے لیے اور باطل کی پسپائی کے لیے اپنی کمر کس لی تھی۔ مولانا مرحوم کی یہ دونوں کتابیں مستحکم دلائل کے ساتھ دینِ قادیانیت کو اس طرح باطل کر دیتی ہیں کہ قادیانیت اپنے آئینے میں بالکل ہی برہنہ نظر آنے لگتی ہے۔

مولانا مرحوم کی دینی حمیت وغیرت کا اندازہ اس بات سے بھی لگائیں کہ علامہ تقی الدین الہلالی رحمہ اللہ جیسے سلفی مکتب فکر کے معروف زمانہ عالم دین نے جب حجاب کے بارے میں اجتہادی غلطی کا ارتکاب کیا اور مختلف دلائل کی روشنی میں چہرے کے پردہ کا انکار کیا تو مولانا کی حمیت جاگ اٹھی اور انہوں نے علامہ تقی الدین الہلالی رحمہ اللہ کے دلائل کا جواب مستحکم دلائل کے ساتھ رد کی اور حق بات منظر عام پر لانے کے لیے قلم کو حرکت دی اور ان کا رد لکھا اور خوب لکھا۔ جس کسی نے مولانا کی اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے اسے مولانا مرحوم کی بالغ نظری اور ان کے قوی علم کا اندازہ لگانے میں وقت نہیں لگے گا۔ کہ اس بحر بیکراں میں بہت نہیں، بہت بہت نہیں؛ بلکہ بہت ہی زیادہ علم تھا، جس کے کنارے کا کوئی پتہ نہیں تھا۔

یہ کتاب "إبراز الحق والصواب في مسألة السفور والحجاب" کے نام سے عربی زبان میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ علامہ تقی الدین الہلالیؒ کی علمی شان میں کوئی دھبہ لگائے بغیر انتہائی سنجیدگی اور متانت سے قوی و مستحکم دلائل کی روشنی میں ان کے اجتہاد کا رد کیا گیا ہے اور حق کی وضاحت کی گئی ہے۔

مولانا مرحوم کی کتابوں کی خوبیوں پر گفتگو کے لیے سیکڑوں صفحات درکار ہوں گے، ہمیں ان کتابوں پر تبصرے کرنے کی یہاں ضرورت نہیں، بلکہ ہم تو صرف یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ مولانا کی جملہ تصنیفات وتالیفات ان کی حمیتِ دینی اور غیرتِ اسلامی کی شہادت دیتی ہیں۔

مگر یہاں ضمناً یہ بات بڑے افسوس کے ساتھ بیان کر رہا ہوں کہ مولانا مرحوم نے جتنی محنت اور

دلجمعی سے کتابیں لکھی ہیں، ان میں کچھ کتابوں کی طباعت اس وقت بوسیدگی کا شکار ہیں۔ خاص کر جامعہ سلفیہ بنارس سے جو ان کی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کے صفحات الٹتے ہی پھٹ جاتے ہیں چہ جائیکہ ان کا مطالعہ کیا جائے!! اسی تناظر میں میں نے مذکورہ عنوان کے تحت ان کی توجہ دلائی ہے!!

مولانا کی تالیفات بوسیدگی کا شکار:

مولانا مرحوم نے جس محنت اور لگن سے اپنی کتابیں تالیف کی ہیں اور مراجع کی چھان بین میں جس قدر تجسس اور عرق ریزی سے کام لیا ہے اس کا اندازہ وہی شخص صحیح طور پر لگا سکتا ہے جو اس میدان کا کھلاڑی ہو یا اس میدان میں کام کرنے کی تگ ودو دیکھ چکا ہو۔ مگر انتہائی افسوس کی بات ہے کہ مولانا مرحوم کی بعض تالیفات کی طباعت اس قدر غیر معیاری ہوئی ہے کہ وہ کتاب کی شان میں گستاخی شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ مولانا کی جو تالیفات معروف ہوگئیں، ان کی طباعت بھی ان کی شایانِ شان ہوئی۔ مثلاً 'الرحیق المختوم' اور 'تجلیات نبوت' وغیرہ۔ مگر جو کتابیں معروف نہ ہوئیں، ان کی پرانی طباعت اس وقت بوسیدگی کا شکار ہے۔ البتہ ان کی عربی تالیفات بہت ہی معیاری اور خوبصورت انداز میں شائع ہوئی ہیں۔ کیونکہ عرب ممالک میں ان کی طباعت ہوئی ہے۔ اور الحمدللہ عرب ممالک میں موجودہ زمانہ میں کتابوں کی طباعت کا معیار بہت ہی بلند اور عمدہ ہے۔ لیکن مولانا کی جو عربی کتابیں جامعہ سلفیہ سے شائع ہوئیں وہ بھی اردو کتابوں کی طرح بوسیدگی کا شکار ہیں۔

جامعہ سلفیہ بنارس میں کتابوں کی تحقیق وتالیف میں جو تیزی آئی تھی اور جس قدر محنت سے اس کے باحثین نے عربی اور اردو زبانوں میں دینی وعلمی اور اصلاحی کتابیں تیار کی تھیں، بہت ہی جلد کتابوں کی اشاعتی دنیا میں اس نے اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔ مگر نہ معلوم اب اس کا طباعتی معیار اتنا بوسیدہ کیوں ہوگیا۔ مولانا مرحوم کی جو کتابیں بھی جامعہ سلفیہ سے شائع ہوئی تھیں، اب وہ انتہائی بوسیدگی کا شکار ہیں۔ میرے پاس مولانا کی جتنی بھی مطبوعات ہیں، ان میں سب سے غیر معیاری اور بوسیدہ طباعت جامعہ سلفیہ ہی کی ہے۔ مولانا کی کتاب ''فتنۂ قادیانیت اور مولانا ثناء اللہ

امرتسری'' بھی میرے سامنے ہے۔

سب سے پہلے میں نے یہ کتاب غالباً 1992ء میں عمر آباد سے خریدی تھی۔ آج سے تقریباً چھ ماہ قبل جب دوسری مرتبہ مرکزی جمعیت اہل حدیث دہلی سے یہ کتاب خریدی تو اتفاق سے وہی ایڈیشن ملا جو 1992 میں میں نے خرید رکھی تھی۔ اس کتاب کی بوسیدگی کا حال یہ ہے کہ ایک صفحہ کو نشان کے طور پر جہاں سے الٹیں پھٹ جاتا ہے۔ البتہ مولانا کی کتاب ''قادیانیت اپنے آئینے میں'' بھی میری لائبریری میں موجود ہے جس کی طباعت پاکستان سے ہوئی ہے اور جامعہ سلفیہ کے مقابلے میں اس کی طباعت معیاری اور بہت عمدہ ہے۔ چاہیے تو تھا کہ جامعہ سلفیہ میں ادارۃ البحوث العلمیۃ کے ذمہ داران مولانا کی تمام تر کتابیں (جس کے حقوق ان کے پاس محفوظ ہیں) اچھے کاغذ اور عمدہ ٹائٹل کے ساتھ شائع کرتے۔ مگر وہاں کی مطبوعات دیکھ کر سچ پوچھیں تو سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ اتنی اچھی مواد سے پُر کتابیں ہیں مگر بوسیدگی اور غیر معیاری طباعت کے باعث اپنی اہمیت کھو چکی ہیں۔

میں جامعہ سلفیہ کے ادارۃ التحقیق والتالیف کے ذمہ داران کی توجہ کتابوں کی طباعت کی طرف مبذول کرانا چاہوں گا کہ اگر آپ مولانا مرحوم کی کتابوں کے ساتھ دوسری تالیفات کو بھی زمانے کے تقاضے کے مطابق نئے انداز سے شائع کرنے کی طاقت رکھتے ہیں تو کریں۔ ورنہ اگر استطاعت نہیں ہے تو پھر ان کتابوں کے حقوق کسی مستحق کو دے دیں تاکہ وہ ان کتابوں کی شایانِ شان ان کو طباعت کے مراحل سے گزار سکے!!

مولانا مرحوم کی یومیہ روٹین:

میری تحریر کا ذیلی عنوان عام طلبہ کے لیے اور خاص طور سے طالبانِ علوم نبوت کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہوگا۔ کیونکہ زمانۂ طالبعلمی میں جب اساتذۂ کرام طلبہ کے سامنے پڑھنے اور محنت کرنے کی بات کرتے ہیں تو طلبہ کے لیے ایک تجویز کی کمی رہ جاتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ طالب علم کتنی محنت کرے، کب کب کرے، وقتِ مطالعہ کیا ہو، کتنی دیر کام کرے اور کتنی دیر آرام، غرض یہ ایک ایسا سوال ہے جو خاص کر طلبہ کے لیے موضوع بنا رہتا ہے۔

محنتی طلبہ میں کچھ کرگزرنے کا جذبہ دوسروں کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی ہوا کرتا ہے۔اس لیے وہ رات دن میں جب اور جس وقت بھی تھوڑا بہت وقت پاتے ہیں، اس میں کچھ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ایسے طلبہ ہمہ وقت اس سوال کا جواب جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم کتابوں کے مطالعے میں اپنا کتنا وقت صرف کریں۔اس موقع پر میں بھی زمانۂ طالب علمی میں ایک مرتبہ شش وپنج کا شکار رہا تھا۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھ رکھا تھا کہ ہر طالب علم کو چاہیے کہ وہ زندوں یا مردوں میں سے ایک کی زندگی کو اپنے لیے آئیڈیل اور نمونہ بنالے، اور اس کی زندگی کے تمام گوشوں کو غور سے دیکھے کہ اس نے اپنی زندگی کو کامیاب بنانے میں کس قدر محنت ومشقت سے کام لیا ہے اور کس کس موڑ پر کون کون سا طریقہ اپنایا ہے۔

میں نے مذکورہ سوال کا جواب جاننے کے لیے ایک مفکر کی محنت وکامیابی کو آئیڈیل کے تناظر میں دیکھتے ہوئے خط لکھا تھا کہ ہم طلبہ کو دن اور رات میں کتنا وقت پڑھنے لکھنے اور مطالعہ کرنے میں لگانا چاہیے اور سونے میں کتنا؟! اس نے میرے سوال کے جواب میں لکھا تھا:

> ”آدمی کتنی دیر کام کرے اور کتنی دیر آرام۔اس کا کوئی ایک اصول نہیں ہر آدمی کو اپنے تجربہ کی روشنی میں اس کا تعین کرنا چاہیے“۔

اب جب کہ میں نے مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کے متعارفین میں سے کئی لوگوں سے مولانا مرحوم کے یومیہ روٹین کے بارے میں معلومات لی ہیں، مجھے یقین ہے کہ جن طلبہ کے اندر مستقبل میں کچھ کرگزرنے کا لگن اور جستجو ہے، اگر مولانا کو اپنا آئیڈیل تسلیم کرلیں تو علمی دنیا میں ان کی ترقی وکامیابی اسی رفتار سے قریب آتی چلی جائے گی جس قدر اخلاص ومحبت کے ساتھ ان کی محنت اور لگن ہوگی۔

مولانا مرحوم زمانہ طالب علمی ہی سے بہت محنتی تھے۔رات کو جاگ کر سبق یاد کرنا ان کا معمول تھا۔درس وتدریس کے بعد جو بھی وقت ملتا اس میں مطالعہ کرتے، لکھتے پڑھتے، تصنیف وتالیف میں لگے رہتے، رات گئے تک لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے۔ ہندستان میں کڑی محنت ومشقت کے ذریعے آپ نے علمی حلقوں میں اپنی پہچان بنالی۔ ہندستان سے جب آپ 1988ء میں مرکز

خدمۃ السنۃ مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہاں بھی آپ نے اپنی محنت ومشقت کا تسلسل باقی رکھا اور تعلیم وتعلم سے اپنے جملہ اوقات کو مربوط رکھا۔

حافظ فاروق عمری ومدنی حفظہ اللہ ہندستان کے معروف صوبہ آندھرا پردیش کے مشہور شہر کرنول کے ہیں۔ 1993ء سے سعودی عرب کے شہر حائل کی جالیات میں اردو داعی کی حیثیت سے دعوتی وتبلیغی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے مولانا کے یومیہ روٹین کے بارے میں مجھے بتایا، اور یہ خود انہوں نے مولانا مرحوم سے مسجد نبوی میں بیان کرتے ہوئے سنا بھی ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

فجر کی نماز کے بعد مولانا 7:30 تک مطالعۂ کتب اور لکھنے پڑھنے میں مشغول رہتے۔ صبح 7:30 میں ناشتہ کر کے آفس (مرکز خدمۃ السنۃ) جاتے اور وہاں دوپہر ڈھائی بجے تک مرکز کا کام کرتے۔ آفس سے جب اپنے سکن میں واپس آتے تو کھانا کھا کر پھر پڑھنے لکھنے میں مشغول ہوجاتے اور یہ سلسلہ عصر کی نماز تک جاری رہتا۔ بعد نماز عصر بھی آپ کا معمول تھا کہ لکھنے پڑھنے میں لگ جاتے۔

مغرب سے پانچ دس منٹ قبل آپ مسجد نبوی میں تشریف لے جاتے۔ یہ آپ کا روزانہ کا معمول تھا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر باب الرحمۃ سے متصل باب الملک سعود کے پاس بیٹھ جاتے۔ جامعہ اسلامیہ کے طلبہ کو مولانا کا معمول معلوم تھا اس لیے وہ بھی مولانا کے پاس آکر بیٹھ جاتے۔ مولانا سے سوالات کرتے اور مولانا ان کا تشفی بخش جواب دیتے۔ جامعہ اسلامیہ میں تقریباً پوری دنیا کے ممالک کے طلبہ پڑھتے ہیں۔ ہر ملک کا طالبعلم مولانا سے استفادہ کی غرض سے وہاں حاضر ہوتا اور مولانا سے علیک سلیک کے بعد کچھ مسئلے مسائل دریافت کرتا۔ آپ کی گفتگو لطیف واقعات سے پُر ہوتی۔ آپ کے ساتھ سوال وجواب اور گفتگو کا سلسلہ عشاء تک چلتا رہتا۔

اس دوران طلبہ آپ سے محظوظ ہوتے اور آپ بھی ان کے سوالات سے محظوظ ہوتے۔ بلکہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں مغرب سے عشاء تک مسجد نبوی میں ذہنی تفریح کے لیے آتا

ہوں تاکہ میرا موڈ فریش ہوجائے اور عشاء بعد اپنے علمی کاموں میں مشغول ہوجاؤں۔

بعد نمازِ عشاء مولانا مسجد نبوی سے اپنے سکن چلے جاتے اور 11 بجے رات تک لکھنے پڑھنے اور علمی کاموں میں مصروف رہتے۔ اس کے بعد سو جاتے اور فجر میں اٹھنے کے بعد دوسرے روز بھی وہی روٹین شروع ہوجاتی''۔

مذکورہ تفصیلات سے مولانا کی بے حد محنت و مشقت اور لگن و جستجو کا پتہ چلتا ہے۔ دراصل مولانا مرحوم اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ کامیابی و کامرانی اور فلاح و بہبودی کا راز آدمی کی اپنی سچی محنت و لگن اور جدوجہد میں پنہاں ہے۔ جو شخص جتنا زیادہ کامیاب ہونا چاہتا ہے اسے اسی قدر زیادہ محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے۔ انگریزی میں ایک مقولہ ہے:

''Hard work is the key of success''

''محنت و مشقت ہی کامیابی و کامرانی کی کنجی ہے''۔

ایک عربی شعر میں شب بیداری کر کے محنت کرنے کو ہی کامیابی کا زینہ بتایا گیا ہے۔

بِقَدْرِ الْكَدِّ تُكْتَسَبُ الْمَعَالِي

وَمَنْ طَلَبَ الْعُلَى سَهِرَا للَّيَالِي

وَمَنْ طَلَبَ الْعُلَى مِنْ غَيْرِ كَدِّ

أَضَاعَ العُمْرَ فِي طَلَبِ المُحَالِ

''آدمی کو اس کی محنت کے مطابق ہی کامیابی و ترقی ملتی ہے۔ جسے بلندی درکار ہوتی ہے وہ راتوں کو جاگتا ہے (اور خوب محنت کرتا ہے)۔ جس نے بلندی بغیر کسی محنت کے طلب کی، گو اس نے ناممکن چیز کے حصول میں اپنی عمر برباد کیا''۔

یقیناً مولانا مرحوم نے اللہ کے فضل و کرم اور پھر اپنی محنت و مشقت سے وہ اعلیٰ کامیابی حاصل کر لی تھی جس کے وہ مستحق تھے۔ یہ شعر انہی جیسے محنتی افراد کے لیے کہا گیا ہے۔

زیب دیتا ہے اسی کو سرخ پتوں کا لباس

جو شجر صحرا کی تپتی دھوپ میں پلتا رہا

طلبہ یا جو بھی افراد اپنے یومیہ روٹین کے بارے میں کوئی تجویز چاہتے ہیں انہیں مولانا مرحوم کی زندگی اور ان کے یومیہ روٹین سے استفادہ کرنا چاہیے۔

مولانا مرحوم اور امارتِ اہل حدیث ہند:

مولانا مرحوم جن دنوں مرکز خدمۃ السنۃ مدینہ سے مکتبہ دارالسلام ریاض میں تشریف لائے، مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کی امارت آپ کے لیے اپنی کرسی تیار کر رہی تھی۔ مولانا مختار احمد ندوی رحمہ اللہ اس وقت امیرِ جماعت تھے۔ جماعتی اختلافات کے سبب اب ان کے لیے امارت کا منصب سنبھالنا محال تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اب مرکزی جمعیت اہل حدیث کو ضرورت تھی ایک ایسے امیر کی جو اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکے۔ جمعیت اہل حدیث ہند کے ممبران اور عوام الناس کی نگاہیں بڑی بے قراری سے کسی مناسب اور قابل امیر کو تلاش کر رہی تھیں۔ اجتماعی طور پر مشورے ہوئے، انفرادی طور پر بھی اہل فکر ونظر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سب کی رائے اس پر متفق ہو گئی کہ اس عظیم عہدے کے لیے چونکہ کوئی عظیم شخصیت ہی درکار ہے اور موجودہ وقت میں مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری سے زیادہ مناسب شخصیت نظر نہیں آئی، اس لیے انہی کو جمعیت اہل حدیث ہند کا امیر منتخب کر دیا جائے۔

امیرِ جمعیت اہل حدیث ہند کے انتخاب کے لیے جب کوششیں جاری تھیں تو اس موقع پر مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ ہندستان سے باہر سعودی عرب میں تھے۔ ذمہ دارانِ جمعیت اہل حدیث نے مولانا سے اتصال کیا اور امارت سنبھالنے سے متعلق ساری تفصیلات انہیں بتائی گئیں۔ مولانا مرحوم نے اس موقع پر سعودی عرب میں پھیلے اپنے شاگردوں اور معتقدین سے رائے ومشورہ کیا۔ اس سلسلے میں کئی ایک مجلسیں قائم ہوئیں۔ مکہ میں بھی بیٹھک ہوئی۔ جمعیت اہل حدیث سے تعلق رکھنے والوں کا اتفاق تھا کہ مولانا کو یہ منصب سنبھال لینا چاہیے۔ چنانچہ مولانا نے مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کی امارت کا عہدہ قبول کر لیا اور 19 جولائی 1998ء کو اس عظیم منصب پر رونق افروز ہو گئے۔

جس دنوں مولانا کی امارت سنبھالنے کی بات چل رہی تھی، میں جامعہ ریاض العلوم دہلی میں زیر تعلیم تھا۔ ریاض العلوم سے مرکزی جمعیت اہل حدیث میں برابر آنا جاتا رہتا تھا۔ مولانا کے لیے جو کمرہ تیار کیا جا رہا تھا اس میں ٹائل وغیرہ لگ رہے تھے۔ مشہور تھا کہ مولانا مرحوم اس کمرے میں بیٹھا کریں گے۔ ہم طلبہ کو یہ سن کر قدرے خوشی ہوتی۔ میں اور لیاقت علی بن شوکت علی (ٹانڈہ بادلی، مراد آباد یوپی) نامی میرے ایک دوست تقریباً روزانہ ہی جمعیت جایا کرتے تھے اور وہاں مولانا سے متعلق باتیں سنا کرتے تھے۔

مولانا مرحوم کے امارت سنبھالنے کے بعد جمعیت پہلے جس رفتار سے چل رہی تھی اسی رفتار سے چلتی رہی۔ مولانا نے کئی دفعہ کوشش کی کہ جمعیت کا وہ بوسیدہ نظام جو ایک زمانے سے چلتا آ رہا ہے اور جس کا حالات حاضرہ سے کوئی لگاؤ نہیں، اس کو تبدیل کر کے نئے نظام کی تشکیل ہو اور جمعیت جو برسوں سے منجمد تھی اس میں ایک اسپرٹ ہو؛ تاکہ جمعیت کے کاز کو آگے بڑھایا جا سکے۔ مگر لاکھ کوشش کے باوجود مولانا کو اپنی فکر و نظر ماند پڑتی نظر آئی اور انہیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ جمعیت برسوں سے تجمد کا شکار ہے، اس کے اوپر وہ برف نہیں ہے جو دیر یا سویر دھوپ کی تپش سے پگھل جائے گی؛ بلکہ اس کے اوپر برف نما چٹیل زمین کا سایہ ہے جس پر گرمی بھی بے اثر، سردی بھی بے اثر۔

چنانچہ مولانا مرحوم نے اپنی عزت پانی طے کر کے جمعیت سے علیحدگی اختیار کر لینے میں اپنی عافیت سمجھی اور تقریباً دو سال بعد 3 / اگست 2000ء میں جمعیت کی امارت سے مستعفی ہو گئے۔

عہدۂ امارت سے مستعفی ہونے کے اسباب:

یہ ایک ایسا موڑ ہے جہاں سارے ہی لوگوں کی زبانوں پر تالا لگ جاتا ہے مگر میں نے ان کی ڈگر سے ہٹ کر یہ تحریر قلمبند کی ہے۔ اس سلسلہ میں کئی طرح کی باتیں سامنے آئیں۔ کوئی کہتا ہے کہ مولانا مرحوم سعودی عرب نہیں چھوڑنا چاہتے تھے، اس لیے انہوں نے استعفیٰ دے دینے میں ہی اپنی بھلائی سمجھی۔ حالانکہ مولانا کا خود بیان تھا کہ جمعیت کے افراد میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے ملنے کو تیار نہیں ہے اور بغیر کسی تحریک کے کوئی تحریک ہو ہی نہیں سکتی!!

مولانا نے جب دیکھا کہ جمعیت جو کئی سالوں سے بے حس وحرکت بغیر کسی اصول کے چل رہی ہے،اس میں ترمیم لائی جائے۔مگر جمعیت کے ذمہ داران نے مولانا کی آواز پر کچھ دھیان نہ دیا حتی کہ ایک مرتبہ مولانا مرحوم اور جمعیت کے بعض ارکان کویت میں بیک وقت موجود تھے۔ جمعیت کے متعلق سرگرمیاں جاری تھیں۔سارے کاغذات مولانا مرحوم ہی کے دستخط سے گزرتے مگر اصل مقصد مولانا سے اوجھل تھا۔اسی دوران جب مولانا کو حقیقت کا علم ہوا تو وہ اس حرکت سے کافی کبیدہ خاطر ہوئے اور امارت کے عہدے سے استعفیٰ دینے میں ہی بھلائی سمجھی۔

یہ جو خیال کیا جاتا ہے کہ مولانا مرحوم چونکہ سعودی عرب چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، اس لیے انہوں نے جمعیت کی امارت سے استعفیٰ دے دیا۔اس بات میں کچھ زیادہ وزن نہیں لگتا۔کیونکہ مولانا خود کہا کرتے تھے کہ اگر امریکہ کا صدر ایک حصے میں رہ کر دوسرے حصے پر حکمرانی کرسکتا ہے تو کیا میں سعودی عرب میں رہ کر ہندستان میں جمعیت اہل حدیث کا عہدہ نہیں سنبھال سکتا ہوں؟اس لیے مولانا کے امارت سے مستعفی ہونے کا سبب یہ نہیں کہا جاسکتا۔

درست بات تو یہی ہے کہ مولانا چونکہ ایک اصول پسند آدمی تھے اور جمعیت کو بھی آپ اصول کی بنیاد پر چلانا چاہتے تھے،مگر جمعیت جو کہ کافی دنوں سے اصول سے ہٹ کر چل رہی تھی،آپ کے اصولی پسند موقف کو قبول نہ کرسکی یا یہ کہ آپ ہی نے اس کے غیر متوازن اصول سے خود کو علیحدہ کرلیا!!

ایسے موقع پر ہم تو یہی کہیں گے کہ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے اراکین وذمہ داران اصول پر چلنے چلانے کا خوگر بنے اور بنائیں۔پھر انشاءاللہ دیکھتے ہی دیکھتے جمعیت ترقی کی راہ پر گامزن ہوجائے گی۔

وفات حسرت آیات:

مولانا مرحوم بچپن ہی سے بہت ہی زیادہ صحت مند تھے اور ماشاءاللہ اس صحت کو انہوں نے بہت ہی اچھے طریقے سے استعمال بھی کیا۔اپنے اوقات کو کبھی فضول کاموں میں ضائع نہیں کیا۔ جیسا کہ عام طور سے مدارس کے اساتذہ گپ شپ میں اپنے قیمتی اوقات ضائع کردیتے ہیں۔یہی

محنت ومشقت کا سلسلہ مولانا نے مملکت سعودی عرب میں بھی سروس کے دوران جاری رکھا جیسا کہ میں نے مولانا کے یومیہ روٹین کے عنوان سے ان کی زندگی میں اوقات کے استعمال کا مفصل خاکہ پیش کردیا ہے۔

مگر بیماری بھلا کسے چھوڑتی ہے۔زندگی بھر انسان کافی احتیاط کی کوشش کرتا ہے مگر جب بیماری اس کے اوپر منڈلانے لگتی ہے تو اس کی ساری تدبیریں اور جملہ احتیاطات دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔مولانا مرحوم پورے آب وتاب کے ساتھ اپنی علمی زندگی کے خوش نما مراحل طے کر رہے تھے اور سیرت وتاریخ اور حدیث وتفسیر میں سے موتیاں چن چن کر قیمتی ہار بنانے میں مصروف عمل تھے کہ اچانک 1994ء میں مدینہ منورہ میں آپ پر فالج کا حملہ ہوا۔فالج ایک انسان دشمن بیماری کا نام ہے جو جس پر بھی حملہ بول دے، اسے ناکارہ بنا کر رکھ دیتی ہے۔اس کی زندگی کے سارے منصوبے اور عزائم کو خاکستر کردیتی ہے۔

مولانا مرحوم کے ایک قریبی رشتے دار نے مجھے بتایا کہ ایک روز مولانا جامعہ اسلامیہ سے ڈیوٹی کر کے آئے اور کام میں لگ گئے۔دن بھر کام کیا اور رات میں کام کرتے رہے۔گھر والے سو چکے تھے اور آپ کام میں مشغول رہے۔رات کا کافی حصہ گزر چکا تھا۔آپ کام کرتے کرتے تھک گئے تو آپ کو پانی پینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔آپ فریج کے پاس گئے اور اس سے ٹھنڈا پانی نکال کر کچھ زیادہ ہی پی لیا۔صبح ہوئی تو آپ پر فالج کے آثار نمایاں تھے۔اور اسی روز آپ پر فالج کا پہلا حملہ تھا۔مولانا مرحوم پر جونہی فالج کا حملہ ہوا، آپ کو مدینہ کے ہسپتال میں بغرض علاج داخل کردیا گیا۔آپ دس روز تک ہسپتال میں رہے اور آپ کا علاج ہوتا رہا۔قدرے افاقہ ہوا تو ہسپتال سے چھٹی مل گئی۔کچھ دنوں تک عصا کے سہارے چلتے پھرتے رہے اور الحمد للہ آہستہ آہستہ آپ کی صحت بحال ہوگئی۔اس کے بعد آپ اپنے کاموں میں مشغول ہوگئے۔عام آدمی کو اندازہ کرنا مشکل تھا کہ آپ پر فالج کا کبھی حملہ بھی ہوا تھا۔

1998ء میں جب آپ مکتبہ دارالسلام ریاض تشریف لائے تو یہاں بھی آپ حسب دستور علمی وتحقیقی اور دعوتی سرگرمیوں میں مشغول رہے۔2001ء میں جمعہ کا دن تھا۔آپ نے ریاض کے

معروف علاقہ حی الوزارت کے ہوٹل ''الحمراء'' میں دوپہر کا کھانا کھایا۔اس وقت آپ کے ساتھ مکتبہ دارالسلام کے سینئر انگلش مترجم جناب سعید الدین صاحب اور جناب محمد ایوب سپرا کیلانی صاحب تھے۔ان دونوں صاحبان کا تعلق کراچی سے ہے۔ جناب سعید الدین صاحب نے مجھ سے بتایا کہ ہم تینوں آدمیوں نے مذکورہ ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھایا۔کھانے میں نہاری، پائے، بریانی اور کھیر تھی۔کھانا کھا کر دارالسلام کے سکن آرہے تھے کہ سڑک پر اچانک مولانا پر فالج کا حملہ ہوا اور آپ گر پڑے (1)۔ ساتھیوں نے تعاون کیا اور آپ کو فوراً ریاض کے مشہور ہسپتال ''مستشفی العبید'' میں بھرتی کر دیا گیا۔آپ کو افاقہ تو ہو گیا مگر اس کے بعد آپ کی صحت بحال نہ ہو سکی۔ بلکہ آپ کی صحت روبہ زوال ہونے لگی۔ پھر آپ کو ریاض کے کنگ خالد ہسپتال میں منتقل کیا گیا جہاں آپ کا علاج ذمہ داری کے ساتھ چلتا رہا۔اس کے بعد آپ ریاض سے ہندستان تشریف لے گئے۔

2001ء سے 2006ء کی درمیانی مدت میں غالباً آپ دو یا تین مرتبہ سعودی عرب تشریف لائے اور ذوالقعدة ۱۴۲۶ھ کو جب ہندستان گئے اور 9 جون 2006ھ کو سعودی عرب آنے کا ٹکٹ ریزرو تھا کہ جون کے ابتدائی ہفتے میں آپ پر پھر فالج کا حملہ ہو گیا۔اس مرتبہ آپ اس قدر کمزور ہو گئے کہ آپ کا چلنا پھرنا ناممکن ہو گیا۔آپ صاحبِ فراش ہو گئے۔آپ کو بنارس کے ایک ہسپتال میں علاج کے لیے داخل کیا گیا۔مگر اس علاج سے آپ کو کوئی فائدہ نہ ہو رہا تھا۔آپ کی صحت بحال ہونے کی بجائے دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی، جسم لاغر ہوتا جا رہا تھا۔ بالآخر رب ذوالجلال کا بلاوا آ ہی گیا۔اور یکم دسمبر 2006ء بروز جمعہ دوپہر پونے تین بجے علم وعرفان کا ٹمٹماتا

(1) مولانا کو شوگر کا بھی مرض تھا۔کسی حکیم نے انھیں بتایا تھا کہ شوگر کے مریض کو میٹھی چیزیں کھانے میں کسی قسم کا پرہیز کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ میٹھا کو میٹھا ہی کاٹتا ہے۔مولانا اس حکیم کی بات پر اعتماد کر کے چینی اور میٹھی چیزوں سے کچھ بھی پرہیز نہیں کرتے تھے۔آج بھی نہاری، پائے اور بریانی کے ساتھ کھیر کھا کر آرہے تھے کہ راستے میں آپ کا بلڈ پریشر ہائی ہو گیا اور جو فالج کا سبب بنا۔ سچ کہا ہے کسی نے

نیم حکیم خطرۂ جان　　　اور نیم ملا خطرۂ ایمان

ہوا یہ چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

نمازِ جنازہ:

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مولانا مرحوم کو جلد از جلد سپرد خاک کر دیا جاتا۔ کیونکہ رسول اکرم ﷺ کی یہی تعلیم ہے کہ میت کو جلدی سے جلدی اس کے مقام تک پہنچا دیا جائے۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"أَسْرِعُوا بِالْجَنَازَةِ فَإِنْ تَكُ صَالِحَةً فَخَيْرٌ تُقَدِّمُونَهَا وَإِنْ يَكُ سِوَى ذَٰلِكَ فَشَرٌّ تَضَعُونَهُ عَنْ رِقَابِكُمْ".

"جنازے کو جلدی سے لے جاؤ، اگر وہ نیک ہے تو اس کے لیے بھلائی ہے کہ تم اسے اس کے مقام تک پہنچا رہے ہو، اور اگر برا ہے تو پھر (یہ تمہارے لیے بہتر ہے کہ) تم اسے اپنے کندھوں سے اتار دو گے"(1)۔

مگر مولانا کے صاحبزادے ہشام مدنی کے آنے کے انتظار میں دفن میں تاخیر ہو گئی۔ اور دوسرے روز یعنی 2 دسمبر 2006ء کو تقریباً ساڑھے تین بجے دوپہر کو آپ کا دفن عمل میں آیا۔ آپ کے صاحبزادے ہشام مدنی نے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ آپ کے جنازے میں ممبئی، دہلی، لکھنؤ اور نیپال وغیرہ سے آئے ہوئے ہزاروں افراد نے شرکت کی اور پرنم آنکھوں کے ساتھ انتہائی حزن وغم کے ساتھ مولانا کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچایا گیا۔

"اللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ وَعَافِهِ وَاعْفُ عَنْهُ وَنَوِّرْ قَبْرَهُ وَأَدْخِلْهُ فَسِيحَ جَنَّاتِهِ".

مولانا مرحوم سے کسبِ فیض کرنے والے ان کے شاگرد:

مولانا مرحوم سے کسبِ فیض کرنے والے ان کے شاگردوں کی تعداد لاتعداد ہے۔ ان کی فہرست اتنی لمبی ہے کہ صرف ان کے اسماء کا شمار بھی مشکل ہے۔ اور اگر ان کے روحانی شاگردوں کا شمار کیا جائے تو یہ ناممکن ہے۔ ان روحانی شاگردوں میں راقم الحروف بھی شامل ہے۔ مجھے مولانا

(1) بخاری: 1315، مسلم: 944۔

سے پڑھنے کا موقع تو نہیں ملا مگر میں نے ان سے علمی میدان میں اس وقت استفادہ بہت کیا، جب میں ان کے ساتھ دارالسلام ریاض میں کام کر رہا تھا۔

مولانا مرحوم کے شاگردوں میں سے جو معروف ہیں ان میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں:

☆ شیخ اصغر علی امام مہدی سلفی (ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند)
☆ شیخ عبدالسلام سلفی (امیر صوبائی جمعیت اہلحدیث ممبئی)
☆ شیخ عزیر شمس (معروف محقق، مکہ مکرمہ)
☆ مولانا صلاح الدین مقبول احمد (جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی کویت)
☆ شیخ کفایت اللہ سلفی رحمہ اللہ (سابق استاذ جامعہ ریاض العلوم دہلی)
☆ شیخ عبدالمبین بن صالح سلفی (سابق استاذ بخاری جامعہ ریاض العلوم دہلی)
☆ شیخ ابوالمکرّم عبدالجلیل سلفیؒ (سابق موظف وکالۃ المطبوعات بالوزارۃ، ریاض)
☆ محمد یونس بن عبدالتین مدنی (شیخ الجامعہ جامعہ سلفیہ بنارس)
☆ شیخ حمیداللہ بن انعام اللہ سلفی (ناظم المرکز الاسلامی ممبرہ ممبئی)
☆ شیخ محمد ارشد مدنی (نائب رئیس جامعہ امام ابن تیمیہ بہار)
☆ ڈاکٹر رحمت اللہ سلفی (استاذ جامعہ امام ابن تیمیہ بہار)
☆ مولانا جنید مکی بنارسی (جمعیت شبان اہلحدیث بنارس)
☆ شکیل احمد سلفی (باحث مکتبہ دارالسلام، ریاض)
☆ مولانا نیاز احمد بن ریاض احمد فیضی (مدرسہ منظر العلوم پرسہ، مغربی چمپارن، بہار)
☆ مولانا ابوالقاسم عبدالعظیم مدنی (مدرس جامعہ فیض عام مئو، یوپی)
☆ رضاء اللہ عبدالکریم مدنی (مدیر جریدہ ترجمان، دہلی)
☆ سعید میسور بن محمد الیاس مدنی (مدرس جامعہ سلفیہ بنارس)
☆ شبیر احمد بن ابوالحسن مدنی (ناظم ندوۃ السنۃ، اٹوا بازار، سدھارتھ نگر، یوپی)
☆ عبدالاول بن عبدالرحمٰن (پرنسپل جامعہ رحمانیہ بنارس)

☆ حافظ عبدالبر بن عبدالرب فیضی (مدرس مدرسہ شرفیہ رفیع گنج، گیا)
☆ عبداللہ بن عبدالتواب مدنی جھنڈانگری (ناظم اعلیٰ مدرسہ خدیجۃ الکبریٰ، نیپال)
☆ مولانا ابورضوان محمدی (مدیر ثانویہ واستاذ جامعہ محمدیہ منصورہ مالیگاؤں)
☆ ڈاکٹر اقبال احمد بسکوہری (رئیس قسم السنۃ جامعہ محمدیہ مالیگاؤں)
☆ مولانا عبدالقیوم محمد شفیع بستوی (شارجہ، امارات)
☆ مولانا عبداللہ سعود (ناظم اعلیٰ جامعہ سلفیہ بنارس)
☆ ڈاکٹر بدرالزماں نیپالی (رئیس جامعۃ التوحید، بجوا، نیپال)
☆ مولانا شہاب اللہ مدنی (شارجہ)
☆ مولانا شمیم احمد خلیل (نزیل قطر، رئیس ندوۃ السنۃ، اٹوابازار)
☆ علی حسین بن علی جان سلفی (مدرس جامعہ سلفیہ بنارس)
☆ عبدالواحد بن عبدالقدوس مدنی (ناظم اعلیٰ صفا شریعت کالج، ڈومریا گنج، سدھارتھ نگر)
☆ عبدالمنان بن عبدالحنان (وکیل الجامعہ سراج العلوم جھنڈانگر، ومدیر ماہنامہ السراج)
☆ محمد ابراہیم بن حفظ الرحمٰن مدنی (مدرس ندوۃ السنۃ، اٹوابازار، سدھارتھ نگر، یوپی)
☆ محمد حنیف بن عبدالرشید مدنی (مدرس جامعہ سلفیہ بنارس)
☆ حافظ محمد طاہر حنیف سلفی (داعی مرکز الدعوۃ والارشاد بطحاء ریاض)
☆ محمد بن عبدالقیوم مدنی (مدرس جامعہ سلفیہ بنارس)
☆ ڈاکٹر حافظ نصر اللہ فیضی (مدرس جامعہ رحمانیہ بنارس)
☆ اکرم مختار مدنی بن مولانا مختار احمد ندوی
☆ عزیز الرحمٰن بن عبداللہ سلفی (ریاض، سعودی عرب)

ان کے علاوہ بھی بہت سارے معروف لوگ ہیں جنھوں نے مولانا سے شرف تلمذ حاصل کیا ہے اور جو مختلف میدان میں نمایاں کام انجام دے رہے ہیں۔ یہاں میں نے بطور مشتِ از خاک یہ چند نام بیان کر دیا ہے؛ ورنہ مولانا مرحوم کے شاگردوں کے ناموں کی فہرست بہت

طویل ہے۔

پسماندگان:

مولانا رحمہ اللہ نے اپنے پیچھے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں سوگواروں کو چھوڑا ہے۔ آپ کے روحانی شاگردوں اور عقیدتمندوں کی تعداد لاتعداد ہے۔ آپ نے پسماندگان میں اہلیہ بدر النساء، چار بیٹوں اور چار ہی بیٹیوں کو چھوڑا ہے۔ ان کے علی الترتیب نام یہ ہیں:

(1) فیض الرحمٰن (2) رُمیثہ (3) عاتکہ (4) رُشیدہ

(5) یاسر (6) طارق (7) عامر (8) عطیہ

مولانا مرحوم سے محبت وعقیدت کا ایک منظر:

اس دور میں اگر پوری دنیا میں مسلمانوں کی طرف سے سیرت نبوی کے حوالے سے کسی کو محبت واخلاص ملا ہے تو وہ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ کی ذات ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی محبت والفت کا دم بھرنے والا کم سے کم آپ ﷺ کی سیرت پر لکھی گئی کتابوں میں سے کسی کتاب کا مطالعہ ضرور کرتا ہے اور اگر کوئی لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تو کم از کم کسی کی زبان سے ضرور آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کے متعلق معلومات لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس دور میں جب کسی مسلمان کو رسول اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ پر کوئی کتاب پڑھنے کی توفیق ہوتی ہوگی تو وہ ضرور 'الرحیق المختوم' کے نام سے واقف ہوگا۔ مسلمانوں کا کوئی بھی طبقہ خواہ وہ بریلوی ہو یا دیوبندی، شافعی ہو یا مالکی، حنبلی ہو یا حنفی، اخوانی ہو یا اہلحدیث؟ سارے ہی گروہ کے افراد 'الرحیق المختوم' کو بلاتفریق مسلک ومشرب اپنے مکتبات میں رکھتے ہیں اور اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔

ایسی صورت میں 'الرحیق المختوم' سے لگاؤ کے ساتھ ساتھ اس کے مؤلف سے محبت بھی فطری امر ہے۔ ابھی چند ہی ہفتہ کی بات ہے کہ پاکستان کے شہر پشاور سے ایک دوشیزہ کا خط مولانا مرحوم کے نام آیا تھا، اس میں اس نے مولانا سے دعا کی درخواست کی تھی اور مولانا سے اس کا روحانی تعلق

ان کی کتاب ''تجلیات نبوت'' کے حوالے سے ہوا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ جب یہ کتاب اتنی پاکیزہ ہے تو اس کے لکھنے والا کتنا پاکیزہ ہوگا۔ چنانچہ اس نے بڑے عجز وانکسار سے مولانا مرحوم سے دعا کی درخواست کی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ مولانا یکم دسمبر 2006ء کو اس دنیائے فانی سے ابدی دنیا کی طرف کوچ کر چکے ہیں۔ غرض یہ مولانا مرحوم سے اس کی انتہائی عقیدت کا نتیجہ تھا۔

ایک مرتبہ میں رمضان المبارک کے ایام میں جالیات سُلی ریاض کی طرف سے افطار کے وقت کسی خیمہ میں روزہ داروں کے سامنے کچھ مسئلے مسائل بیان کرنے کی غرض سے گیا، اتفاق سے میں راستہ بھول گیا۔ افطاری کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ اتنے میں ایک سعودی شخص نے میرے پاس اپنی گاڑی لاکر کھڑی کردی اور پوچھا: کس کی تلاش ہے؟ میں نے بتایا: فلاں خیمہ کی تلاش ہے جہاں مجھے افطاری کرنے والوں کے سامنے درس دینا ہے۔ اس نے مجھے اپنی گاڑی میں بیٹھالیا اور میرے مطلوبہ خیمہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستہ میں اس نے میرے بارے میں پوچھا کہ کس ملک سے ہو؟ میں نے بتایا: ہندستان کا ہوں۔ وہ کہنے لگا: ابھی حال ہی میں میری بہن تمہارے ایک ہندستانی کی کتاب پڑھ رہی تھی جو سیرت کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اس کا نام 'الرحیق المختوم' ہے، اس کا مؤلف تو ہندستانی ہے مگر بہت کمال کی کتاب لکھی ہے۔ اور پھر شیخ مرحوم کی تعریفیں کرنے لگا جبکہ کبھی اس نے شیخ مرحوم کو دیکھا بھی نہ تھا۔ وہ شیخ سے اپنی انتہائی عقیدت کا اظہار کررہا تھا۔

مجھے مولانا مرحوم کے ساتھ زیادہ دنوں تک کام کرنے کا موقع نہیں ملا مگر میں نے چند دنوں میں یہ اندازہ لگایا کہ شیخ مرحوم کے عقیدت مندوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ گاہے بگاہے شیخ کے پاس سعودی عقیدت مند آتے اور شیخ کے بارے میں پوچھتے کہ آپ کہاں تشریف رکھتے ہیں؟ بتایا جاتا کہ شیخ صاحب وہ سامنے کرسی پر بیٹھے ہیں تو وہ انتہائی جذبۂ محبت میں آگے بڑھتے اور شیخ کا ماتھا چوم کر ان سے اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار کرتے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے کئی سعودیوں کو دیکھا ہے کہ وہ شیخ صاحب کا ماتھا چوم کر اتنی خوشی کا اظہار کرتے جیسے انہیں کوئی عظیم خوشی مل گئی ہو۔

ایک مرتبہ میں ریاض کے ادارۃ الوافدین میں اپنے بچوں کے ویزوں کی تمدید کے لیے گیا ہوا تھا۔ وہاں مجھے ایک موظف سے باتوں بات میں دوستی ہوگئی۔ اس کا نام صناوی شطیط الحربی تھا۔ وہ

28یا30 سالہ نوجوان تھا۔ اس کو جب معلوم ہوا کہ میں ایک بین الاقوامی ادارے میں باحث ومترجم کی حیثیت سے کام کررہا ہوں تو اس نے مجھ سے خاصی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس نے مجھ سے چند عربی کتابوں کا تقاضا کیا۔ میں نے پوچھا: کس قسم کی کتابیں چاہتے ہو؟ اس نے بمشکل تین کتابوں کا نام بتایا۔ ان میں دو کتابوں کا تعلق عقیدہ سے تھا جبکہ تیسری کا نام 'الرحیق المختوم' بتلایا۔ اس سے 'الرحیق المختوم' اور صاحب 'الرحیق المختوم' کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ایک دفعہ ۲۱/۱۰/۱۴۲۵ ہجری کو میں اپنے سینئر ساتھی عبداللہ عمری مدنی کو امام محمد بن سعود یونیورسٹی کی لائبریری میں لے جارہا تھا۔ وہ مدینہ یونیورسٹی سے ایم اے کے مقالہ کے تکمیل کے لیے آئے تھے۔ اتفاق سے ایک سعودی طالب علم نے یونیورسٹی کے اندر ہی اپنی گاڑی سے میری گاڑی میں ٹکر ماردی۔ یہ بڑا زبردست ایکسیڈنٹ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ہمیں بچالیا۔ میں نے اپنی گاڑی بننے کے لیے ایک ورکشاپ میں دی اور ٹیکسی کے انتظار میں روڈ پر کھڑا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک ٹیکسی میرے پاس آکر رکی۔ میں سوار ہوگیا۔ ڈرائیور سعودی تھا۔ وہ مجھے اجنبی جان کر ٹوٹی پھوٹی عربی میں بات کررہا تھا۔ میں خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور ہاں سے ہاں ملا رہا تھا۔ دورانِ کلام اس نے عامی زبان میں مجھ سے پوچھا:

"في هند في مساجد؟"

اس کا مطلب تھا: "ہندستان میں مسجدیں پائی جاتی ہیں؟"

میں نے اس مرتبہ اس کو عامی زبان کی بجائے فصیح عربی میں ناقدانہ جواب دیا اور کہا:

"عُلَمَاؤُنَا قَدْ عَلَّمُوا عُلَمَاءَكُمْ وَأَنْتَ تَسْأَلُنِي الْيَوْمَ: فِي الْهِنْدِ تُوجَدُ الْمَسَاجِدُ؟".

"ایک دور تھا کہ ہمارے علماء نے تمہارے علماء کو بھی پڑھایا ہے اور آج تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ ہندستان میں مسجدیں پائی جاتی ہیں؟"۔

اتنا سننا تھا کہ وہ تعجب میں پڑ گیا۔ پھر اس کی گفتگو کا رخ مڑ گیا، اور میرے بارے میں پوچھنے لگا کہ تم نے عربی زبان کی تعلیم کہاں سے حاصل کی ہے؟ میں نے جب بتلایا کہ ہندستان میں۔ تو

اسے اور بھی تعجب ہوا۔ میں نے کہا: تعجب مت کرو۔ رابطہ عالم اسلامی مکہ کے بین الاقوامی انعامی مقابلے میں سیرت نبوی کے عنوان پر جس شخصیت نے انعامِ اول حاصل کیا ہے وہ بھی ہندوستانی ہے۔ جن کی کتاب 'الرحیق المختوم' ہے۔ پھر میں نے اس سے عربی کتابوں خصوصاً احادیث کی کتابوں کی نشر واشاعت میں نواب صدیق حسن خان کا حوالہ دیا کہ انہوں نے کس طرح عرب ممالک میں اپنے نمائندوں کے ذریعے عربی کی کتابیں مفت پہنچوائیں۔ غرض جب میں اس کی ٹیکسی سے اترنے لگا تو اس کا کرایہ دیا، مگر اس نے یہ کہہ کر کرایہ لینے سے انکار کر دیا کہ تم نے عربی زبان میں بات کر کے میرا دل خوش کر دیا ہے، اس لیے میں ہرگز تم سے کرایہ نہیں لوں گا۔ اس کا نام صالح تھا۔

وہ چلا گیا۔ ہفتہ دو ہفتہ بعد اپنے ایک دوست عبدالعزیز بن ابراہیم الصبیح کے ہمراہ مجھ سے موبائل پر رابطہ کر کے مجھ سے ملنے آیا۔ میں نے اس ملاقات میں ان دونوں کو ایک ایک 'الرحیق المختوم' ہدیہ میں دی۔ وہ اپنے گھروں کو واپس ہو گئے، مگر آج تک وہ 'الرحیق المختوم' اور صاحب 'الرحیق المختوم' سے بے حد متاثر ہیں۔ آج بھی وہ وقتاً فوقتاً 'الرحیق المختوم' اور اس کے مؤلف کو یاد کرتے رہتے ہیں اور کتاب اور مؤلف دونوں سے انہیں گہری عقیدت ہو گئی ہے۔

دنیا کے طول وعرض میں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں افراد ہیں جو مولانا مرحوم کو بن دیکھے ان سے گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ اس کے لیے ثبوت فراہم کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ بہت سارے افراد جو ذمہ داران ومسئولین سے امیدیں وابستہ نہیں رکھتے تھے، وہ امیدیں مولانا مرحوم سے رکھتے تھے اور خطوط اور ٹیلی فون کے ذریعے مولانا سے رابطہ میں رہتے تھے اور مولانا حتی الامکان ان کی آرزوئیں پوری کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ کم از کم مجھے دو خطوط ایسے ہاتھ لگے جن میں خط لکھنے والوں نے مولانا سے اپنی گہری عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے اپنی امیدوں کا اظہار کیا تھا۔ ایک خط مہاراشٹری زبان میں ترجمہ قرآن کریم کے بارے میں شیخ سے تعاون کی درخواست کی گئی تھی۔ چونکہ خط لکھنے والے صاحب کئی پبلشرز کو اپنی خواہش کا اظہار کر چکے تھے اور انہیں خطوط لکھ چکے تھے کہ وہ مہاراشٹر کی زبان میں قرآن کریم اور اس کی مختصر تفسیر کا ترجمہ کرنا چاہتے ہیں، جب انہیں پبلشر وغیرہ کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تو انہوں نے مولانا مرحوم کی خدمت میں اپنی

خواہش قلم بند کی۔ چونکہ ان دنوں مولانا مرحوم کافی کمزور ہو چکے تھے اور ہندستان جا چکے تھے، اس لیے اس کا جواب لکھنے کے لیے خط میری ٹیبل پر پہنچا۔ مکتبہ دارالسلام کے جنرل مینجر جناب عبدالمالک مجاہد کی خدمت میں دنیا کے مختلف ممالک سے عقیدتمندوں کے خطوط پہنچتے رہتے ہیں۔ کثرتِ مشغولیت کے سبب بسا اوقات بعض خطوط کے جوابات کے لیے مجھے مکلف کر دیتے ہیں۔ اسی ضمن میں مولانا کا خط بھی میری ٹیبل پر پہنچا تھا۔ مولانا مرحوم جب ہندستان سے تشریف لائے، میں نے ان سے اس کا تذکرہ بھی کیا تھا مگر مولانا کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اتنے بڑے پراجیکٹ پر اس عمر میں جبکہ کئی بار فالج کے حملے کا شکار ہو چکے تھے، خاطر خواہ تعاون نہیں کر سکتے تھے۔

غرض مولانا مرحوم کے عقیدتمندوں کی ایک طویل فہرست ہے جن کا شمار ممکن نہیں۔ یہ مولانا کی انتہائی مقبولیت کی دلیل ہے۔

مولانا کی وفات امت مسلمہ میں ایک عظیم خلا:

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ کے انتقال سے امت مسلمہ میں اتنا عظیم خلا ہوا ہے جس کی تلافی کے مستقبل قریب میں کوئی آثار نظر نہیں آرہے۔ اللہ تعالیٰ جلد ہی اس خلا کو پوری کرے۔ دراصل مولانا کی وفات کے ساتھ ہی سیرت نبوی ﷺ کا ایک باب دفن ہو گیا ہے۔ مولانا کو سیرت طیبہ میں اتنی مہارت تھی کہ اس موضوع پر بحث و تحقیق کرنے والے مولانا کو اپنا راہبر مانتے تھے اور صحیح معنوں میں مولانا اس موضوع پر ایک اتھارٹی کی حیثیت رکھتے تھے۔

عربی زبان کا مقولہ ہے:

"مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمِ"

یعنی کسی عالم کی موت سے ایک دنیا کا وجود صفحہ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔

یقیناً مولانا کا شمار انہی عالموں میں تھا جن کی وفات سے خلق کثیر کو خسارہ ہوتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق اس دنیا سے علم چھن جانے سے جہالت کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور یہی حالت ہے جس سے ضلالت و گمراہی لازم آتی ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"إِنَّ اللَّهَ لا يَقْبِضُ العِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ العِبَادِ، وَلَكِنْ يَقْبِضُ العِلْمَ بِقَبْضِ العُلَمَاءِ حَتَّى إِذَا لَمْ يَبْقَ عَالِمًا يَتَّخِذَ النَّاسُ رُؤُوسًا جُهَّالاً، فَسُئِلُوا فَأَفْتَوا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا".

"اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح نہیں اٹھا لے گا کہ اس کو بندوں سے چھین لے۔ بلکہ وہ (پختہ کار) علماء کو موت دے کر علم کو اٹھا لے گا۔ حتیٰ کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنا لیں گے، ان سے سوالات کیے جائیں گے اور وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے۔ چنانچہ وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے"(1)۔

اس حدیث میں صریح وضاحت ہے کہ اس دنیا سے علم اس وقت اٹھ جائے گا جب علماء نہیں رہیں گے۔ اسی لیے ایک عالم کی وفات امت کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے۔ علماء کا وجود اس دنیا کے لیے باعث خیر و برکت ہے۔ علماء نہیں رہیں گے تو علم نہ رہے گا اور جب علم نہ رہے گا تو جہالت کا وجود لازم آتا ہے۔ اور دنیا کی ساری برائیاں جہالت ہی کا دین ہوا کرتی ہیں۔ اسی لیے جاہل کی نفلی عبادت سے عالم کی نیند کو اچھا کہا گیا ہے۔ ایسی صورت میں مولانا صفی الرحمن مبارکپوریؒ کی وفات امت کے لیے عظیم خسارے کا باعث ہے کہ ان کے سانحۂ ارتحال سے رسول ﷺ کی سیرت طیبہ کا ایک باب ہم سے ہمیشہ ہمیش کے لیے بند ہو گیا۔

ہم تمام مسلمانانِ عالم مولانا کے سانحۂ ارتحال سے غمزدہ ہیں، مولانا کے لیے ہم دست بدعا ہیں کہ الٰہی! تو اپنے بندے کو وہی عظیم مقام آخرت میں بھی عطا فرما جو اس عارضی دنیا میں عطا کیا تھا۔ الٰہی! تیرا بندہ تیرے رسول ﷺ کی سیرت پر انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتا تھا۔ انہیں آخرت میں بھی رسول اکرم ﷺ کے محبین میں شامل فرما، الٰہی! تیرے بندے نے تیرے رسول کی حیات سعیدہ پر مقالہ لکھا اور پوری دنیا میں اسے اول پوزیشن حاصل ہوا، الٰہی! قیامت کے روز بھی تو اپنے

(1) بخاری:100، مسلم: 2673۔

بندے کو اپنے گرانقدر انعامات واکرامات سے نواز۔ الٰہی! تیرے اس بندے کی وفات سے ہم مسلمانانِ عالم میں سیرت نبوی کے باب میں ایک عظیم خلا پیدا ہو گیا ہے۔ الٰہی! تو ہمیں جلد ان کا نعم البدل عطا فرما۔ ہم تیرے بندے کی وفات سے غمزدہ ضرور ہیں لیکن تیری لکھی ہوئی تقدیر پر ہم بلا کسی پس وپیش کے راضی برضا ہیں۔ ہم بھی اس موقع پر وہی کچھ کہیں گے جو تیرے نبی ﷺ نے اپنے لخت جگر ابراہیمؑ کی وفات پر کہا تھا:

"إِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبُ يَحْزَنُ وَلَا نَقُولُ إِلَّا مَا يَرْضَى رَبُّنَا، وَإِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا إِبْرَاهِيمُ لَمَحْزُونُونَ".

"آنکھ سے آنسو جاری ہے اور دل غم سے نڈھال ہے، پر زبان سے ہم وہی کچھ کہیں گے جو ہمارے پروردگار کو پسند ہے اور اے ابراہیم! ہم تمہاری جدائی سے غمگین ہیں"(1)۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولانا مرحوم کے حسنات کو قبول فرمائے اور ان کے سیئات کو درگذر فرمائے اور ان کی خدمات کو قبول فرمائے۔ آمین

وصلى الله على نبينا محمد وآله وأصحابه أجمعين

---

(1) بخاری: 1303۔

آہ! مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ

(از: عبدالمعید سلفی، علی گڑھ)

جناب مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری یکم دسمبر 2006ء بروز جمعہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اور دوسرے دن انھیں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

موت سے کس کو رستگاری ہے　　آج تم کل ہماری باری ہے

اس عالمِ خاک وبو میں مولانا مبارکپوری کو 64 سال کی فرصتِ حیات ملی۔ 1942ء میں انہوں نے اس جہانِ ناسوت میں آنکھ کھولی اور 2006ء میں آنکھ موند لی۔ اور اپنے پیچھے سوگواروں کا ایک انبوہ چھوڑ گئے۔ ان کی رحلت پر ان کے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے قدردان سوگوار ہیں۔ کس کو پتہ کب اس دنیا سے وہ رخت سفر باندھ لے۔ کب اس کا کوسِ رحلت بج جائے۔

مولانا صاحب کو اللہ نے جس قدر مہلتِ حیات دی۔ اس میں انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے اور بھرپور زندگی گزاری۔ اللہ نے انہیں ذہانت وفطانت سے سرفراز فرمایا تھا۔ ان کی یہ خوبی ہمیشہ نمایاں رہی اور ہر شے میں نمایاں رہی۔ تدریس، خطابت، تحریر، معاملات، غرض ہر کام پر ان کی ذہانت کی چھاپ رہتی تھی۔ ان کی طالب علمی کا بھی زمانہ ان کی ذہانت کے سبب ممتاز رہا اور طالبعلمی کے بعد عملی دور بھی ان کی ذہانت کی بنا پر نمایاں رہا۔ ایسا لگتا ہے جامعہ سلفیہ کے ساتھ جڑنے سے پہلے تمام اداروں میں ان کی ذہانت کی وسعت نہیں سما سکتی تھی۔ اور جیسے ہی انہوں نے جامعہ میں قدم رکھا ان کی ذہانت کو پھلنے پھولنے کا موقع مل گیا اور ان کی ساری صلاحیتوں کو جلا مل گئی۔

ایک اہم خوبی ان کے اندر یہ بھی تھی کہ وہ بہت باہمت اور بہت مضبوط ارادے کے مالک تھے۔ اس لیے کٹھن حالات میں بھی مایوسی اور شکست خوردگی کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ 1967ء سے پہلے تک کے حالات ان کے لیے زیادہ سازگار نہیں تھے۔ لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری اور اپنی راہ

بناتے رہے۔ان کی صلاحیتیں اوران کی کارکردگیاں کسی کی منت پذیر نہ تھیں۔عام طور پر ماحول ان کے خلاف ہی ہوتا تھا۔لیکن وہ ہر حالات میں اپنی ترقی اور پیش رفت کے لیے راہ نکال لیتے تھے۔ ان کی ذہانت ہمیشہ ان کا ساتھ دیتی تھی۔

جامعہ سلفیہ سے وابستہ ہونے سے پہلے عربی زبان میں تحریر کا انہیں کوئی تجربہ نہ تھا۔لیکن جب عربی زبان میں لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو اس طرح فراٹے سے لکھتے چلے گئے جس طرح اردو میں لکھتے تھے۔ان کی عربی تحریریں برائے تحریر نہ تھیں؛ بلکہ ان میں لطافت، زور اور سلاست ان لوگوں کی عربی تحریروں سے بھی زیادہ تھی جو عربی ماحول میں پلے بڑھے اور برابر لکھتے رہے۔اور الرحیق المختوم سے بڑا ثبوت اس کا کیا ہوگا کہ عالم عرب کی 84 کتابوں میں انہیں اول کا مستحق گردانا گیا۔

الرحیق المختوم کے حوالے سے وہ لمحات ہمیں بھی یاد آتے ہیں جب کتاب کی تالیف میں مولانا جٹے ہوئے تھے اور اس وقت ان کے اوپر ایک کیفیت طاری تھی۔سیرت کے مطالعہ اور تصنیفی لگن سے وہ سرشاری کا لطف اٹھا رہے تھے۔کبھی کوئی عربی شعر موضوع سے متعلق گنگناتے۔کبھی کسی نص کو دہراتے۔یہ شہرۂ آفاق کتاب پانچ چھ مہینوں میں تیار ہوگئی۔میں بھی حاضر تھا وہاں۔ بات یہ ہے کہ تسوید کے بعد حضرت مولانا کو اس کی تبییض کی فرصت نہیں تھی۔اس لیے طے یہ ہوا کہ میں اس کی تبییض کروں۔مغرب سے عشاء تک دو مہینہ پیہم اس کی تبییض ہوتی رہی۔اس بیچ الیاس میاں مقیم ریاض کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ چائے تیار کرکے ہم لوگوں کو چستی پہنچائیں اور ہم دو حضرات کام میں جم کر لگے رہیں۔

اللہ نے انہیں صلاحیت بھی عطا کی اور کام کرنے کی توفیق بھی دی۔انھوں نے عربی اردو میں کئی درجن کتابیں لکھی اور انہیں قبول عام بھی حاصل ہوا۔جس کثرت سے 'الرحیق المختوم' مختلف زبانوں میں چھپی تقسیم ہوئی اور پڑھی گئی آزادی کے بعد مشکل ہی سے سیرت کی کسی کتاب کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی ہوگی (1)۔

(1) آزادی ہی نہیں؛ بلکہ کئی صدیاں کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ازمرتب

اس کتاب نے مولانا کو عظمت کی چوٹیوں پر پہنچادیا۔ وہ ان کی دنیاوی کامیابی کا ذریعہ بن گئی اور امید یہی ہے وہ ان کے لیے ذخیرۂ آخرت ثابت ہوگی۔ دعا بھی ہے کہ اللہ انہیں اس کتاب کے ذریعہ آخرت میں بھی سرفراز فرمادے۔

مولانا نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور آٹھ دس سال تک ماہنامہ ''محدث'' بنارس کی ادارت کی ذمہ داری نبھائی۔ اس میں ان کے مختلف کالم کافی دلچسپ ہوتے تھے۔ اداریہ، سوالات کے جوابات، کتابوں پر تبصرہ وتجزیہ بھی کرتے تھے۔ خمینی کے انقلاب پر انہوں نے کافی تفصیل سے لکھا تھا اور اسے کافی پسند بھی کیا گیا تھا۔ مولانا کو شعروشاعری کا بھی اچھا ملکہ تھا۔ محدث کے ہر شمارے میں دو ایک نظمیں یا غزلیں چھپتی تھیں اور فنی ومعنوی اعتبار سے قابلِ اصلاح کلام پر اصلاح ضرور دیتے تھے۔ انہوں نے میری کئی غزلیں اور نظمیں چھاپیں اور بہت صائب مشورے دیے اور جس کو پسند فرمایا جم کر داد بھی دی۔ 1983ء کے اسٹرائک پر میری ایک غزل نما نظم محدث میں چھپی تھی۔ اس کا ہر ہر بند اساتذہ نے اپنی پسند کے مطابق گنگنایا۔ اسٹرائک کی انجمن میں نظم دلوں کا ترجمان بن گئی تھی۔

مولانا نے دعوت وتبلیغ کے لیے ملک کے کونے کونے کا دورہ کیا اور دنیا کے کئی ملکوں کا بھی تبلیغی ودعوتی سفر کیا۔ امریکہ، برطانیہ، پاکستان بھی گئے اور بلادِ خلیج کا انہوں نے بارہا دورہ کیا۔ پندرہ سولہ سال تک سعودی عرب میں مرکز السنہ مدینہ منورہ اور دارالسلام ریاض میں علمی وتحقیقی کام کیا۔ ان کے انہماک کا یہ حال تھا کہ جب تک جسم میں طاقت رہی تمام کمزوریوں کے باوجود کام میں لگے رہے۔ بے کار وہ بیٹھ ہی نہیں سکتے تھے۔

1983ء سے لے کر 1985ء تک مجھے بھی جامعہ سلفیہ میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اس وقفے میں اکثر ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہوتا۔ تبادلۂ خیال ہوتا، باتیں ہوتیں۔ مسلمانانِ عالم اور عالمِ اسلام کے متعلق ہمیشہ فکرمند رہتے اور ان کے حالات سے باخبر رہتے۔ ان میں ان کی اپنی ایک رائے رہتی تھی۔ فلسطین اور برصغیر کے مسلمانوں کے متعلق وہ کچھ زیادہ حساس رہتے تھے اور ہمیشہ اپنی

تدبیروں اور منصوبوں کا اظہار کیا کرتے تھے۔ وہ عام علمائے کرام کی طرح ایک سکہ بند قسم کے آدمی نہ تھے۔ وہ مجاہدانہ عزائم کے بھی مالک تھے اور کچھ کر گزرنا چاہتے تھے۔ اللہ نے انہیں جو صلاحیت عطا کی تھی اس کی بنیاد پر انہیں جس کام کا موقع ملتا تھا وہ اس میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ ان کی روشن دماغی ہر مقام پر ان کا مدد و معاون ثابت ہوتی۔ اگر انہیں موقع ملتا تو بہتر جرنلسٹ بن جاتے۔ شاعری کرتے تو کامیاب شاعر ہوتے۔ عسکریت کی طرف جاتے تو بہترین فوجی کا کردار ادا کرتے۔ سیاست کرتے تو بہترین منجھا ہوا سیاست داں بن جاتے۔ ادب کی راہ پر چلتے تو بہترین نقاد بن سکتے تھے۔ خطابت کی تو اس کو بھی اعتبار بخشا۔ مناظرہ کیا تو ایک نقش چھوڑ دیا۔ معلمی کی تو سب سے آگے نکل گئے اور طلبہ کو گرویدہ بنا لیا۔ تحقیق و دراسہ کا کام کیا تو اشراف و سیادت کے منصب پر فائز رہے۔

سفر و حضر میں میرا ان کا بہت ساتھ رہا۔ سفر میں بھی ان کا ساتھ بہت دلچسپ ہوتا تھا اور حضر میں بھی۔ حضر میں رہتے تو ان کی ذہانت کے شگوفے کھلتے اور پھلجھڑیاں چھوٹتی رہتیں۔ چٹکلے، علمی و ادبی نکتے، مشاہدے، تبصرے، سیاست پر تبصرہ، اقوام و ملک پر تبصرہ، علمائے کرام پر تبصرہ، سیاست دانوں پر تبصرہ، عام انسانوں پر تبصرہ۔ ان کا ذہن ہمیشہ کام کرتا اور عام لوگوں اور عام امور میں بھی دلچسپ نکتے نکال لاتے۔ ان کی قوتِ مشاہدہ بہت زبردست تھی۔ شگفتگی اور ٹھہراؤ ان کا خاص اسٹائل تھا۔ ہر دم مسکراہٹ ان کے لبوں پر کھیلتی رہتی۔ غم میں بھی مسکراہٹ، خوشی میں بھی مسکراہٹ، ان کی شگفتگی اور ان کی شخصیت کا آئینہ دار تھی۔ اور ان کی مسکراہٹ ان کی ذہانت کا ترجمان۔ اپنی شگفتگی اور ٹھہراؤ سے لگتے تھے وہ ایک زندہ دل باحوصلہ اور باہمت انسان ہیں۔ مشکلات میں گھبرانا نہیں جانتے تھے اور حالات کیسے بھی ہوں ان کا سامنا کرنا جانتے تھے اور جب ذہن کو کوئی نکتہ سوجھتا تو مسکراہٹ لبوں پر کھیلنے لگتی اور کبھی ان کی مسکراہٹ شرارت آمیز ہوتی اور ایسے نکتے کے ساتھ اس کی آمد ہوتی کہ سامنے والا جھیل جاتا۔ دراصل ذہین انسان یبوست کا شکار نہیں ہوتا اس کا ذہن کچھ نہ کچھ نیا لاتا رہتا ہے اور آس پاس کے ماحول اور رجحانات ہر ایک کے

متعلق چلتا رہتا ہے اور کچھ نہ کچھ لاتا رہتا ہے۔

انسان کا ذہنی رجحان، ذہنی صلاحیت، اس کی پسند و ناپسند، اس کی زندگی و حرارت کا اندازہ، اس کے روزمرہ معمولات سے ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کون کس معیار کا ہے اور کس کے اندر کتنا دم خم ہے؟ انسان کی زندگی کے بے شمار رخ ہیں۔ وہ سب سامنے ہوں تو بہت سچی تصویر سامنے نکھر کر آتی ہے۔ میں نے ان کی سچی تصویر دیکھی ہے۔ بحیثیت مجموعی وہ اپنے دور کے علماء میں بے شمار علمی و عملی، دعوتی و تربیتی ناحیوں سے ممتاز و نمایاں فرد تھے۔ وہ ایک زندہ دل شگفتہ مزاج عالم تھے۔ ان کے اندر اجتہادی واستنباطی صلاحیت بدرجہ اتم تھی۔ سیاست، رجال، تحریکات کے بارے میں ان کی اپنی ایک رائے ہوتی تھی۔

کتاب وسنت کی تعلیمات کو عام کرنے اور محدثین کے طریقۂ فکر وعمل، اصول ومنہج کو لوگوں تک پہنچانے کا ان کے اندر بھرپور جذبہ تھا۔ انہوں نے طریقۂ سلف کی حقانیت اور اس کی اشاعت کے لیے بے شمار تقریریں کی ہیں۔ ان کے خطابات کی کیسٹیں بازار میں دستیاب ہیں۔ انہوں نے اس منہج کے مطابق لاتعداد تلامذہ کی تربیت کی اور اپنے پیچھے ایک معتبر علمی ورثہ چھوڑا ہے۔

علمی ذہن ومزاج رکھنے والے علماء کا دنیاوی معاملات میں عام طور پر استحصال ہوتا ہے۔ لیکن اس معاملے میں حضرت مولانا بہت زیرک تھے۔ کبھی مشکل سے ان میں چوک ہوئی ہوگی اور اگر کبھی کسی نے ان سے بجا یا بے جا توقع باندھی تو اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس دور میں تو معمولی فائدے کی اگر کسی سے توقع ہو تو مہم جوئی شروع کر دیتے ہیں اور ہمارے اوپر تو یہ یلغار اور مہم جوئی 1978ء سے ہی شروع ہے اور اب تک جاری ہے۔ لیکن مولانا اس معاملے میں اتنے زیرک تھے کہ لوگوں کو کبھی یہ ہمت ہی نہ ہوئی کہ کسی طرح ان پر اپنی مہم جوئی کا تجربہ ہی کریں۔

آج کے ہنگامہ خیز زمانے میں لوگ مجبور ہیں کہ جس کام میں گھسے تو بس اسی میں پڑے رہیں۔ اختصاص ہر میدان میں گھس چکا ہے۔ اختصاص کے نام پر زندگی کی مشغولیات میں ایسا اکہرا پن آگیا ہے کہ انسان کی شخصیت ہلکی اور سطحی بن کر رہ گئی۔ بحیثیت انسان علمی، اخلاقی وثقافتی اعتبار سے

اور عائلی و سماجی اور اجتماعی اعتبار سے اسے ایک معتبر اور مکمل فرد بننے کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے، اب بہت کم لوگ ان کا حامل بن پاتے ہیں۔ انسان کی اڑان اور معراج بس ذاتی مادی ضروریات کی تکمیل اور پھر کمالیات جمالیات اور ترفہ پسندی ہے۔ حتی کہ علمی انہماک کے بہانے فرائض کی ادائیگی کے بدلا پڑ گئے ہیں۔ آدمی اپنے کام میں گھساپڑا ہوتا ہے۔ اسے فرائض کی ادائیگی کے لیے فرصت نہیں ملتی۔ اس صورت حال پر دیدہ وروں کا یہ جملہ اکثر سننے میں آتا ہے:

"قائدینِ ملت غمِ ملت میں اتنا الجھے رہتے ہیں کہ انہیں اپنی عاقبت کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہیں مل پاتا"۔

حضرت مولانا کا حال بالکل مختلف تھا۔ وہ سارے بکھیڑے اور ذمہ داریوں سے فراغت کر کے اپنی شخصیت کو باغ و بہار بنالیا کرتے تھے۔ لکھتے پڑھتے رہتے تھے اور جیسے ہی کتاب وقلم سے فراغت حاصل کی لطافت کا دریا بہانے لگتے۔ ان کی ایک ذمہ داری دوسری ذمہ داری میں دخیل نہیں ہوتی تھی۔ آفس میں ہیں تو ذمہ داریوں کا بوجھ ہے۔ محفل میں ہیں تو بے تکلف ہیں، باغ و بہار بنے ہیں۔ خطابت کے منبر اور اسٹیج پر ہیں تو سامعین پر حکمراں ہیں۔ عبادت کا وقت آیا تو اس میں پیچھے نہیں اور حلال روزی کمانی ہو تو اس میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ ایک مکمل شخصیت کے اوصاف کے حامل اور ایک کامیاب انسان، کامیاب مصنف، کامیاب خطیب، کامیاب صحافی اور کامیاب داعی۔

اللہ غریقِ رحمت کرے مرحوم کو جو بڑی خوبیوں کے مالک تھے(1)۔

(1) ماخوذ از ہفت روزہ ترجمان، دہلی 16۔31 دسمبر 2006ء۔ جلد: 26، شمارہ: 24۔

آہ! شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری ہم میں نہ رہے!

(از: حافظ صلاح الدین یوسف، پاکستان)

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات

تا زِ بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

علم ہوا ہے کہ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری، مصنف الرحیق المختوم اپنے آبائی قصبے حسین آباد (مبارکپور، اعظم گڑھ، بھارت) میں یکم دسمبر 2006ء بروز جمعۃ المبارک دنیائے فانی سے رہ گرائے عالم بقا ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

مبارک پور بھارت کا ایک نہایت مردم خیز خطہ ہے جہاں بڑی بڑی منتخباتِ روزگار قسم کی شخصیات پیدا ہوئیں۔ مثلاً: مولانا عبد السلام مبارکپوری مصنف سیرۃ البخاری، مولانا عبدالصمد مبارکپوری، مولانا محمد امین اثری مبارکپوری، مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری مصنف تحفۃ الاحوذی و تحقیق الکلام وغیرہ، مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری مصنف مرعاۃ المفاتیح وغیرہ اور قاضی اطہر مبارک پوری وغیرہم رحمہم اللہ۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ بھی اسی مردم خیز علاقے سے تعلق رکھتے تھے اور اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی تھے جس کا تذکرہ اوپر ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی بڑی عظیم صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ بہ یک وقت ایک قابل مدرس، ماہر علم فرائض، کامیاب مناظر، شارح حدیث، سیرت نگار، محقق اور عربی/اردو دونوں زبانوں کے اعلیٰ پائے کے قلم کار، نثر نگار اور انشا پرداز تھے۔ جس پر ان کی مشہورِ زمانہ تالیف الرحیق المختوم شاہدِ عادل ہے۔ جس پر ان کو رابطہ عالم اسلامی کے زیر اہتمام سیرت نگاری کے عالمی مقابلے میں اول انعام ملا۔ یہ کتاب انہوں نے اصلاً عربی میں لکھی اور اس وقت لکھی جب وہ جامعہ سلفیہ بنارس (بھارت) میں استاذ تھے۔ اس وقت تک انہوں

نے عرب کی کسی یونیورسٹی کا منہ دیکھا تھا، نہ سعودی عرب میں ان کی آمد ورفت کا کوئی سلسلہ ہی تھا۔انہوں نے بھارت کے دینی مدارس ہی میں تعلیم حاصل کی اور وہیں سلسلۂ تدریس سے وابستہ رہے۔ایسے ماحول میں رہ کر عربی انشا پردازی میں اتنی استعداد بہم پہنچالینا کہ عرب بھی اس پر انعام دینے پر مجبور ہوجائیں، بلاشبہ ان کی غیر معمولی ذہانت وفطانت اوراعلیٰ قابلیت کی ایک واضح دلیل ہے۔ذلک فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم۔

پھر الرحیق المختوم کو اردو کے حسین قالب میں بھی انہوں نے خود ہی ڈھالا۔جس سے ان کے اردو اسلوب میں بھی پختگی کا ثبوت ملتا ہے۔الرحیق المختوم جب عربی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوئی تو نہ صرف ان کی شہرت بامِ عروج پر پہنچ گئی؛ بلکہ دنیوی ترقی کے راستے بھی ان پر وا ہوگئے۔اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد ان کو 'الجامعة الاسلامية' مدینہ منورہ کے ایک ذیلی شعبے 'مركز السيرة النبوية' میں بطورِ محقق ذمہ داری سونپ دی گئی جس میں ان کے ذمے سیرت نبویہ ﷺ سے متعلقہ تاریخی وحدیثی مواد کی تحقیق وتنقیح کا کام تھا۔

1993ء میں راقم کی ان سے مکتبہ دار السلام الریاض (سعودی عرب) میں ملاقات ہوئی۔ جب راقم وہاں تفسیر احسن البیان کی تالیف میں مصروف تھا۔میں نے ان سے ان کے مذکورہ کام کی بابت پوچھا کہ وہ کس قسم کا کام ہے اور وہاں کام کی نوعیت کے اعتبار سے وہ مطمئن ہیں؟ تو فرمایا کہ یہ ادارہ صرف علماء کو نوازنے کے لیے بنایا گیا ہے۔یوں گویا انہوں نے کام کی نوعیت کے اعتبار سے عدمِ اطمینان فرمایا۔اس پر راقم نے ان سے عرض کیا کہ جب معاملہ ایسا ہے تو آپ جیسے باصلاحیت افراد کو ٹھوس علمی وتحقیقی کام کرنا چاہیے اور یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے ان کو علم وتحقیق کی جو گہرائی وگیرائی اور انشا وتحریر کا جو سلیقہ عطا فرمایا تھا۔وہ علمائے اہل حدیث میں بہت کم پایا جاتا ہے۔اس اعتبار سے وہ بلاشبہ یکتائے زمانہ اور اپنے اَقران واَماثل میں نہایت ممتاز تھے۔

لیکن غالبًا مولانا کثیر العیالی کی وجہ سے اس ادارے سے ہی وابستہ رہے۔تاہم اس دوران میں دار السلام سے بھی ایک گونہ تعلق انہوں نے قائم رکھا۔اور دار السلام کے بعض علمی ووقیع کاموں کی

نگرانی ونظر ثانی فرماتے رہے۔ راقم کی تفسیر احسن البیان پر بھی انہی ایام میں انہوں نے نظر ثانی فرما کر اپنی توثیق کی مہر اس پر ثبت فرمائی تھی۔ راقم اپنی یہ مختصر تفسیر (جو نہایت عجلت اور مختصر وقت میں تحریر کی گئی تھی) اپنے الریاض کے چار مہینے پر محیط قیام کے دوران سورۂ ھود تک لکھ پایا تھا اور بقیہ کام لاہور آکر اپنے گھر میں پورا کیا۔ یہ حصہ ان کی نظر سے گزر چکا تھا۔ راقم نے آنے سے قبل ان سے مشورہ پوچھا کہ تفسیر کے اسلوب کے بارے میں کچھ وضاحت فرما دیں تا کہ اس کی روشنی میں اس کو مزید بہتر بنایا جا سکے تو انہوں نے فرمایا کہ جس اختصار اور قلیل مدت میں آپ یہ کام کر رہے ہیں، اس کو دیکھتے ہوئے یہ بہت بہتر ہے۔ اس کی بابت مزید مشوروں کی ضرورت نہیں ہے۔

مذکورہ ادارے سے فراغت کے بعد پھر وہ دارالسلام الریاض سے وابستہ ہو گئے اور دارالسلام کی خواہش پر انہوں نے عربی میں صحیح مسلم کی شرح لکھی۔ جو 'منة المنعم' کے نام سے چار جلدوں میں دارالسلام ہی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ الرحیق المختوم کی تالیف سے پہلے بلوغ المرام کی عربی زبان میں شرح بھی لکھ چکے تھے۔ جو 'إتحاف الکرام شرح بلوغ المرام' کے نام سے بھارت ہی سے شائع ہوئی۔ پھر دارالسلام نے اسے شائع کیا۔ علاوہ ازیں دارالسلام ہی کے زیر اہتمام اس شرح کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا۔

دارالسلام نے الرحیق المختوم کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا؛ بلکہ مولانا مرحوم نے '(عربی) کا ایک اختصار بھی عربی زبان میں 'روضة الأنوار فی سیرة النبی المختار' کے نام سے کیا تھا۔ دارالسلام نے یہ عربی نسخہ بھی شائع کیا اور خود مولانا مرحوم ہی نے الرحیق المختوم کی طرح اس کا اردو ترجمہ بھی 'تجلیات نبوت' کے نام سے کیا۔ دارالسلام نے اسے بھی نہایت دیدہ زیب انداز سے شائع کیا ہے۔ ان کے علاوہ دارالسلام کی بہت سی کتابوں پر انہوں نے نظر ثانی کا کام کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی ان تمام خدمات کو قبول فرمائے اور اس کی بہترین جزا، انہیں اپنے پاس سے عطا فرمائے جہاں اب وہ پہنچ چکے ہیں۔

چند سال قبل ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا، جس سے ان کی صحت خاصی متاثر ہوئی اور آپ تصنیف

وتالیف کا کام کرنے کے قابل نہ رہے اور بظاہر ان کی صحت یابی کی امید بھی نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن اللہ نے اپنا فضل فرمایا اور وہ قدرے صحت یاب ہو کر تھوڑا بہت کام کرنے لگے تھے۔ تاہم بیماری سے طبیعت میں جو نقاہت اور نڈھال پن پیدا ہو گیا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے محسوس یہی ہوتا تھا

دل کا جانا ٹھہر گیا ہے، صبح گیا یا شام گیا !!

بالآخر وہ وقت آ ہی گیا کہ علم وعمل کا یہ آفتاب سارے عالم میں اپنی تابانیاں بکھیرنے کے بعد بھارت کی سرزمین میں غروب ہو گیا۔ غفر اللہ لہ و رحمہ

واقعہ یہ ہے کہ ان کی وفات سے تدریس وافتاء کی ایک عظیم مسند خالی ہو گئی ہے۔ علم وتحقیق کا باب بند ہو گیا۔ اَسلاف کی علمی واخلاقی روایات کا حامل ایک حسین پیکر ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ حلم وتدبر کا ایک عظیم مرقع پیوند خاک ہو گیا اور پاک وہند کی جماعتِ اہلِ حدیث اپنے گوہرِ شب چراغ سے محروم ہو گئی۔ بقولِ میر وہ ایسے عظیم انسان تھے جس کی بابت اس نے کہا تھا

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں

تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

یقیناً وہ اپنے علمی کارناموں کی بدولت ہمیشہ زندہ رہیں گے (1)۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

(1) ماخوذ از ماہنامہ محدث، لاہور پاکستان، دسمبر 2006ء۔

استادِ مرحوم کی یاد میں!

(از: محمد عزیر شمس، مکہ مکرمہ)

یکم دسمبر 2006ء کو جمعہ کی نماز کے بعد بیت اللہ شریف میں یہ اندوہناک اطلاع ملی کہ ابھی تھوڑی دیر قبل مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم اپنی کتاب الرحیق المختوم کی وجہ سے پوری دنیا میں معروف تھے۔ سیرت نبوی پر ان کی یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ دنیا کی بارہ، تیرہ زبانوں میں اس کا ترجمہ شائع ہوا۔ بلاتردد کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت سیرت کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب یہی ہے۔ عوام وخواص، طلبہ واساتذہ، ریسرچ اسکالر اور محققین، مسلم اور غیر مسلم سب ہی اسے شوق سے پڑھتے ہیں اور اس کے مضامین سے مستفید اور مؤلف کے اسلوب سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بہت سی جامعات اور مدارس میں یہ داخلِ نصاب ہے۔ اس لیے مختلف ممالک کے ناشرین بڑی تعداد میں اسے چھاپتے رہتے ہیں، اور سب ہی اس کے حقوق طبع اپنے نام محفوظ بتاتے ہیں!!

کتاب کی وہ کون سی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے اسے یہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، ان کے بارے میں محققین لکھتے رہیں گے۔ مجھے یہاں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، مگر چونکہ میں اس کی تالیف وترتیب کا عینی شاہد ہوں، اس لیے چند باتیں عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

1976ء میں میں جامعہ سلفیہ (بنارس) میں فضیلت کے آخری سال کا طالب علم تھا۔ رابطہ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) کی طرف سے جب سیرت نگاری کے عالمی مقابلہ کا اعلان کیا گیا تو میں اور دوسرے چند ساتھیوں نے مولانا سے بار بار یہ اصرار کیا کہ آپ اس میں ضرور شرکت کریں۔ جب بھی ان سے ملاقات ہوتی موضوعِ گفتگو یہی ہوتا؛ حتی کہ مولانا نے آمادگی ظاہر کی اور صرف چار پانچ ماہ میں دن رات محنت کرکے کتاب عربی زبان میں تیار کردی اور کچھ خود اور کچھ اپنے شاگردوں

سے تبییض کرا کے ہاتھ سے لکھا ہوا یہ مسودہ رابطہ العالم الاسلامی روانہ کر دیا۔ ڈیڑھ سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد جب جولائی 1978ء میں کراچی میں منعقدہ پہلی ایشیائی اسلامی کانفرنس کے اندر مقابلہ کے نتائج کا اعلان کیا گیا تو راقم الحروف گرمی کی تعطیل میں مدینہ یونیورسٹی سے بہ راہِ کراچی ہندستان جا رہا تھا۔ دہلی جاتے ہوئے ہوائی جہاز میں پتہ چلا کہ پہلے انعام کے مستحق استاد مرحوم ہیں۔ طبعی طور پر مجھے اور سارے دوستوں کو یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ دہلی سے بذریعہ ٹرین دوسرے دن صبح بنارس پہنچا تو جامعہ سلفیہ میں مولانا کو یہ خوش خبری سنائی۔ جامعہ کے سارے اساتذہ وطلبہ مولانا کی اس کامیابی سے خوش تھے، سبھوں نے انہیں مبارکباد دی، اور اس اعزاز کو جامعہ، جماعت، ہندستان بلکہ پورے برصغیر کے لیے باعثِ افتخار قرار دیا۔

ایک ہندی نژاد جس نے عربی سیکھنے کے لیے کبھی باہر کا سفر نہ کیا ہو، صرف چند ماہ میں ایک ایسی محققانہ کتاب تیار کر دیتا ہے جو سیرت کی سیکڑوں کتابوں میں ایک امتیازی شان کی حامل ہے، اسے توفیق الٰہی کا نتیجہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ پھر عربی میں اس کی پہلی اشاعت 1980ء اور اردو میں پہلی طباعت 1987ء سے آج تک اس کی مقبولیت اور شہرت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اور دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمے کے بعد وہ بین الاقوامی شہرت کی حامل بن گئی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح کتاب کو مقبولیت عطا کی اسی طرح مؤلف کو بھی اپنے مقبول بندوں میں سے بنائے اور ان کی مغفرت فرمائے اور علیین میں انہیں جگہ دے۔ آمین۔

استاد مرحوم نے 1984ء تک کے اپنے حالاتِ زندگی مختصر طور پر الرحیق المختوم کے شروع میں تحریر کر دیے ہیں، یہاں ان کے اعادے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

وہ مبارک پور (ضلع اعظم گڑھ) میں 1942ء میں پیدا ہوئے۔ جنوری 1961ء میں مدرسہ فیض عام (مئو) سے سند فراغت حاصل کی۔ اس زمانے میں والد مرحوم (مولانا شمس الحق سلفی) وہاں شیخ الحدیث تھے، چنانچہ صحیح بخاری اور دوسری کئی کتابیں ان سے پڑھیں۔ فراغت کے بعد تیرہ سال مختلف مدارس میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اکتوبر 1974ء میں جامعہ سلفیہ

(بنارس) آئے اور مسلسل 14 سال وہاں تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف کا کام کرتے رہے۔ اور وہاں کے اردو مجلّہ "محدث" کی ابتدائے اشاعت فروری 1982ء سے جولائی 1988ء تک ایڈیٹر رہے۔

محرم ۱۴۰۹ھ (اگست 1988ء) میں وہ مدینہ یونیورسٹی کی دعوت پر وہاں کے مرکز خدمۃ السنۃ والسیرۃ سے وابستہ ہو گئے اور شعبان ۱۴۱۸ھ (دسمبر 1997ء) تک تقریباً ساڑھے آٹھ سال مقیم رہے۔ اس عرصے میں انہوں نے وہاں کام کرنے والوں کے ساتھ مل کر سیرت انسائیکلوپیڈیا تیار کرنے کے لیے خاکہ بنایا۔ نیز حرمین شریفین سے متعلق ایک انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ام المومنین عائشہؓ سے متعلق احادیث کی نو کتابوں اور طبقات ابن سعد وغیرہ میں جو معلومات پائی جاتی ہیں ان کے جمع وترتیب کا کام کیا۔ حرم مکی سے متعلق مفصل معلومات سارے مآخذ سے کھنگال کر کارڈ کی شکل میں جمع کیے تاکہ حرم سے متعلق انسائیکلوپیڈیا میں ان کا اندراج ہو سکے۔ سیرت نبوی ﷺ سے متعلق ساری احادیث (جو کتب ستہ اور مسند احمد میں موجود ہیں) کی ایک فہرست بھی تیار کی۔ پھر صحیحین اور ترمذی میں موجود احادیث سیرت کو مختلف عناوین اور ذیلی عناوین کے تحت ترتیب دینے کا کام کیا۔ سیرت کے تعلق سے وہاں ان کا ایک قابل ذکر کام یہ تھا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا باپ اور ماں دونوں جانب سے نسب نامہ کی تفصیلات آدمؑ اور حوا تک مرتب کیں۔ اور اس سلسلے کے سارے ناموں کی تحقیق کی۔ اہل علم خوب جانتے ہیں کہ "عدنان" کے بعد سے آدم تک سلسلۂ نسب میں کتنا اختلاف اور ناموں میں کتنا تضاد ہے۔

مرحوم نے رسول اللہ ﷺ کی آمد سے متعلق مختلف مذاہب وادیان کی کتابوں میں جو بشارتیں مذکور ہیں ان کے بارے میں بھی ایک کتاب تیار کی جس میں پہلے بدھ مت والوں پھر ہندوؤں پھر مجوسیوں کی کتابوں میں مذکورہ بشارتیں مع شرح وتوضیح ذکر کی گئی ہیں۔ نیز سیرت ابن ہشام پر مختلف طرح کے نمبر اور نشان لگانے کے لیے کمپیوٹر کے ایک پروگرام پر کام کیا۔ مرکز میں اس کے علاوہ بھی کام کیے مثلاً متعدد کتابوں کو چیک کر کے ان کے بارے میں رپورٹ تیار کی اور سیرت

نبوی اور حرمین شریفین سے متعلق مراجع و مآخذ کی فہرستیں بنائیں ...... وغیرہ وغیرہ۔

افسوس کہ مدینہ منورہ میں قیام کے دوران مرکز میں ترتیب دیے گئے یہ سارے کام ہنوز غیر مطبوع ہیں۔ اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کبھی ان کی اشاعت کی نوبت آئے گی یا نہیں؟

مولانا مرحوم نے الرحیق المختوم کے علاوہ عربی اور اردو میں تقریباً بیس کتابیں لکھیں۔

مولانا کی غیر مطبوعہ کتابوں میں "شرح أزهار العرب" (عربی)، ترجمہ "الکلم الطیب" لابن تیمیہ، ترجمہ وتوضیح الاربعین للنووی، "صحف یہود ونصاری میں محمد ﷺ سے متعلق بشارتیں" اور "الفرقة الناجية والفرق الإسلامية الأخرى" (عربی) ہیں۔

مدینہ یونیورسٹی کے بعد 1998ء کے اوائل میں مولانا ریاض منتقل ہو گئے۔ اور وہاں مشہور اشاعتی ادارہ دارالسلام کے شعبہ تحقیق وتصنیف کے نگراں مقرر ہوئے۔ ادارے کی متعدد عربی اور اردو مطبوعات ان کی نظر ثانی، مراجعت اور تصحیح سے شائع ہوئیں۔ ریاض میں قیام کے دوران وہ 19 جولائی 1998ء سے 30 اگست 2000ء تک مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے امیر رہے۔

اس کے کچھ عرصے کے بعد مولانا پر فالج کا حملہ ہوا، اور پھر وہ مستقل زیر علاج رہے۔ کبھی مدینہ یا جدہ میں قیام رہتا اور کبھی ہندستان چلے جاتے۔ اس دوران کئی بار ریاض، مکہ اور ان کے گھر مبارکپور میں ان سے ملاقات ہوئی۔ طبیعت بجھی بجھی سی رہتی تھی، گفتگو کے وقت زبان میں تھوڑی لکنت ہوتی مگر توجہ سے سننے پر باتیں سمجھ میں آ جاتی تھیں۔

استاد مرحوم کو درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے علاوہ دعوت وتبلیغ اور مناظرہ سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ 1978ء میں بجرڈیہہ (بنارس) میں بریلویوں سے مناظرہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ایک بڑی تعداد اہل حدیث ہو گئی، اور انہوں نے ایک مرکز قائم کر لیا۔ منکرین حدیث کی رد میں ان کی دو کتابیں بھی اپنے موضوع پر مختصر مگر تشفی بخش ہیں۔ ان کے دعوتی پروگرام سعودی عرب کے مختلف شہروں میں ہوتے رہتے تھے۔

مولانا دنیا بھر میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم اور ان کے ردعمل کے طور پر وجود میں آنے

والی تحریکوں سے بھی بڑی واقفیت رکھتے تھے۔ اور اصلاح حال کے لیے ان کی رہنمائی کرتے، انہیں مشورے دیتے اور عملی تدبیریں بھی بتاتے۔ طلبہ کو ہمیشہ بلند ہمتی، ٹھوس علمی صلاحیت، اور صحیح معنوں میں تحقیق کا ذوق پیدا کرنے پر ابھارتے۔ ملکی اور بین الاقوامی حالات سے باخبر رہنے کی تاکید کرتے۔ تحقیق کے سلسلے میں فرمایا کرتے کہ اس کے چھلکوں پر قناعت کرنے کی بجائے اس کے مغز کو پانے کی کوشش کیجیے۔ جس سے ان کی مراد یہ ہوتی کہ تحریر میں کاما، فل اسٹاپ، ڈیش وغیرہ کے استعمال یا حاشیہ میں تخریج، نسخوں کے اختلاف اور طویل حواشی کی بجائے اصل مسائل کی تحقیق پر توجہ مرکوز رہنی چاہیے، ظاہری آرائش وزیبائش پر نہیں۔

یہ چند سطور فی الحال حوالۂ قرطاس ہو گئے۔ ابھی ان کی بہت سی یادیں باقی ہیں، کبھی آیندہ تحریر ہوں گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ (1)۔

(1) شاید آیندہ ایڈیشن میں وہ یادیں معرضِ تحریر میں آجائیں۔ باذن اللہ۔ از مرتب۔

باپ کی کہانی، بیٹی کی زبانی

(از: رُشَیدہ صفی الرحمٰن مبارکپوری، مکہ مکرمہ)

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على أشرف الأنبياء والمرسلين.

والدِ محترم جناب مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کی ولادت باسعادت ہندستان کے زرخیز صوبہ اتر پردیس کے معروف علمی و صنعتی قصبہ مبارکپور کے قریب ایک چھوٹی سی بستی ''حسین آباد'' میں 1942ء کے وسط میں ہوئی۔ والدِ محترم ابھی صرف چار سال اور کچھ ماہ کے ہوئے تھے کہ ہندستان کی آزادی کی تحریک اپنے شباب پر پہنچ چکی تھی۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب مل کر انگریزوں سے ہندستان کو آزادی دلانے کے لیے میدانِ کارزار میں بڑھنے کی زبردست تیاری میں تھے۔ بالآخر 1947ء کو پورے اتحاد کے ساتھ آزادیٔ ہند کا پرچم لال قلعہ پر لہرا دیا گیا۔

اس وقت والدِ محترم نے قاعدہ بغدادی پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ گو آپ کی ولادت کے ساتھ ہی آزادی کی لہر تیز سے تیز تر ہو گئی تھی۔ آپ کی پرورش و پرداخت آپ کے آبائی گاؤں میں والدین کے زیرِ سرپرستی ہوئی۔ آپ کا خاندان ''احاطہ'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ خاندان مال و جائیداد اور دنیاوی سرمایہ سے گرچہ کچھ کمزور تھا مگر دینی حمیت اور اسلامی خدمات میں اپنی اعلیٰ مثال رکھتا تھا۔

آپ کے والد کا نام عبداللہ بن اکبر تھا جو ایک معمولی پڑھے لکھے آدمی تھے۔ مگر نہایت ہی دیندار تھے۔ زہد و تقویٰ اور دینداری میں ان کی شہرت تھی۔ اُن کی کفالت میں والد صاحب کے چھ بھائیوں اور ایک بہن کے علاوہ کچھ یتیم بچے اور بچیاں بھی تھیں۔ دادا جان نے پورے انصاف کے ساتھ ان کی کفالت کی ذمہ داری نبھائی۔ اپنے بچوں کی طرح ان یتیموں کی جان مان کرتے تھے اور ان کے ساتھ انتہائی شفقت و محبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔

ابو جان نے جس زمانے میں آنکھیں کھولیں ہمارے علاقے میں بچوں کو گھر ہی پر بغدادی

قاعدے سے قرآن تک کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس لیے ابو جان نے بھی اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز گھر ہی سے کیا۔ آپ کے استادِ اول آپ کے چچا یونس بن اکبر تھے۔ آپ نے انھی سے قرآن شریف کا کچھ حصہ پڑھا۔ آپ نے اپنی تعلیم کا تذکرہ اپنی مشہورِ زمانہ کتاب الرحیق المختوم میں لکھا ہے۔

والد صاحب خشک مزاج زاہد نہ تھے؛ بلکہ آپ زہد وورع کے ساتھ اپنے ارد گرد کے ماحول کو بہت خوشگوار رکھنے والے خوش دل وخوش مزاج انسان تھے۔ میں نے بچپن سے آپ کو ایک شفیق باپ کی حیثیت سے پایا ہے۔ آپ میرے علاوہ دیگر بہنوں کے ساتھ بہت شفقت سے پیش آتے تھے اور بھائیوں کے ساتھ بھی۔ جب کبھی ہم بھائی بہنوں میں کسی بات پر اختلاف ہو جاتا، والد محترم بڑے سلیقے اور اچھے ڈھنگ سے ہمیں سمجھاتے بجھاتے اور بڑی پیاری نصیحتیں کرتے تھے۔ گھریلو فضا ہمیشہ خوشگوار رکھنے کے عادی تھے۔

آپ کو جس کسی نے قریب سے دیکھا ہے، اور آپ کی مجلسوں میں اسے بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے، اسے یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہوگی کہ آپ ملنے جلنے والے کے ساتھ انتہائی محبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اپنے دوستوں، یاروں میں کبھی بھی خودنمائی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کے ساتھ مل جل کر رہتے، ان کی خوشی وغم میں ان کا برابر کے شریک رہتے۔ مگر کوئی بھی غیر اسلامی پروگرام میں ان کے ساتھ شرکت نہیں فرماتے۔ کئی دفعہ دوستی میں یہ موقع بھی سامنے آیا کہ والد محترم کو کسی ایسے پروگرام میں شرکت کی دعوت دی گئی اور دوستوں نے اس پر اصرار کیا؛ مگر آپ نے ان کی دلجوئی کی خاطر کبھی شرعی موقف سے انکار نہیں کیا۔ ہاں، جب بھی کسی اچھے کام میں شرکت کی دوستوں کی طرف سے دعوت ملی، آپ نے خوشدلی کے ساتھ ان کی دعوت قبول فرمائی اور ان کے ساتھ ساتھ رہے۔

مجھے یاد ہے، میں اس وقت بچی تھی۔ آپ جب بھی چھٹیوں میں مدرسے سے گھر آتے، آپ کے دوست آپ کی خدمت میں پہنچ جاتے اور چڑیوں کا شکار کرنے کی خواہش کا اظہار کرتے۔ آپ ان کا دل نہیں توڑتے؛ بلکہ ان کے ساتھ گاؤں سے باہر کھیتوں میں، ندی کے کنارے اور باغات

وغیرہ میں چڑیوں کا شکار کرنے جاتے۔ آپ کا نشانہ بہت اچھا تھا۔ آپ کو فنِ تیراکی بھی بہت اچھا آتا تھا۔

آپ کی یہ عادت تھی کہ اپنا کام خود کرتے تھے۔ کبھی اِس خواہش کا اظہار نہیں کرتے تھے کہ دوسرے ان کے کاموں کو نمٹانے میں ان کا معاون بنیں۔ آپ پڑھنے پڑھانے کے بعد جو وقت مل جاتا گھر میں سلائی کڑھائی کا کام بھی کر لیتے تھے۔ آپ کو بنارسی ساڑیاں بُننے کا ہنر تھا۔ بچوں کے کپڑے خود ہی کاٹتے اور سلتے تھے۔ لیکن جلد ہی یہ سلسلہ بند ہو گیا اور آپ صرف تعلیم و تعلم ہی کے ہو کر رہ گئے۔

والد صاحب کو اپنے والد کی طرف سے کوئی خاص جائداد وراثت میں نہیں ملی تھی۔ اس لیے آپ شروع ہی سے اپنے آپ کو اپنی محدود آمدنی کے ساتھ مربوط رکھتے تھے۔ جو تنخواہ ملتی، اپنے جیب خرچ کے علاوہ گھر کے اخراجات میں خرچ کر دیتے۔ بسا اوقات کوئی ایسا کام نکل پڑتا جو بھاری رقم سے پورا ہو سکتا تھا، مگر استطاعت نہ ہونے کے سبب اسے خاطر میں نہ لانا اور قناعت کرنا آپ کی فطرت تھی۔ آپ ہمیشہ کوشش کرتے تھے کہ اپنی محدود آمدنی میں اپنے سارے اخراجات پورے کر لیں؛ تاکہ دوسروں کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔

آپ ایک مرتبہ جامعہ اسلامیہ فیض عام مئو میں طلبہ کو حدیث کا درس دے رہے تھے۔ حدیث حج کے بارے میں تھی۔ آپ گرچہ اس وقت تک نہ تو مکہ آئے تھے اور نہ ہی حج کیا تھا کہ منیٰ، مزدلفہ اور عرفات وغیرہ دیکھتے۔ مگر آپ ان مقامات کے بارے میں طلبہ کو اس طرح بتاتے جیسے آپ نے قریب سے ایک بار نہیں بلکہ کئی بار دیکھا ہے۔ آپ ان مقامات کے بارے میں بتا ہی رہے تھے کہ ایک طالبعلم نے آپ سے سوال کیا: مولانا صاحب! کیا آپ نے حج کیا ہے؟

والد صاحب نے جواب دیا: آپ اس کے جواب میں لمحہ بھر کے لیے رک گئے اور پھر کہا: میں نے اب تک حج نہیں کیا ہے، لیکن اللہ نے چاہا تو ضرور اس کے دربار میں حاضر ہوں گا۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ میری مراد ضرور پوری کرے گا۔

آپ کو حج کی بہت خواہش تھی مگر بظاہر اس کی امید کم ہی نظر آتی تھی۔ اسی طرح آپ کو مدینہ منورہ سے بھی بہت محبت تھی۔ جن دنوں آپ الرحیق المختوم کی تالیف میں مصروف تھے، آپ کے پاس مراجع کی کتابیں بھی موجود نہیں تھیں۔ اس لیے آپ مکتبات سے عاریتاً کتابیں گھر لاتے اور استفادے کے بعد واپس کر دیتے۔ میری والدہ بیان کرتی ہیں کہ آپ الرحیق المختوم لکھتے لکھتے جب کچھ تھک جاتے تو اپنا سر اوپر اٹھاتے اور کہتے۔

دکھا دے یا الٰہی وہ مدینہ کیسی بستی ہے
جہاں پر رات دن مولیٰ تیری رحمت برستی ہے

والد محترم کی یہ عادت تھی کہ جب وہ لکھنے پڑھنے میں مصروف ہوتے تو گو دنیا و مافیہا سے کنارہ کش ہوتے اور انتہائی دھیان اور توجہ کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا کام انجام دیتے تھے۔ آپ کے قلم اور زبان میں بہت روانی تھی۔ ماہنامہ محدث کا اداریہ اور حالاتِ حاضرہ پر آپ کا تبصرہ جن لوگوں نے پڑھا ہے، انھیں آپ کی قلمی صلاحیت کا بخوبی اندازہ ہوگا۔

آپ کی خالص محنت اور رسول اکرم ﷺ سے گہری عقیدت کا صلہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ دیا کہ آپ کی تالیف الرحیق المختوم کو ایک زندہ جاوید کتاب کا درجہ عطا فرما دیا۔ 1398ھ میں آپ کی یہ کتاب رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ میں پوری دنیا میں اول انعام کی مستحق قرار پائی اور 12 ربیع الاول 1399ھ میں آپ کو مکہ مکرمہ میں بلا کر انعام سے نوازا گیا۔ اس کے بعد آپ کے لیے دنیوی ترقی کے بھی دروازے کھل گئے۔ پچاس ہزار ریال کا انعام حاصل کرنے کے بعد آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ آپ نے اپنے والد کے ساتھ فریضۂ حج ادا کیا۔ آپ کا سفرِ حج چونکہ بحری راستے سے ہوا تھا۔ اس لیے واپسی میں آپ سعودیہ عرب سے سیکڑوں مراجع کی کتابیں بھی ساتھ میں ہندستان لے گئے۔

آپ کا معمول تھا کہ درس وتدریس کا فریضہ انجام دینے کے بعد جو وقت بھی ملتا، تصنیف وتالیف میں گزارتے۔ ملک وبیرونِ ملک آپ کے دعوتی پروگرام ہوتے۔ گاؤں کی مسجد میں خطبۂ

جمعہ دیتے اور نماز بھی پڑھاتے۔ آپ کا خطبہ سننے کے لیے لوگ دور دور سے آیا کرتے تھے۔ حاضر جوابی میں آپ کی مثال نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو مختلف اوقات میں بریلویوں سے جب مناظرے ہوئے تو آپ نے اپنی حاضر جوابی سے انھیں بری طرح شکست دی اور وہ دم دبا کر بھاگنے پر مجبور ہوئے۔

گاؤں کی بڑھتی ہوئی آبادی دیکھ کر آپ نے ایک مسجد کی بنیاد ڈالی۔ گاؤں کی جامع مسجد کی مرمت بھی کرائی۔ ''حسین آباد'' چونکہ قصبہ مبارکپور سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اس لیے لوگ اپنی بچیوں کو پڑھنے کے لیے نہیں بھیجتے تھے۔ نتیجتاً ان کی بچیاں پرائمری کے بعد تعلیم سے محروم رہ جاتی تھیں۔ والد صاحب کو اس کا بڑا افسوس تھا۔ اس لیے آپ نے اس موضوع کو اٹھایا اور چند سربرآوردہ حضرات سے مشورہ کے بعد 1994ء میں گاؤں ہی میں ''مدرسة الصالحات'' کے نام سے ایک درسگاہ کی بنیاد رکھی۔ جس میں گاؤں کی بچیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ چونکہ والد محترم کا مزاج عام مدرسہ کے موسسین سے مختلف تھا اس لیے وہ اس مدرسہ کو زیادہ ترقی نہیں دے سکے۔ ورنہ آپ کا مزاج بھی اگر عام موسسینِ مدارس کی طرح ہوتا تو آپ کے ادارے کو بھی بہت زیادہ ترقی ملتی۔ اور بالخصوص اس صورت میں جبکہ عرب ممالک کا بچہ بچہ آپ کے نام سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا!!

1994ء میں جب والد صاحب پر پہلی مرتبہ فالج کا حملہ ہوا تو آپ اس وقت مدینہ منورہ میں موجود تھے۔ علاج معالجے کے بعد جب آپ کی صحت عود کر آئی تو آپ حسب معمول پھر تصنیف وتالیف میں لگ گئے۔ لیکن چند سالوں کے بعد آپ پر دوبارہ فالج کا حملہ ہوا۔ اس وقت آپ ریاض میں مقیم تھے۔ اس بیماری کے بعد آپ کی صحت کماحقہ بحال نہ ہوسکی۔ تاہم آپ نے علمی میدان سے خود کو الگ تھلگ نہیں کیا۔ بلکہ ریاض سے ہندستان جاتے آتے رہے اور مکتبہ دارالسلام کی کتابوں پر اشراف فرماتے رہے۔ مگر جب جون 2006ء میں آپ پر تیسری دفعہ فالج کا حملہ ہوا تو آپ کی صحت ناگفتہ بہ ہوگئی۔ اور آپ بستر مرگ کے ہو کر رہ گئے۔ پانچ چھ ماہ مسلسل آپ بستر

مرگ پر پڑے رہے۔ آپ کا علاج معالجہ چلتا رہا۔ مگر آپ کا آخری وقت آن پہنچا تھا۔ بالآخر یکم دسمبر 2006ء کو جمعہ کے دن شام پونے تین بجے آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔ آپ کی تدفین 2 دسمبر 2006ء کو آپ کے آبائی قبرستان میں بعد نماز عصر عمل میں آئی۔ اور یہ ناچیز بندی دل میں اپنے والد محترم سے ملاقات کے ارمان لیے ہمیشہ کے لیے اپنے مشفق باپ سے محروم ہو گئی اور ان کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکی۔ اور یہ اس کی زندگی کا سب سے تکلیف دہ باب بن گیا جس کی تلافی ممکن نہیں (1)!!

---

(1) محترمہ نے میری فرمائش پر معلومات لکھ کر میرے پاس فیکس کروایا تھا۔ میں نے ان کی معلومات کی بنیاد پر اسے ایڈٹ کر دیا (مرتب)۔

یادِ رفتگان

(از: حافظ محمد الیاس عبدالقادر سلفی ومدنی، ریاض)

الحمد لله رب العالمين والعاقبة للمتقين، والصلاة والسلام على نبينا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد:

ے جاتے ہیں اس جہاں سے انسان رفتہ رفتہ

یکم دسمبر بروز جمعہ ناظمِ اعلیٰ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند نے اطلاع دی کہ مہربان و مشفق، مربی استاد محترم جناب مولانا صفی الرحمٰن صاحب مبارکپوری کا انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون! دل سے دعا نکلی:

"اللَّهُمَّ أْجُرْنَا فِي مُصِيبَتِنَا هَذِهِ وَاخْلُفْ لَنَا خَيرًا مِنْهَا".

"اے اللہ! ہماری اس مصیبت میں ہمیں اجر وثواب سے نواز، اور اس کے عوض ہمیں بہتر عطا فرما"۔

مرض کی شدت اور ناسازگیِ طبع کی خبریں کئی ماہ سے موصول ہو رہی تھیں۔ آخر عمرِ طبیعی کی 62 منزلیں پوری کر کے اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

آپ نے اپنی عمر عزیز کے ہر ہر لمحے کو صحیح مصرف میں استعمال کیا۔ جد وجہد، کد وکاوش، درس وتدریس، دعوت وتبلیغ، تصنیف وتالیف، مناظرات، تربیت سازی اور اہم تعمیری امور سے بھرپور کامیاب زندگی گزاری۔ اور امت مسلمہ کو اپنی مساعی جمیلہ سے مستفید کرتے رہے، اور اپنے پیچھے مؤلفات وتصانیف، مستفیدین وتلامذہ کا ایک جمِ غفیر چھوڑا ہے۔ حقیقت میں ایک مومنِ مخلص، عالم ربانی، داعی الی اللہ کی متاعِ حیات جاودانی یہی ہے۔

نبی رحمت ﷺ کا فرمان ہے:

"جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے مگر تین چیزوں کا ثواب جاری رہتا

ہے: ایک صدقہ جاریہ کا، دوسرے علم کا جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں، تیسرے نیک اولاد کا جو اس کے لیے دعا کرتے رہیں"۔ (مسلم ۱۶۳۱)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے ان کی جہود مخلصہ کو قبول فرمائے، لغزشات سے درگزر کرے اور ان کے محبین کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ آمین

اسلافِ کرام کی سیرت وسوانح اور ان کے محاسن وخوبیاں ذکر کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ شاید کوئی بات ہمارے دلوں کو جھنجوڑ ڈالے، اور سستی وکاہلی میں پڑے کچھ جوہر میدانِ عمل میں نکل پڑیں، شاید کسی کو عبرت حاصل ہو جائے اور وہ بے عملی سے عمل کی راہ پر گامزن ہو جائے۔ ہمارے استاد مولانا صفی الرحمٰن صاحبؒ کی شخصیت ایسی متعدد صفات کی حامل ہے جو باعثِ عبرت اور اسوۂ محمد ﷺ ہے۔

ملاقات وتعارف:

ماہ شوال ۱۳۹۴ھ کی بات ہے۔ راقم جب سالانہ چھٹیاں گزار کر اپنی محبوب علمی درسگاہ مرکزی دارالعلوم بنارس پہنچا تو غرفۃ المدرسین میں ماسٹر اکبر صاحبؒ کے ساتھ ایک نئی، قدآور، باوقار، پرنور چہرے والی شخصیت کو دیکھا۔ ماسٹر صاحب نے تعارف کرایا۔ تذکرۃ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ اور تاریخ آل سعود کے تعلق سے غائبانہ کچھ تعارف تھا، یوں اس طرح اچانک ملاقات وتعارف سے میں حیرت وخوشی میں ڈوب کر رہ گیا، اور پھر یہی ملاقات اس وقت سے لے کر مولانا محترم کے ریاض میں موجود ان کے آخر ایام تک نہایت عقیدت واحترام سے قائم رہی۔ ان کی شفقت ومحبت، عنایت وکرم نوازی کے ایسے نقوش دل ودماغ پر موجود ہیں جو تاحیات بھلائے نہیں جا سکتے ہیں۔

مولانا صاحب کی علمی صلاحیت، حسنِ اخلاق وکردار کی وجہ سے عقیدت واحترام میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا۔ استاد محترم جناب مولانا عبدالسلام صاحب مدنی حفظہ اللہ کا یاد کرایا ہوا یہ شعر ذہن نشین تھا:

أُحِبُّ الصَّالِحِينَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللَّهَ يَرْزُقُنِي صَلَاحًا

چنانچہ اپنے تمام اساتذۂ کرام کی قدر ومنزلت، عزت واحترام، خدمت وقربت کو باعثِ سعادت سمجھا اور مولانا محترم کی قربت اور آپ سے استفادے کا عزم مصمم کیا جو اُن کی حیات تک قائم رہا اور دعاؤں کے ساتھ ہمیشہ قائم رہے گا۔

مولاناؒ کے ساتھ گزرے ہوئے اوقات ولمحات کی کچھ روداد پیش خدمت ہے جس سے آپ کی منزلت، علم دوستی، گہرائی، چھوٹوں سے محبت، بڑوں کا احترام، تعلیم وتربیت، محبت وانسیت کے بہت سے پہلو سامنے آئیں گے۔

جامعہ سلفیہ کے شب وروز:

محترم جناب مولانا صاحب کی جامعہ آمد کے بعد شروع میں آپ تصنیف وتالیف تک محدود رہے اور جب میدانِ تدریس میں اترے تو ہم لوگ فضیلت کے آخری سال میں تھے اور مولانا کو صرف عالمیت کے کلاسز میں پڑھانے کی کتابیں ملیں۔ ہماری جماعت کے طلباء کی خواہش تھی کہ آپ سے استفادہ کریں۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا تو ناچیز نے اس کا حل اپنے قریبی دوست وہمدرد ساتھی، علم ومطالعہ کے شائق شیخ عبدالمعید سلفی صاحب کے ساتھ یہ نکالا کہ مولانا صاحب سے درسی کتب کا نہ سہی، کچھ نہ کچھ استفادہ ضرور کیا جائے۔ چنانچہ درخواست کی گئی جو قبول ہوئی اور مولانا محترم نے ہم دونوں کو قرآن پاک کی کچھ سورتوں کا ترجمہ، تفسیر اور خلاصہ نہایت بلیغ انداز میں گویا گھول کر پلایا۔ اس طرح آپ کے شاگرد ہونے کی سعادت ملی۔ ناچیز سے مولانا محترم کی محبت وعنایت، شفقت ومہربانی کا عالم یہ تھا کہ جمعرات اور جمعہ کی چھٹیوں میں آپ خاکسار کو اپنے ہمراہ کئی بار سفر پر لے گئے۔ آپ کے ساتھ مئو ناتھ بھنجن، اعظم گڑھ، مبارکپور، حسین آباد، مئو آئمہ، پریوانرائن پور اور املو جانے کا اتفاق ہوا۔ بعد میں آپ کے ساتھ کلکتہ تک کا سفر کیا اور موصوف نے کہیں بھی کسی حال میں علمی پیاس بجھانے، تربیت وافادے میں کسر نہ چھوڑی۔ علمی شخصیتوں سے ملاقاتیں کرائیں، نصیحتوں سے دامن بھرا، جمعے پڑھوائے اور اپنے علمی دروس ومحاضرات سے دیگر سامعین ومحبین کے ساتھ مجھے بھی مستفید فرمایا۔

مولانا کا طریقِ تدریس اور طرزِ تخاطب وخطابت بہت سادہ تھا لیکن دل نشین، آیات واحادیث سے مزین، معلومات سے پُر اور لفاظی سے دور ہوا کرتا تھا۔ایک بار بتایا کہ ترنم کے ساتھ گا گا کر تقریریں کرنے والوں نے سامعین کے کانوں کو عیاش بنادیا ہے۔قرآن وحدیث کی سیدھی سادی باتیں مشکل سے دلوں میں اترتی ہیں۔ نیز فرمایا: شیخ الحدیث علامہ عبیداللہ رحمانیؒ اس طرح کے طرزِ خطابت کو ناپسند کرتے ہیں۔

مبارکپور کے ایک سفر میں شارحِ مشکاۃ محدثِ عصر مولانا عبیداللہ رحمانی صاحب سے ملاقات کرانے اور دعاؤں وپندونصائح کے لیے ان کے پاس لے گئے۔وہاں شیخ الحدیث صاحب کے سامنے مولانا کا حسنِ ادب، استماع وانصات دیکھ کر ایسا لگا کہ ہماری طرح آپ بھی طفلِ مکتب ہیں۔اور شیخ الحدیث صاحب کا اندازِ گفتگو، طرزِ تکلم ان کے ساتھ بہت ہی مشفقانہ، مربیانہ، انسیت ومحبت سے بھرپور تھا۔مولانا محترم اکثر ان کے پاس جاتے اور مشورے کرتے رہتے تھے۔جامعہ سلفیہ میں قیام کے دوران مرکزی جمعیت میں انہیں لے جانے کی بات چلی تو مولانا نے شیخ الحدیث صاحب سے مشورہ کیا۔جواب ملا: وہ جگہ تمہارے لیے مناسب نہیں۔اس طرح الرحیق المختوم کی تالیف میں بھی ان کے مشورے اور رہنمائی اور دعائیں شامل تھیں۔مولانا صاحب شیخ الحدیث صاحب کی طرح ان کے فرزند کبیر جناب مولانا عبدالرحمٰن حفظہ اللہ کی بھی بہت عزت وقدر کرتے اور بڑے احترام سے ان کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔وہ بنارس جامعہ میں جب بھی تشریف لاتے مولانا کے پاس ہی قیام کرتے تھے۔

مبارک پور میں انہوں نے حکیم عبدالسمیع صاحب، حاجی ادریس صاحب اور دارالتعلیم کے کچھ اساتذۂ کرام سے بھی ملاقاتیں کرائیں۔حکیم صاحب سے بھی آپ کو کافی انسیت تھی۔ان کا ذکر بھی کیا کرتے تھے۔ان کا ایک لطیفہ بھی بیان کیا جو یاد آرہا ہے۔مولانا صاحب نے بتایا کہ ایک رافضی نے ان کے سامنے اول فول بکتے ہوئے کہا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا جب بصرہ سے نکلیں تو ان پر کتے بھونک رہے تھے۔حکیم صاحب سے چپ نہ رہا جا سکا۔ برجستہ کہا کہ ان پر آج تک کتے بھونک رہے

ہیں۔ رجل عاقل تھا، اشارہ سمجھ گیا اور پھر اسے بھاگتے ہی بنی۔ حکیم صاحب کی حذاقت ومہارت کے بھی مولانا صاحب بڑے معترف تھے۔ بتاتے تھے کہ ان کا تجربہ اتنا وسیع اور تشخیص اتنی صحیح ہوتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ آپ مریض کی چال سے اس کے احوال کا ادراک کر لیتے ہیں۔ (تغمده الله بواسع رحمته)

اسی طرح مولانا صاحب اس ناچیز کو اپنے ساتھ استاد محترم جناب مولانا ادریس صاحب آزادؒ کے گاؤں "املو" بھی لے گئے جہاں حاجی محمد ایوب صاحبؒ وغیرہ سے ملاقات کرائی۔ حسین آباد میں جمعہ کا دن پڑ گیا۔ مولانا نے کہا: خطبہ تم ہی دو گے۔ ناچیز اس وقت طالب علم اور قدرتی طور پر ایسے مواقع اور امور سے جھجکنے اور بھاگنے والوں میں سے تھا۔ ٹال مٹول کی کوشش کی لیکن مولانا صاحب کا اصرار رہا اور مولانا کے سامنے خطبہ دینے کا پہلا چانس تھا۔ ہلتے کانپتے یہ ذمہ داری نبھائی۔ لیکن مولانا صاحب خوش ہوئے۔ بعض جملوں پر تعریف کی اور بڑی فراخ دلی سے حوصلہ افزائی فرمائی۔ ذرہ نوازی کا انکشاف ہوا۔ اور حوصلہ ملا، اس کے بعد مئو ائمہ میں مولانا عبدالنور صاحب اور مولانا عبداللہ صاحب وغیرہما سے ملاقات کرائی اور ایک مسجد میں وہاں بھی خطبہ دلوایا اور یہ تربیت وتمرین میرے لیے ہمت کا سامان بنی۔

تالیف الرحیق المختوم:

سیرۃ خاتم الرسل رحمت دو عالم محمد ﷺ سے آپ کو بہت لگاؤ تھا۔ کتب سیر میں "رحمۃ للعالمین" کے مؤلف قاضی منصور پوری کے بڑے مداح تھے۔ ایک بار کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں صرف آیات واحادیث صحیحہ کی روشنی میں سیرۃ النبی ترتیب دوں۔ پھر ۱۳۹۶ ہجری میں جب رابطہ عالم اسلامی کا اعلان سامنے آیا تو دیگر گرامی قدر شخصیات کے ساتھ میں نے بھی مولانا صاحب سے سیرت نگاری کے اس مقابلے میں شرکت کے لیے اصرار کیا جس کا تذکرہ موصوف نے پاکستان کے اردو طبع (۱۴۱۶ھ) میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ بڑے تردد کے بعد انہوں نے کمر کس لی اور کام شروع کر دیا۔ کاپیوں پر کاپیاں بھری جانے لگیں۔ مولانا محترم کو اللہ تعالیٰ نے ایک یہ صفت بھی وافر انداز

میں عطا فرمائی تھی کہ مطالعے اور مراجع سے بہت جلد نتائج اخذ کر کے بڑے سہل انداز میں ذکر کر دیا کرتے تھے۔کبھی کبھی ناچیز سے کہہ دیتے کہ فلاں حدیث اس طرح فلاں کتاب سے نقل کرلو۔ اس طرح کام ہوتا رہا۔ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ کام مولانا صاحب خارجِ دوام اوقات میں انجام دیتے تھے اور ڈیوٹی کے وقت میں صبح سے شام تک اپنے کمرے یا لائبریری (مکتبہ) میں شعبۂ ترجمہ وتالیف کی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے اہل حدیث اور ترجمان کی فائلیں کھنگالتے اور مولانا امرتسری ؒ کی سیر وسوانح اور ان کے کارنامے قلمبند کرنے میں صرف کرتے۔عصر یا مغرب کے بعد سیرت نگاری کا کام شروع کرتے تھے جو رات دیر گئے تک جاری رہتا۔اس کے دوران خادم اکثر اوقات آپ کے ساتھ رہا۔والد محترم حفظہ اللہ کھانے کی ماہانہ فیس ادا کروادیا کرتے تھے اس وجہ سے میرا کھانا بھی اساتذہ والا ہوتا تھا۔اس لیے کھانا بھی اکثر ساتھ ہی کھالیا کرتے تھے۔

ایک قابل ذکر امر یہ ہے کہ اتنی محنت شاقہ ،سحر (جگار) دماغی دباؤ کے باوجود کبھی انہیں سر درد کی بھی شکایت نہیں ہوئی اور نہ کبھی کسی نماز سے خود پیچھے رہے نہ رہنے دیا۔کبھی تھک جاتے تو خود ہی چائے بنا لیتے اور کبھی ناچیز کو یہ شرف حاصل ہوتا۔الٹی سیدھی بے ذائقہ چائے کو بھی بلا تکلف نوش فرمالیتے۔اس دوران نکت اور لطائف کا دور چلتا اور فرحت وتازگی عود کر آتی۔اور پھر سے موصوف کام میں لگ جاتے۔کبھی کبھار مراجعہ اور املا پر لگا دیتے۔تسوید کا کام مکمل ہوا تو تبییض کے لیے شیخ عبدالمعید صاحب نے عربی رسم الخط اچھا ہونے کی وجہ سے بہت ساتھ دیا۔اس طرح یہ عظیم کارنامہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔انڈیکس اور فہارس کی ترتیب کا شرف بھی ناچیز کو حاصل ہوا۔

صبر وقناعت:

جامعہ سلفیہ کے ابتدائی دور میں مولانا کی تنخواہ چند صد روپے تک محدود تھی،جن میں سے اوپر کے چالیس روپے وہ اپنے چائے پانی اور خرچ کے لیے رکھ لیتے اور باقی اپنے صابر وشاکر ہر حال میں راضی برضا رہنے والے اہل وعیال کے پاس پہنچا دیتے یا خود جا کر دے آتے تھے۔انہوں نے تنگ دستی وتنگ حالی کے ایام گزارے تھے۔لیکن (الغنی غنی النفس) کی مکمل تفسیر تھے۔ہم نے کبھی

مولانا کو فکر معاش سے پریشان یا شکوہ کناں نہیں دیکھا؛ بلکہ بڑے ہشاش بشاش فکرِ فردا سے بے نیاز اور تنگی میں بھی انہیں فراوانی کی سی زندگی گزارتے دیکھا ہے۔ ہمارے خود کے اخراجات ان سے زیادہ تھے۔ ان کا صبر و شکر، عزم و ارادہ قابل تحسین تھا، اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اوصاف پر شاید الرحیق المختوم کے ذریعہ ایسا نوازا کہ انہیں عزت و شہرت، فراوانی، کشادگیٔ رزق کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ (ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء)

تعلق اور ذرہ نوازی:

جامعہ سلفیہ سے تخرج کے بعد ناچیز کو B.U.M.S کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ مل گیا۔ خط و کتابت جاری رہی جس میں مولانا القاب و آداب، املا وغیرہ کی اصلاح بھی کرتے تھے۔ ایک دو بار علی گڑھ بھی تشریف لائے اور وہاں کے ماحول کے لحاظ سے نصیحتیں کیں، اور جب جامعہ اسلامیہ میں داخلے کے لیے جامعہ سلفیہ سے کاغذات بھیجے جانے لگے تو کچھ ذمہ داران نے کہا کہ محمد الیاس تو طبیہ کالج میں ہے، اس کی جگہ کسی اور کو چانس دیا جائے۔ لیکن مولانا محترم نے کہا: نہیں، اس کا نام خارج نہ کیا جائے۔ ایک اسٹوڈیو جس میں الہ آباد بورڈ کے لیے میں نے فوٹو کھینچوائے تھے۔ وہاں سے بروقت بدقت تمام فوٹو حاصل کر کے کاغذات مکمل کیے اور پھر مجھے پاسپورٹ لے کر جامعہ پہنچنے کی ہدایت دی۔ والد صاحب (مدظلہ العالی) کو تردد تھا۔ ان کا کہنا تھا: پہلے کورس مکمل کر لو۔ لیکن والدہ صاحبہ (رحمہا اللہ) نے اسی کو ترجیح دی اور میں مسلم یونیورسٹی میں دو سال گزار کر اللہ تعالیٰ، پھر مسئولینِ جامعہ اور مولانا کی نظرِ کرم اور اصابت رائے سے دوبارہ خیر و بھلائی کی طرف لوٹ آیا اور آج اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دین و دنیا سے دامن بھرا ہوا ہے۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے ۱۴۰۱ھ میں فراغت کے بعد ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب کے تعاون سے تحفیظ القرآن میں جگہ مل گئی۔ سماحۃ الشیخ ابن بازؒ کی صحبت نصیب ہوئی۔ ان سے ۱۷ سال تک استفادہ کیا۔ تقریباً ۷۱ کتب ان سے پڑھیں، انہیں سنائیں جن کی شرح سیکڑوں کیسٹ اور سی ڈیز میں موجود ہیں (نفع اللہ بہا المسلمین)۔ موصوف کے سایہ تلے امامت و تدریس، دعوت

وتبلیغ، علم وروحانیت سے دامن سجانے کا موقع ملا۔ متعدد دعاۃ کا اپنی سفارش پر علی حساب الشیخ تعاقد کرایا۔ پندرہ سال تک معہد القرآن الکریم میں متوسط اور ثانویہ میں حدیث، مصطلح، تخریج، علوم القرآن، قرآن پاک اور فقہ کی تدریس کی سعادت نصیب ہوئی۔ ان سب امور میں جو بھی کامیابی ہوئی، ناچیز اپنے مربیان، اساتذۂ کرام، والدین صاحبان اور خویش واقارب کی دعاؤں کے ساتھ مولاناؒ کی رہنمائی اور دعاؤں کو اہم سبب گردانتا۔ **فجزاهم الله عني خير الجزاء**۔

ایک بار جب میں نے عرض کیا کہ دین ودنیا کے لحاظ سے آج مجھے اللہ تعالیٰ نے جس مقام تک پہنچایا ہے اس میں آپ کا بڑا ہاتھ ہے۔ بکمال شفقت فرمایا:

''مجھے اس مقام تک لانے میں الرحیق المختوم کے لیے اصرار میں تمہارا بھی ہاتھ ہے''۔

یہ آپ کی ناچیز سے محبت ہی تھی کہ مدینہ منورہ آنے سے پہلے دور دراز کے سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے بنارس سے میری شادی میں شرکت کے لیے آبائی وطن باڑی تشریف لائے جس سے ہماری خوشیوں میں چار چاند لگ گیا۔

۱۳۹۹ھ میں جب استلامِ جائزہ (ایوارڈ) کے لیے مولانا سعودیہ تشریف لائے تو جدہ ائیر پورٹ سے ہی راقم اور محترم جناب عبدالوہاب خلجی صاحب آپ کے ساتھ رہے۔ جدہ، مکہ، طائف اور خیبر وبدر کے تاریخی مقامات کی سیر کی۔ مولانا صاحب نے بڑی دلچسپی سے ان مقامات کا مشاہدہ کیا اور اپنے علم وانداز سے بتاتے جاتے تھے: وہ مقام اس جگہ ہونا چاہیے، فلاں شہید اس جگہ ہوگا۔ خیبر کے سفر میں ڈاکٹر رضاء اللہ مبارکپوری، شیخ سہیل صاحب مئوی، برادرِ کبیر عبدالکبیر صاحب بھی ہمراہ تھے۔ خیبر کے قلعوں نخلستان اور چشموں پر لطیفے اور چٹکلوں نے اس سفر کو یادگار بنا دیا۔

انعام کی رقم مولانا صاحب نے میرے ہی پاس رکھی جو وقفے وقفے سے ہندستان تحویل کر دی گئی۔ سرکاری ضیافت میں فندق سے چھٹی کے بعد کئی ہفتے مولانا نے سکن الجامعہ میں میرے ہی ساتھ قیام فرمایا۔ ان تمام زیارات کا تذکرہ خود مولانا نے پاکستانی ایڈیشن کے عرضِ مؤلف میں کیا ہے۔

۱۴۰۹ھ میں ''مرکز خدمة السنة والسيرة النبوية'' کی تاسیس کے بعد استاذ محترم شیخ عمر

فلاتہؒ کے اصرار و کوشش پر آپ مدینہ طیبہ تشریف لائے۔ اس وقت راقم ریاض میں اقامت پذیر تھا۔ ٹیلیفونک رابطہ قائم رہا اور مدینہ منورہ سے آتے جاتے سفر میں آپ غریب کے غریب خانے کو رونق بخشتے۔ محترم جناب عبدالمالک مجاہد صاحب آ کر ملاقات کرتے اور کہتے تھے:

''مجھے تم پر رشک آتا ہے، اتنی عظیم ہستیوں کی خدمت کی تمہیں سعادت حاصل ہے''۔

1997ء میں جب مرکز السنۃ سے آپ کا معاہدہ ختم ہوا، محترم جناب خلجی صاحب اور ناچیز نے مولانا صاحب سے جمعیت اہلحدیث ہند کی امارت قبول کر لینے پر زور دیا جسے بڑے تردد اور دعائے استخارہ کے بعد مولانا نے قبول فرما لیا۔ اتفاق اس بات پر ہوا تھا کہ ان کے صاحبزادے جب جامعہ اسلامیہ سے فارغ ہوں گے تب ہی مولانا ہندستان منتقل ہوں گے۔ جمعیت کی مجلس شوریٰ نے باتفاق رائے آپ کو امیر جمعیت اہل حدیث منتخب کیا۔ شروع میں آپ نے اپنے عزائم اور ترجیحات کے لیے مناسب رہنمائی اور کد و کاوش بھی کی، لیکن پھر دارالسلام سے معاہدہ ہو گیا اور وہ ریاض میں قیام پذیر ہو گئے اور آخر میں دو سال بعد نامعلوم وجوہ کے سبب آپ نے جمعیت کی امارت سے استعفیٰ دے دیا۔

ریاض میں بھی جب تک آپ کا قیام رہا۔ مسلسل رابطہ رہا، برابر آتے جاتے اور ہمیں شرف ضیافت بخشتے۔ کبھی کبھار من پسند ڈش کے لیے بھی کہہ دیتے۔ بلا تکلف ماحضر تناول فرماتے اور استحسان ظاہر کرتے۔ فرصت کے اوقات میں ناچیز بھی حاضر خدمت ہوتا۔ اسی طرح دن گزرتے گئے اور آج احساس ہوتا ہے ہم مولانا صاحب سے مزید علمی استفادہ کر سکتے تھے۔

چند سال قبل فالج کا شدید حملہ ہوا، اللہ تعالیٰ نے شفا بخشی، لیکن قوی کمزور سے کمزور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ بڑی مشقت برداشت کرتے۔ اس حال میں بھی ہندستان اور مدینہ منورہ کا چکر لگاتے رہے۔ ریاض آئے تو دارالسلام میں بھی اپنی ڈیوٹی کے اوقات میں ڈیوٹی دیا کرتے تھے۔ انہیں بے کار بیٹھنا قطعاً پسند نہ تھا۔ ہندستان واپسی سے کچھ پہلے ایک دن ہلکی بارش میں مسجد سارۃ (جو کہ میرے گھر سے تقریباً 700 میٹر کے فاصلے پر ہے) آ کر نماز جمعہ پڑھی اور پیدل چلتے ہوئے

گھر آئے۔آپ کی صعوبت دیکھ کر دھچکا لگا۔عرض کیا: ٹیلیفون کر دیتے تو ہم خود حاضر خدمت ہو جاتے لیکن آپ خاموش ہو گئے۔

کبھی کبھار ہومیو پیتھک دوائی بھی لیجاتے اور کئی بار افادیت کی تصدیق کی۔ایک بار میں نے پوچھا تھا: ان ادویہ میں نوے پرسنٹ الکحل ہوتا ہے آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ بتایا کہ شیخ الحدیث صاحب سے پوچھا گیا تو فرمایا تھا: ''کیونکہ دوا کے ساتھ الکحل کی ماہیت تبدیل ہو جاتی ہے اور نشہ آور نہیں رہتی، اس لیے ہومیو پیتھک دوا استعمال کی جا سکتی ہے''۔

ذہنی و دماغی صلاحیت:

اللہ تعالیٰ نے بلا کی ذہانت اور دماغی قوت عطا کی تھی۔نتائج اور مسائل اخذ کرنے میں ممتاز صلاحیت کے مالک تھے۔کشاف، تفسیر بیضاوی اور حجۃ اللہ البالغہ کی مشکل ترین عبارتیں بلا تردد آسانی سے حل فرما دیا کرتے تھے۔وزارۃ الشؤون الاسلامیہ سے خادم کو ''الوسائل المفیدة للحیاة السعیدة'' کے ترجمے کا آڈر ملا۔کچھ اشعار اور آثار کا ترجمہ کرنے میں دقت آ رہی تھی۔ مولانا صاحب کے پاس گیا اور ایک مجلس میں سارے عقدے حل فرما دیے اور اتنے فصیح و بلیغ انداز میں کہ مزہ آ گیا۔آپ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ کسی بھی استفسار پر بڑے پیار اور کمال شفقت اور محبت سے اس طرح سمجھاتے تھے کہ سائل کو خجالت محسوس نہ ہوتی اور تعلّی کا شائبہ بھی نہ ملتا۔

ایک بار بتایا کہ مؤناتھ میں کچھ رفقاء کسی حکیم صاحب کی کوئی عبارت حل کرنے میں جٹے ہوئے تھے جس میں حکیم صاحب نے کسی مرض کا نسخہ لکھتے ہوئے اپنے نسخہ کو عام آدمی کی خرد برد اور سمجھ سے بچانے کے لیے بڑا گنجلک بنا دیا تھا۔نسخہ کچھ اس طرح تھا:

''فارسی گدھا، عربی مٹی، بیچ میں ہزار کا فاصلہ''۔

اتفاق سے مولانا وہاں پہنچ گئے اور یہ معمہ حل کرنے کی درخواست کی گئی۔مولانا صاحب فرماتے ہیں: فوراً میرے ذہن میں آیا اور میں نے کہا: یہ تو ''خراطین'' کا ترجمہ ہے۔

اور کچھ اوصاف:

آیات ، احادیث، اشعار اور تاریخی واقعات کا استحضار بھی قابل رشک تھا۔ ایک بار مجاہد صاحب نے ریاض سے تقریباً دوسو کلومیٹر دور دمام کے راستے میں مزارع سعید پر عوائل کا ایک پروگرام رکھا۔ اس وقت دولِ خلیج پر جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے، عالم اسلام یاس وقنوط میں ڈوبا تھا اور لوگ ڈرے سہمے سے تھے۔ مولانا صاحب ہمارے ساتھ موجود تھے۔ مجاہد صاحب نے کہا: ان وحشتناک حالات میں مولانا سے گزارش ہے کہ تسلی وتشفی کا سامان بہم پہنچائیں۔ مولانا کھڑے ہوئے اور حمد وصلاۃ کے بعد آیت شریفہ:

﴿وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللَّهِ مَكْرُهُم وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ، فَلا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخْلِفَ وَعْدِهِ رُسُلَهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ﴾

"دشمنوں نے مکر وفریب کی کیا کیا چالیں چلیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی ساری چالوں کا علم ہے، گرچہ ان کے حملے بھی اتنے شدید تھے کہ پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل جائیں۔ اس لیے اے نبی! آپ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں سے وعدہ خلافی کرے گا، اللہ تعالیٰ تو بڑا ہی غالب اور بدلہ لینے والا ہے"۔ (ابراہیم:46،47)

پڑھی اور بتایا کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کفر وشرک اور ظلم وستم کی آندھیاں ہمیشہ چلتی رہی ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو ایسے موقعوں پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے وعدہ ہے کہ وہ انھیں غالب کر کے رہے گا۔ دیگر اور اسی طرح کی آیات واحادیث کی ایسی فصیح وبلیغ انداز میں تشریح وتوضیح کی کہ عوام وخواص جھومنے لگے، اطمینان وسکون میسر آیا اور

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی

کا نقشہ سمجھ میں آنے لگا۔ فرمایا:

"توپ وتفنگ، راکٹ ومیزائل اور بم دھماکے قدرتِ الٰہی کے سامنے سب ہیچ ہیں"۔

میں نے عرض کیا: آپ کو بروقت موضوع سے مناسب آیات واحادیث کیسے یاد آ گئیں؟ فرمایا:

''یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، لیکن کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کاش قرآن کریم حفظ کر لیا ہوتا''۔

سامعین کو یاد ہوگا مولانا محترم نے بڑے دل نشیں انداز میں مرض کی نشاندہی بھی کی تھی اور عالم اسلام کی بے حسی ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''ایک وقت تھا ایک اسلامی حکمران نے صرف ایک عورت کی آہ وفغاں پر فوج کشی کر دی تھی اور فتح ونصرت کے جھنڈے گاڑتے ہوئے اس مظلوم عورت کو ظلم وستم سے نجات دلائی، آج عالم اسلام سو رہا ہے''۔

مولانا صاحب کو علوم شرعیہ کے ساتھ، اسلامی تمدن وتاریخ، سرایا وغزوات، تاریخ وسیر، ملوک عصرِ حاضر اور احداثِ عالم پر گہری نظر اور دلچسپی تھی۔ میدانِ عمل میں اترنے کے بھی متمنی رہے اور اپنی صواب دید کے مطابق حمایت ورہنمائی اور تعاون بھی پیش کرتے رہے۔ دفاعی صلاحیتوں سے بھی مالا مال تھے۔ سیونی (مدھیہ پردیش) میں قیام کے دوران فساد پھوٹ پڑا تو وہاں کس طرح دفاعی حکمتِ عملی اختیار کی اور مقامی سکان کو کس طرح جانی ومالی نقصان سے بچایا بڑی دلچسپی سے اس طرح کے واقعات بیان کرتے تھے جو بہادری کے جوہر جگاتی۔ بتایا کہ فساد کے دوران لوگوں نے زور دیا کہ اہل وعیال کو فلاں کی نگرانی وحفاظت میں فلاں جگہ پہنچا دیجیے۔ فرمایا: ''مجھ سے زیادہ میرے اہل وعیال کی حفاظت ونگرانی کون کر سکے گا''۔

سعودی عرب اور آل سعود سے بلادِ عربیہ آنے سے پہلے ہی بڑی الفت ومحبت تھی اور شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب اور آل سعود سے متعلق بہت کچھ لکھا بھی اور بتایا بھی کرتے تھے۔ ایک بار ملک عبدالعزیز (غفر اللہ لہ) کے بارے میں بڑا عبرت آموز اور دلچسپ واقعہ سنایا جس کی قدرے تفصیل یہ ہے:

''جلاوطنی کے دوران صحرائے کویت میں جب موصوف سنِ شباب پر تھے کہ کسی خادمہ نے ان کے والد صاحب کو خبر دی کہ یہ شہزادے جب سب لوگ سو جاتے ہیں تو چپکے سے نکل کر پتہ نہیں کہاں چلے جاتے ہیں اور فجر کے وقت سب کے جاگنے سے پہلے آ کر لیٹ جاتے

ہیں۔ان کے والد صاحب نے نگرانی شروع کرادی اور کئی دن کے بعد نگراں نے آکر کہا کہ آج رات آپ میرے ساتھ تشریف لے چلیں اور بچشم خود دیکھ لیں کہ صاحبزادے کہاں جاتے ہیں، کیا کرتے ہیں؟

رات ہوئی ملک عبدالعزیز نے اپنی عادت کے مطابق جب محسوس کیا کہ سب سو چکے ہیں، اٹھے اور چل دیے۔ان کے پیچھے تعاقب میں کچھ وقت اور فاصلے سے یہ لوگ بھی روانہ ہوئے۔جا کر دیکھا ایک ٹیلے کے پیچھے وہ سجدے میں پڑے اللہ سے مناجات کر رہے ہیں، روتے ہیں اور دعا کرتے ہیں: اے اللہ! اسلامی نظام نافذ کرنے اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے امن وامان قائم کرنے کے لیے ہمیں ہمت وطاقت عطا کر۔شاید انہی دعاؤں اور سحر گاہی کا اثر تھا کہ صرف ایک درجن کے قریب سرفروشوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح ونصرت عطا فرمائی اور ریاض فتح ہوا۔سعودی حکومت قائم ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے امن وامان قائم فرمایا جو آج تک ہمارے سامنے ہے"۔

غالباً انہیں کے بارے میں مولانا صاحب نے بتایا تھا کہ ان سے کسی نے پوچھا کہ کب تک آل سعود کی حکومت قائم رہنے کی توقع رکھتے ہیں؟ فرمایا: جب تک اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہیں گے ورنہ اس امانت کو تو اللہ تعالیٰ ہم سے چھین کر کسی اور کو دے دے گا۔شاہ عبدالعزیزؒ کے توکل علی اللہ اور اعتماد ویقین کی بات بتاتے ہوئے مولانا نے بیان کیا: "کسی مصاحب نے طائرات حربیہ کی بمباری اور ان کی خطرناکی ذکر کی تو شاہ نے فرمایا: کتنی اونچائی سے پرواز کرتے ہیں؟ بتایا گیا کہ بہت اوپر اڑتے ہیں۔کہا: جاؤ فکر نہ کرو، اُن سے اوپر بھی ایک زبردست طاقت وقوت والی ذاتِ مبارکہ موجود ہے یعنی ذاتِ باری تعالیٰ"۔

بزرگوں کا احترام:

مولانا صاحب اپنے ہم عصر علمائے کرام اور بزرگوں کا تذکرہ بڑے احترام وادب سے کیا کرتے تھے۔شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی، ناظم اعلیٰ مولانا عبدالوحید، استاد محترم شیخ الجامعہ

مولانا عبدالوحید رحمانی، مولانا عبدالمعید بنارسی، ناظم جامعہ فیض عام، شائق صاحب، مولانا شمس الحق مولانا مصلح الدین صاحب (رحمہم اللہ اجمعین) وغیرہ کے تذکرے ہمارے سامنے بڑی عقیدت واحترام سے کرتے تھے۔

مولانا مصلح الدین صاحب کے طرز خطابت وطریق تدریس، تبحر علمی اور نکتہ آفرینی درس بخاری شریف ان کے دل نشین انداز کا ذکر کرتے وقت ان کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔

اسی طرح مولانا شمس الحق شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ کے بھی مداح تھے۔ایک دن فرمانے لگے:

''چلو مولانا سے سندِ اجازہ لی جائے''۔

مولانا شمس الحق رحمہ اللہ سے اجازت لی اور ہم دونوں نے **أطراف الصحيحين** پڑھے۔اس سے قبل میں نے ان سے صحیح مسلم، موطأ امام مالک، **بداية المجتهد** اور دیگر کئی درسی کتب پڑھی تھیں۔مولانا شمس الحق صاحب نے مجھے اور مولانا صفی الرحمٰن کو سندِ اجازہ عطا کی جس کی سعادت کم ہی طلبہ کو ملی ہوگی۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ مولانا امرتسری رحمہ اللہ کی ذہانت، علم، حاضر جوابی، منطق، خلوص وللّٰہیت وغیرہ سے بہت متاثر تھے اور اکثر ان کے مکالمے، اشعار اور لطائف سنایا کرتے تھے۔اور اس احترامی انداز میں ان کا ذکر کرتے کہ ان کی شخصیت کا جیتا جاگتا نمونہ نظروں کے سامنے آجاتا۔ ایک بار فاتحِ قادیانیت کی تواضع وخاکساری کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ جب ان پر قاتلانہ حملہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے صحت وتندرستی عطا کی تو بڑی حسرت سے جامِ شہادت سے بچ جانے پر لکھا: ہائے افسوس بے کمالی میں بھی کامل نہ ہوئے اور بتایا کہ قید کے دوران انتہائی خاموشی سے قاتل کے اہل وعیال کی کفالت کرتے رہے، جس پر وہ نادم ہوکر تائب ہوا اور غالباً اہل حدیث ہوگیا۔مولانا اپنے ہم عصر ساتھیوں کا ذکر بھی عزت واحترام سے ہی کرتے تھے اور بلاوجہ کسی پر کیچڑ نہیں اچھالتے۔ہاں اگر کسی نے آپ سے تعرض کیا تو الفاظ وجُمل میں ایسی گندی کرتے کہ مقابل بغلیں جھانکنے لگتا۔

مولانا صاحب کے ادراک وآگہی، حالات سے پنجہ آزمائی، عدمِ استسلام، اور بہت سی خوبیاں

مسلم تھیں جن کا تذکرہ عبدالمعید صاحب نے اچھے انداز میں کیا ہے۔

مولانا کامیاب ترین زندگی گزار کر دنیا سے چلے گئے اور تصانیف وتلامید کا ایک جم غفیر چھوڑا ہے جو ہمیشہ آپ کی یاد دلاتا رہے گا اور میدانِ عمل کی بھی دعوت دیتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَمَنْ كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا﴾

''جو کوئی بھی اپنے رب سے ملاقات کی آرزو رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اچھے کام کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ کرے''۔ (الکہف:111)

اس دنیا سے ہر ایک کو جانا ہے، ہر انسان کو دیکھنا چاہیے کہ اس نے ساتھ لے جانے کے لیے کیا اکٹھا کیا ہے۔

انساں کی زندگی تک ہے مال وملک وزر سب
مرتا ہے جب تو پوچھو کیا ساتھ لے چلا ہے؟

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اہل خانہ کو بھی صبر وسکون نصیب فرمائے اور کسی کو ان کا صحیح جانشیں بنائے۔

"اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ وَاعْفُ عَنْهُ وَأَكْرِمْ نُزُلَهُ وَوَسِّعْ مُدْخَلَهُ وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَنَقِّهِ مِنَ الذُّنُوبِ وَالْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ"۔ (آمین)

و صلى الله على نبينا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين۔

صاحب ''الرحیق المختوم'' کی زندگی کے بعض گم گشتہ پہلو

(از: غازی عزیر، الجبیل، سعودی عرب)

علامہ شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کی وفات کے بعد سے دیارِ عرب اور برصغیر کے جرائد ورسائل میں آپ کی سوانح، پیدائش، نام ونسب، وطن، تعلیم، تدریسی ودعوتی وصحافتی تحقیقی وجماعتی خدمات، اسفار، مرض، وفات پسماندگان، شرکائے جنازہ اور تدفین وغیرہ کے متعلق اس قدر لکھا جا چکا ہے اور مسلسل لکھا جارہا ہے کہ مزید لکھنے کی چنداں حاجت محسوس نہیں ہوتی ہے۔ چنانچہ جب برادرم رضوان اللہ ریاضی سلمہ اللہ نے شیخ رحمہ اللہ کی زندگی پر اپنے تاثرات ومشاہدات اور ان کے متعلق اپنی یادداشت کو قلمبند کرنے پر مسلسل اصرار کیا تو راقم نے فیصلہ کیا کہ عمومی روش سے ہٹ کر شیخ رحمہ اللہ کی زندگی کے صرف ان پہلوؤں یا واقعات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا جائے جن سے قارئین کا صرف ایک محدود طبقہ ہی واقف ہے۔

ان واقعات کو تحریر کرنے کا مقصد جہاں یہ ہے کہ شیخ رحمہ اللہ کا صحیح مقام ومرتبہ آن دی ریکارڈ ہوسکے وہیں یہ بھی کہ شاید شیخ کی زندگی کے یہ پہلو بعض جویانِ علم اور تحقیق وتالیف کے میدان میں مصروفِ علم حضرات کے لیے مشعلِ راہ بن سکیں۔ اس تحریر کا ایک ثانوی مقصد یہ بھی ہے کہ جمعیت اہلحدیث میں ''مرثیہ خوانی'' کی جو بدعت رائج ہوچکی ہے کسی حد تک اس کا تدارک بھی ہوسکے۔ اپنے علماء کے تراجم اور ان کی خدمات کو مرتب اور محفوظ کرنا بلاشبہ ہمارے اسلاف کی سنت رہی ہے۔ لیکن مسلسل چھ ماہ تک پُرغلو مدح خوانی کرنا، سیکڑوں سوگواری کے پیغامات شائع کرنا، تعزیتی مجالس منعقد کرنا، تعزیتی قراردادیں شائع کرنا، دینی رسالوں کے خصوصی نمبر شائع کرنا، سیکڑوں اہلِ قلم سے مقالات لکھوانا، سیمینار منعقد کرانا اور اس طرح کئی کئی ماہ تک اپنی مجموعی توانائی کو لاحاصل سوگ منانے یا رنج وحزن وملال کے اظہار میں ضائع کرنا، ایک ایسی مہلک بدعت ہے جو جمعیت

اہلحدیث کی صفوں میں بھی جگہ پا چکی ہے اور اس لائق ہے کہ سختی کے ساتھ اس شنیع فعل پر نکارت کی جائے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب میں اصل مقصود کی طرف آتا ہوں:

(1) دیارِ عرب میں اپنے اٹھائیس سالہ قیام کے دوران راقم کا رابطہ اہل عرب کے تقریباً ہر طبقہ سے رہا ہے۔ عین دیانت کے ساتھ بیان کرتا ہوں کہ عرب دنیا میں ہندستانی علماء میں سے جو چند شخصیات متعارف ہیں وہ صاحب "تحفة الأحوذي" علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری، شیخ ابوالحسن علی ندوی، علامہ احسان الٰہی ظہیر، صاحب مرعاۃ علامہ عبیداللہ رحمانی اور علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہم اللہ ہی ہیں؛ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے جو مقبولیت عطا کی وہ کسی اور کی مقدر نہ بن سکی تو بھی غلط نہ ہوگا۔

(2) شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے راقم کی پہلی ملاقات علی گڑھ کی جامع مسجد میں ہوئی تھی۔ یہ واقعہ غالباً 1980ء (یا کچھ آگے پیچھے) کا ہے۔ اس وقت شیخ موصوف کے ایک فرزند علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات میں غالباً "فقاہت ابی ہریرۃ" کے عنوان پر ڈاکٹریٹ کر رہے تھے۔ شیخ رحمۃ اللہ علیہ انہیں سے ملنے کے لیے علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ جب موصوف کو علم ہوا کہ راقم سعودی عرب سے آیا ہے تو ملاقات کے لیے شہر تشریف لائے اور والد صاحب کے اصرار پر دو دن گھر پر ہی قیام فرمایا۔ دورانِ قیام شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے مختلف موضوع پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ یہ دور شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے ارتقاء کا ابتدائی دور تھا۔ اور آپ جامعہ سلفیہ بنارس میں بحیثیت استاد مفوض تھے۔ اسی دوران شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے والد (یعنی شیخ محمد امین الاثری الرحمانی المبارکپوری) سے سند حدیث بھی حاصل کی تھی۔

(3) جب رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی طرف سے سیرت نبوی کے عنوان پر بین الاقوامی مقابلہ کا اعلان شائع ہوا تو برادرم جناب ڈاکٹر رضاء اللہ محمد ادریس مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے کسی ہم جماعت (جن کا نام مجھے یاد نہیں) نے شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو اس مقابلہ میں شرکت کے لیے ابھارا۔ شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدائی یہ جواب دیا کہ تدریسی اور "صوت الجامعہ" کی ادارتی ذمہ داریوں کے پیش نظر

یہ اہم کام ممکن نہیں ہے۔ لیکن جب ڈاکٹر صاحب اور ان کے ساتھی نے بار بار اصرار کیا اور مکمل تعاون کرنے کا وعدہ کیا تو شیخ رحمہ اللہ کمر بستہ ہو گئے۔ خود شیخ رحمہ اللہ نے راقم سے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ ڈاکٹر رضاء اللہ رحمہ اللہ کی تحریک پر ہی یہ کام شروع ہوا اور ان کے تعاون سے ہی اِتمام کو پہنچا تھا۔ مراجع کا تتبع اور بحثوں کی ترتیب ڈاکٹر صاحب کے ذمہ ہی تھی بلکہ بعض اجزاء تو ان ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ جب ڈاکٹر صاحب نے ان اجزاء کو لکھ کر شیخ رحمہ اللہ کو دکھایا کہ فلاں جگہ اس بات کا اضافہ مفید رہے گا تو شیخ رحمہ اللہ نے بشکریہ اس کو قبول کیا۔ شیخ رحمہ اللہ کہا کرتے تھے:

''ڈاکٹر رضاء اللہ اگر چہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے مگر ان کی عربی دانی بلا کی تھی''۔

یہی وجہ تھی کہ شیخ رحمہ اللہ ڈاکٹر رحمہ اللہ پر بے حد اعتماد کیا کرتے تھے۔ شہرۂ آفاق سیرت نبوی الرحیق المختوم کے متعلق اس حقیقت سے شاید چند لوگ ہی واقف ہوں۔

(4) شیخ رحمہ اللہ نے الجامعۃ الاسلامیۃ (مدینہ منورہ) کے شعبہ "مرکز خدمۃ السیرۃ والسنۃ النبویۃ" میں تقریباً دس سال بحیثیت ''مساعد باحث'' خدمت انجام دی تھی، لیکن اس دوران سیرت پر ان کی کوئی ریسرچ منصۂ شہود پر نہیں آئی۔ جب اس بارے میں راقم نے شیخ رحمہ اللہ سے استفسار کیا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ جیسا برق رفتار محقق دس سال تک شعبۂ تحقیق سے وابستہ رہے اور کوئی نئی تحقیق سامنے نہ آئے؟ تو فرمایا:

''یہ قسم السیرۃ والسنۃ کے مشرف کی کرم فرمائیوں کا نتیجہ ہے''۔

حقیقت یہ ہے کہ شیخ رحمہ اللہ کئی بار اپنی تحقیقی انجازات کو مشرف کے سامنے لے کر گئے مگر اس ناقدر شناس نے کوئی نہ کوئی وجہ بتا کر اسے واپس کر دیا۔ یہ مشرف غالباً کوئی مصری شخص تھا، اور اسے عام عربوں کے مزاج کے مطابق یہ ہرگز گوارہ نہ تھا کہ کوئی شخص اس سے زیادہ جانا اور پہچانا جائے۔ بہر حال شیخ رحمہ اللہ کو اس بات کا بے حد قلق تھا۔

(5) ہندو مذہب کی مقدس کتابوں میں موجود نبوت کی بشارتوں اور بالخصوص "مکۃ المکرمۃ" کے متعلق جو کچھ اشارات ان میں ملتے ہیں، شیخ رحمہ اللہ کو ان کی تحقیق سے بہت دلچسپی

تھی، اور شاید اس موضوع پر اردو اور عربی میں ان کی کچھ کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ جب شیخ نے عرب شیوخ اور امیرِ مکہ سے ہندومت کی کتابوں میں مکۃ المکرّمۃ کی بابت پیشین گوئی کا تذکرہ کیا کہ ''اس شہر میں داخلہ کے سات راستے ہوں گے جو دشوار پہاڑیوں سے گزر کر وہاں پہنچتے ہوں گے، اور میرا خیال ہے کہ وہ شہر کوئی اور نہیں بلکہ مکہ ہی ہے'' تو فوراً مکہ مکرمہ کی ان قدیم گزرگاہوں کی تلاش کے لیے ایک ٹیم تیار کر دی گئی جس نے شیخ رحمہ اللہ کی سرکردگی میں ہیلی کوپٹر کی مدد سے ان سات پہاڑی درّوں کا سراغ لگایا۔

(6) سعودیہ میں تشریف لانے کے بعد سے شیخ رحمہ اللہ سے تاقیام مسلسل رابطہ رہا، کبھی ٹیلیفون کے ذریعہ تو کبھی مدینہ میں شیخ کے ساتھ قیام کے ذریعہ۔ ٹیلی فون پر عموماً شیخ رحمہ اللہ عائلی گفتگو سے زیادہ علمی باتوں کو پسند فرماتے تھے۔ بیشتر تو غرائب الحدیث کے متعلق والد رحمہ اللہ کی شرح یا مسموعات یا کسی مسئلہ میں ان کے نزدیک راجح چیز یا علل کی بابت دریافت کرتے تھے۔

(7) شیخ رحمہ اللہ راقم کی درخواست پر دوبار الـــجبیـــل کے دعوہ وارشاد سنٹر (جالیات) کے سالانہ اجتماعِ عام (یوم المفتوح) سے خطاب کے لیے بطور مہمان خصوصی تشریف لائے اور اپنے علم وتجربہ سے ہر خاص وعام کو مستفید فرمایا۔

(8) ایک بار جب آپ الـــجبیـــل تشریف لائے تو راقم سے کہنے لگے کہ سعودیہ میں رہتے ہوئے جمعیت کی امارت بعض لوگوں کو ناگوار گزر رہی ہے؛ لہٰذا وہ طرح طرح کے اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔ راقم نے مشورتاً عرض کیا کہ آپ کا دامن جاہ طلبی اور ذاتی مفادات سے ہمیشہ پاک وصاف رہا ہے، لہٰذا بہتر ہے کہ آپ امارت سے مستعفی ہو جائیں۔ یہ سن کر آپ نے اس بارے میں راقم سے کھل کر بات کی اور ہر قسم کی اونچ نیچ بتاتے ہوئے بالآخر راقم کے مشورہ کو ہی پسند کیا۔ نتیجتاً غالباً 2000ء کے اواخر میں امارت کی ذمہ داری سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

(9) جمعیت اہل حدیث کے علاوہ شیخ رحمہ اللہ کو دار التعلیم مبارکپور سے بھی بہت محبت تھی۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب (ابن علامہ عبیداللہ رحمانی مبارکپوری رحمہ اللہ) جب مدرسہ دار التعلیم کی

نظامت پر قابض ہوئے اور انہوں نے مدرسہ کے مفادات کو بلا دریغ نقصان پہنچانا شروع کیا تو شیخ رحمہ اللہ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ یہی کہتے تھے کہ کاش مدرسہ کی نظامت حاجی عبدالسلام رحمہ اللہ یا پھر راقم کے ہاتھوں ہی میں رہتی۔

(10) جب استاذی علامہ عبیداللہ رحمانی مبارکپوری رحمہ اللہ کے بنام والد رحمہ اللہ کا مجموعہ ''مکاتب رحمانی'' کے عنوان سے مکتبہ ترجمان دہلی (جمعیۃ اہلحدیث ہند) کے زیر اہتمام شائع ہوا اور اس کے مقدمہ میں مولوی عبدالوہاب خلجی صاحب نے والد رحمہ اللہ کے متعلق نہایت جارحانہ اور خلاف واقعہ کلمات کا استعمال کیا؛ بلکہ 1956ء کے دوران مالیرکوٹلہ میں رونما ہونے والے دو خاندانوں کے مابین نزاع کے ایک فریق (یعنی جناب عبدالاحد خلجی صاحب والد مولوی عبدالوہاب خلجی صاحب) کے موقف کو صحیح ٹھہراتے ہوئے نصف صدی کے قبل کے قضیہ کو از سر نو بلا وجہ زندہ کرنے اور والد رحمہ اللہ کو مطعون کرنے کی سعی غیر مشکور کی تو شیخ رحمہ اللہ کو بے حد قلق ہوا۔ شدید غصہ کی حالت میں شیخ نے یہاں تک فرمایا:

> ''خلجی کا یہ قدم نہایت قابلِ ملامت ہے۔ اسے اپنے اکابرین اور محسنین کی شناخت ہی نہیں ہے۔ وہ اس لائق بھی نہیں ہے کہ اس جمعیت کا رکن کہا جائے کجا کہ جمعیت کے کسی منصب پر باقی رہے۔''

(11) جب راقم نے 1990ء میں جدید منکرین حدیث پر مفصل نقد کا ارادہ کیا تو شیخ رحمہ اللہ سے اس بارے میں مشورہ طلب کیا۔ آں رحمہ اللہ نے راقم کے اس قدم کو بے حد سراہا، بلکہ دو صفحات پر مشتمل اس بحث کا خطہ بھی مرتب کر کے بھیج دیا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ بعد میں بھی شیخ رحمہ اللہ مراجع کی فراہمی کے متعلق مسلسل راہنمائی کرتے رہے۔ الحمد للہ یہ بحث چند سال قبل جامعہ سلفیہ بنارس سے چار ضخیم جلدوں میں ''فتنۂ انکار حدیث کا ایک نیا روپ۔ اصلاحی اسلوب تدبر حدیث'' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔

اسی ضمن میں ایک بات یہ بھی یاد آئی کہ راقم نے ۱۴۱۲ھ میں شیخ رحمہ اللہ سے حافظ زین الدین

عراقی رحمہ اللہ کی تالیف "ألفية الحديث" کی شرح: "فتح المغيث" جامعہ اسلامیہ کے مکتبہ میں تلاش کرنے کی درخواست کی تو شیخ رحمہ اللہ نے جواباً لکھا کہ "فتح المغيث" تو حافظ سخاوی کی شرح ہے، حافظ عراقی کی اس نام کی کوئی شرح نہیں ہے۔ جب راقم نے بتایا کہ شیخ عبدالغفار حسن صاحب سے راقم نے اس شرح کے بارے میں سنا ہے کہ اس کا ایک نسخہ جامعہ اسلامیہ کی لائبریری میں موجود ہے تو شیخ رحمہ اللہ نے اس کی تحقیق شروع کر دی اور مدینہ کے کسی مکتبہ میں جب اس کا مطبوعہ نسخہ دیکھا تو ایک اپنے لیے اور ایک راقم کے لیے خرید لیا۔ اسی طرح شیخ رحمہ اللہ نے علامہ سخاوی رحمہ اللہ کی "فتح المغيث" مطبوعہ جامعہ سلفیہ بنارس کا مکمل سیٹ بھی راقم کو فراہم کیا جو کہ محقق اور بے حد مفید ہے۔

اس علمی تعاون کے علاوہ شیخ رحمہ اللہ نے راقم کی بحث "فتنۂ انکارِ حدیث کا ایک نیا روپ...... الخ"۔ کی اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود پڑھا اور پسند فرمایا۔ آپ کی ان مساعی کا تذکرہ راقم نے کتاب مذکور کی ابتدا میں یعنی "احوال واقعی" کے تحت ج ا ص ۵۲ پر کیا ہے۔

(12) 1999ء میں عزیزم جناب شیخ انصار زبیر محمدی صاحب (داعی مركز الدعوة والإرشاد، الجبيل) کے توسط سے شیخ رحمہ اللہ کا ایک مضمون راقم کو ملا تھا جس میں میت کی طرف سے قربانی کے متعلق ابوالحسناء کے طریق سے آنے والی حضرت علی کی حدیث کی تضعیف پر کلام کیا گیا تھا (ملاحظہ ہو ماہنامہ محدث بنارس، ماہ ستمبر 1984ء ص ۱۷، ۱۸)۔ راقم نے شیخ رحمہ اللہ کے اس مضمون پر کھل کر تعاقب کیا، اور کسی رسالہ میں اشاعت کے لیے بھیجنے سے قبل اس تعاقب کی ایک عکسی نقل شیخ محترم کے ملاحظہ کے لیے بھیجی۔ شیخ محترم نے نہایت فراخدلی کے ساتھ اس تعاقب کی ستائش کی اور دعاؤں سے نوازا۔ شیخ کا یہ جملہ ابھی تک راقم کے کانوں میں گونجتا ہے:

"آپ جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کے متعلق جملہ مباحث کو جمع کر دیتے ہیں اور کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑتے"۔

ہمت افزائیہ کلمات سننے کے بعد ہی راقم نے یہ مضمون مختلف دینی رسائل کو بھیجا جن میں وہ

شائع بھی ہوا۔

شیخ سے متعلق یہ چند بے ترتیب یادیں ہیں جنہیں راقم نے یہاں جمع کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ جہاں تک شیخ رحمہ اللہ کے متعلق راقم کے ذاتی تاثرات کا تعلق ہے تو راقم نے آپ کو نہایت سادہ لوح، سنجیدہ، پروقار، مشفق، مہمان نواز، بذلہ سنج، دنیاداری اور شہرت سے بے نیاز، خوش مزاج، دل کش، علم کے قدرداں اور انسان شناس شخصیت کے طور پر پایا ہے۔

عزیزم جناب شیخ انصار زبیر محمدی صاحب ماہ رمضان ۱۴۲۷ھ کے اواخر میں جب چھٹی پر وطن گئے تو عید الفطر کے بعد شیخ رحمہ اللہ سے ملاقات کے لیے مبارکپور بھی گئے تھے۔ واپس آنے پر آں موصوف نے راقم سے شیخ کی کیفیت کچھ یوں بیان کی:

"قوتِ گویائی بالکل سلب ہوگئی ہے، مستقل صاحب فراش ہیں، سماعت بھی متاثر ہوگئی ہے۔ جب میں نے اپنا تعارف کرایا کہ الجبیل سے آیا ہوں تو مسکرائے اور جب آپ (راقم) کا سلام پیش کیا تو بھی مسکرائے۔ ان کے صاحبزادہ نے بتایا کہ پہچان کر ترحیب فرما رہے ہیں۔"

راقم کے ساتھ شیخ رحمہ اللہ کے اسی خصوصی تعلق کی بنا پر جونہی آپ کی وفات کی خبر ٹیلی فون پر یہاں پہنچی تو بے شمار لوگوں کے تعزیتی ٹیلیفون، خطوط اور ای میل راقم کو موصول ہوئے۔ اگلے دن مختلف عربی چینل نے شیخ کی زندگی اور خدمات پر خصوصی پروگرام نشر کیے۔ عربی ریڈیو، انٹرنیٹ اور ٹی وی کی نشریات، نیز جرائد ورسائل میں آپ کی وفات پر جس کثرت سے مضامین شائع ہوئے وہ اس گنجینہ علم کی ہردل عزیزی ومقبولیت کے شاہد ہیں۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ وأکرم نزلہ وأدخلہ جنة النعیم.

(29 جنوری 2007ء، بمطابق ۱۰ محرم ۱۴۲۸ھ)

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری - بطور مفسر، محدث اور سیرت نگار

(از: عبدالمالک مجاہد، جنرل منیجر مکتبہ دارالسلام، ریاض)

مجھے صحیح طور پر یاد نہیں کہ میری کتنے سال پہلے مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری سے ملاقات ہوئی۔ حافظے پر زور ڈالنے سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ پندرہ سال تو گزر ہی چکے ہوں گے۔ محترم ڈاکٹر محمد لقمان سلفی کے ہاں کوئی تقریب تھی، مہمان تشریف فرما تھے کہ انہوں نے ایک شخصیت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ ہیں مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری۔ میری بڑی دیرینہ تمنا تھی کہ مولانا سے ملاقات ہو، مگر اس طرح اچانک، میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا، اور پھر مولانا نے مجھے یہ کہہ کر گلے لگا لیا کہ اچھا آپ ہیں عبدالمالک مجاہد۔ میں نے تعجب سے کہا: جی ہاں۔ فرمانے لگے: میں نہ صرف آپ کو جانتا ہوں بلکہ آپ کا مضمون بھی اپنے پرچہ میں شائع کر چکا ہوں۔ فرطِ مسرت سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

دراصل میں نے انقلابِ ایران کے حوالے سے بڑی محنت کے ساتھ ایک مضمون لکھا تھا جسے مختلف پرچوں نے شائع کیا تھا۔ ان کا اشارہ اسی طرف تھا۔ ساتھیوں نے ان کے ساتھ ہی مجھے جگہ دے دی اور میں نہایت محبت سے اس عظیم شخصیت کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ جس کی کتاب الرحیق المختوم نے دنیا بھر میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ اس نشست میں مولانا سے کافی باتیں ہوئیں اور پھر ان سے رابطہ گہرا ہوتا چلا گیا۔ وہ مدینہ یونیورسٹی کے ''مرکز خدمۃ السنۃ والسیرۃ النبویۃ'' میں علوم سیرت کمیٹی کے رکن تھے۔ اور دیگر رفقائے کار کے ساتھ ریسرچ میں مشغول رہتے تھے۔ مدینہ طیبہ آنا جانا رہتا ہی تھا۔ میری خواہش ہوتی کہ جب بھی مدینہ طیبہ جاؤں مولانا سے ضرور ملاقات کروں۔ چنانچہ عموماً فون کر کے وقت لے لیتا اور پھر مرکز خدمۃ السنۃ میں ہم گھنٹوں مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہتے۔ اس دوران میں نے ان سے گزارش کی کہ اسکول کے طلبا کے لئے سیرت پر ایک متوسط حجم کی کتاب تصنیف کریں، جو میٹرک تک کے طلبا کے لئے بطور سلیبس پڑھائی جا سکے۔

چنانچہ انہوں نے میری اس تجویز کو شرف قبولیت بخشا اور عربی زبان میں ''روضۃ الانوار فی سیرۃ النبی المختار'' (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام سے ایک کتاب تالیف فرمائی۔ کتاب شائع ہوئی تو سعودی عرب کے متعدد تعلیمی اداروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کئی لوگوں نے اسے مفت تقسیم کیا۔ کتنے ہی عربی اسکولوں نے اسے اپنے نصاب میں داخل کر لیا۔ پھر میری خواہش تھی کہ اس کتاب کو اردو زبان میں بھی منتقل ہونا چاہیے۔ اسی سوچ میں تھا کہ اس دوران مولانا محترم ریاض تشریف لائے۔ دورانِ ملاقات میں نے اردو ترجمہ کی فرمائش کی تو انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنا بیگ کھولا اور اردو ترجمہ کا مسودہ یہ کہتے ہوئے میرے حوالے کر دیا کہ مجھے معلوم تھا تم اس کا مطالبہ کرو گے۔ اور پھر'' تجلیات نبوت'' کے نام سے یہ کتاب دارالسلام نے نہایت محبت سے شائع کی۔ دارالسلام نے تجلیات نبوت کا ترجمہ دیگر زبانوں میں بھی کیا۔ جن میں انگلش زبان نہایت قابل ذکر ہے۔

مولانا کو جس کتاب نے دائمی شہرت عطا فرمائی وہ ان کی سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر شہرہ آفاق تصنیف الرحیق المختوم کے نام سے شائع ہوئی۔ مارچ 1976ء میں کراچی میں عالمی سیرت کانفرنس ہوئی۔ جس کے اختتام پر رابطہ عالم اسلامی نے سیرت کے موضوع پر مقالہ نویسی کا ایک عالمی مقابلہ منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ یہ ربیع الاول 1396ھ (مارچ 1976ء) کی بات ہے کہ کراچی میں عالم اسلام کی پہلی سیرت کانفرنس ہوئی جس میں رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور اس کانفرنس کے اختتام پر ساری دنیا کے اہل قلم کو دعوت دی کہ وہ سیرت نبوی کے موضوع پر دنیا کی کسی بھی زندہ زبان میں مقالے لکھیں۔ پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی اور پانچویں پوزیشن حاصل کرنے والوں کو علی الترتیب پچاس، چالیس، تیس، بیس اور دس ہزار ریال کے انعامات دیے جائیں گے۔ جامعہ سلفیہ کے طلبہ اور بعض اقارب کے بے حد اصرار پر مولانا نے بھی عربی زبان میں مقالہ لکھا جس کا نام الرحیق المختوم رکھا۔ جس کا اردو میں معنی مہر لگی ہوئی مصفا شراب ہے۔ یہ رتبہ بلند جس کو مل گیا، سیرت کے اس عالمی مقابلے میں بڑی تعداد میں مقالات پیش کیے گئے۔ جن کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد مقابلے کے لیے 171 مقالات کو منتخب کیا گیا۔ اس وقت کے سعودی وزیر تعلیم شیخ حسن عبداللہ آل الشیخ کی سرکردگی میں قائم ماہرین کی ایک

آٹھ رکنی کمیٹی نے ان مسودات کا جائزہ لیا۔اس کمیٹی کے ارکان سیرت نبوی اور تاریخ اسلام کے ماہر اساتذہ تھے۔ان کا تعلق جامعہ ام القریٰ سے تھا۔انہوں نے مسلسل چھان بین کے بعد متفقہ طور پر مولانا کی تالیف ’الرحیق المختوم‘ کو اول قرار دیا۔ چنانچہ مولانا کو 12 ربیع الاول 1399ھ کو مکہ مکرمہ میں ایک باوقار تقریب میں مکہ کے نائب گورنر امیر سعود بن عبدالمحسن بن عبدالعزیز کے ہاتھوں انعام دیا گیا۔صدر مجلس حالیہ مجلس شوریٰ کے رئیس اور امام کعبہ شیخ صالح بن حمید کے والد گرامی شیخ عبداللہ بن حمید تھے۔

الرحیق المختوم کی اشاعت کے بعد مدینہ یونیورسٹی نے انہیں ہندستان سے مدینہ منورہ بلوایا اور وہ مرکز خدمۃ السنۃ والسیرۃ النبویۃ میں بطور ریسرچ فیلو کام کرتے رہے۔اس دوران فارغ اوقات میں انہوں نے کئی کتابوں کی تالیف اور ترجمہ کا کام کیا۔میری درخواست پر صحیح مسلم کی شرح ”منۃ المنعم في شرح صحیح مسلم“ تالیف فرمائی، جو دارالسلام نے نہایت خوبصورت انداز میں شائع کی۔انہوں نے حدیث کی مشہور کتاب بلوغ المرام کی شرح عربی زبان میں لکھی۔جس کے مختلف زبانوں میں تراجم شائع ہوئے۔

راقم الحروف کی دعاؤں میں یہ دعا اکثر شامل رہتی ہے:”اے اللہ! مجھے اچھے ساتھی عطا فرما کہ اچھے ساتھیوں کے بغیر آپ کچھ بھی نہیں کرسکتے۔فردِ واحد خواہ وہ کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو اچھے ساتھیوں اور ٹیم کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا (1)۔

یہ دسمبر 1998ء کی بات ہے ایک دن مولانا کا مجھے فون آیا۔وہ میرے ساتھ خاصے بے تکلف تھے۔ ہر قسم کا مشورہ و گفتگو کرتے تھے۔کہنے لگے: میرا مدینہ یونیورسٹی کے ساتھ معاہدہ ختم ہوا چاہتا

(1) کسی بھی ادارے کے مسؤل و ذمہ دار کو یہ دعا اور یہ نظریہ اپنی زندگی میں ضرور شاملِ حال رکھنا چاہیے یہ جملہ اتنا عظیم ہے کہ آبِ حیات سے لکھے جانے کے قابل ہے۔اسی اصول پر عمل کر کے کوئی قابل قدر کام انجام دیا جاسکتا ہے۔اچھے ساتھی اور مخلص ٹیم کے بغیر کامیابی کا تصور سطح آب پر تاج محل کی تعمیر کرنا ہے۔جس نے اس کی حقیقت سمجھا، کامیاب و کامران ہوا اور جس نے اس کی اہمیت کو قبول نہ کیا، ناکامی و نامرادی ہاتھ آئی مگر اکثر لوگ اس حقیقت سے آگاہ نہیں!!! از مرتب.

ہے، مگر میں اس بلادِ حرمین میں مزید قیام کا متمنی ہوں۔

میں نے ایک لمحہ سوچا اور عرض کیا کہ آپ دارالسلام تشریف لے آئیں۔ یہاں کی علمی کمیٹی کے چیرمین کی حیثیت سے۔ یہ ممکن ہے کہ ہم آپ کی شایانِ شان مالی طور پر خدمت نہ کرسکیں۔ مگر عزت واحترام کے ساتھ ساتھ آپ کو بہت سارے علمی کام کرنے کے مواقع بھی ملیں گے۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ میری اس دعوت کو شرف قبولیت بخشیں گے۔ میں دعائیں مانگتا رہا اور بالآخر میری دعائیں رنگ لائیں۔ مولانا دارالسلام کے ساتھ منسلک ہوگئے اور تصنیف وتالیف اور علمی کاموں میں مشغول ہوگئے۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر شرف کی کوئی اور بات نہ تھی کہ مولانا ہمارے ادارے سے منسلک ہوجائیں۔ میرے ساتھیوں نے بھی ان کی بے حد عزت اور توقیر کی۔ وہ تھے ہی اس قابل کہ ان کی عزت اور توقیر کی جاتی۔ وہ دارالسلام سے کم وبیش 6 سے 8 سال تک منسلک رہے۔ اس دوران انہوں نے کافی کتابوں کا مراجعہ کیا۔

سب سے اہم کاموں میں کتب ستہ (بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) کو ایک جلد میں لانے کا کام تھا۔ اس کا اشراف سعودی عرب کے مذہبی امور کے وزیر جناب شیخ صالح بن محمد بن ابراہیم آل الشیخ نے کیا۔ ہمارے لیے یہ بڑا چیلنج تھا اسلامی کتابوں کی تاریخ کا غالباً سب سے بڑا منصوبہ تھا۔ اصل مسئلہ اس کی تصحیح کا تھا، ہم چاہتے تھے کہ ایک ایسا نسخہ شائع ہو جو صحیح ترین اور غلطیوں سے پاک ہو۔ مولانا موصوف کو علمی کمیٹی کا سربراہ بنایا گیا اور ریکارڈ وقت میں ایسا نسخہ اٹلی سے شائع ہوا جس میں 2772 صفحات ہیں، جو کتب ستہ کا سب سے صحیح نسخہ تھا۔

مولانا نے تاریخ مکہ مکرمہ اور تاریخ مدینہ منورہ پر بھی کام کیا اور پھر تفسیر ابن کثیر کے اختصار پر علمی کام تھا۔ اس پر مولانا ابوالاشبال (مکہ مکرمہ) حفظہ اللہ نے کام کیا، اس کے مراجعہ پر مولانا موصوف نے خوب محنت کی اور اس کا ایک ایک لفظ پڑھا۔ اسی طرح تفسیر احسن البیان کے تفسیری نوٹ پر بھی مولانا نے مراجعہ فرمایا اور گراں قدر مشوروں سے نوازا۔ یہ مضمون زیادہ وسعت کا متحمل نہیں ہے؛ ورنہ ان کی زندگی کے حوالے سے کتنے ہی واقعات ہیں جو ایک الگ کتاب کے متقاضی

ہیں۔ بہر حال میں نے ان کو بیک وقت کسی مفسر، محدث، سیرت نگار، مؤرخ، مناظر اور فتویٰ نویس کے طور پر دیکھا ہے۔ ان کا علم بڑا پختہ اور دماغ بہت حاضر تھا۔ ہم نے جب بھی کبھی کسی مسئلہ میں ان سے رجوع کیا، چند لمحات کے اندر مولانا اس کا شافی جواب فراہم کر دیتے۔ وہ بلا شبہ ہمارے لیے ابر رحمت کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا اخلاق مثالی تھا۔ ہم بھی ان سے محبت اور عقیدت رکھتے تھے اور ان کا رویہ بھی ہمارے ساتھ ایک بزرگ اور باپ جیسا تھا۔ میں نے ان کے ماتھے پر کبھی شکن نہیں دیکھی۔ عموماً ان پر سنجیدگی طاری رہتی۔ وہ اپنے کام سے غرض رکھتے۔ عام مولفین کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیز کام کرتے تھے۔ ان کا قلم بہت تیز چلتا تھا۔ مگر اتنا خوبصورت لکھتے کہ بہت کم مصنف اتنا پیارا لکھتے ہوں گے۔ سیرت کے حوالے سے وہ ایک اتھارٹی تھے۔ تاریخ اسلام پر ان کی گہری نظر تھی۔

بلا شبہ ان کی وفات سے عالم اسلام ایک بہت بڑی شخصیت سے محروم ہو گیا ہے۔ چند سال پہلے ان کو فالج کا حملہ ہوا، اس دوران وہ ہندستان اور سعودی عرب آتے جاتے رہے۔ علاج معالجہ بھی چلتا رہا مگر ساتھ ساتھ وہ علمی کاموں میں بھی مشغول رہے۔ گذشتہ چند مہینوں سے وہ اپنے آبائی گھر مبارک پور میں صاحب فراش تھے۔ موت کا وقت مقرر ہے۔ یکم دسمبر 2006ء جمعہ دن کے تین بجے انہوں نے داعیٔ حق کو لبیک کہا۔ اس طرح علم و عمل کا یہ ستارہ مبارک پور میں غروب ہو گیا۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون.

انہوں نے پسماندگان میں بیوی کے علاوہ چار بیٹے، چار بیٹیاں اور بے شمار شاگرد اور ہمدرد چھوڑے ہیں۔ بڑا بیٹا ڈاکٹر فیض الرحمٰن علی گڑھ یونیورسٹی سے پی، ایچ ڈی کر چکا ہے۔ تین بیٹے مدینہ یونیورسٹی سے فارغ ہیں۔ ایک صاحبزادی ام القری یونیورسٹی مکہ میں اپنے خاوند کے ساتھ مقیم ہے اور سب سے چھوٹی بیٹی ریاض میں جامعۃ الامام یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے اور اپنے خاوند کے ہمراہ ریاض میں مقیم ہیں۔

میرے استاد میرے مشفق مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ

(از: محمد طاہر محمد حنیف سلفی، مرکز دعوت وارشاد بطحاء، ریاض)

اکتوبر 1973ء کا مہینہ تھا۔ میں اپنے ماموں شیخ امانت اللہ سلفی، استاد حدیث دار العلوم احمد یہ سلفیہ دربھنگہ کے ہمراہ ضلع اعظم گڑھ کے مشہور ومعروف قصبہ مبارکپور میں بغرض تعلیم وارد ہوا۔ پہلی منزل شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوریؒ صاحب ''مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح'' کی منزل مبارک تھی۔ شیخ الحدیث رحمہ اللہ مہمان نوازی اور تواضع میں سلف کا نمونہ تھے۔ جن لوگوں نے ان کا زمانہ دیکھا ہے یا ان کے قیام گاہ کی زیارت کی ہے یا تھوڑی دیر کے لیے بھی ان کے مہمان ہوئے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ شیخ الحدیث رحمہ اللہ اپنے تالیفی انشغال، علمی مشغولیت، مرعاۃ کی تالیف، اور احکام ومسائل کے استفسارات کے ساتھ جسمانی نحافت کے باوجود مہمانوں اور خاص طور پر علمائے کرام وطلبۂ علم کی بہت محبت اور اخلاص کے ساتھ ضیافت فرماتے تھے۔

ان کے آنگن میں ایک چھوٹا سا کنواں تھا۔ جس سے وہ خود مہمانوں کے لیے پانی نکالا کرتے تھے۔ اگر کسی مہمان نے پیش قدمی کر کے پانی نکالنے کی کوشش کی تو وہ ڈول ان سے لے لیتے اور ان کو دوبارہ ایسا نہ کرنے کی تاکید کرتے۔ مہمان خواہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔ بسا اوقات شیخ صاحب رحمہ اللہ کی اس خدمت کی وجہ سے مہمانوں کو شرمساری بھی ہوتی تھی۔

عصر کی نماز کے بعد محلہ رانی پورہ جہاں شیخ صاحب کا مکان ہے، وہاں سے ہم مدرسہ دار التعلیم صوفی پورہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اور مدرسہ میں داخل ہونے کے ساتھ سب سے پہلے مولانا صفی الرحمٰن صاحب کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے۔ مولانا وہاں صدر مدرس کے منصب پر جلوہ افروز تھے۔ انٹرویو کے لیے انہوں نے مجھے اپنے کمرے میں طلب فرمایا اور نحو کے سوالات کرنے کے بعد

اپنے حلقہ شاگردی میں داخل کرلیا۔وہ جوایک مشہور ضرب المثل ہے:

"First Impression is Last Impression"

''یعنی پہلا تاثر ہی آخری تاثر ہوتا ہے''۔

مولانا سے پہلی ملاقات کے بعد آخر تک ان کے بارے میں میرا یہی تاثر برقرار رہا۔وہاں ایک سال تک ان سے شرف تلمذ حاصل رہا۔اس دوران ان سے درس وتدریس کے علاوہ تبلیغ ودعوت، مقالہ نویسی،عربی انشاء،تحریکات وجمعیات سے متعلق امور پران کی گرانقدر افکار دآراء سننے کوملا۔

1974ء میں وہ جامعہ سلفیہ بنارس تشریف لے آئے اور ایک سال کے بعد میں نے بھی مبارکپور سے رخت سفر باندھا،اور جامعہ رحمانیہ بنارس میں ایک سال گزارنے کے بعد 1976ء میں پھر جامعہ سلفیہ میں ان کے زیر شفقت آ گیا۔اس وقت سے اپنے تخرج کے سال 1982ء تک برابر مولانا سے اکتساب فیض کا شرف حاصل ہوتا رہا۔1983ء سے 1988 تک کا زمانہ میں نے دہلی میں مرکزی جمعیت کے دفتر میں گزارا۔اس دوران مولانا بار بار دہلی آتے جاتے رہے۔اور ہمیشہ اپنی مشفقانہ التفات سے نوازتے رہے۔پھر وہ 1987ء میں مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔

1988ء میں اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی اس دیار مقدسہ میں حاضر ہونے کی توفیق بخشی۔اس وقت سے 1997ء تک اگر چہ مدینہ اور ریاض کی دوری مولانا سے روزانہ،ماہانہ اکتساب فیض میں مانع رہی۔مگر وقفہ وقفہ سے وہ ریاض آتے اور ہم سبھوں کو اپنے مشاہدوں،تبصروں،علمی لطائفوں اور اپنی علمی ودعوتی مصروفیتوں سے نوازتے رہے۔یہاں تک کہ 1997ء میں وہ مکتبہ دارالسلام جواب اسلامی کتب کا ایک عالمی شہرت یافتہ ادارہ ہے اس سے منسلک ہوگئے۔پھر تو ان سے روزانہ کسب فیض کا موقع ملتا رہا اور حیات مستعار کے آخری مہینوں تک شرف تلمذ کا یہ سلسلہ برقرار رہا۔
33 سال کے اس عرصہ میں میں نے ان کی زندگی میں نشیب وفراز بھی دیکھے۔دارالتعلیم کا وہ زمانہ بھی دیکھا جب وہ صبح سے دوپہر تک تدریسی اور ادارتی خدمات انجام دینے کے بعد اپنے گاؤں حسین آباد میں اپنے آبائی پیشہ سے منسلک ہوجاتے۔اور جدوجہد سے بھرپور ایک جفاکش انسان کی

زندگی گزارتے۔ ایک ہی دن میں جہاں وہ ایک باوقار عالم، کامیاب استاد، اعلیٰ منتظم اور نکتہ سنج ادیب ہوتے، وہیں دوسری جانب وہ ایک حکیم، صناع اور ماہر کاریگر کی صورت میں نظر آتے۔ بہت سارے احباب کو شاید یہ معلوم نہ ہو کہ مولانا ایک بہترین عطار تھے۔ مئوناتھ بھنجن میں نورانی تیل، روغن احمر، لال تیل وغیرہ کے جو فارمولے پائے جاتے ہیں، مولانا ان فارمولوں کے ماہر استاد تھے۔ اور کئی بار انہوں نے ہمیں اپنے ہاتھوں سے وہ لال تیل بنا کر دیا کہ جس کسی نے اس تیل کو استعمال کیا، دوسرے کو بھول گیا۔

دارالتعلیم میں اگرچہ ایک ہی سال تک ان سے استفادہ کا موقع ملا۔ اور 1974ء میں وہ بنارس منتقل ہو گئے، مگر ان کے اسلوب تدریس نے ذہن پر وہ اثر ڈالا کہ پھر مٹ نہ سکا۔

جامعہ سلفیہ کے چھ سالہ طالب علمی کے زمانے میں ان کو بہت قریب سے دیکھنے، سمجھنے اور استفادہ کا موقع ملا۔ مبارکپور کے زمانہ سے ہی وہ میرے ایک مشفق، مہربان سرپرست اور مخلص مربی تھے۔ چونکہ میرے ماموں گرامی قدر جناب مولانا امانت اللہ سلفی صاحب نے ابتدائے ملاقات کے وقت ہی ان سے گزارش کی تھی کہ اس بچے پر خصوصی توجہ دیں گے۔ اس لئے استاد محترم کی مربیانہ نوازش ہمیشہ میرے ساتھ برقرار رہی۔ 1977ء سے 1982ء تک تعلیمی مراحل کے ان سالوں میں مختلف علوم وفنون کی بے شمار کتابیں انہوں نے پڑھائیں۔ اور جس موضوع کو لیا اس کا حق ادا کر دیا۔ حدیث ہو، تفسیر ہو، فقہ ہو، فلسفہ یا منطق ہو۔ اصول شریعت ہو یا تاریخ و سیرت۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ اس فن کے متخصص ہیں۔ الفاظ ومعانی اور ادق عبارتوں کی تشریح وتوضیح اس انداز سے کرتے کہ بات دل میں اتر جائے۔ طلبہ کو نشیط اور مستعد رکھنے کے لیے اکثر علمی لطیفے بھی سناتے۔ جن کے بعد طلبہ کی دلجمعی اور نشاط میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

مولانا نہ صرف ایک کامیاب مدرس، محدث، مورخ، سیرت نگار، صحافی، ادیب، انشاء پرداز، اور فقیہ ومجتہد تھے۔ بلکہ ایک بہترین مناظر اور باحوصلہ مجاہد تھے۔ میرے سامنے مناظرہ بجرڈیہہ جو 1978ء میں بنارس کے ٹاؤن ہال میں ہوا تھا اور میں بھی اس مناظرہ میں کتابت مسودہ کی تبییض

کرنے والوں میں شامل تھا، جس میں بریلویوں کی جانب سے ان کے علماء ضیاء المصطفیٰ قادری، مولانا مشتاق نظامی اور دیگر حاملین جبہ ودستار شامل ہوئے تھے۔ اہلحدیثوں کی جانب سے مولانا صفی الرحمٰنؒ ہی رئیس المناظرین تھے۔ مناظرہ کی پوری تفصیل ''رزم حق وباطل'' نامی کتاب میں موجود ہے۔

یہ مناظرہ اس وقت ہوا تھا جب اللہ کے فضل وکرم سے مولانا کے مقالہ کو رابطہ عالم اسلامی کی جانب سے منعقد کردہ عالمی مقابلہ سیرت نگاری میں اول درجہ حاصل ہوا تھا، اور غالباً مولانا کی زندگی کا یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے وہ عالمی شہرت کی بلندیوں پر چڑھ گئے تو چڑھتے چلے گئے۔ پھر انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اور وہ علمی دنیا کے بین الاقوامی مسلمہ شخصیت بن گئے۔ بلکہ انعام حاصل کرنے کے کچھ ہی دنوں بعد 1982ء میں لاس انجلیس امریکہ میں سیرت پر ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد ہوا، جس میں رابطہ نے مولانا کو اپنا مندوب بنا کر بھیجا۔ اور آمدورفت کے سارے اخراجات رابطہ نے ادا کیے۔

ورنہ یہ ایک کربناک حقیقت ہے کہ ان کی زندگی کے بعض مراحل میں ان کی ذہانت وفطانت اور خداداد لیاقت وصلاحیت کی وجہ سے بہت سارے ارباب حل وعقد ان کو یارڈ میں ڈالنے کی تگ ودو میں لگے رہتے تھے۔ مگر مولانا نے کبھی بھی اپنی خودداریت اور انفرادیت کا سودا نہیں کیا۔ اور نہ اصول سے ہٹ کر کسی بات پر سمجھوتہ کیا۔ بلکہ ایسے وقت میں وہ کہا کرتے تھے۔

''گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔''

اور چونکہ مولانا ایک زیرک اور ذہین شخص تھے، اس لئے اس ماحول میں بھی انہوں نے اپنی دنیا بھرپور بسا رکھی تھی اور حالات کو اپنے اوپر مسلط نہیں ہونے دیا۔ بلکہ اس خوش اسلوبی سے وہ ان مراحل سے گزرتے رہے کہ آس پاس کے لوگوں کو بسا اوقات معلوم ہی نہیں ہو پاتا کہ ہوا کا رخ کدھر جا رہا ہے۔

مولانا کی زندگی کے اتنے گوناگوں پہلو ہیں کہ اس پر کئی سو صفحات پر مشتمل ایک تحقیقی مقالہ لکھا

جا سکتا ہے۔ بلکہ سوڈان کی جامعہ ام درمان میں شیخ کی حیات اور ان کی شہرہ آفاق کتاب الرحیق المختوم پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا بھی جا چکا ہے۔

مگران کی زندگی کی ایک مختصر تصویر کشی مولانا عبدالمعید صاحب مدیر مجلّہ ''الاستقامہ'' عربی نے پندرہ روزہ جریدہ ترجمان کے جلد نمبر 26 اور شمارہ نمبر 24 میں کی ہے۔ وہ مولانا کی زندگی کی بہترین عکاس ہے۔

1997ء سے دارالسلام سے منسلک ہو جانے کے بعد تقریباً روزانہ ان کی خدمت عالیہ میں حاضر ہونے اور ساتھ ہی کام کرنے کا موقع بھی ملتا۔ جب بھی کسی مسئلہ میں دشواری ہوتی، مولانا کی طرف رجوع کرتا۔ وہ عام طور پر اپنی علمی مشغولیات میں منہمک رہتے۔ اور سر جھکا کر پوری مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں جٹے رہتے۔ مگر جیسے ہی ان سے کوئی علمی استفسار کیا جاتا۔ وہ سر اٹھاتے اور سوال کو توجہ سے سننے کے بعد فوراً اس کا جواب عنایت فرما دیتے۔ دارالسلام سے انگریزی زبان میں تاریخ اسلام پر ایک مستند کتاب تیار کرنے کا مسئلہ تھا۔ کیونکہ اسلامی تاریخ کے بارے میں عام طور پر انگریزی میں جو کتابیں پائی جاتی ہیں وہ یا تو مستشرقین کی تیار کردہ ہیں یا ایسے افراد نے تیار کی ہیں جن کو صحیح اسلامی تاریخ معلوم نہیں میں نے مولانا عبدالمالک مجاہد صاحب کو مشورہ دیا کہ اردو میں موجود تاریخ اسلام کی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے۔ اور اس موضوع پر مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کی تاریخ اسلام بہت معقول ہے۔ مگر مجاہد صاحب کو تھوڑا تردد تھا۔ انہوں نے فوراً مولانا کے باب عالی مقام پر دستک دیا۔ اور اس موضوع پر استفسار کیا۔ انہوں نے بھرپور انداز میں میرے خیال کی تائید کی۔ اور مجاہد صاحب کو یہ بھی خوش خبری سنادی کہ ایک بار میں خود پوری کتاب کا مراجعہ کروں گا۔ اور جہاں کہیں کوئی رطب و یابس چیز ہوئی اس کی نشاندہی کردوں گا۔ چنانچہ نجیب آبادی کی تاریخ اسلام کی تینوں جلدیں انہوں نے پوری دلجمعی سے پڑھیں اور تصحیح و تنقیح کے مرحلے سے گزارتے رہے۔ پھر وہ کتاب بدر عظیم آبادی مرحوم اور دیگر دو مترجمین کی کدوکاوش سے انگریزی کے قالب میں ڈھلی۔

دارالسلام میں قیام کے دوران بے شمار علمی، اجتماعی، انفرادی، دعوتی اور خصوصی مجلسوں میں مولانا کے ساتھ دیر تک شریک رہنے کا اتفاق ہوا۔ وہ ہر مجلس میں اپنی خداداد لیاقت وصلاحیت اور بھاری بھرکم علمی شخصیت کی وجہ سے امیر مجلس ہوتے۔ جس موضوع کی مجلس ہوتی ایسا لگتا وہ اس موضوع کے متخصص ہیں۔ بلاشبہ وہ اس دور کی ایک عبقری شخصیت اور مجتہد وامام تھے۔ رحمہ اللہ رحمة واسعة وأسكنه فسيح جناته.

2000ء میں ریاض میں ان پر فالج کا دوسرا شدید حملہ ہوا۔ اور عبید اسپتال میں فوراً داخل کیے گئے۔ ان کا شوگر 400 کے لگ بھگ پہنچ گیا تھا۔ وہ intensive care میں کئی روز رہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو شفایابی عطا فرمائی اور اسپتال میں چند روز علاج کے بعد اپنی قیام گاہ پر واپس آئے اس حالت میں بھی انہوں نے منطقہ شرقیہ کا ایک دعوتی سفر کیا۔ بلکہ زندگی کے آخری چند مہینوں تک بھی انہوں نے اپنا علمی وتحقیقی سفر جاری رکھا۔ جب کبھی طبیعت میں نشاط ہوتا تیز کام کرتے اور جب نقاہت محسوس ہونے لگتی کام کار فتار سست ہو جاتا تھا، اسی مد وجزر میں زندگی کے کم وبیش چھ سال کی مدت انہوں نے گزارے یہاں تک کہ مارچ 2006ء میں اپنے وطن مبارک پور منتقل ہو گئے۔ اور کچھ دنوں کے بعد صاحب فراش ہو گئے۔

10/ ذوالقعدہ 1427ھ موافق یکم دسمبر 2006ء جمعہ کا دن تھا۔ میں جمعہ کی نماز پڑھ کر گھر میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ ہندوستان سے آدھے گھنٹہ کے وقفہ میں تین چار فون آیا ہے۔ اسی میں مولانا اصغر علی امام مہدی سلفی ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کا فون بھی تھا، میں نے فوراً ان سے رابطہ کیا۔ اور انہوں نے یہ روح فرسا خبر سنائی کہ مولانا صفی الرحمن صاحب آج ساڑھے بارہ بجے فوت ہو گئے ہیں، ہم لوگ مبارکپور جانے کی تیاریوں میں لگے ہیں۔ تم ریاض میں احبابِ جماعت اور اخوان کو بتا دو۔ میں نے اشکبار آنکھوں سے انا للہ وإنا إلیہ راجعون پڑھا۔ اور ناظم صاحب سے تعزیت کی۔ پھر اسی وقت ڈاکٹر عبدالرحمن فریوائی کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ ان کو اطلاع مل چکی ہے۔ دیگر اخوان کو بھی مطلع کیا۔ مولانا عبدالمالک مجاہد صاحب سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ

وہ الجبیل دعوۃ سنٹر میں خطاب فرما رہے ہیں، فوراً حافظ عابد الٰہی کو اطلاع دی اور انہوں نے مجاہد صاحب کو اس اندوہناک خبر کی اطلاع دی۔ ایک گھنٹے کے اندر پوری دنیا میں یہ روح فرسا خبر پھیل چکی تھی۔

اسی دن شام کو ایک دعوتی پروگرام میں احباب جماعت نے مولانا کی وفات پر ایک دوسرے کی تعزیت کی، اور رات ساڑھے گیارہ بجے المجد ٹی وی چینل پر پانچ منٹ تک آپ کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالی گئی۔ پھر ۴ردسمبر بروز یکشنبہ سعودی ٹی وی چینل دوم پر مولانا کے بارے میں ایک گھنٹہ کا انگریزی میں سمینار ہوا۔ جس میں سعودی عرب سے راقم کے علاوہ مولانا عبدالمالک مجاہد، ڈاکٹر عبداللہ المحسن، رفیق لاکھانی، اور انعام الحق رحمانی نے اور امریکہ سے ابوخلیل تونی اور پاکستان سے پروفیسر ساجد میر صاحب امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان نے حصہ لیا۔ اور آپ کی علمی خدمات کو سراہا، اور آپ کی وفات کو عالم اسلام کے لیے ایک بڑا سانحہ قرار دیا۔ صحیح ہے:

موت العالم موت العالم

آہ! ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ

(از: قاضی عبدالباسط مدنی)

یہ 1990ء کی بات ہے جب برادرِ مکرم ڈاکٹر عبدالماجد قاضی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ حصول تعلیم کے لیے روانہ ہوئے۔ والدِ گرامی مولانا عبداللطیف کشمیری حفظہ اللہ نے ان کو روانہ کرتے وقت نصیحت کی:

"شیخ صفی الرحمن مبارکپوری سے برابر تعلق رکھنا اور استفادہ کرنا"۔

دو سال بعد جب اس عاجز کو یہ سعادت نصیب ہوئی تو مشفق والد نے یہی نصیحت میرے پلے بھی باندھ دی۔ چنانچہ مدینہ منورہ پہنچ کر چند دنوں میں شیخ صاحب کے حلقۂ ملازمت میں جگہ پانے میں کامیاب ہوگیا۔ اب چاہے وہ سرِ شام باب الرحمہ پر شیخ کی علمی مجالس ہوں، یا نماز ظہر کے وقت جامعہ اسلامیہ کی مرکزی مسجد میں چلتی ہوئی مختصر رفاقت، مدینہ منورہ میں تارکین وطن کے قائم کردہ ہفت وار دروس ہوں یا جامعہ کے طلبہ کی طرف سے منعقدہ خصوصی پروگرام۔ ہر جگہ میں شیخ کے آس پاس ہی نظر آتا تھا۔

اس عرصہ میں شیخ کے علمی کمالات اور اخلاقی بلندیوں کے ناقابلِ فراموش نقوش دل پر مرتسم ہوئے۔

اخلاق کریمانہ:

نو واردوں کے لیے بسا اوقات شیخ کو سمجھنا دشوار ثابت ہوتا تھا۔ خصوصاً پہلی ملاقات کے پہلے لحات میں جب شیخ کچھ زیادہ کھل کر نہیں ملتے تھے، جس کی بعض جلد باز لوگ اپنے اعتبار سے توجیہ کرتے تھے۔ جبکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اس میں کسی بد اخلاقی یا خود پسندی کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا تھا بلکہ زیادہ سے زیادہ اسے ناقابلِ فہم سی نفسیاتی کیفیت کہا جا سکتا ہے۔ ان کی اس کیفیت کو مولانا آزاد کی ممدوح چینی چائے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے، جو پہلے چند گھونٹوں میں تلخ مگر آہستہ آہستہ

جس کی ہر گھونٹ بتدریج پینے والے کو تا عمر اپنا گرویدہ بنائے رکھتی ہے۔

دراصل شیخ بہت زیادہ سادہ دل، صاف ستھری طبیعت کے مالک اور کروفر، چم خم سے بالکل بے نیاز شخص تھے۔ ان کے کردار کا خاص وصف خورد نوازی تھی۔ وہ ادنیٰ سے کسی طالب علم میں بھی اگر خیر کا کوئی پہلو دیکھتے تو اس کو خصوصی توجہ سے نوازتے اور اپنے حلقے میں شامل فرما لیتے۔ اس طرح دعوتی ذہن رکھنے والا صالح کردار کا عام سا تارکِ وطن مزدور بھی اُن کا خاص مصاحب قرار پاتا۔ جب کہ اچھے اچھے نام و نمود رکھنے والے تصنع سے بھرے اعیان جماعت شیخ کی نگاہ میں جچتے نہیں تھے۔ شیخ اُن کی ملاقات سے کنی کاٹ جایا کرتے اور اگر ملاقات ہو بھی تو کوئی تکلف و تصنع روا نہ رکھتے؛ بلکہ بسا اوقات کھری کھری بھی سنا دیتے۔ ایک بار جماعت کے ایک ذی علم وذی ثروت بزرگ سے ہوئی خوبصورت نوک جھونک کو ہم طلبہ نے بڑی دلچسپی سے سنا۔

شیخ کی اخلاقی بلندی کے ثبوت کے لیے یہی ایک واقعہ کافی ہے کہ ایک بار حج سے واپسی کے سفر میں جامعہ میں زیر تعلیم ایک طالب علم برادرم محمد عالم نذیر احمد (داعی مقیم دمام) شیخ کے ہمراہ تھے، مدینہ پہنچ کر محمد عالم تو شیخ کے قیام گاہ پر ہی لمبی چادر تان کر سو گئے جبکہ شیخ نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے اور محمد عالم کے کپڑے اکٹھے کیے، غسالے میں ڈالے اور دھو کر سکھانے کے لیے ڈال دیے۔ بیدار ہونے پر محمد عالم نے جو اپنے کپڑے دھلے ہوئے دیکھے تو سخت پشیمان ہوئے اور شیخ سے بصد ندامت احتجاج کیا۔ شیخ نے فرمایا:

> ”میں دیکھ رہا تھا کہ تمہارے سارے جوڑے گندے ہو چکے ہیں اور صبح تمہیں جامعہ میں کلاس کرنی ہے، تم کیا پہن کر جاتے، اس لیے میں نے دھو دیے۔“

علمی مشاغل:

شیخ کے وقت میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت رکھی تھی۔ تصنیف و تالیف، درس و افتاء، وعظ و تبلیغ غرضیکہ شیخ ہمہ تن مصروف عمل رہتے۔ مکمل طور پر Self Made انسان تھے۔ مناظرۂ بجرڈیہہ جس نے شیخ کو اولین شہرت دی، تک خود اَرباب جامعہ سلفیہ بنارس بھی ان کی علمی صلاحیتوں سے

ناواقف تھے۔ خود شیخ فرماتے تھے کہ شیخ الحدیث مولانا شمس الحق صاحب مجھے مناظرہ میں لے جانے کے لیے تیار نہیں تھے، مگر جامعہ سلفیہ میں زیر تعلیم ایک بنگالی طالب علم جو شہر میں مقیم تھا (اور شیخ کی جلالتِ علمی کا اندازہ کر چکا تھا) کے اصرار پر مجھے مناظرہ کے لیے لے جایا گیا۔

شیخ نے بہت بڑی علمی ورثہ چھوڑا ہے۔ ''الرحیق المختوم'' کو جو آفاقی قبولیت حاصل ہوئی ہے اسے محض تائیدالٰہی کا کرشمہ کہا جا سکتا ہے۔ دنیا کے لگ بھگ نو زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ سوڈان کی جامعہ، جامعہ امام درمان، میں شیخ پر تحقیقی مقالہ لکھا گیا۔ شیخ کی عمر اور صحت نے دفانہ کی۔ جب کہ شیخ کے سامنے اب بھی بڑے علمی پروجیکٹ تھے۔ فرمایا کرتے تھے:

''ایک جامع قسم کی تاریخ اسلام لکھنے کی ضرورت ہے، جو اس نہج پر لکھی جائے کہ وہ مسلمانوں کی تاریخ ہی نہ ہو بلکہ اسلام کی تاریخ ہو، جس میں اُس اسلام پر، جس کو محمد عربی ﷺ چھوڑ کر گئے تھے، گزرنے والے اَدوار کے احوال درج ہوں''۔

شیخ اظہارِ رائے میں بڑے بیباک تھے۔ بسا اوقات شیخ البانی رحمہ اللہ پر کھل کر تنقید کر دیا کرتے۔ چند احباب اس پر سخت نالاں ہوتے اور شیخ سے میری قربت کے پیش نظر میرے سامنے ناراضگی کا اظہار بھی کرتے تھے۔ میں نے شیخ کی توجہ اس جانب مبذول کروائی تو فرمانے لگے:

''دراصل میں دیکھ رہا ہوں لوگ باضابطہ شیخ البانی کی اندھی تقلید کرنے لگ گئے ہیں، اس لیے میرا لب و لہجہ بھی سخت ہو جاتا ہے''۔

پھر مسکراتے ہوئے فرمایا:

''آپ کہتے ہیں تو آیندہ خیال رکھا جائے گا''۔

صوبہ سرحد پاکستان کے ایک عالم مسعودالرحمٰن جانباز نے ایک بار استفسار کیا کہ آج کے دور میں امام اہلِ حدیث کون ہے؟

شیخ نے بلاتوقف فرمایا: ''شیخ البانی''۔

مولانا جانباز جو شیخ کی زبان سے شیخ البانی کے متعلق سخت الفاظ سن چکے تھے۔ متعجب ہوئے تو

شیخ نے فرمایا:

''میری تنقید اصولوں پر مبنی ہوتی ہے، لیکن شیخ البانی کی امامت تو اپنی جگہ مسلم ہے''۔

دیگر پسندیدہ شخصیات میں صوفی نذیر احمد کاشمیری رحمہ اللہ کا اکثر ذکر کیا کرتے۔

تنظیمی ذمہ داری:

شیخ رحمہ اللہ اصلاً جس طرح طبیعت لے کر آئے تھے، وہ شاید کسی طرح کی تنظیمی ذمہ داریوں کے لیے موزوں نہیں تھی۔ جب اوّل اوّل شیخ کو مرکزی جمعیت اہل حدیث کی امارت کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے بعض کلیدی ذمہ داریوں پر فائز شخصیات نے آمادہ کرنا شروع کیا تو شیخ نے حسب عادت ہم ادنیٰ طالب علموں سے مشورہ طلب کیا۔ مسجد نبوی کے صحن میں اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ ہم دو طالب علم تھے۔ میرے علاوہ پاکستان کے ایک طالب علم عبدالغفور صاحب بھی تھے۔ میں نے تو سنتے ہی شیخ کو اس ذمہ داری کے لیے منانا شروع کر دیا۔ چونکہ جمعیت شبان اہل حدیث دہلی کے صدر کے طور پر کچھ دن گزار کر میں نے یہ پایا تھا کہ خصوصاً نوجوان طبقہ اکابرین جماعت کے بعض رویوں سے دل برداشتہ ہے۔ ایسے وقت میں شیخ جیسی شخصیت کا اس عہدے پر فائز ہونا نوجوان طبقہ کے جذبوں کو مہمیز لگا سکتا تھا۔ مگر عبدالغفور صاحب کی رائے بالکل الگ تھی۔ ان کا اصرار تھا کہ شیخ یہ ذمہ داری ہرگز قبول نہ کریں۔ انہوں نے مثال دی کہ

''پاکستان میں حافظ یحییٰ عزیز میر محمدی سب سے زیادہ قابلِ احترام اور غیر متنازعہ شخصیت تھے، مگر متحدہ جمعیت اہل حدیث پاکستان کی چند روزہ امارت میں حافظ صاحب کی عزت کو بڑا نقصان پہنچا اور یہی کچھ مجھے آپ کے ساتھ ہوتا دکھائی دیتا ہے''۔

بہر حال شیخ امیر منتخب ہوئے مگر مشکل یہ تھی کہ شیخ سعودیہ نہیں چھوڑ سکتے تھے، دور سے رہ کر جمعیت چلانا آسان کام نہ تھا۔ سعودیہ کے سلفی حلقے جب شیخ کے سامنے شکایتیں کرتے اور جمعیت میں اصلاح پر آمادہ کرتے تو شیخ بڑے پرعزم لہجے میں فرماتے:

''ہندستان جاؤں گا تو کوئی نہ کوئی صورت اصلاح کی ضرور نکال لوں گا''۔

مگر جب چھٹی ختم ہونے پر واپس سعودیہ تشریف لاتے تو چہرے سے مایوسی عیاں ہوتی۔اس کشمکش میں استعفے کی نوبت آگئی اور ہم جیسے دور افتادگان نہ کبھی جان سکے شاید نہ جان سکیں گے کہ کمی کہاں رہ گئی تھی۔

تری گلی تک تو ہم نے دیکھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

بہر حال یہ چند یادیں تھیں جو اس صدمہ کے وقت ذہن کے پردہ پر رقصاں تھیں، سپردِ قرطاس کر دی گئی ہیں۔ابھی شیخ کی زندگی کے بہت سے پہلو ایسے بھی ہیں خوفِ فسادِ خلق سے نہ جانے کب تک ناگفتنی ہی رہیں اور شاید جن کے اظہار کو امت کے عزت واقبال کے ایامِ موعود تک کے لیے اٹھا رکھنا ہی قرینِ مصلحت ہوگا۔

عجیب اتفاق:

29 نومبر 2006ء کو جموں وکشمیر کے ایک دور افتادہ گاؤں کی مسجد میں یہ عاجز خطبۂ جمعہ دے رہا تھا اور اصلاحِ معاشرہ کے تذکرے کے ضمن میں اس نے شیخ کا بیان کردہ ایک فارمولا شیخ کے حوالے سے بیان کیا اور شیخ کے لیے منبر پر دعائے خیر کی۔لگ بھگ وہی لمحہ جیسا کہ دہلی سے بذریعہ فون معلوم ہوا شیخ کے استحضار کا بھی تھا۔اور نہ جانے خطۂ زمین پر کتنے لوگ شیخ کے افاداتِ علمیہ کے حوالے سے آپ کے لیے دعا گو ہوں گے[1]۔ اَللّٰهُمَّ بَرِّدْ مَضْجَعَهُ.

(1) بحوالہ پندرہ روزہ ترجمان دہلی 1،15 جنوری 2007ء۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(از: انعام الحق رحمانی مبارکپوری)

الحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ العَالَمِينَ، وَالصَّلاَةُ وَالسَّلاَمُ عَلَى خَيْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَّ آلِهِ وَصَحْبِهِ أجْمَعِيْنَ، وَ بَعْد:

یکم دسمبر بروز جمعہ ۲۰۰۶ء ریاض کے معروف علاقہ دیرہ کی جامع مسجد امام ترکی میں نمازِ جمعہ ادا کر کے گھر واپس ہو رہا تھا۔ کہ شیخ شکیل احمد سلفی مکی کا ٹیلیفون استفہامیہ جملہ کے ساتھ آیا کہ آپ کو مولانا کے تعلق سے کچھ خبر ہے؟ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ سن کر ایک لمحے کے لئے مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا اور زبان پر اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن کے کلمات رواں ہو گئے۔ آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ فوراً اپنے ہم زلف شیخ عمر فاروق مکی صاحب کے گھر مکہ فون لگایا تو وہ حرم سے اپنے گھر واپس نہیں پہنچے تھے، ان کی اہلیہ نے فون اٹھایا۔ میں نے ان سے استفہامیہ جملہ کے ساتھ پوچھا کہ مولانا کے بارے میں کچھ اطلاع ہے؟ اتنا سنتے ہی ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ چونکہ اسی دن میں نے صبح میں مولانا کی خیریت معلوم کی تھی تو کسی ناگہانی خبر کی کوئی امید نہیں ملی تھی۔ اس لیے اچانک اس خبر سے مجھے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ گھر (ہندستان) ٹیلیفون لگایا تو اس خبر کی تصدیق ہو گئی۔

مولانا کی وفات کی خبر سنتے ہی پوری دنیا میں لاکھوں کروڑوں سوگواروں میں ہلچل مچ گئی. خبر رساں ایجنسیاں حرکت میں آ گئیں اور مولانا کے تعلق سے معلومات فراہم کرنے لگ گئیں۔ مولانا کی وفات کے دن آٹھ بجے شب ریاض میں مولانا کے عقیدتمندوں کا ڈاکٹر عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی حفظہ اللہ (استاذ حدیث جامعہ امام محمد بن سعود الاسلامیہ) کی رہائش پر تعزیتی اجتماع ہو گیا۔ مولانا کے عقیدتمندوں نے مولانا کی وفات پر اپنے شدید رنج وغم کا اظہار کیا۔ اسی دوران مصر کے معروف ٹی وی چینل جو کہ عربوں میں قناۃ المجد کے نام سے مشہور ہے، کے نمائندے کا ڈاکٹر فریوائی کی خدمت میں ٹیلی فون آیا۔ اور ان سے مولانا کی سیرت اور ان کی خدمات کے

حوالے سے انٹرویو لیا۔ ڈاکٹر فریوائی نے تقریباً تین منٹ تک مولانا سے متعلق گفتگو کی اور ان کا یہ انٹرویو ڈائرکٹ کاسٹ کیا گیا۔ اس وقت ہم لوگ ان کے گھر پر ہی موجود تھے۔

جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ اور والد محترم مولانا قاری محمد زبیر مبارکپوری حفظہ اللہ کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم رکھے ہوئے پایا ہے۔ دونوں کے درمیان یہ دوستی بچپن سے قائم تھی۔ زمانہ طالب علمی سے ساتھ ساتھ رہے۔ ایک سال کے فرق کے ساتھ دونوں کو مدرسہ فیض عام مئو سے دستار فضیلت عطا کی گئی۔ اور پھر دونوں گلشن اسلام کی آبیاری کے لئے یکسو ہو گئے۔ والدِ محترم فراغت کے بعد دہلی چلے گئے اور وہیں پر کم وبیش پندرہ، سولہ سال تدریسی خدمات انجام دیں، اور مسلسل خطبہ جمعہ کے علاوہ جلسہ وجلوس کا بھی شغل جاری رکھا۔ پھر ۱۹۷۶ء میں مدرسہ عربیہ دارالتعلیم مبارکپور آ کر مستقر ہو گئے، تقریباً دو سال پہلے ضعف اور پیرانہ سالی کی وجہ سے متقاعد ہو گئے۔ اور مولانا رحمہ اللہ فراغت کے بعد درس وتدریس کے سلسلے میں الہ آباد، ناگپور اور مختلف شہروں میں تدریسی سلسلہ قائم رکھتے ہوئے ۱۹۷۴ء میں دارالعلوم جامعہ سلفیہ بنارس تشریف لا کر مستقر ہو گئے، اور وہاں چودہ سال رہ کر تدریس کے فرائض انجام دیے، اور اونچے کلاس کی کتابیں پڑھاتے رہے۔ مولانا نے تدریسی خدمات میں کل چھبیس، ستائیس سال گزارے۔

اس کے بعد مرکز خِدمَةُ السُّنَّة وَالسِّيْرَةِ النَّبَوِيَّة مدینہ منورہ کی طلب پر ۱۹۸۸ء میں مدینہ منورہ آ گئے، اور دسمبر ۱۹۹۷ء تک بحث وتحقیق میں مشغول رہے۔ اس کے بعد مکتبہ دارالسلام ریاض سعودی عرب سے منسلک ہو گئے اور یہاں پر بھی بحث وتحقیق اور تصنیف وتالیف میں اپنے شب وروز بسر کیے۔ اس اجمال کے بعد مولانا کی حیاتِ مستعار کے چند واقعات ملاحظہ کیجئے جس سے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں کافی حد تک مدد ملے گی۔

مولانا رحمہ اللہ نے دیندار گھرانے میں آنکھیں کھولیں، ان کے والدین صوم وصلاۃ کے بڑے پابند تھے۔ غربت وتنگ دستی کے باوجود مولانا کے والد حاجی عبداللہ رحمہ اللہ نے اپنے پانچ یتیم بھتیجے اور بھتیجیوں کی پرورش کر کے نہ صرف ان تمام بچوں اور بچیوں کو اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا اور بلکہ اپنی

جائداد میں سے اپنے بیٹوں کی طرح برابر برابر حصہ دیا۔

مجھ سے مولانا کی اولاد سمیت کئی لوگوں نے ان کی والدہ کے تعلق سے ایک واقعہ بیان کیا جس کا ذکر یہاں مناسب سمجھتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی پیدائش سے پہلے ان کی والدہ نے خواب دیکھا کہ میرے گھر میں آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹ کر گر گیا ہے، اور اس ستارے سے اتنی زبردست روشنی پھوٹی کہ پوری دنیا اس کے نور سے منور ہوگئی۔ یہ بات انہوں نے اپنے دل میں چھپائے رکھی۔ مولانا رحمہ اللہ جب عالمِ دین بن گئے اور ان کا خوب شہرہ ہوا تو ان سے یہ بات بیان کی۔ یہ بات سن کر مولانا بھی خاموش رہے لیکن جب مولانا نے اپنی مایہ ناز تصنیف الرحیق المختوم لکھی تو اس کی دھوم پوری دنیا میں مچی، اور اس کتاب کے ذریعہ نبی پاک ﷺ کی سیرت زمین کے چپے چپے میں اجاگر ہوئی تو مولانا نے اپنی والدہ کے خواب کی تعبیر بیان کی۔ یہ سن کر ان کی والدہ کہا کرتی تھیں کہ میرے پیٹ سے اتنے بڑے عالم نے جنم لیا ہے۔

مولانا رحمہ اللہ کے والد بڑے ہی با حوصلہ، اور طاقتور آدمی تھے۔ ان کی طاقت وقوت کے حوالے سے ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک بہت بڑا اقلہ (مٹی کا بنا ہوا بہت بڑا مٹکا، یا ڈہری) جس میں گڑ بھرا ہوا تھا، ایک انگریز میجر نے کہا کہ جو اس کو اٹھالے گا وہ اس کو دے دیا جائیگا۔ انگریز سپاہی سمیت کئی لوگوں نے قسمت آزمائی کی لیکن کوئی اس کو اٹھا نہ سکا۔ مولانا کے والد کو بھی اس بات کی خبر لگی تو وہاں پر گئے اور اس ڈہری کو اپنے سر پر اٹھا کر اپنے گھر لے آئے۔ تعجب تو یہ ہے کہ اس کے اٹھانے میں انہیں کسی کی مدد کی بھی ضرورت نہ پڑی۔

مولانا رحمہ اللہ کے والد نے اپنے ساتوں بیٹوں کو دینیات عربی وفارسی کی تعلیم دلانے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے ناکام رہے۔ مگر ان کے دو بیٹوں نے دینی تعلیم مکمل کی۔ ایک مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ، دوسرے مولانا عزیز الرحمٰن مدنی رحمہ اللہ۔ یہ مولانا کے انتقال سے دو سال پہلے اچانک ہارٹ اٹیک ہو جانے کے باعث اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ ان کو غریقِ رحمت کرے آمین۔ راقم الحروف کو ان سے شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ اور ایک بیٹے

عبدالمنان صاحب حفظِ قرآن کی دولت سے مالا مال ہوئے، مولاناؒ کا علمی دور جس قدر تابناک تھا تعلیمی دور اس سے کم تابناک نہ تھا، آپ اساتذہ کے دروس بڑے ہی انہماک سے سنتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو ذہانت وفطانت کا وافر حصہ عطا کیا تھا اس لیے دورانِ درس سنی ہوئی اکثر باتیں انہیں یاد ہوتی تھیں۔ بالآخر مولاناؒ فیصل قرار پاتے تھے۔ امتحان کے دوران دوسرے طالب علموں کی طرح بہت زیادہ کتابیں یاد کرنے کے عادی نہ تھے، اکثر وبیشتر انہیں گھومتا پھرتا ہوا دیکھا جاتا تھا، اساتذہ میں سے جب کوئی انہیں گھومتا پھرتا دیکھ لیتے تو اپنے پاس بلا کر مذاکرہ کے لیے تنبیہ کیا کرتے تھے، لیکن مولانا بڑے ہی اطمینان سے کہتے کہ مجھے سب یاد ہے۔ بالآخر امتحان کے بعد امتیاز اول کی صورت میں نتیجہ نکلتا تھا۔

مدرسہ فیض عام مئو کی لائبریری خاصی بڑی ہے، اس میں قدماء کی بیشتر کتابیں اور مراجع اصلیہ موجود ہیں، مولاناؒ اس لائبریری سے ہمیشہ استفادہ کرتے رہے، چونکہ آپ نہایت ہی ذہین وفطین تھے اس لئے کسی کتاب کا ایک دفعہ مطالعہ کرنا آپ کے لیے کافی ہوتا تھا، سعودیہ عربیہ میں عاشورا کے موضوع پر آپ نے ایک تقریر کی اور واقعہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اسقدر علمی جائزہ لیا کہ اس طرح کی تقریر اب تک نہ سننے میں آئی، دورانِ تقریر آپ نے کہا کہ بہت عرصہ پہلے میں نے پاکستان سے چھپی ایک کتاب پڑھی تھی، جو کچھ میں نے ابھی بیان کیا ہے اس کا خلاصہ ہے۔

مدرسہ فیض عام مئو میں طلبا کی ایک یونین قائم ہے جس میں قلمی صلاحیت کے علاوہ طلبا کی تقریری صلاحیت اجاگر کرنے کے لئے ہر ہفتہ ایک استاذ کی صدارت میں مختلف موضوعات پر تقریر کرائی جاتی ہے، اور کبھی کبھی ڈبیٹ کا بھی پروگرام ہوتا ہے، مولانا - رحمہ اللہ - اکثر وبیشتر ڈبیٹ کرتے تھے، ان کو موضوع چاہے اثبات میں ملا ہو یا اس کی نفی میں اپنے مدمقابل کو عقلی یا نقلی دلائل دے کر زیر کر دیتے تھے، البتہ جب کبھی مولاناؒ اور مولانا عبدالحمید رحمانی کے درمیان ڈبیٹ ہوتا تو اکثر مولانا کی فتح ہوتی تھی، یہ بات مجھ سے میرے والد نے بیان کی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا رحمہ اللہ صاحبِ فراست، بذلہ سنج، حساس، حاضر جواب اور علمی

شخصیت کے مالک تھے۔ مسائل کی تحقیق میں ان کو یدِ طولیٰ حاصل تھا، اس کا اعتراف ہر اس شخص کو ہے جو مولانا رحمہ اللہ، یا ان کی مؤلفات سے واقف ہے۔

جامعہ سلفیہ میں تدریس کے دوران 1978ء میں مولانا رحمہ اللہ اور جامعہ اشرفیہ مبارکپور کی علمی اور باا ثر شخصیت ضیاء المصطفی اعظمی قادری کے درمیان بجرڈیہہ بنارس میں ایک مناظرہ ہوا تھا، جس میں جناب قادری صاحب کو منہ کی کھانی پڑی تھی۔ مولانا کے سوالات کا جواب دینے کے لئے تاب نہیں تھی۔ الفاظ کے پیچ وخم میں گم، فلسفہ اور منطق کی گردان لگاتے لگاتے اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے، بالآخر انہیں شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کی وجہ سے بریلویانِ مبارکپور، بنارس اور مئو کے اندر غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اپنی رسوائی کو چھپانے کے لئے انہوں نے اس مناظرہ کی روداد چھپوا کر مفت تقسیم کی، اور اس کے اندر جگہ جگہ ردوبدل کی تاکہ وہ یہ کہنے کے لائق ہو جائیں کہ وہابی اس مناظرے میں شکست کھائے ہیں، ہم نہیں۔ ابھی وہ لوگ اسی خوش فہمی میں تھے کہ مولانا نے کیسٹ ریکارڈنگ کی مدد سے مناظرے کی روداد شائع کرادی، اور حقیقتِ حال سے آگاہ کیا جس سے ان لوگوں کو دوبارہ رسوائی نصیب ہوئی۔ (مولانا نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ تمام کیسٹیں جامعہ سلفیہ کی لائبریری میں محفوظ ہیں) اس مناظرہ کی برکت دیکھئے کہ بجرڈیہہ بنارس میں اسی وقت چالیس لوگوں نے بریلویت سے توبہ کر کے مسلک اہل حدیث اختیار کیا۔

یہ دیکھ کر بریلوی مکتبہ فکر بوکھلا اٹھا، جب ان لوگوں سے کچھ نہیں بن پڑا تو اہل حدیثوں پر لعن طعن کی بوچھاڑ شروع کردی، اور برسر اسٹیج گالی گلوچ بکنے سے بھی گریز نہیں کیا، جگہ جگہ جلوس نکالا جانے لگا۔

جب اہل حدیثوں کے برداشت سے بالکل باہر ہوگیا تو انہوں نے بھی مختلف جگہوں میں جلسوں کا انعقاد کیا، دو جلسوں میں مولانا رحمہ اللہ نے شرکت کی۔ تیسرے جلسے میں ایسا ماحول ہوگیا کہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ طرفین کے درمیان کہیں لڑائی نہ ہو جائے۔ اس لئے مولانا رحمہ اللہ کے گاؤں حسین آباد کی بڑی مسجد میں اس جلسے کا انعقاد کیا گیا۔ میں اس جلسے میں حاضر تھا، مجھے یاد ہے کہ مولانا نے اس جلسے میں صحیح بخاری کی اسراء ومعراج کی لمبی حدیث اپنے حفظ سے پڑھی اور اس کی

وضاحت کرنے کے بعد شفاعتِ رسول کے موضوع پر اپنی تقریر ختم کی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب جلسہ ختم ہوا اور لوگ اپنے گھروں کو واپس ہوئے۔

پھر بریلویوں کی جانب سے دوبارہ مناظرہ کرنے کا پیغام آنے لگا، اور یہ باور کرایا گیا کہ مناظرہ مبارکپور ہی میں ہوگا (تاکہ انہیں شر و فساد کا موقع مل سکے)۔ مولانا نے بھی اس کا جواب دینے کے لئے کمر ہمت باندھ لی اور کہلا بھیجا کہ میں بھی تیار بیٹھا ہوں۔ لیکن ان لوگوں کی طرف سے مناظرہ کے کچھ بنود میں ترمیم کرنے کی بات کی گئی تو مولانا نے صاف لفظوں میں انکار کر دیا اور کہا کہ اگر مناظرہ ہوگا تو بجرڈیہہ کی بنود کے مطابق ہی ہوگا مگر وہ لوگ تیار نہ ہوئے۔ اس طریقہ سے یہ مناظرہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ مولانا رحمۃ اللہ کی حوصلہ مندی اور دلیرانہ جرأت کی داد دینی چاہیے کہ انہیں مارنے کی بھی دھمکی دی گئی لیکن ان کے پایۂ استقلال میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی۔

مبارکپور کی فضا بہت ناخوشگوار تھی کہ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ کی مایہ ناز کتاب الرحیق المختوم اردو میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر ہندستان میں آگئی اور جگہ جگہ مفت تقسیم ہونے لگی۔ میں ابھی عربی تیسری، یا چوتھی جماعت کا طالب علم تھا کہ مدرسہ عربیہ دارالتعلیم مبارکپور کے تمام طالب علموں کو بھی یہ کتاب تحفے میں دی گئی۔ مجھے جہاں اس کی ظاہری زیب و زینت سے خوشی ہوئی، اس کو پڑھ کر بھی اتنی ہی خوشی ہوئی۔ اس کتاب کو پڑھنے سے پہلے میں نے قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری رحمۃ اللہ کی کتاب رحمۃ للعالمین اور مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ کی کتاب رسولِ رحمت پڑھ رکھی تھی۔ لیکن الرحیق المختوم پڑھ کر مجھے جس قدر واقعات کا صحیح علم ہوا اس قدر ان کتابوں کے پڑھنے سے حاصل نہیں ہوا تھا۔ میں نے الرحیق المختوم اپنی فراغت سے پہلے دو بار پڑھی پھر بھی اس کے مطالعے کی تشنگی باقی رہی۔

حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی اس کتاب کو پڑھنا شروع کرتا ہے، جب تک پوری کتاب ختم نہیں ہو جاتی اسے اپنے ہاتھ سے نہیں رکھتا ہے۔

اس کتاب کے تعلق سے جو بات بتلانا چاہتا ہوں کہ اغیار نے بھی اس کتاب کو سر آنکھوں پر رکھا۔ جو لوگ مولانا کی جان کے دشمن تھے، اس کتاب کو پڑھ کر وہ بھی ان کے مداح بن گئے۔

دھیرے دھیرے وہ گرما گرمی کی فضا مبارکپور سے دور ہوگئی، لیکن اہل حدیث اور بریلویوں کے درمیان مقاطعہ وغیرہ کا جو بیج پڑ گیا تھا اب وہ تناور درخت بن چکا تھا، اس لئے اس میں کوئی جنبش نہیں ہو سکی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد کی طرح بڑے ہی باحوصلہ اور حق گو انسان تھے۔ ایک مرتبہ ایک شیعہ عالم مولانا کے گھر آیا اور ان سے کسی مسئلہ میں مباہلہ کی دعوت دی۔ مولانا فوراً تیار ہو گئے۔ مگر مولانا کو اسی روز مدینہ منورہ کے لیے گھر سے نکلنا تھا۔ اس لیے یہ مباہلہ نہیں ہو سکا اور وہ شیعہ عالم چلا گیا۔ چلتے چلتے مولانا نے اس سے کہا کہ اگر آپ کچھ دن پہلے آئے ہوتے تو اتمامِ حجت کے لیے بحث ومباحثہ کر لیا جاتا، افسوس کہ آپ نے آنے میں تاخیر کر دی۔

مولانا کی بے باکی، جرأت مندی، حوصلہ، تدبیر اور بہادری کی کئی ایک مثالیں میرے سامنے ہیں جن میں سے دو کا تذکرہ کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ پہلا واقعہ مولانا کی سیونی میں تدریس کے وقت کا ہے۔ کچھ لوگوں نے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان فسادات کرانے کی ناکام کوشش کی، اور سیکڑوں کی تعداد میں بلوائیوں کو اسلحے سے لیس کر کے مسلمانوں کی بستیوں کی جانب روانہ کر دیا، چونکہ مسلمان تعداد میں کم تھے اس لئے اس بات کا زیادہ خطرہ تھا کہ بلوائی حملہ کرنے اور لوٹ مار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، اس کی اطلاع مسلمانوں کو لگ گئی تو کئی لوگوں نے اپنے اپنے اہل خانہ کو دوسری جگہوں میں منتقل کر دیا، لیکن مولانا رحمہ اللہ نے اپنی اہلیہ کو خبر تک نہ ہونے دی۔ بلوائیوں نے ایک ناکام چال چلنے کی کوشش کی کہ انہوں نے بلند آواز سے بایں الفاظ "نعرۂ تدبیر" کے ساتھ نعرہ بلند کیا، اس میں یہ حکمت پوشیدہ تھی کہ یہ آواز سننے کے بعد مسلمان ہماری طرف دوڑ پڑیں گے اور ہم ان کو گاجر اور مولی کی طرح کاٹنے میں کامیاب ہو جائیں گے، اس حکمت عملی کے ساتھ بلوائیوں نے بستی کی جانب پیش قدمی کی تو مولانا رحمہ اللہ نے طے شدہ جنگی حکمتِ عملی اور نبی ﷺ کی جنگی چالوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹھیک وہی کیا جو آپ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر اپنایا تھا۔ مسلمانوں سے کہا گیا کہ صرف لا الہ الا اللہ کی صدا بلند کریں۔ چار چار کا گروپ

بنا کر سب کے ہاتھوں میں لاٹھی تھمادی گئی اور اس میں کپڑا باندھ کر آگ لگا دی اور گلی کے ہر نکڑ پر دستے کی شکل میں کھڑے ہو گئے اور وقفے وقفے سے تیزی کے ساتھ ایک گلی سے دوسری گلی میں داخل ہو جاتے۔ یہ دیکھ کر بلوائیوں کے دلوں میں رعب بیٹھ گیا کہ مسلمان بھی اسلحے سے لیس ہیں اور بہت بڑی تعداد میں ہیں، اس لئے ناکام ونامراد واپس ہو گئے۔ اس بات کا تذکرہ مولانا کی اہلیہ اپنے بچوں سے بہت کیا کرتی تھیں کہ جب میں نے کہا کہ آپ نے ان حالات میں مجھے بھی دوسری جگہ پر کیوں نہیں منتقل کر دیا جیسا کہ دوسرے لوگوں نے کیا تھا؟ تو مولانا نے کہا کہ کسی کو تم تک پہنچنے کے لئے پہلے میری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ جامعہ سلفیہ کا بھی ہے کہ کرفیو کے دوران اکثر اساتذہ کرام اپنی جان بچانے کے لئے جامعہ کے کیمپس سے کسی محفوظ مقام پر منتقل ہو گئے، لیکن مولانا رحمہ اللہ اور شیخ عزیر شمس مکی حفظہ اللہ کے والد مولانا شمس الحق رحمہ اللہ جامعہ میں رہ گئے اور طلبا کو اخیر وقت تک حوصلہ اور دلاسا دیتے رہے۔ لیکن اس دوران کوئی ناخوش گوار واقعہ رونما نہیں ہوا، یہ بات مجھ سے شیخ محمد جنید مکی بنارسی حفظہ اللہ نے بیان کی۔

مولانا رحمہ اللہ نے اپنے گاؤں میں ایک مسجد کی توسیع کرائی، جب مسجد بن کر تیار ہو گئی تو گاؤں کے کچھ لوگوں نے حساب طلب کیا۔ مولانا نے کہا کہ آپ لوگ یہیں ٹھہریں میں ابھی آتا ہوں۔ فوراً اپنے گھر گئے اور ایک کاپی نکال کر لے آئے اور ہر دن کے خرچے کو الگ الگ کر کے دکھلا دیا۔

اسی مسجد کے تعلق سے ایک اور واقعہ سنتے جائیے کہ جب اس مسجد کی توسیع کے لئے کھدائی ہو رہی تھی تو مسجد سے باہر کچھ ہڈیاں نکلیں، بڑے بوڑھوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ انہیں لوگوں نے کوشش کر کے یہ چھوٹی سی مسجد بنوائی تھی، ان کو ان کی وصیت کے مطابق مسجد سے باہر دفن کر دیا گیا، لیکن ان لوگوں نے ایک اور بات کہی تھی کہ جو شخص ہمیں پالے گا وہ ہم لوگوں کے لئے دعائے مغفرت کرے۔ جب یہ بات مولانا کو معلوم ہوئی تو ان کی مغفرت کے لئے اپنے ہاتھ دعا کے لئے اٹھا دیے اور دیر تک دعا کی۔ اس کے بعد ان ہڈیوں کو مقامی قبرستان میں لے جا کر دفن کرا دیا گیا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے اندر امانتداری کی صفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یہ بات میں جس حوالے سے بتلانا چاہتا ہوں اس میں اکثر علماء کوتاہ نظر آتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے والد کے سگے بھائی مولانا عبدالصمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (حقیقی چچا) تھے۔ اس علاقے میں وہ بڑے علماء میں شمار کئے جاتے تھے، بہت ہی قابل شخصیت کے مالک تھے، (یہ وہی ہیں جن کی بہن سے شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کی شادی ہوئی تھی)۔ اپنے انتقال سے پہلے انہوں نے ایک وصیت لکھی تھی کہ اس گھرانے میں جو عالم پیدا ہوگا میری ان کتابوں کی حفاظت اور دیکھ ریکھ کریگا۔ جب مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس گھرانے میں عالم ہوئے تو تمام کتابیں ان کی تحویل میں آگئیں۔ مولانا ان نایاب کتابوں سے استفادہ کرتے رہے، اور ان کتابوں کی صحیح طریقے سے حفاظت کی۔ لیکن جب مولانا عبدالصمد صاحب کا پوتا اسلم بن الحاج محمد انور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے پڑھ کر فارغ ہوگیا تو مولانا نے کہا کہ اب ان کتابوں کا خود ہی وارث پیدا ہوگیا ہے، لہٰذا تمام کتابیں اس کو واپس کردیں۔

مبارکپور نے جہاں بڑی بڑی علمی شخصیتوں کو پیدا کیا ہے وہیں بڑے بڑے سورماؤں کو بھی جنم دیا ہے، جنہوں نے تحریکِ شہیدین میں حصہ لیا، سکھوں اور انگریزوں کے خلاف جنگ کی، اپنے امیر کی اطاعت کرتے ہوئے یکے بعد دیگرے جام شہادت نوش کرتے ہوئے اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ مرزا حیرت دہلوی نے حیاتِ طیبہ میں اہل مبارکپور میں سے تین لوگوں کا نام درج کیا ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ مجاہدین آزادی اور تحریکِ شہیدین سے منسلک وہ تمام لوگ جو اللہ کی راہ میں قربانی دینے کا جذبہ رکھتے ہیں بے حد عزیز رکھتے تھے، اللہ والوں کے اس گروہ سے ان کو قلبی لگاؤ تھا، ان کی خبرگیری کرتے رہتے تھے، اور ان کی تشجیع کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ریاض سعودی عرب میں ایک استراحے کے اندر جلسہ منعقد کیا گیا، میں بھی اس جلسے میں حاضر تھا، ایک مقرر نے بڑے اچھے انداز میں تقریر کی، دورانِ تقریر اللہ کی راہ میں جام شہادت نوش کرنے والوں میں سے بعض لوگوں کا

تذکرہ کیا۔ میں نے مولانا رحمہ اللہ کو دیکھا کہ وہ زار و قطار رونے لگے، آنکھوں سے آنسو بہہ کر ان کی سفید داڑھیوں سے ٹپک رہے تھے۔ مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ اس طریقے سے ان کی طبیعت مزید خراب ہو سکتی ہے، لہٰذا ان کو آرام کرنے کے لئے دوسرے کمرے میں لے جایا گیا۔

حقیقت پسندی اور صاف گوئی عمدہ صفات ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں مولانا رحمہ اللہ کی زندگی میں ملتی ہیں۔ ایک مرتبہ ان کے کسی قریبی رشتہ دار نے گھر پر آ کر کہا کہ مجھے کہیں سے مبعوث کرا دیجئے۔ مولانا نے کہا کہ تم فلاں جگہ جاؤ اور وہاں تدریسی خدمات انجام دینا شروع کر دو تو میں اس سلسلے میں بھرپور کوشش کروں گا، لیکن انہوں نے کہا کہ آپ پہلے یہ کام کروا دیجئے میں فلاں جگہ چلا جاؤں گا۔ لیکن مولانا نے کہا کہ جب تک تم وہاں چلے نہیں جاتے تب تک میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ بالآخر نہ وہ وہاں گئے اور نہ ہی مولانا نے کچھ لکھا۔

مولانا کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ حق شناس عالمِ دین تھے۔ ایک مرتبہ ایک آدمی نے مدرسے کے سلسلے میں ان سے تزکیہ لکھوانے کی کوشش کی اور بہت کچھ بیان کیا۔ مولانا رحمہ اللہ نے کہا کہ آپ مجھے اس کے کچھ ثبوت دکھلا دیں تو میں تزکیہ لکھ دوں گا۔ بالآخر وہ کچھ بھی نہیں دکھا سکے تو مولانا نے معذرت کر دی۔

مولانا بزرگوں اور اللہ والوں کی دعائیں لینے سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔ ایک مرتبہ میں مدینہ منورہ میں عید کے موقع پر ان کے گھر میں موجود تھا۔ اسی دوران شیخ صوفی عیش محمد پاکستانی بھی تشریف لائے (یہ بڑے ہی مستجاب الدعوات شخص تھے، اور کثرتِ صیام کے عادی تھے) مولانا نے ان سے درخواست کی کہ یہ ہمارے بچے ہیں اور یہ ہمارے داماد ہیں۔ سب تعلیم و تعلّم سے منسلک ہیں۔ آپ ان کے لئے دعائیں کر دیں۔ انہوں نے بڑی عاجزی سے تمام لوگوں کے لئے ہاتھ اٹھا کر دعائیں کیں۔ انہیں کے تعلق سے مجھے ایک واقعہ یاد ہے کہ انہوں نے مولانا سے بیان کیا کہ میں نے اللہ کے حضور بڑی عاجزی سے دعا کی ہے کہ اے اللہ! جب تک امریکہ تباہی کے دہانے پر نہ کھڑا ہو جائے تب تک مجھے زندہ رکھ، میں اس کی تباہی دیکھنا چاہتا ہوں کیونکہ اس وقت

دنیا کا وہ سب سے بڑا طاغوت ہے۔

جب تک مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہے مولانا رحمہ اللہ کا عام معمول تھا کہ مغرب کی نماز کے بعد مسجد نبوی کے باب السلام کے پاس جا کر بیٹھ جاتے تھے۔ جامعہ اسلامیہ کے طلبہ اور دوسرے لوگ آ کر آپ کے اِردگرد بیٹھ جایا کرتے تھے۔ طلبہ مسئلے مسائل دریافت کرتے تو ان کا بڑے ہی سلیقے سے جواب دیتے۔ مختلف ممالک کے علماء اور مسئولین اگر مدینہ منورہ میں آتے تو مولانا سے ضرور ملاقات کرتے، اور ملی وسماجی مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔

مولانا کا ایسا ہی معمول جامعہ سلفیہ میں تدریس کے وقت بھی تھا، نماز کے بعد مسجد میں بیٹھ جاتے تو طلبہ آپ کو گھیر کر بیٹھ جاتے تھے، اور جو کچھ پوچھنا ہوتا پوچھتے تھے۔ مولانا طلبہ کی تربیت کیسے کرتے تھے؟ ایک بات میرے بڑے بھائی حافظ محمد عمیر حفظہ اللہ نے بیان کی ہے کہ مولانا جب کوئی کتاب یا کوئی مضمون لکھتے اور کافی مشغول ہوتے تو طلبہ کے ذمے کام لگا دیتے کہ فلاں بحث یا فلاں حدیث، یا اس کے متعلقات فلاں فلاں کتاب سے ڈھونڈھ کر لے آؤ۔ طلبہ بڑی خوشی سے ان کا یہ کام کرتے تھے، پھر مجلسوں میں ان طلباء کی حوصلہ افزائی کرتے، اور ان کو لکھنے پڑھنے کا طریقہ سکھلاتے تھے۔

آدمی اگر صدق ووفا کا پیکر، متبع سنت، دنیا کی لالچ سے بے رغبت، زاہد اور اکل حلال پر اپنی نشو ونما کرنے والا ہو، حرام اور ناجائز چیزوں سے بچتا ہو تو اللہ اسے اپنے محبوب بندوں میں شامل کر لیتا ہے، اور جب وہ اللہ کا محبوب بندہ ہو جاتا ہے تو فرشتے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ لوگوں میں اس کو قبولیتِ عام سے سرفراز کر دیتا ہے۔ یہ ساری صفتیں مولانا رحمہ اللہ کے اندر موجود تھیں، دنیا نے دیکھا کہ وہ ہر دلعزیز شخصیت تھے، اور ہر شخص ان سے پیار کرتا تھا۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ مولانا کی ہمارے گھر دعوت تھی۔ مولانا تشریف لائے۔ مولانا اور میرے والد دونوں دوستوں میں گفت وشنید ہوتی رہی۔ دورانِ گفتگو مولانا رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ الرحیق المختوم لکھنے میں میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ بلاوضو اس کی ایک سطر بھی نہ لکھوں، اور

کہا کہ اس پوری مدت میں مجھ سے کسی نماز کی قضا نہیں ہوئی ہے۔اسی مجلس کے تعلق سے یہ واقعہ مجھے یاد آ گیا۔مولانا آم اور پپیتا بہت رغبت سے کھاتے تھے،ہمارے احاطے میں یہ دونوں درخت بکثرت پائے جاتے تھے،اور نہایت ہی عمدہ قسم کا پھل آتا تھا،واپس جانے سے پہلے مولانا نے کہا کہ مجھے پپیتے کا کچھ بیج دیجئے کیونکہ یہ عمدہ نوعیت کا ہے۔مولانا کی یہ بات پوری کی گئی اور ایک پلاسٹک کی تھیلی میں میں نے ان کو ڈھیر سارے بیج دے دیے۔مولانا نے اپنے احاطے میں ان تمام بیجوں کو زمین میں گاڑ دیا۔جس سے کئی ایک پودے اُگے اور کئی ایک پودے پانی کی وجہ سے سڑ گئے۔مولانا نے کہا کہ جب یہ پودے کچھ بڑے ہو گئے تو بڑی عمدہ نوعیت کے پھل لگتے ہوئے معلوم ہوئے،لیکن یہ کسی سے دیکھا نہیں گیا،دیوار پھلانگ کر احاطے میں داخل ہوا اور تمام پیڑوں کو جڑ سے کاٹ دیا،مولانا اس بات کو بڑے افسوس کے ساتھ بیان کرتے تھے۔

جب میں اپنی فیملی کے ساتھ مکتبہ دارالسلام کے قریب حی الوزارات (حارہ) میں رہنے لگا تو مولانا جب کبھی ریاض تشریف لاتے،ہمارے گھر میں ٹھہرتے تھے،ان کی صحت وغیرہ کا کافی خیال رکھا جاتا،جس چیز کی طبیعت کرتی ان کے لئے حاضر کی جاتی تھی،ان کی یہاں پر اقامت کو میں نے غنیمت جانا اور ان سے فائدہ اٹھایا،ان سے خوب مسئلے مسائل دریافت کئے،اکثر اختلافی مسئلہ ان کے سامنے بیان کر کے پوچھتا تو راجح مسلک دلیل دے کر بتلاتے تھے۔

خوابوں کی صحیح تعبیر بیان کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں،لیکن یہ چیز مولانا کے لئے آسان تھی،اکثر خواب کی تعبیر جیسی بیان کرتے ویسی ہی واقع ہو جاتی تھی۔البتہ جب ایسا کوئی خواب بیان کیا جاتا جس کی تعبیر اچھی نہیں ہوتی تو اس کی تعبیر بیان کرنے سے گریز کرتے تھے۔ایک مرتبہ خوابوں کی بات چلی تو مولانا رحمہ اللہ نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دو مرتبہ خواب میں دیکھا ہے۔اتنا بیان کر کے مولانا خاموش ہو گئے،لیکن میرا دل سننے کے لئے بیتاب ہوا جا رہا تھا تو میں نے مولانا سے درخواست کی کہ برائے مہربانی آپ مجھ سے وہ خواب بیان کریں تو مولانا نے اپنے پہلے خواب کو اس طرح سے بیان کیا کہ نبی پاک ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ ایک جگہ تشریف

فرماتے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر گردوغبار پڑ رہے تھے اور کچھ مکھیاں بیٹھنے کی کوشش کر رہی تھیں، میرے ہاتھ میں پنکھا تھا، میں اپنے اس پنکھے کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے سے وہ تمام چیزیں پرے کرر ہا تھا۔ دوسرا خواب بیان کرتے ہوئے کہا: میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے آگے چل رہے ہیں، جہاں جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک پڑ رہے تھے ان نشانِ قدم پر میرا بھی پیر پڑ رہا تھا۔ میں نے مولانا کے سلسلے میں دارالسلام کی جانب سے منعقد کئے گئے ایک تعزیتی پروگرام میں ان دونوں خوابوں کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ دونوں خواب مولانا کے متبع سنت ہونے اور الذَّبُّ عَنِ السُّنَّة کی عکاسی کرتے ہیں۔

مولانا رحمہ اللہ نے جامعہ سلفیہ بنارس میں تدریس کے دوران ماہنامہ محدث کی کامیاب ایڈیٹنگ کی۔ اپنے تحقیقی اداریے، علمی مقالات اور انقلاب آفرین افکار سے اس ماہنامے کو مزین کیا۔ اس کے ذریعے سے سلفی فکر کو اجاگر کیا اور پوری دنیا میں اپنے زورِ قلم کا لوہا منوالیا۔ آج بھی ان کے دور میں شائع محدث کے ایڈیشن کو اہلِ علم قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آپ نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ مناظرے کیے۔ جمعیت اہل حدیث ہند کے امیر بھی بنائے گئے، لیکن ناخوشگوار ماحول میں سال، یا ڈیڑھ سال کے اندر اس عہدے سے مستعفی ہوگئے۔ مکتبہ دارالسلام ریاض میں شعبہ بحث وتحقیق کے مسئول کی حیثیت سے رہے۔

اللہ تعالی نے مولانا رحمہ اللہ کو خطابت جیسے ہنر سے بھی نوازا تھا۔ مولانا بڑے ہی سلیس انداز میں علمی اور گہری باتیں کہہ جاتے، بدعات ومنکرات پر ایسی نکیر کرتے کہ سننے والے کو یہ محسوس نہیں ہو پاتا تھا کہ یہ بات ہمارے معتقد کے خلاف کہی جارہی ہے، عام آدمی ان کی باتوں کو سن کر اپنے باطل معتقد سے تائب ہوجاتے تھے، اور کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے شیدائی بن جاتے تھے۔ اس طریقہ سے سانپ بھی مرجاتا اور لاٹھی بھی صحیح سالم رہتی تھی۔

مولانا رحمہ اللہ ہر شخص کی دعوت قبول کرتے تھے، اور اپنے مرض کی پروانہ کرتے ہوئے جو کچھ دسترخوان پر چن دیا جاتا بلا تردد کھالیا کرتے تھے اگرچہ وہ چیزیں ان کی صحت کے لئے نقصان دہ

ہوا کرتی تھیں۔ غالباً یہی بے احتیاطی ان کے جان لیوا مرض کا سبب بنی۔ ایک مرتبہ دعوت کھا کر کسی ہوٹل سے آرہے تھے، دارالسلام کے سکن سے قریب پہنچے تو پیر لڑکھڑانے لگ گئے، اور سڑک پر گر پڑے، دیکھتے ہی دیکھتے ان کی حالت نہایت ہی نازک ہوگئی، فوری طور پر عبید ہاسپٹل کے ایمرجنسی وارڈ میں داخل کرادیا گیا۔ مولانا اپنی تمام یادداشت کھو چکے تھے، حتی کہ کسی کو پہچان بھی نہیں سکتے تھے۔ اسی اسپتال میں ایک بڑا ماہر کمار نامی ہندستانی ڈاکٹر تھا، جب اس کو پتا چلا کہ مریض ہندستانی ہے اور بہت بڑا رائٹر ہے تو اس نے کافی توجہ سے مولانا کی دیکھ ریکھ کی۔ ڈاکٹر اپنے حساب سے تمام لوگوں کو تسلی دیتا رہتا تھا لیکن تمام لوگوں کا رجحان یہ بن چکا تھا کہ اب شاید مولانا اس دنیا سے کوچ کر جائیں گے۔ سب سے پہلے میں حاضر ہوا، پھر مولانا کے تینوں فرزند مدینہ سے فلائٹ کے ذریعہ ریاض آپہنچے۔ کچھ دنوں کے بعد جب مولانا کی یادداشت تھوڑی بہت لوٹ آئی، ہوش وحواس ٹھکانے ہوئے تو وزیر وزارۃ الشؤون الاسلامیہ کی سفارش پر ملک خالد اسپتال میں ٹرانسفر کردیا گیا۔ وہاں پر مملکت سعودیہ عربیہ کے مشہور ڈاکٹر ربیعہ کے ہاتھوں اللہ کے حکم سے مولانا کی شفایابی ہوئی اور مولانا کچھ چلنے پھرنے کے قابل ہوگئے۔ اس کے بعد ہندستان چلے گئے اور وہاں پر علاج معالجہ کرایا تو کافی حد تک ٹھیک ہوگئے اور سعودیہ آتے جاتے رہے، لیکن اب ان کو یقین ہو چلا تھا کہ میرا وقت قریب آچکا ہے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے بڑے بیٹے فیض الرحمٰن صاحب کو جنہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے، ایم فل، اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہوئی ہے یہاں پر بلالیا، ان کو طریقۂ کار سمجھا کر اپنے تمام کاموں کا بار ان کے کندھوں پر ڈال دیا، وہ مولانا کے تمام کاموں کی دیکھ ریکھ کرنے میں لگ گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب آدمی ارتقاء اور بلندی کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے حاسدین بھی بیشمار پیدا ہوجاتے ہیں، مشاہدے کی بات ہے کہ حسد کی بیماری علمائے کرام کے اندر عام لوگوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ امام ذہلی رحمہ اللہ امام بخاری رحمہ اللہ کے ہمعصر بہت بڑے محدث، ثقہ، اور حافظ تھے، ان کو امام بخاری رحمہ اللہ کی شہرت اور مقبولیت دیکھی نہ گئی، طرح طرح کے

اتہامات ان پر لگائے گئے، بالآخر امام بخاری رحمہ اللہ کو بخارا سے نکلنا پڑا، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے دعا کی:

" لَقَدْ ضَاقَتْ عَلَيَّ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ، فَاقْبِضْنِي اِلَيْکَ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ"

''مجھ پر زمین اپنی کشادگی کے باوجود تنگ ہو کر رہ گئی ہے، تو اے اللہ! مجھ کو فتنے میں پڑنے سے پہلے اپنے پاس اٹھا لے''۔

اس دعا کے بعد دوسرے ہی دن ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اللہ ان پر کروڑہا رحمت نچھاور کرے، اور ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین. اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا امتِ اسلامیہ پر بہت ہی بڑا احسان ہے کہ انہوں نے ایک ایسی کتاب لکھی جو قرآن مجید کے بعد اس دنیا میں سب سے صحیح کتاب ہے۔

مولانا رحمہ اللہ بھی حسد کی آگ سے نہ بچ سکے، طرح طرح کے الزامات ان پر تھوپے گئے۔ اس قسم کی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کے چہروں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ اس پر گرہن لگا ہوا ہے۔ آسمانِ دنیا پر چمکتے ہوئے ستاروں کی روشنی کبھی مدھم پڑ جاتی ہے، لیکن مولانا رحمہ اللہ وہ ستارہ ہیں جو زندۂ جاوید بن چکے ہیں۔ جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ میں میرے ایک بوسنی دوست کو پتا چلا کہ میں مبارکپور سے تعلق رکھتا ہوں اور مولانا رحمہ اللہ کا قریبی رشتہ دار ہوں تو اس نے مجھ سے دوستی پکی کر لی۔ ایک مرتبہ اس نے بتلایا کہ بوسنیاں میں جنگ کے ایام میں کسی نے الرحیق المختوم کا بوسنوی زبان میں ترجمہ کر کے نشر کر دیا، اس کا اثر یہ ہوا کہ آٹھ نو ایڈیشن انتہائی تیزی کے ساتھ ختم ہو گئے، ہر شخص کے ہاتھ میں وہ کتاب موجود تھی، اس کو پڑھ پڑھ کر لوگوں میں اس قدر بیداری پیدا ہوئی کہ ہر شخص جوالا مکھی بن گیا۔ اس بوسنی لڑکے کے الفاظ آج بھی مجھے یاد پڑتے ہیں کہ اس نے کہا کہ اس زمانہ میں ہم لوگوں کے لئے یہ کتاب کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھی، یہ کتاب ایک کتاب ہی نہیں بلکہ ایک قنبلہ ذرّیہ تھی جس کی برکت یہ ہوئی کہ ہر شخص جہاد کے میدان میں دیوانہ وار کود پڑا، اور سربوں کے دانت کھٹے کر دیئے، بالآخر انہیں آزادی نصیب ہوئی۔ اس نے کہا کہ بوسنیا کا ہر شخص اس کتاب کے مصنف کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھتا ہے۔ شاعر کے الفاظ میں۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

مولانا کے حافظے اور ان کے سریع الحفظ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ ان کے سریع الحفظ ہونے کا ایک واقعہ سنتے جائیے: مولانا کی فالج کے حملے کے بعد حیّ الناصریہ ریاض میں ایک جگہ مولانا کو دعوت دی گئی، میں بھی اس دعوت میں شریک تھا، وہاں پر دس بارہ لوگ پہلے سے موجود تھے۔ سبھی لوگوں نے اپنا اپنا تعارف کرایا، ان میں سے ایک آدمی ابو دجانہ تھے جنہوں نے اپنا تعارف کرایا اور کچھ باتیں عرض کیں، اس کے بعد دسترخوان لگایا گیا، قریب دو گھنٹے کے بعد مجلس برخواست ہوئی تو ابودجانہ صاحب نے اپنی بات کی یاددہانی مولانا رحمہ اللہ سے کرائی، اور کہا کہ آپ میرا نام بتلا دیجئے؟ ابھی اس کا یہ جملہ بھی پورا نہیں ہو پایا تھا کہ مولانا نے ان کا نام بتلا دیا۔ یہ سن کر تمام لوگ عش عش کرنے لگ گئے۔ ان میں سے بعض لوگوں نے کہا کہ اتنے وقفے کے بعد واقعی مجھے آپ کا نام بھول گیا تھا لیکن مولانا کو دیکھئے کہ اس خطرناک بیماری کے بعد بھی آپ کا نام یاد ہے۔ مولانا رحمہ اللہ نے یہ بات سن لی اور کہا کہ اگر تم سب لوگوں نے کہا ہوتا کہ ہمارے نام بتلا دیں تو میں سب کا نام بتلا دیتا۔ لیکن جب مولانا کا مرض شدت اختیار کر گیا تو ان کی یادداشت میں کمی آ گئی تھی۔

قریب ایک سال پہلے تیسری بار ہندستان میں مولانا کو بائیں جانب فالج کا زبردست اٹیک ہوا، علاج معالجہ کے لئے بنارس کے کئی اسپتالوں میں لے جایا گیا، لیکن مولانا کو کامل شفایابی نہیں ہوئی۔ بالآخر طویل علالت کے بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہتے ہوئے اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے. آمین یارب العالمین۔

مولانا رحمہ اللہ نے انتقال کے وقت بیوی، چار بچے، چار بچیاں۔ ایک پوتا، پانچ پوتیاں۔ سات نواسے اور آٹھ نواسیاں چھوڑیں۔ بچوں اور بچیوں کے بالترتیب اسمائے گرامی یہ ہیں:

(۱) فیض الرحمٰن (۲) رُمیثہ (۳) عاتکہ (۴) رُشیدہ (۵) یاسر (۶) طارق (۷) عامر (۸) عطیہ۔

مولانا رحمہ اللہ نے اپنے تمام بچوں اور بچیوں کو دینی وعصری تعلیم دلانے کی بھرپور کوشش کی۔

جناب فیض الرحمن صاحب جامعہ سلفیہ بنارس سے فارغ ہو کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے، ایم اے، ایم فل، اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اور اول الذکر دو بچیاں عصری تعلیم ہائی اسکول کی تعلیم حاصل کر سکیں۔ اور رشیدہ: کلیہ فاطمۃ الزہراء مئو سے فارغ ہو کر امّ القری مکہ مکرمہ یونیورسٹی میں بی اے کر رہی ہیں۔ یاسر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے بی اے کر کے ممبئی میں شیخ عبدالحکیم صاحب کے مدرسے میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ طارق جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے بی اے کر کے اصول فقہ میں وہیں سے ایم اے کر رہے ہیں۔ عامر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے بی اے کر کے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے ایم اے کر رہے ہیں۔ اور عطیہ کلیہ فاطمۃ الزہراء سے فارغ ہو کر ریاض سعودی عرب میں کلیۃ التربیۃ سے بی اے کر رہی ہیں۔

مولانا نے اپنی زندگی میں تمام بچوں اور بچیوں کی شادیاں کر دیں، سوائے اپنے سب سے چھوٹے صاحبزادے عامر کے، جن کی شادی اپنی زندگی میں نہ کر سکے۔ مولانا کے دو داماد میں سے ایک شیخ عمر فاروق حفظہ اللہ ام القری مکہ مکرمہ یونیورسٹی سے بی اے کر رہے ہیں۔ اور دوسرے راقم الحروف جو امام محمد بن سعود اسلامک یونیورسٹی ریاض سے ڈپلوما اور بی اے کر چکے ہیں۔

مولانا رحمہ اللہ کی نمازِ جنازہ ان کے صاحبزادے حافظ یاسر مدنی نے پڑھائی۔ مولانا رحمہ اللہ کے جنازہ میں خلقِ کثیر نے شرکت کی جس کی وجہ سے موضع حسین آباد مبارکپور میں قدم رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهُ وَارْحَمْهُ وَعَافِهِ وَاعْفُ عَنْهُ ، وَوَسِّعْ مُدْخَلَهُ ، وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ ، وَنَقِّهِ مِنَ الذُّنُوْبِ وَالْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْاَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ ، وَاَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ الْفِرْدَوْسَ۔ آمِيْن يَا رَبَّ الْعَالَمِيْن۔

آہ! استاد محترم رحمۃ اللہ علیہ

(از: ابوحماد عبدالغفار مدنی، مکہ مکرمہ)

میں ایک تفریحی پروگرام میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ جدہ گیا ہوا تھا۔ جمعہ کا مبارک دن تھا۔ جمعہ کی نماز پڑھ کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک دوست نے فون کر کے یہ اندوہناک خبر سنائی کہ استاد محترم مولانا صفی الرحمٰن صاحب مبارکپوری داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر اپنے ربِ حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ غمناک خبر میرے لیے کسی بجلی کی کرنٹ سے کم نہ تھی۔ کیونکہ ابھی ذہن ودماغ سے اپنے عظیم محسن، قوم وملت کے بےلوث خادم جناب ڈاکٹر عبدالوہاب صاحب رحمہ اللہ (أدخله الله فسيح جناته) کی عظیم شخصیت کو فراموش نہیں کر پایا تھا کہ اس روح فرسا خبر نے مزید حواس باختہ کر دیا۔ یقیناً رب کریم کا فیصلہ اٹل ہے اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سچ ہے کہ قیامت کے قریب مخلص علماء کا اٹھ جانا ہی علم کے اٹھ جانے کی علامت رہے گا۔ یہ فرمان نبوی اس وقت صد فیصد صادق آرہا ہے کہ ابھی چند سالوں میں کتنی عظیم شخصیتوں سے ہم محروم ہو گئے۔ محدث کبیر علامہ عبیداللہ رحمانی مبارکپوری صاحب مرعاۃ المفاتیح، قاطعِ بدعت اور حامیٔ سنت علامہ شیخ ابن باز، علامہ عثیمین اور محدثِ زماں ابوعبدالرحمٰن ناصرالدین البانی (غفر الله لهم) یہ نفوس قدسیہ علم وتقوی کے پہاڑ اور وقت کی بے نظیر شخصیتیں تھیں۔ ان کے یکے بعد دیگرے چلے جانے پر مذکورہ حدیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر صادق آتی ہے اور اس وقت علمی دنیا میں ایک ایسا خلا محسوس ہو رہا ہے جس کا پر ہونا محال تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہے۔ انہیں رجال علم وفن میں سے ایک شخصیت مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کی تھی۔

کون جانتا تھا کہ 1942ء میں حسین آباد میں ایک گمنام گھرانے میں طلوع ہونے والا یہ روشن ستارہ حب نبوی میں سرشار ہو کر سیرت پاک پر اپنی نوکِ قلم کو جنبش دے گا تو یہی جنبشِ قلم سیکڑوں

کیاہزاروں ستاروں کے درمیان چودھویں کا چاند بن کر ابھرے گا۔ 1976ء میں رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ میں سیرت نبوی کے موضوع پر منعقد انعامی مقابلہ میں سیکڑوں مقالہ نگاروں کے درمیان الرحیق المختوم نے پہلا امتیازی مقام حاصل کیا۔ داد دینا چاہیے ان کی قوتِ فکر پر کہ مؤلف مرحوم نے کس قوتِ فکر کے ساتھ اس نام کا انتخاب کیا۔ یہ جنتیوں کے لیے مہر بند شراب ہے۔ جس طرح یہ شراب سب سے اعلیٰ ہے اسی طرح یہ کتاب بھی سب سے اعلیٰ وارفع ہے۔ **هذا من فضل الله يؤتيه من يشاء.**

آپ درسگاہ کے اچھے، مخلص اور بلند پایہ استاد، میدانِ بحث وجدل کے عظیم مناظر، میدانِ صحافت کے بہترین قلمکار، اچھے ادیب، مدقق، محقق، انشاء پرداز، اورفنِ سپہ گری کے ماہر تھے۔

لیکن وقت کی ستم ظریفی کہ غربت نے آپ کو ابھرنے نہیں دیا۔ بلکہ آپ کی اکثر زندگی مدارس کی چہار دیواری میں محدود رہ کر تشنگانِ علم وفن کی علمی پیاس بجھانے میں مصروف ومحدود ہو کر رہ گئی۔

1974ء میں جامعہ سلفیہ بنارس میں بحیثیت استاد رونق افروز ہوئے۔ یہی سال راقمِ سطور کے جامعہ سلفیہ میں داخلے کا سال تھا۔ اور حسنِ اتفاق کہ میرا داخلہ امتحان مولانا مرحوم کے پاس ہی پڑا۔ مولانا نے مجمع کے سامنے مشکاۃ شریف کی ایک یا دو حدیثیں پڑھوائیں۔ ایک جگہ اعراب کے بارے میں مجھ سے سوال کیا کہ یہاں یہ اعراب کیسے ہے؟

میں نے بلا جھجک جواباً عرض کیا: یہاں یہ اعراب غلط ہے لیکن ضرورت شعری کی بنا پر جائز ہے۔

اس پر مولانا ہنس پڑے اور فرمایا: ''جائیے آپ کا امتحان ہو گیا''۔

الحمدللہ بعد میں معلوم ہوا کہ کامیابی کا پروانہ مجھے بھی مل گیا ہے۔ **فلله الحمد والشكر.**

مولانا کی تدریس کا انداز بے حد نرالا تھا۔ آپ عمومی طور پر اور بالخصوص دورانِ درس لغو اور لایعنی موضوعات سے قطعی پرہیز کرتے تھے؛ البتہ طلبہ کے اندر نشاط اور بیداری لانے کے لیے بسا اوقات دورانِ درس قدرے چٹکلے چھوڑ دیا کرتے تھے۔ مشکل اور پیچیدہ عبارت کو بہت آسانی سے حل کر دیا کرتے تھے۔ سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ دورانِ درس جس قسم کا سوال طلبہ کرنا چاہتے تھے خواہ وہ موضوع درس سے متعلق ہو یا نہ ہو، مولانا ہر قسم کے سوالات کا جواب تسلی بخش دیتے تھے۔

سوال کرنے سے کبھی نہ اکتاتے تھے اور نہ ہی کسی قسم کی پابندی لگاتے تھے۔ اور یہی کامیاب استاد کی علامت ہوتی ہے۔

نمازِ عصر کے بعد جب مولانا میدان میں آتے تو اس وقت بھی طلبہ ان کو گھیر لیتے اور علمی بحث ومباحثہ شروع کر دیتے تھے۔ اسی طرح جب سیر وتفریح کے لیے نکلتے تو اس وقت بھی طلبہ ساتھ میں ہوتے اور اس وقت بھی علمی مباحثہ چلتا رہتا تھا۔ مولانا جملہ علوم وفنون پر اچھا درک رکھتے تھے۔ علومِ تفسیر، علومِ حدیث، منطق وفلسفہ، ریاضیات، تاریخ وجغرافیہ، جرح وتعدیل وغیرہ پر اچھی مہارت رکھتے تھے۔ اسلاف کے بہترین نمونہ تھے۔

مولانا تحقیق پسند قلمکار تھے:

جس طرح مولانا ایک کامیاب استاد تھے۔ اسی طرح ایک کامیاب اور عمدہ قلم کار بھی تھے۔ آپ کی تحریر کا ایک ایک لفظ آپ کی تحقیق وتدقیق پسندی کا غماز ہے۔ تحریر انتہائی مختصر مگر جامع ہوتی ہے۔ بے جا اور غیر مستند روایات وواقعات سے قطعی اجتناب کرتے ہیں۔ تطویلِ مجمل اور تقصیر مغلق سے دور رہتے ہیں۔ مختلف فیہ روایات میں ترجیح اور واقعات واُحداث کی تاریخ کی تعیین میں جو ملکہ آپ کو حاصل تھا وہ شاذ ونادر ہی کسی کے اندر پایا جاتا ہے۔ اس کی واضح مثال آپ کی شاہکار تالیف الرحیق المختوم ہے۔

یہ کتاب اصل میں عربی زبان میں تھی۔ عربی زبان وادب کا ماہر جب اس کتاب کا مطالعہ کرتا ہے اور پھر الفاظ کی ترکیب، زبان کی سلاست، موزوں وفصیح الفاظ کا انتخاب، قواعد کی مکمل رعایت کے ساتھ اس کو دیکھتا ہے تو وہ اس بات کو تسلیم ہی نہیں کرتا کہ یہ کسی عجمی شخص کی تالیف ہوسکتی ہے۔ اسی طرح آپ نے اپنے ہندو پاک کے اردو خواں حضرات کے لیے ان کے حسب خواہش اس عظیم کتاب کو اردو زبان میں ڈھالا۔ اس میں بھی آپ نے انتہائی سادہ الفاظ، آسان اور روزمرہ میں استعمال ہونے والے جملوں کا انتخاب کیا۔ قاری جب اس کو پڑھتا ہے تو پڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور جب تک ختم نہیں کر دیتا، اس کو سکون نہیں ملتا۔ اسی طرح آپ کے دوسرے علمی شاہکار بھی ہیں جو آپ کے ٹھوس علم، قوتِ استدلال اور علمی تحقیق کی روشن دلیل ہیں۔

مسلک:

مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑتا ہے کہ جب کوئی یہ سوال کرتا ہے کہ فلاں کا مسلک کیا ہے؟ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کا ایک ہی مذہب ومسلک ہونا چاہیے اور وہ ہے: ''مسلکِ کتاب وسنت''۔ لیکن فقہی اختلافات وجمود نے مسلمانوں کو حقیقت سے دور کر کے فرقوں اور ٹولیوں میں بانٹ دیا ہے۔ اب مسلمان ہو کر بھی کہتا ہے کہ کونسا مسلک ہے (نعوذ باللہ)۔ اب کوئی مرتا ہے تو چشتی بن کر مرتا ہے یا قادری یا حنفی مگر محمدی بن کر مرنا نہیں چاہتا جو کہ اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔

لیکن بفضل اللہ تعالیٰ استاد محترم کا مسلک ومشرب اور منہج وہی ہے جو کتاب وسنت کا ہے؛ یعنی اہل حدیث۔ زندگی بھر آپ کتاب وسنت کی خدمت میں اور ان کی طرف دعوت وتبلیغ میں لگے رہے۔ مسلکِ حق کی وضاحت میں ساری دشوار گزار گھاٹیوں کو عبور کیا حتی کہ اس کے لیے اگر میدانِ مناظرہ کا موقع آیا تو اس سے بھی آپ پیچھے نہیں ہٹے۔ مسلکِ حق کے داعی اور اس کے زبردست علمبردار رہے۔ 1978ء میں بجرڈیہہ کا مناظرہ اس کی روشن مثال ہے۔

دعوت وتبلیغ:

درسِ نظامی کے ساتھ ساتھ دعوت وتبلیغ کے میدان میں آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آواز قدرے پست تھی، مگر اندازِ بیان عمدہ اور نرالا تھا۔ کوئی بیان اور کوئی وعظ ونصیحت، حکمت وتدبیر سے خالی نہیں رہتی تھی۔ لوگ آپ کے وعظ کو کافی پسند کرتے تھے۔ آپ جہاں بھی گئے اور جس طرف بھی رخ کیا، وہاں نوجوانوں کو دعوت وتبلیغ میں حصہ لینے کی رغبت دلاتے رہے۔ ہندستانی معاشرہ ہو یا مسلم امت، ان کے اندر جو انتشار ہے اسے کس طرح ختم کیا جائے؟ اس کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتے تھے۔

اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے منعقدہ پروگرام کے موقع پر امتیازی پوزیشن حاصل کرنے کی وجہ سے جب آپ کو دعوتِ سخن دی گئی تو اس موقع پر آپ نے رابطہ کو ہندستان کے اندر دعوت وتبلیغ کے بعض ضروری اور متروک گوشوں کی طرف توجہ دلائی اور اس کے متوقع اثرات ونتائج پر روشنی ڈالی۔ اس وقت رابطہ کی طرف سے اس کا حوصلہ افزا جواب بھی دیا گیا۔

تلامذہ:

آپ کے تلامذہ کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے، کیونکہ آپ مختلف مدارس میں علمی موتیاں بکھیرتے رہے۔ چنانچہ ہر جگہ آپ کا تربیت یافتہ زبردست علمی شاہکار بن کر نکلا۔ آپ کا آخری تدریسی مرحلہ جامعہ سلفیہ بنارس ہے۔ یہاں پر ہزاروں طلبہ نے آپ سے کسب فیض کیا، انہیں یگانۂ روزگار اور علمی ستاروں میں سے ڈاکٹر رضاء اللہ محمد ادریس مرحوم بھی تھے۔ عربی زبان وادب کے ماہر، بہترین محقق، صاحب ابن تیمیہ مولانا عزیز شمس حفظہ اللہ بھی آپ ہی کے تربیت یافتہ ہیں جن کا شمار عصر حاضر کے معدودے چند محققین میں ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولائے کریم آپ کو صحت وعافیت کے ساتھ لمبی عمر عطا فرمائے تا کہ آپ جس طرح علمی ثروت کو اپنی ٹھوس تحقیق کے ساتھ منظر عام پر لا کر اسلامی لائبریریوں اور کتب خانوں کو نادر تحفہ پیش کر رہے ہیں اسی طرح علمائے اہل حدیث کا سوانحی خاکہ جو آپ کے سینوں میں محفوظ ہے، اسے بھی جلد کتابی شکل میں منظر عام پر لانے کی توفیق نصیب فرمائے، آمین)

اسی طرح فضیلۃ الشیخ صلاح الدین مقبول کویت، فضیلۃ الشیخ بدر الزماں نیپالی مدنی، ادیب وقت، خوش الحان شاعر اور ٹھوس مناظر مولانا رضاء اللہ بدایونی، نائب ناظم جماعت اہلحدیث ہند، فضیلۃ الشیخ اصغر علی امام مہدی ناظم اعلیٰ جماعت اہل حدیث ہند، اردو زبان وادب کے ماہر، بہترین اسلامی شاعر مولانا عبداللہ عبدالتواب مدنی نیپالی وغیرہم جیسی بیسیوں عظیم شخصیات آپ کی تربیت یافتہ ہیں۔ اس سے قاری خود اندازہ لگا سکتا ہے کہ جب تلامذہ کا یہ عالم ہے تو استاد کا عالم کیا ہوگا۔ اب یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ آپ کی وفات سے صرف آپ کا گھر ہی نہیں؛ بلکہ پورا عالم اسلام سوگوار ہے اور ایسے ہی موقع پر محاورہ صادق آتا ہے:

"موت العالم موت العالم"

اللہ تعالیٰ آپ کی چھوٹی بڑی تمام لغزشوں کو معاف فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ نصیب فرمائے۔ آمین۔

(9 محرم الحرام 1428ھ)

شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری اپنی تحریر کے آئینے میں

(از: قاری محمد اقبال، مدیر شعبۂ ریسرچ مکتبہ دارالسلام، ریاض)

مولانا صفی الرحمٰن رحمہ اللہ کے سایہ عاطفت میں مجھے ان کے معاون کی حیثیت سے دارالسلام کے شعبہ تحقیق و تألیف میں ۱۹۹۸ سے ۲۰۰۵ تک قریباً سات برس تک کام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس دوران مجھے ان سے استفادہ کرنے کے بہت سے مواقع میسر رہے۔ آج جب کہ وہ اپنے خالق حقیقی کے پاس جا چکے ہیں، ان کی ہمہ گیر شخصیت کے مختلف پہلو دل و دماغ میں گردش کر رہے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ قارئین کرام کو بھی ان احساسات میں شریک کر لیا جائے۔ اور مولانا کی چند منتخب تحریریں اس مضمون میں شامل کی جائیں تاکہ احباب مولانا کے بارے مزید کچھ جان سکیں۔

مولانا مرحوم علمائے مبارک پور کے سلسلہ ذہبیہ کی بہت نمایاں کڑی تھے۔ وہ ایک خاص عالمانہ وقار و منزلت کے حامل، علوم حدیث کے ماہر، رجال حدیث کے احوال سے واقف، تفسیری علوم کے راز داں، تاریخ اور جغرافیہ پر گہری نظر رکھنے والے، ادیبانہ شان رکھنے والے صاحب طرز انشا پرداز، پیچیدہ فقہی مسائل کو چشم زدن میں حل کر دینے والے عالم ربانی، عصر حاضر اور عہد قدیم کے باطل فرقوں کی گمراہی کو واضح کرنے والے مرد حق، کتاب و سنت کی دعوت کے علم بردار اور عملی نمونہ، زاہد شب زندہ دار، باثر مبلغ و داعی، دشمنان اسلام کے خلاف جرأت مندانہ موقف رکھنے والے مُناظر، اللہ کے خوف سے رونے والے، ساتھیوں کی مجلس میں انتہائی متواضع اور ایک فراخ دل شخصیت تھے۔ میں نے کئی مرتبہ دیکھا کہ دوران مطالعہ جب آخرت کے احوال کا ذکر آتا یا عظمت الٰہی کی بات آتی یا نبی کریم ﷺ کا ذکر مبارک آتا تو آپ کی آنکھیں برسنے لگ جاتیں۔ ایک بار انہوں نے بتلایا کہ ان کو خواب میں کئی بار رسول اکرم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی اور آپ ﷺ

نے انہیں خوش خبریوں سے نوازا۔

مولانا صفی الرحمٰن محض زاہد خشک نہ تھے بلکہ وقفے وقفے سے اپنے شاگردان عزیز اور رفقائے کار کے ساتھ مناسب مزاح بھی کرتے رہتے تھے۔ بعض لوگ اپنے علمی پندار کے باعث بے حد کھردرے اور خشک مزاج واقع ہوتے ہیں حتی کہ ان کی اس خشک مزاجی سے اردگرد کی فضا بھی خشک ہو جاتی ہے اور ان کے پاس بیٹھنے والے شخص کے لئے سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے۔ مگر مولانا ایک زندہ دل آدمی تھے۔ وہ خوش رہنے اور رفقاء کو خوش رکھنے کے فن سے خوب آگاہ تھے۔ مگر اس ساری صورت حال میں وہ اپنے وقار، وضع داری اور عالمانہ شان کو کبھی مجروح نہ ہونے دیتے تھے۔

جب ہم مولانا کی تحریر پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کی روانی، سلاست، پختگی، الفاظ کے تناسب ومعنویت اور حسن وخوبی کے باعث انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ انہوں نے عجمی ہونے کے باوجود عربی میں ایسے رشحات قلم چھوڑے ہیں کہ عرب علماء ان کی تحریریں پڑھ کر جھوم جاتے اور عالم حیرت واستعجاب میں گم ہو جاتے ہیں۔ ان کی اردو تحریریں بھی ادبی خوبصورتی کا شاہکار ہیں۔ انہوں نے اپنی تصانیف الرحیق المختوم اور ''روضۃ الأنوار'' کا بنفس نفیس ترجمہ کر کے تشنگان علم پر بڑا احسان کیا۔ اگر کوئی دوسرا شخص ان کتابوں کا ترجمہ کرتا تو غالباً وہ حق ادا نہ کرسکتا۔ آغا شورش کاشمیری نے اپنے ایک خطاب کے دوران کہا تھا کہ جب میں تقریر شروع کرتا ہوں تو الفاظ میرے سامنے قطار در قطار ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس انتظار میں رہتے ہیں کہ میں کس کا انتخاب کرتا ہوں اور کسے چھوڑتا ہوں۔ کچھ ایسی ہی قدرت مولانا صفی الرحمٰن کو بھی الفاظ کے انتخاب اور انہیں موتیوں کی طرح پرونے میں حاصل تھی۔

سیرت نبوی کے واقعات کو حوالہ قرطاس کرتے ہوئے وہ ایک بہتے دریا کے مانند روانی سے لکھتے چلے جاتے ہیں۔ مگر ان کی تحریروں کی اصل خوبی وہ برمحل تبصرے ہیں جو انہوں نے واقعات سیرت کے درمیان جابجا قلمبند کیے ہیں۔ یہ تبصرہ جات بیک وقت نسل نو کی درست سمت میں رہنمائی کے لیے نشان منزل بھی ہیں اور دین اسلام اور پیغمبر اسلام سے ان کی سچی محبت اور گہری

عقیدت کا مظہر بھی ہیں۔ اپنی ان تحریروں میں وہ اسلام کے ایک پرجوش وکیل کی حیثیت سے اسلام کا دفاع کرتے ہوئے کفار ومشرکین اور ملحدین کے حملوں کا پوری قوت سے جواب فراہم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

مولانا اپنی تحریروں کے آئینے میں ایک مخلص داعی، سچے مؤمن، دور اندیش رہنما، بالغ نظر دانشور، ملت کا درد رکھنے والے دینی رہنما، قابل اعتبار تاریخ نویس، اسلام کے ایک لائق وکیل اور رحیم وشفیق مربی نظر آتے ہیں اور پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ

دیکھنا تحریر کی لذت کہ جو اس نے لکھا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ذیل میں مولانا کی چند منتخب تحریریں بطور نمونہ پیش کی جارہی ہیں، غور فرمایئے کہ ان میں کیسے کیسے لعل وگہر ثبت کردیے گئے ہیں۔ ''الرحیق المختوم'' میں مسلم امت پر گزرنے والے مکی دور کے پرصعوبت ایام اور ابتدائی مسلمانوں کے صبر وثبات کے حالات بیان کرنے کے بعد مولانا یوں رقمطراز ہیں:

یہاں پہنچ کر گہری سوجھ بوجھ اور مضبوط دل ودماغ کا آدمی بھی حیرت زدہ رہ جاتا ہے اور بڑے بڑے عقلاء دم بخود ہوکر پوچھتے ہیں کہ آخر وہ کیا اسباب وعوامل تھے جنہوں نے مسلمانوں کو اس قدر انتہائی اور معجزانہ حد تک ثابت قدم رکھا؟ آخر مسلمانوں نے کس طرح ان بے پایاں مظالم پر صبر کیا جنہیں سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور دل لرز اٹھتا ہے۔ بار بار کھٹکنے اور دل کی تہوں سے ابھرنے والے اس سوال کے پیش نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان اسباب وعوامل کی طرف ایک سرسری اشارہ کردیا جائے۔

ا۔ ان میں سب سے پہلا اور اہم سبب اللہ کی ذات واحد پر ایمان اور اس کی ٹھیک ٹھیک معرفت ہے کیونکہ جب ایمان کی بشاشت دلوں میں جاگزین ہوجاتی ہے تو وہ پہاڑوں سے ٹکرا جاتا ہے اور اسی کا پلہ بھاری رہتا ہے۔

۲۔ پرکشش قیادت: نبی اکرم ﷺ جوامت اسلامیہ ہی نہیں بلکہ ساری انسانیت کے سب سے بلند پایہ قائد و رہنما تھے۔ ایسے جسمانی جمال، ونفسانی کمال، کریمانہ اخلاق، باعظمت کردار اور شریفانہ عادات واطوار سے بہرہ ور تھے کہ دل خود بخود آپ ﷺ کی جانب کھنچے جاتے تھے اور طبیعتیں خود بخود آپ ﷺ پر نچھاور ہوتی تھیں، کیونکہ جن کمالات پر لوگ جان چھڑکتے ہیں ان سے آپ ﷺ کو اتنا بھرپور حصہ ملا تھا کہ اتنا کسی اور انسان کو دیا ہی نہیں گیا۔ آپ ﷺ شرف وعظمت اور فضل وکمال کی سب سے بلند چوٹی پر جلوہ فگن تھے۔ عفت وامانت، صدق وصفا اور جملہ امور خیر میں آپ ﷺ کا وہ امتیازی مقام تھا کہ رفقاء تو رفقاء آپ ﷺ کے دشمنوں کو بھی آپ ﷺ کی یکتائی وانفرادیت پر کبھی شک نہ گزرا۔ آپ ﷺ کی زبان سے جو بات نکل گئی، دشمنوں کو بھی یقین ہو گیا کہ وہ سچی ہے اور ہو کر رہے گی۔

۳۔ احساس ذمہ داری: صحابہ کرام جانتے تھے کہ یہ مشت خاک جسے انسان کہا جاتا ہے اس پر کتنی بھاری بھرکم اور زبردست ذمہ داریاں ہیں اور یہ کہ ان ذمہ داریوں سے کسی صورت میں گریز اور پہلوتہی نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس گریز کے جو نتائج ہوں گے وہ موجودہ ظلم وستم سے زیادہ خوفناک اور ہلاکت آفریں ہوں گے اور اس گریز کے بعد خود ان کو اور ساری انسانیت کو جو خسارہ لاحق ہو گا وہ اس قدر شدید ہو گا کہ اس ذمہ داری کے نتیجہ میں پیش آنے والی مشکلات اس خسارے کے مقابل کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

۴۔ آخرت پر ایمان: جو مذکورہ احساس ذمہ داری کی تقویت کا باعث تھا۔ صحابہ کرام اس بات پر غیر متزلزل یقین رکھتے تھے کہ انہیں رب العالمین کے سامنے کھڑا ہونا ہے پھر ان کے چھوٹے بڑے اور معمولی وغیر معمولی ہر طرح کے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ اس کے بعد یا تو نعمتوں بھری دائمی جنت ہو گی یا عذاب سے بھڑکتی ہوئی جہنم۔ اس یقین کا نتیجہ یہ تھا کہ صحابہ کرام اپنی زندگی امید وبیم کی حالت میں گزارتے تھے، یعنی اپنے پروردگار کی رحمت کی امید رکھتے تھے اور اس کے عذاب کا خوف بھی۔

۵۔ان ہی پر خطر، مشکل ترین اور تیرہ و تار حالات میں ایسی سورتیں اور آیتیں بھی نازل ہو رہی تھیں جن میں بڑے ٹھوس اور پرکشش انداز سے اسلام کے بنیادی اصولوں پر دلائل و براہین قائم کیے گئے تھے اور اس وقت اسلام کی دعوت انہیں اصولوں کے گرد گردش کر رہی تھی۔ان آیتوں میں اہل اسلام کو ایسے بنیادی امور بتلائے جا رہے تھے جن پر اللہ تعالیٰ نے عالم انسانیت کے سب سے باعظمت اور پر رونق معاشرے یعنی اسلامی معاشرے کی تعمیر و تشکیل مقدر کر رکھی تھی۔

٦۔کامیابی کی بشارتیں: ان ساری باتوں کے علاوہ مسلمانوں کو اپنی مظلومیت کے پہلے ہی دن سے...... بلکہ اس کے بھی پہلے سے...... معلوم تھا کہ اسلام قبول کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دائمی مصائب اور ہلاکت خیزیاں مول لے لی گئیں بلکہ اسلامی دعوت روز اول سے جاہلیت جہلاء اور اس کے ظالمانہ نظام کے خاتمے کے عزائم رکھتی ہے اور اس دعوت کا ایک اہم نشانہ یہ بھی ہے کہ وہ روئے زمین پر اپنا اثر و نفوذ پھیلائے اور دنیا کے سیاسی موقف پر اس طرح غالب آجائے کہ انسانی جمعیت اور اقوام عالم کو اللہ کی مرضی کی طرف لے جا سکے اور انہیں بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کر سکے۔

اس تحریر کو پڑھنے والا اس امر کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ حالات و واقعات کی تجزیہ نگاری اور اسباب و عوامل پر گہری نظر کے اوصاف سے مولانا کو نصیب وافر عطا ہوا تھا۔

''تجلیات نبوت'' میں غزوات نبوی کا مختصر مگر جامع تذکرہ کرنے کے بعد ''غزوات کے متعلق چند کلمات'' کے زیر عنوان مولانا فرماتے ہیں:

جاہلیت میں جنگ کے معنی تھے، بغیر کسی رحم و مروت کے قتل و غارت گری، آتش زنی، اکھاڑ پچھاڑ، لوٹ مار، عورتوں کی بے حرمتی، زمین میں فساد، کھیتی باڑی اور جانوروں کی تباہ کاری، لیکن اسلام نے آکر جنگ کے مطلب کو مکمل طور پر بدل دیا، چنانچہ اس نے جنگ کو مظلومین کی مدد، ظالموں کی سرکوبی، زمین پر امن و امان پھیلانے، عدل قائم کرنے، کمزوروں کو طاقتوروں کے چنگل سے چھڑانے، بندوں کو بندوں کی عبادت سے نکال کر اللہ کی عبادت کی طرف لگانے اور باطل

ادیان کے ظلم سے اسلام کے عدل کی طرف لانے کا ذریعہ بنا دیا۔

عربوں کی عادت تھی کہ کسی کے سامنے سر نہ جھکائیں، خواہ جنگ کتنی ہی طول پکڑے اور قیمت بھی کتنی ہی زیادہ چکانی پڑے۔ چنانچہ "بکر" و "تغلب" کے درمیان "جنگ بسوس" چالیس سال تک چلتی رہی اور فریقین کے کوئی ستر ہزار آدمی مارے گئے، مگر کسی نے بھی دوسرے کے سامنے سر نہ جھکایا۔ اوس وخزرج کی لڑائی سو سال سے زیادہ چلی، مگر کسی نے بھی دوسرے کے سامنے سر نہ جھکایا۔ جنگ جاری رکھنا اور دشمن کے سامنے سر نہ جھکانا، اسلام سے پہلے عربوں کی معروف ومعلوم عادت تھی۔

پھر رسول اللہ ﷺ دین اسلام لے کر آئے تو عرب نے آپ کا بھی اسی اسلوب سے سامنا کیا اور آپ کو میدان جنگ تک گھسیٹ لائے لیکن آپ نے ایک دوسرے ہی اسلوب سے ان کا سامنا کیا جو نہایت حکیمانہ تھا، یہاں تک کہ ان کا ملک فتح کرنے سے پہلے ان کے دل جیت لیے۔ آپ کے غزوات میں کام آنے والوں کی تعداد اور ان غزوات کے نتائج کا تقابل جب جاہلیت میں پیش آنے والی جنگوں کے نتائج سے کیا جائے، تو عجیب وغریب بات سامنے آتی ہے۔ آپ کے غزوات اور جنگوں میں قتل ہونے والے سارے مسلمان، مشرکین اور یہود ونصاریٰ کی تعداد مجموعی طور پر کم و بیش ایک ہزار بنتی ہے اور ان غزوات میں جو مدت صرف ہوئی وہ آٹھ سال سے زیادہ نہیں، مگر اتنے تھوڑے عرصے میں اور اتنا معمولی سا خون بہا کر آپ نے تقریباً پورے جزیرہ عرب کو اپنا تابع فرمان بنا لیا اور اس کے اطراف واکناف میں امن وامان کا دور دورہ ہو گیا۔

کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ تلوار کی قوت سے ممکن ہے؟ بالخصوص ان لوگوں کے لئے جو معمولی بات پر نہ ختم ہونے والی جنگ چھیڑ دیتے تھے اور ہزاروں پر ہزار افراد قربان کرتے جاتے تھے مگر یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ دوسرے فریق کے سامنے سر جھکائیں گے۔ ہرگز نہیں، بلکہ آپ نے جو کچھ پیش فرمایا وہ نبوت اور رحمت تھی، رسالت اور حکمت تھی، دعوت اور معجزہ تھا اور اللہ کا فضل اور اس کی نعمت خاص تھی۔

غور فرمایئے مولانا اسلام اور کفر کے درمیان ہونے والی لڑائیوں کے مقاصد اور اسلوب کا فرق

کس خوبصورتی سے واضح فرماتے ہیں اور کس عمدہ طریقے سے نبی کریم ﷺ کی عبقریت، قائدانہ صلاحیت، عسکری مہارت، حکمت، شجاعت، کمال درجہ کی منصوبہ بندی، انتقام وتشدد سے اجتناب، جنگ سے شریفانہ مقاصد کے حصول، بلند پایہ اہداف تک رسائی، آپ کے عدل وانصاف اور قواعد وضوابط کی تشکیل کا تذکرہ کرتے ہیں اور آپ ﷺ کی لڑائیوں کو ایک مقدس مشن ثابت کرتے ہیں۔ آج کی جنگجو قوتوں کے سیاہ کارنامے بھی دیکھ لیجئے۔ عراق میں ایک لاکھ سے زائد انسانوں کا قتل، ابوغریب جیل میں قیدیوں سے انسانیت سوز سلوک، عراقی خواتین کی عصمت دری اور افغانستان میں ہزاروں معصوم شہریوں، عورتوں اور بچوں کا بہیمانہ قتل، گوانتانا موبے اور دیگر امریکی اور برطانوی خفیہ جیلوں میں بے جرم وخطا پابند سلاسل کیے جانے والوں سے درندگی کا مظاہرہ اور ایسی ہی بے شمار حرکات وسکنات یہ ثابت کرتی ہیں کہ اسلام امن اور سلامتی کا دین ہے جبکہ کفر شر وفساد پھیلانے کا ذمہ دار ہے۔

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے علمی ورثہ سے امت کو مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقامات عطا فرمائے اور ان کی خطاؤں اور لغزشوں سے درگزر فرمائے۔ ان کی وفات سے پیدا ہونے والے خلا کو پر کرنے کے اسباب پردہ غیب سے مہیا فرمائے اور ان کی علمی اور قلمی خدمات کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ: یادوں کے آئینے میں!

(از: حافظ حسن مدنی، ایڈیٹر ماہنامہ محدث، لاہور، پاکستان)

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ دورِ حاضر کے ان چند ایک علماء میں سے تھے جن سے ملاقات کر کے اور ان کی تحریریں پڑھ کر دورِ خیر القرون کے ائمہ اسلاف کا تاثر ذہن میں ثبت ہو جاتا۔ مولانا سے ان کی مشہورِ زمانہ تصنیف 'الرحیق المختوم' کے ذریعے ایک تعارف تو تھا ہی، لیکن آپ سے ملاقات کا بھی عرصہ سے اشتیاق تھا۔ ۱۹۹۶ء میں مجھے جب دوسری بار مدینہ منورہ کی زیارت کا موقع ملا تو ان دنوں مولانا موصوف مدینہ یونیورسٹی میں مصروفِ کار تھے۔ وہاں کے طلبہ سے آپ کے بارے میں دریافت کیا تو پتہ چلا کہ آپ ہر روز بعد نمازِ مغرب مسجدِ نبوی میں تشریف لاتے ہیں اور وہیں آپ سے بآسانی ملاقات ہو سکتی ہے۔

میرے ذہن میں آج تک وہ منظر محفوظ ہے جب میں نے مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری کو مسجد نبوی کے باب الرحمہ سے عربی لباس میں نکلتے دیکھا اور ان سے ملاقات کے لیے آگے بڑھا اور اپنا تعارف کرایا، مولانا بڑی محبت سے ملے اور جامعہ کے بارے میں چند تفصیلات بھی دریافت کیں۔ آپ کی شخصیت باوقار اور پرنور دکھائی دیتی تھی اور آپ کی گفتگو میں ایک عجب جلال محسوس ہوتا تھا۔ بعد میں جب بھی سعودی عرب جانا ہوتا، مولانا سے ملاقات کا ایک اشتیاق برقرار رہتا۔ یہ کیفیت صرف میرے ساتھ خاص نہیں بلکہ میرے کئی متعلقین نے مجھ سے مولانا کی زیارت کی خواہش کا اظہار کیا اور مجھے انہیں بھی ملاقات کرانے کی سعادت حاصل ہوئی۔

میری جب بھی مولانا سے ملاقات ہوتی تو اسے مفید تر بنانے اور آپ کے تجربے سے استفادہ کرنے کے لیے آپ سے اپنے زیرادارت مجلّہ 'محدث' لاہور میں کچھ لکھنے کی درخواست کرتا کیونکہ میں دورانِ طالبعلمی 'محدث' بنارس میں آپ کی تحریریں کافی عرصہ پڑھتا رہا تھا۔

دینی مجلّات کے مطالعے کے دوران مجھے دو شخصیات کی اِدارت نے بہت متاثر کیا اور ان کے دینی روابط، علم و تحقیق سے گہری وابستگی اور اپنی بات خوبصورت اور متوازن انداز میں کہنے کے سلیقے کو ہمیشہ میں نے اپنے لیے ایک مثال سمجھا۔ ان میں ایک مولانا مبارکپوری کا 'محدث' بنارس کا زمانۂ ادارت ہے، دوسرے حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ جنہوں نے کئی برس ہفت روزہ 'الاعتصام' کی ادارت کی۔ اللہ کا مجھ پر خاص کرم ہے کہ مجھے 'محدث' لاہور کی ادارت کے اوّلین سالوں میں حافظ صلاح الدین یوسف کی سرپرستی اور باقاعدہ نگرانی کی سعادت بھی میسر آئی اور میں نے ان سے کئی رُموزِ ادارت سمجھے، بلکہ میری اوّلین تحریریں بھی حافظ صاحب کی اصلاح کے بعد شائع ہوتی رہیں۔

میری نظر میں کسی مجلّے میں شائع ہونے والی تحریریں اور اہل علم کا قلمی تعاون دراصل مدیر کے ذوق اور علمی تعلقات کا مظہر ہوتا ہے۔ جو اہل قلم ان میں اپنی تحریریں شائع کرنے کے لیے بھیجتے ہیں، اس سے مدیرِ مجلّہ سے ان کے حسن تعلق اور اس اعتماد کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ان کی تحریر یہاں بحسن وخوبی شائع ہو جائے گی اور ایک بڑے حلقے تک پہنچ جائے گی۔

ان دو شخصیات کے زیرِادارت شائع ہونے والے مجلّے اہل حدیث صحافت کی درخشندہ مثالیں ہیں اور آپ کو ان کے زیرِادارت نکلنے والے شماروں اور ان کے بعد نکلنے والے شماروں میں بڑا واضح فرق محسوس ہوگا۔ دلچسپ امر یہ بھی ہے کہ ان دونوں شخصیات کا دورِ ادارت بھی قریباً برابر ہے، جن برسوں میں مولانا مبارکپوری 'محدث' بنارس کی ادارت کیا کرتے، عین انہی سالوں میں حافظ صلاح الدین یوسف ہفت روزہ 'الاعتصام' کے مدیر ہوا کرتے۔ یہ سال راقم الحروف کے زمانۂ طالبعلمی کے تھے اور انہی سالوں میں جامعہ کے شعبہ رسائل میں مجھے ذمہ داری ادا کرنے کا موقع بھی ملا، جس میں مختلف رسائل کا موازنہ کیا کرتا۔

اس کتاب کے قارئین کے لیے یہ خبر مسرت بخش ہوگی کہ 'محدث' لاہور سے منسلکہ اسلامی لائبریری 'مکتبہ رحمانیہ' کے شعبۂ رسائل میں راقم کے زیر نگرانی جب دینی بالخصوص اہل حدیث

صحافت کے ممتاز جرائد کے موضوعاتی اشاریے مرتب کرنے کا کام شروع ہوا تو ابتدائی سالوں میں ہی 'محدث' بنارس کے تمام شمارہ جات کا ایک موضوعاتی اشاریہ مرتب کرلیا گیا جس کے آخر میں نہ صرف تمام مقالہ نگاران کے تمام مضامین کی فہارس بھی موجود ہیں بلکہ مبارکپوری مرحوم کے تمام مضامین کی فہرستیں بھی موجود ہیں۔ یاد رہے کہ اسی شعبۂ رسائل میں یہی موضوعاتی فہارس ہفت روزہ 'الاعتصام' کے علاوہ مولانا ثناء اللہ امرتسری کے زیر ادارت ۴۵ برس تک امرتسر سے شائع ہونے والا 'اخبار اہلحدیث'، اور مولانا سید داود غزنویؒ کے زیر ادارت ۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۹ء میں امرتسر سے ہی شائع ہونے والے مجلّہ 'توحید' کی موضوعاتی فہارس اور جملہ مصنّفین کے اعتبار سے فہرستیں بھی تیار کرلی گئی تھیں۔

بات سے بات نکلتے ہوئے اپنے اصل موضوع سے دور جا رہی ہے، میں مولانا مبارکپوری کے بارے میں عرض کر رہا تھا کہ پھر بعد میں جب بھی مولانا سے سعودی عرب میں ملاقات ہوئی، آپ سے ہمیشہ رہنمائی اور مشورہ کا طالب رہا اور آپ نے اپنی بے لاگ رائے اور اصلاح دینے میں کبھی تامل نہ کیا۔ سچی بات یہ ہے کہ آپ سے مل کر ہمیشہ ایک سکون اور قلب کو راحت میسر آتی اور جی چاہتا کہ آپ کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارا جائے لیکن سفری مصروفیات آڑے آجاتیں۔

۲۰۰۲ء میں جب ہم نے محدث کا 'فتنۂ انکارِ حدیث نمبر' شائع کرنے کا پروگرام بنایا تو میں اس سلسلے میں بطورِ خاص مولانا موصوف سے رہنمائی لینے گیا اور آپ سے اس خاص نمبر کے لیے خصوصی مضمون لکھنے کا تقاضا کیا۔ آپ نے حامی بھر لی اور چند روز بعد ہی اپنا ایک تفصیلی مضمون بعنوان 'انکارِ حدیث حق یا باطل؟' اشاعت کے لیے عنایت فرمایا۔

مجھے پہلی بار آپ کی کسی تحریر کو محدث میں شائع کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی تھی۔ اس تفصیلی مضمون میں جب آپ کے دلائل کی فراوانی اور تحریر کی سلاست و روانی کو پایا تو ذہن سرشار ہو اُٹھا۔ گو کہ اسی شمارے میں بہت سی فاضل شخصیات اور بہترین اردو لکھنے والوں کے مضامین شائع کیے

گئے تھے جن میں مولانا مودودیؒ کا ایک مضمون بھی قابل ذکر ہے لیکن جو اہمیت اور بیان و استدلال کی جو قوت مولانا مبارکپوری کے مضمون کو حاصل تھی، وہ آپ کا ہی خاصہ تھی۔ بعد میں بھی جب کسی شخص کو منکرین حدیث کے اعتراضات کا کافی وشافی جواب مطلوب ہوتا تو میں نے کئی بار آپ کا یہی مضمون مطالعہ کرنے کو دیا۔

ہم عصر علماء میں مولانا مبارکپوری کی تحریری جولانی عدیم المثال ہے، اس درجہ خوبصورت اُردو انشا اور علم و تحقیق سے مزین اُسلوبِ بیان اس دور میں خال خال ہے۔ آپ کی ذہانت اور علمی مہارت نے آپ کے علمی کام کو خصوصی امتیاز عطا کر دیا تھا، چونکہ ہمارا آپ سے تعلق آپ کی تحریروں کے توسط سے یا چند شخصی ملاقاتوں کا مرہونِ منت ہے، اس لیے اسی حوالے سے اظہارِ خیال کیا جاسکتا ہے، جہاں تک کئی برسوں پر محیط آپ کی تدریسی زندگی ہے تو اس سلسلے میں آپ کے طلبہ یا جامعات کے ساتھی اساتذہ ہی بہتر رائے دے سکتے ہیں۔ بہر حال آپ کی تحریروں سے آپ کی علمی شان نمایاں ہوتی ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ آپ جیسی علمی، ادبی شخصیت کا وجود علماے برصغیر کے لیے ایک اعزاز سے کم نہ تھا۔

مولانا کی تحریروں سے وہ تاثر جو مزید اُبھرتے ہیں، ان میں علمی کام سے آپ کے والہانہ لگاؤ، ذاتِ نبویؐ سے شدید محبت اور معاشرے کو درپیش مسائل سے گہری واقفیت ہے۔ آپ سے ملاقات کر کے آپ کے تقویٰ اور پرخلوص شخصیت کا تاثر قائم ہوتا۔

یوں تو آپ کی صحت چند سالوں سے کافی متاثر تھی، بالخصوص فالج کے دوسرے حملے کے بعد آپ کے علمی معمولات میں بھی کافی تعطل در آیا تھا، اس لیے ذہن میں بار بار یہ احساس پیدا ہوتا کہ اب آپ چراغِ سحری ہیں، مختلف موقعوں پر آپ کی صحت یابی اور شفائے کاملہ کے لیے دعائیں ہوتی رہیں۔ دسمبر کے پہلے ہفتہ میں مکتبہ قدوسیہ کے روح رواں جناب عمر فاروق نے جب آپ کی وفات حسرت آیات کی خبر دی تو ایک ممتاز عالم دین کی سرپرستی سے محرومی کا احساس شدت سے پیدا ہوا۔ اس موقع پر یہ خیال آیا کہ آپ کی علمی شخصیت سے قارئین محدث کو مطلع کرنا اور آپ کی عظیم

خدمات کو اجاگر کرنا ضروری ہے چنانچہ میں نے حافظ صلاح الدین یوسف سے درخواست کی کہ وہ مولانا مبارکپوری کا تذکرہ سپردِ قلم کریں۔ حافظ صاحب کی صحت بھی عرصہ دراز سے متاثر چلی آ رہی ہے، گوناگوں مصروفیات اس پر مستزاد ہیں، میں نے جب اصرار کیا اور کہا کہ مولانا مبارکپوری جیسی شخصیت کا تذکرہ لکھنا نہ صرف ان کا ہم پر ایک حق ہے، بلکہ یہ تذکرہ ان کے شایانِ شان شخصیت کی طرف سے ہی ہونا چاہیے۔ محترم حافظ صلاح الدین یوسف صاحب نے میرے اس اصرار پر حامی بھر لی، گوکہ اس تذکرہ کی اشاعت کے لیے محدث کو چند روز مؤخر کرنا پڑا لیکن دسمبر کا شمارہ مولانا مبارکپوری کے تذکرے سے مزین تھا اور اس طرح ہم نے جماعت اہل حدیث کے ایک نامور سپوت اور متبحر عالم کی خدمات سے پاکستان میں عوام الناس کو آگاہ کیا۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آزمائش کے اس زمانے میں، جب اہل علم اٹھتے جا رہے ہیں، اپنے خصوصی فضل وکرم سے ہمیں ایسے علما عطا فرما جو تیرے دین کے وارث ہوں اور اپنے پیش رو ائمہ اسلاف کے اچھے جانشین ثابت ہو سکیں۔ کیونکہ بگڑے معاشرے کے لیے حکمت ودانش اور وحی کی روشنی سے منور ایک عالم کی ذات ہی عظیم ترین سرمایہ ہے۔ مولانا مبارکپوری نے اس دور میں اس جہان فانی سے دار البقا کی طرف کوچ کیا جب ان جیسی فاضل شخصیت کی مسلمانوں کو شدید ضرورت تھی۔ آپ مبارکپور کے سلسلہ علما کے بہترین وارث تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی وفات سے پیدا ہونے والا خلا پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

آنکھوں دیکھا حال!

(از: محمد ایوب سپرا کیلانی (1)، کراچی، پاکستان)

الحمد لله رب العالمين، والصلوٰة والسلام على سيدنا محمد سيد الاولين والآخرين، وعلى آله و صحبه ومن اهتدى بهديه الىٰ يوم الدين.

أما بعد:

کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کا بار بار ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے اور جب بھی ان کا ذکر کیا جائے، ان کی شخصیت کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ انہی شخصیات میں سے جناب شیخ صفی الرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ ہیں۔ پاکستان میں ان کی وفات کی خبر پی ٹی وی کے ذریعے سنی تو دل دہل گیا اور زبان پر بے اختیار ﴿إنا لله و إنا اليه راجعون﴾ کے الفاظ اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ غم وصدمہ کی حالت میں دیر تک بیٹھا رہا اور پھر "موت العالم موت العالم" کی جو ضرب المثل سنا کرتے تھے' اس کا عقدہ کھلا کہ ایک عالم کی موت کو کس طرح عالم کی موت قرار دیا جاتا ہے۔

شیخ صفی الرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ جب مرکز السنہ مدینہ منورہ میں مصروف عمل تھے تو گاہے بگاہے دارالسلام ریاض بھی تشریف لایا کرتے تھے۔ "الرحیق المختوم" کے حوالے سے آپ کی

---

(1) محمد ایوب سپرا کیلانی کراچی پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ دارالسلام ریاض کے شعبہ تصنیف وتالیف کے بانی کارکنان میں سے ہیں۔ انہیں ریاض میں اپنے بارہ سالہ قیام کے دوران مولانا صفی الرحمٰن رحمہ اللہ سے طویل عرصہ تک رفاقت کا شرف حاصل ہوا۔ سپرا صاحب نے مولانا صاحب کی معیت میں بیتے ہوئے لمحات کو قارئین کے لئے نہایت جذباتی انداز میں قرطاس پر منتقل کر دیا ہے۔ قارئین کے لئے ان کی یادداشتیں یقیناً مفید ثابت ہوں گی۔ سپرا صاحب کئی ایک کتب کے مصنف ہیں۔ گزشتہ دو سال سے دارالسلام کراچی برانچ کے مینجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

شخصیت عالم اسلام میں تعارف کی محتاج نہیں تھی تاہم قبل ازیں ملاقات کا شرف نصیب نہیں ہوا تھا۔ایک مرتبہ تشریف لائے تو اپنے بیگ میں سے کچھ مسودہ نکال کر مجاہد صاحب کے حوالے کیا۔ بعد میں وہ مسودہ مجھے دیا گیا اور پھر اس مسودے سے جو کتاب تیار ہوئی اس کا نام ''تجلیات نبوت'' رکھا گیا۔ دراصل دارالسلام کے کہنے پر مولانا صاحب نے بچوں کے لئے الرحیق المختوم کا ایک آسان اور مختصر عربی ورجن تیار کیا جس کا نام ''روضۃ الانوار'' رکھا گیا تھا' یہ مسودہ اس کا اردو ترجمہ تھا۔مولانا صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

اس ملاقات کے تھوڑے ہی عرصہ بعد 1997ء میں مولانا صاحب مرکز السنہ مدینہ منورہ سے فارغ ہو گئے تو بہت سے اشاعتی اور دعوت وارشاد کے اداروں نے آپ کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ شیخ صاحب نے دارالسلام کے ساتھ کام کرنے کو ترجیح دی اور یوں ایک عرصہ تک مجھے ان کی رفاقت میسر رہی۔ رہائشی کمرے چونکہ ساتھ ساتھ تھے اس لئے اکثر مل بیٹھنے کا موقع میسر آتا رہا اور آپ کی علمی باتیں سننے کو ملتی رہیں۔ بعد ازاں دارالسلام کے دفاتر نئی بلڈنگ میں منتقل ہو گئے تو بھی ہمیں شیخ صاحب کی معیت میں دفتر آنے جانے کا موقع ملا۔ بعد ازاں انتظامیہ نے طے کیا کہ سنیئر اسٹاف کے لئے دفتر کے قریب ہی رہائش کا بندوبست کر دیا جائے چنانچہ دفتر کے قریب ایک فلیٹ کرایے پر لے لیا گیا۔مولانا صاحب ان دنوں مدینہ منورہ گئے ہوئے تھے۔واپس تشریف لائے تو نئے سیٹ اپ اور شاندار رہائش کو دیکھ کر خوش گوار حیرت کا اظہار کیا۔دو تین روز کے بعد جمعہ کا دن تھا۔ ہمارے ساتھ ہی حارہ میں نماز جمعہ ادا کرنے تشریف لے گئے۔واپسی پر میں اور سعید الدین صاحب نے آپ کی ضیافت کا پروگرام بنایا اور شیخ صاحب کو ہوٹل میں کھانے کی دعوت دی جو آپ نے نہایت خوشدلی کے ساتھ قبول کر لی۔

چنانچہ ہوٹل میں آپ کی پسندیدہ ڈش کا آرڈر دیا گیا اور ہم سب نے نہایت پرتکلف انداز میں کھانا کھایا اور آپ کی علمی باتوں سے مستفید ہوتے رہے۔کھانے سے فارغ ہو کر جب ہوٹل سے باہر آئے تو ہمیں محسوس ہوا کہ مولانا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ میں نے کہا کہ ٹیکسی لے لی جائے تو

فرمایا: نہیں پیدل چلنا میرے لئے بہتر ہے لیکن چند ہی قدم چلے تھے کہ آپ کی طبیعت مزید بگڑنے لگی تو میں اور سعید الدین صاحب آپ کو سہارا دے کر رہائش گاہ تک لائے۔ چارپائی پر لیٹ گئے اور فرمایا کہ میں کچھ دیر آرام کروں گا تو بہتر ہو جاؤں گا۔ عصر کی نماز کے بعد میں نے دیکھا کہ آپ کی طبیعت مزید خراب ہو رہی ہے تو ٹیکسی منگوا کر عبید ہاسپٹل لے گئے۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ بلڈ پریشر بہت زیادہ ہو گیا ہے اس لئے آپ تقریباً بے ہوش ہیں۔ اور شام ہوتے ہوتے آپ پر فالج کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ احباب جمع ہو گئے اور آپ کے صاحبزادے کو مدینہ منورہ میں اطلاع دے دی گئی جو وہاں تعلیم کے سلسلے میں مقیم تھے۔

تین چار روز تک مستشفیٰ عبید میں ہی علاج ہوتا رہا، دوسرے روز میں نے مولانا صاحب کی بیماری کی خبر اردو نیوز میں شائع کرا دی۔ کسی ہمدرد نے عربی اخبار میں بھی خبر شائع کرا دی۔ دارالسلام کے مدیر جناب مولانا عبدالمالک مجاہد صاحب نے حکومت سے رابطہ کیا تو ایک وزیر صاحب نے ملک خالد ہسپتال میں داخلے کے لئے سفارشی لیٹر دے دیا۔ چنانچہ عبید ہسپتال سے ملک خالد ہسپتال میں منتقل کرنے کی تیاری شروع ہوئی۔ پہلے درخواست جمع کرائی گئی۔ حکم ہوا کہ ہاں جگہ ہے مولانا صاحب کو لے آئیں۔ جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ بیڈ خالی نہیں۔ اب واپس عبید ہسپتال جانا بھی ممکن نہ تھا۔ دیر تک ادھر ادھر واقف کار تلاش کرتے رہے۔

کافی پریشانی کے بعد ہسپتال کے ایک ملازم نے بتایا کہ آپ سب سے پہلے باقاعدہ فائل بنوائیں۔ پھر آپ کا ہر کام بغیر کسی سفارش کے ہوتا رہے گا۔ چنانچہ کافی تگ و دو کے بعد میں فائل بنوانے میں کامیاب ہو گیا تو بیڈ کا بندوبست ہو گیا اور ضابطہ کے مطابق علاج شروع ہوا۔ اس دوران آپ کی بیماری کی خبر نہ صرف شہر ریاض بلکہ تمام مملکت میں پھیل چکی تھی۔ پھر کیا تھا' شہر کا ہر چھوٹا بڑا، عالم فاضل، امیر غریب، سعودی اجنبی عیادت کے لئے آنے لگا۔ فالج کا حملہ شدید تھا۔ چنانچہ کئی ہفتے تک علاج جاری رہا۔ کچھ افاقہ ہوا تو ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا لیکن چیک اپ کے لئے آنے کا حکم ملا۔ چنانچہ حافظ الیاس صاحب، حافظ طاہر صاحب اور دوسرے احباب نے

رہائش کا اہتمام کر دیا۔ بعد ازاں انڈیا جانے کا پروگرام بنا اور مولانا صاحب چھ ماہ کے لئے انڈیا تشریف لے گئے۔ پھر علاج کے سلسلے میں ریاض تشریف لاتے رہے۔ لیکن تقریباً دو سال تک کام کے لئے وہ طاقت بحال نہ ہو سکی جو مولانا صاحب کا خاصہ تھی۔

میں نے اپنی پچپن سالہ زندگی میں زیادہ تر وقت پڑھنے لکھنے میں ہی گزارا ہے۔ یوں بہت سی علمی ادبی شخصیات سے شرف ملاقات اور کام کرنے کا موقع میسر آیا۔ ان تمام شخصیات میں مولانا کی شخصیت نمایاں نظر آتی ہے۔ آپ بلاشبہ عصر حاضر کے عظیم محقق، سیرت نگار اور تاریخ دان تھے۔ عہدے کے لحاظ سے آپ جمعیت اہل حدیث ہند کے امیر مقرر ہوئے لیکن سادگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے لئے سالن خود گرم کرتے۔ میں کہتا کہ لایئے مولانا صاحب میں سالن گرم کر دوں تو فرماتے کہ نہیں میں اپنا کام خود کرتا ہوں۔ ہمارے اصرار کے باوجود کھانے کے بعد اپنی پلیٹ خود دھوتے اور نہایت سادگی کے ساتھ ہمارے ساتھ ہی دارالسلام کی ایک تھکی ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر دفتر آتے جاتے۔

قوت یادداشت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ میں نے مجمع ملک فہد مدینہ منورہ میں تفسیر معانی القرآن الکریم کی ایڈیٹنگ کے دوران ایک مسئلہ دریافت کیا تو مجھے ایک جملہ لکھوایا اور فرمایا کہ یہ لکھ دو، مطلب پورا ہو جائے گا۔ دوسرے ایڈیٹر نے جملہ بدل دیا اور مطلب کچھ کا کچھ ہو گیا۔ پریشانی کے عالم میں میں پھر مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ ایڈیٹر نے جملہ تبدیل کر کے اپنے مطلب کی بات لکھ دی ہے۔ اور مسئلہ قرآن و سنت سے دور ہوتا نظر آتا ہے۔ مولانا صاحب نے وہی جملہ پھر مجھے لکھوا دیا جو کئی دن پہلے لکھوایا تھا۔ چنانچہ میں نے پھر وہی جملہ اس طرح لکھ دیا کہ پہلے ایڈیٹر کو پتہ بھی نہ چلا اور یوں میں ایک حق بات لکھنے میں کامیاب ہو گیا۔

مولانا صفی الرحمٰن کو سیرت اور اسلامی تاریخ پر اس قدر عبور تھا کہ تاریخی واقعات یوں بیان کرتے جیسے ابھی ابھی پڑھ کر آ رہے ہیں یا کتاب دیکھ کر پڑھ رہے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ کسی شخص کا سوال سنانا اور پھر سوال کے مطابق اس کا جواب دینا ایک فن ہے۔ اکثر عالم دین پورا سوال سنے بغیر جواب دینا شروع کر دیتے ہیں اور یوں سائل کا مسئلہ الجھ کر رہ جاتا

ہے۔ سائل عالم کی علمی شخصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے خاموش اور مطمئن ہو جاتا ہے حالانکہ اس کا سوال نہ تو سنا گیا ہوتا ہے اور نہ ہی اس کا جواب دیا گیا ہوتا ہے۔ مولانا صاحب کا کمال یہ تھا کہ آپ نہایت تحمل سے سوال سنتے اور پھر صرف اس مسئلے کا نہایت مدلل جواب دیتے۔ لگی لپٹی بات کہنا مولانا نہیں جانتے تھے، اس لئے آپ صرف اپنی بات کہہ دیتے خواہ سننے والا کچھ بھی موقف رکھتا ہو۔

ایک مدت تک ملک فہد ہسپتال سے علاج کراتے رہے، لیکن میرے خیال میں پہلے والا حافظہ، قوت گویائی اور لکھنے کی وہ قوت واپس نہ آ سکی۔ پھر بھی دارالسلام میں گاہے گاہے اپنی سیٹ پر بیٹھے نظر آ جاتے تو دلی سکون میسر آتا اور خوشی ہوتی کہ ہمارے درمیان ایسی عظیم علمی شخصیت موجود ہے۔ بعد ازاں میرا تبادلہ کراچی پاکستان میں کر دیا گیا۔ وہیں مولانا کی وفات کی خبر سنی۔

جب میں کراچی میں مستقل طور پر مکتبہ دارالسلام کے فرعی شعبہ میں منتقل ہو گیا تو پھر مولانا سے میرا رابطہ ختم ہو گیا۔ مگر مولانا کی حسین رفاقت کبھی بھلا نہ سکا۔ خاص کر اس وقت مولانا کی یاد تازہ ہو جاتی جب کراچی برانچ میں مولانا کی مایہ ناز کتاب 'الرحیق المختوم' کا کوئی خریدار آتا۔ مجھے آج ریاض سے کراچی ٹرانسفر ہوئے تقریباً دو سال کا عرصہ ہوا۔ اس درمیان مجھے مولانا کی کتاب کی اہمیت کا اندازہ کچھ زیادہ ہی ہوا؛ گرچہ اس کی مقبولیت کا اندازہ پہلے بھی تھا۔ کراچی میں خریدارانِ کتب جب ہمارے پاس آتے ہیں تو ان میں سیرتِ نبوی کے خریداران میں سے کم وبیش 90 فیصد 'الرحیق المختوم' کا مطالبہ کرتے ہیں۔ دکاندار کو ایسے لگتا ہے جیسے ان شائقینِ سیرتِ رسول ﷺ کو 'الرحیق المختوم' کا ہی نام معلوم ہے، اس کے سوا سیرت کی کوئی کتاب انھیں معلوم ہی نہیں ہے!!

مولانا صاحب سے متعلق بہت سی باتیں ہیں جنھیں صفحۂ قرطاس پر لانے کے لیے کافی اوراق درکار ہیں۔ میں نے تو یہاں اپنی معلومات کا صرف ایک ہی عکس بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا صاحب کو غریق رحمت کرے۔ ان کے درجات بلند کرے، ان کے حسنات کو قبول ومنظور فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ جگہ نصیب فرمائے۔ آمین یارب العالمین

آہ! والد محترم رحمۃ اللہ علیہ

(از: عامر صفی الرحمٰن مبارکپوری)

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی اشرف الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین وبعد:

یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے جب قصبہ مبارک پور کے ایک گاؤں حسین آباد کے ایک علمی گھرانے میں ایک نومولود کی پیدائش ہوئی، اس وقت یہاں کے حالات اتنے خراب تھے کہ لوگ فاقہ کشی پر مجبور تھے، کھانے کے لئے کچھ بھی نہ تھا اسی زمانے میں اللہ تعالیٰ کا بہت کرم ہوا کہ اس نے زمین میں ککڑی کی پیداوار میں فراوانی کردی اور ککڑی اتنی ہوئی کہ لوگ دوماہ تک مسلسل اسی کو کھاتے رہے، چنانچہ اس نومولود کی والدہ بھی اسی ککڑی پر گزارہ کرنے پر مجبور ہوئیں نومولود کا عقیقہ ہوا اور ان کا نام صفی الرحمٰن رکھا گیا۔ چونکہ علمی گھرانے سے تعلق ہونے کی وجہ سے سب سے پہلے آپ کو ناظرہ قرآن مجید پڑھایا گیا جو کہ آپ کے چچا حافظ محمد یونس صاحب مرحوم، اللہ آپ کی قبر کو نور سے بھر دے، نے دی۔ اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ جاری رہا اور آپ نے تمام امتحانات میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوتے رہے۔

آپ کو لکھنے کا اتنا شوق تھا کہ آپ اپنے گھر میں بڑے بڑے گھڑے کے پیچھے چھپ کر اسی گھڑے پر لکھتے تھے اور آپ کی والدہ آپ کو ڈھونڈتی تھیں اور دوسرے بچوں سے کہتیں کہ آپ کو تلاش کریں جب آپ نہ ملتے تو آپ کی والدہ کہتیں کہ پتہ نہیں کہاں چلے گئے تب آپ گھڑے کے پیچھے سے کہتے کہ میں یہاں ہوں۔

آپ نے جن مدارس میں تعلیم حاصل کی ان میں مدرسہ عربیہ دارالتعلیم، مدرسہ عربیہ احیاء العلوم، اور جامعہ فیض عام مئو شامل ہیں۔ آپ ۱۹۶۱ء میں فراغت کے بعد درس وتدریس میں مشغول ہوگئے۔ سب سے پہلے آپ نے مئو آئمہ، الہ آباد، پھر ناگپور میں تدریسی خدمات انجام

دیں پھر مئو اعظم گڑھ کے مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے، پھر سیونی اور مبارک پور میں کچھ سالوں تک پڑھانے کے بعد جامعہ سلفیہ بنارس منتقل ہو گئے۔

یہاں آپ نے چودہ سال تک مختلف تالیفی، تصنیفی اور تدریسی خدمات انجام دیں، یہیں آپ نے اپنی مشہور کتاب ''الرحیق المختوم'' تالیف کی جو پوری دنیا میں سیرت نبوی ﷺ پر اول مقام حاصل کی۔ بنارس میں قیام کے دوران آپ نے علماء بریلویہ سے مناظرہ کیا مخالفین کی ہلڑ بازی اور ماحول کو خراب کرنے کے باوجود ڈی ،ایم اور نگران کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس مناظرہ میں فتح یابی سے ہمکنار کرائی، جس کی روداد آپ نے اپنی کتاب ''رزم حق و باطل'' میں سمو دیا ہے۔

اسی اثنا میں آپ کو مرکزی دارالعلوم جامعہ سلفیہ کا نقیب ماہنامہ ''محدث'' کا اول روز ۱۹۸۲ء سے اڈیٹر بنایا گیا۔ آپ نے اس میں مختلف دینی، علمی، سیاسی مضامین تحریر کئے۔ اور مدینہ طیبہ جانے تک اس کی ادارت فرمائی۔

آپ کو ۱۹۸۲ء میں لاس اینجلس، کیلی فورنیا امریکہ میں رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے آپ نے سیرت کانفرنس میں نمائندگی کی۔

بنارس میں قیام کے دوران آپ کو حج کمیٹی کا ممبر بھی بنایا گیا اور حج کمیٹی کی قرعہ اندازی بھی کرائی گئی۔

اسی اثنا میں آپ کو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے مرکز خدمۃ السنۃ والسیرۃ النبویۃ کے چیرمین اور ہمارے استاذ محترم جناب شیخ عمر فلاتہ صاحب، اللہ تعالیٰ انہیں اعلی علیین میں جگہ دے، کے پیہم اصرار پر آپ نے ۱۹۸۸ء میں مدینہ طیبہ منتقل ہو گئے۔

آپ نے مدینہ منورہ کے مرکز خدمۃ السنۃ والسیرۃ النبویۃ میں دس سال کا عرصہ گزارا۔ اس دوران آپ نے سیرت پر ایک جامع انسائیکلوپیڈیا تیار کیا اور بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن کے نام یہ ہیں:

روضة الأنوار في سيرة النبي المختار ، البشارة بمحمد ﷺ في كتب

الھندوس ، البشارة بمحمد ﷺ عند البوذیین ، البشارة بمحمد ﷺ عند الفرس .

آپ صحیح مسلم کی شرح لکھ رہے تھے کہ اسی دوران آپ پر پہلی مرتبہ فالج کا حملہ ہوا، ہوا یوں کہ آپ رات دیر تک لکھنے میں مشغول رہتے تھے ایک روز اسی طرح دیر تک لکھتے رہے اور سونے سے پہلے آپ نے کافی ٹھنڈا پانی پیا اور آ کر سو گئے صبح میں آپ نے محسوس کیا کہ پاؤں اپنی جگہ نہیں پڑ رہا ہے تو سمجھے کہ ہوسکتا ہے کہ رات میں دب گیا ہے کچھ چلنے کے بعد ٹھیک ہو جائے گا لیکن دھیرے دھیرے وہ بڑھتا ہی گیا تو بھائی طارق کو لے کر جامعہ اسلامیہ کے ہاسپٹل گئے وہاں سے اس نے کنگ فہد ہسپتال میں ریفر کر دیا، یہ سب کچھ ایک ایسے وقت میں ہوا کہ ابھی تمام گھر والوں کو مدینہ میں آئے ہوئے مشکل سے دو مہینے ہوئے تھے، خیر اللہ تعالیٰ نے بہت جلد ہی آپ کو شفائے کامل عطا کر دیا اور لگتا ہی نہیں تھا کہ آپ پر کبھی فالج کا حملہ ہوا تھا۔

اس دوران آپ نے دعوت وتبلیغ میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی، مغرب سے عشاء کے درمیان کا وقت جامعہ اسلامیہ کے بچوں اور عام ملاقاتیوں کے لئے مسجد نبوی کے باب رحمت کے پاس گزارا کرتے تھے اور اس کے بعد اگر گھر آ گئے تو لکھنے میں مشغول ہو جاتے اور نہیں تو کسی نے پروگرام رکھ دیا تو اس کے یہاں اور جمعرات جمعہ تو جیسے فکس ہو گیا تھا، شروع کے کئی سال تک مسلسل آپ نے قبلتین کے بن لادن کیمپ میں تقریریں کیں اس کے بعد جناب ریاض صاحب حیدر آبادی اور اسی طرح جناب یوسف صاحب اور کئی لوگوں کے مکان پر مسلسل اور ہر ہفتہ ہی کوئی نہ کوئی دینی پروگرام ضرور ہوا کرتا تھا، اسی دوران آپ نے سعودی عربیہ کی کوئی ایسی جالیات نہ چھوڑی ہو گی جس میں آپ نے تقریر نہ کی ہو، بہت سے پروگرام میں ہم لوگوں کو بھی ساتھ لے کر جاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر بہت سے لوگوں کو اسلام میں داخل کیا اور بہت سے لوگوں کو صحیح دین کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا موقع دیا۔

مدینہ میں قیام کے دوران آپ کو بہت مرتبہ ریڈیو پر تقریر کرنے کا موقع بھی ملا۔ آپ نے کئی

مرتبہ ریڈیو پر تقریریں کیں، آپ کے معتقدین کی ایک لمبی فہرست تھی جس میں عالم، جاہل، امیر وغریب، امراء وسفراء سب شامل ہیں، امیر ممدوح بن عبدالعزیز آل سعود وزیر الاستراتیجیۃ اور امیر منصور بن عبدالعزیز آل سعود آپ کے خاص معتقدین میں سے تھے اور اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا تناول فرماتے تھے۔

اسی اثنا میں آپ کا جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے اگریمنٹ ختم ہوگیا آپ نے سوچا کہ چل کر ہندستان میں قیام کریں گے اور ساری تیاری بھی مکمل کر لی لیکن ہم لوگوں کا ثانویہ ابھی مکمل نہ ہوا تھا اس لئے وقتی طور پر کہیں شفٹ ہونا ہی بہتر سمجھے آپ کو دارالسلام ریاض کی طرف سے اپنے ادارہ میں خدمت انجام دینے کی دعوت ملی آپ نے اسے قبول فرمایا اور ریاض شفٹ ہوگئے جہاں آپ نے کئی کتابیں تصنیف کیں اور بہت سی کتابوں پر نظر ثانی کی جن میں المصباح المنیر فی تھذیب تفسیر ابن کثیر اور ریاض الصالحین پر تعلیق، تاریخ مکہ تاریخ مدینہ پر نظر ثانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ریاض میں قیام کے دوران مدینہ منورہ سے دلی لگاؤ ہونے کی وجہ سے آپ زیادہ تر قیام مدینہ منورہ میں فرماتے تھے اسی دوران آپ سے مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کی امارت کے لئے اصرار کیا گیا اور آپ کو ۱۹؍جولائی ۱۹۹۸ء کو مرکزی جمعیت کا امیر منتخب کیا گیا۔ آپ نے امارت سنبھالنے کے بعد سب سے پہلا کام جمعیت کا اپنا سائبان ہونے کی غرض سے آپ نے جمعیت اہل حدیث اوکھلا کا کویت کے ہندستان میں سفیر کے ہاتھوں سنگ بنیاد رکھ کر پونے چار کروڑ کے نا تسخیر بجٹ کی منظوری دی۔ اور سب سے پہلا کام اللہ تعالیٰ کا گھر یعنی مسجد کی تعمیر شروع کر دی گئی، اسی دوران آپ نے ہندستان کے مختلف دینی ودعوتی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی غرض سے سب سے پہلے جامعہ سلفیہ (مرکزی دارلعلوم) بنارس، مئو، ممبئی، حیدرآباد بلکہ ہندوستان کے مختلف جگہوں کا تقریباً دو ماہ تک مسلسل دورہ کیا۔ لیکن بہت جلد آپ کو یہ احساس ہونے لگا کہ یہ ایک غیر معقول فریضہ ہے۔ بالآخر آپ نے ۳؍اگست ۲۰۰۰ء کو اپنا استعفیٰ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے دفتر میں سپرد کر دیا۔

آپ کو سعودی عرب کے سوسالہ جشن میں شاہی خاندان کی طرف سے شرکت کی دعوت دی گئی

آپ کو اس میں سونے کے سکے اور بہت سے تحائف سے نوازا گیا اور عمرہ وزیارت کی غرض سے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ اور مختلف تاریخی مقامات کی سیر کرائی گئی۔

آپ کو امریکہ والوں کی طرف سے ایک پروگرام میں تقریبا دو ماہ کے لئے مدعو کیا گیا، آپ اس کے لئے مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر ریاض پہنچے اور سوچا کہ دو روز قیام کر کے امریکہ چلا جاؤں گا لیکن تقدیر میں کچھ اور ہی تھا آپ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کچھ میٹھا کھا رہے تھے کہ آپ پر فالج کا حملہ ہوا آپ اپنے پاؤں پر آ رہے تھے لیکن چلا نہیں گیا تو آپ کے ساتھ آپ کے لوگوں نے آپ کو آپ کے کمرے میں لا کر سلا دیا۔ وہ لوگ مسلسل کہہ رہے تھے کہ ہسپتال لے چلیں۔ لیکن آپ نے کہا: نہیں میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ خیر آپ کمرے میں لیٹے رہے لیکن مرض بڑھتا ہی گیا عصر کے بعد آپ کو عبید ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ وہاں آپ کا دس روز تک علاج چلتا رہا۔ پھر آپ کو وزارۃ الشؤون الاسلامیۃ والاوقاف والدعوۃ والارشاد کے وزیر شیخ صالح بن عبدالعزیز آل الشیخ حفظہ اللہ کے فرمان پر آپ کو کنگ خالد ہسپتال ریاض میں منتقل کیا گیا۔ وہاں تقریبا دس روز تک زیر علاج رہ کر مدینہ منورہ تشریف لائے آپ برابر علاج ومعالجہ کراتے رہے لیکن مکمل صحتیاب نہ ہوئے۔ اس کے باوجود آپ ہمیشہ علمی ودعوتی کام میں مشغول رہے فالج کی وجہ سے آپ کی آواز بھی متاثر ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود آپ نے کئی کانفرنسوں میں شرکت کی جس میں کویت کی کانفرنس قابل ذکر ہے اس علاوہ بھی بہت سے پروگرام میں شرکت کی۔

کمزوری اور بیماری کی وجہ سے اکثر مدینہ منورہ اور مبارکپور میں قیام کرتے۔ آپ تقریباً چھ ماہ سے مبارکپور ہی میں تھے اور ۹ رجون کو مدینہ منورہ جانے والے تھے کہ اچانک ۴ رجون کی صبح تقریباً آٹھ بجے آپ کے اوپر برین ہمبرج کا حملہ ہو گیا اس وقت میں گھر سے باہر بھائی یاسر صاحب کو لانے کے لئے جا رہا تھا کہ موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ دیکھا تو گھر سے فون تھا آواز آئی: والد صاحب گر گئے ہیں جلدی آئیں۔ یہ سننا تھا کہ میں نے اپنی گاڑی وہیں سے موڑ دی اور چند منٹ میں گھر پہنچا۔ والد صاحب کو کمرے لا کر لٹا دیا اس وقت آپ کچھ بول نہیں رہے تھے لیکن کچھ دیر کے بعد

بولنا شروع کیا۔ پوچھا کہ ڈاکٹر کو بلا دیں تو بولے: نہیں۔ لیکن اطمینان نہ ہوا۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا تو اس نے فالج کا دوبارہ اٹیک کا اشارہ دیا اور بولا: ابھی مئو لے جائیں، مئو میں احباب جماعت کو فون کیا اور حلیمہ ہاسپٹل میں چیک اپ کرایا اور پھر ڈاکٹر اور احباب جماعت کے مشورے سے اسی وقت بنارس لے گئے جہاں پر آپ کو راما میڈیکل میں ایڈمٹ کر دیا گیا، ۲۲ روز تک مسلسل علاج کے بعد آپ کو ڈسچارج کر دیا گیا اس دوران آپ کی آواز بہت ہی معمولی سی آتی تھی کہتے تھے لیکن سنائی نہیں دیتا تھا چونکہ اس مرتبہ فالج کا حملہ اتنا شدید تھا کہ آپ صاحبِ فراش رہے۔ صرف اشارہ وغیرہ کرتے تھے۔ اس دوران آپ کو ہفتہ دو ہفتہ پر مسلسل بنارس لے کر جاتے رہے لیکن کوئی خاص فائدہ معلوم ہوتا نظر نہ آتا؛ بلکہ آپ کی صحت مسلسل گرتی ہی گئی لیکن ادھر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ادھر میری پڑھائی بھی متاثر ہو رہی تھی۔ اس کے پیش نظر میں ایک ہفتہ کے لئے دہلی آیا لیکن دوسرے ہی روز والدہ صاحبہ کا فون آیا کہ جتنی جلد ممکن ہو واپس آجاؤ ہچکی آرہی ہے بند ہی نہیں ہو رہی ہے۔ چنانچہ میں نے پہلی فرصت میں ٹکٹ لیا اور گھر پہنچ گیا۔

صحت کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے میں نے ۱ر دسمبر بروز جمعہ کو پروگرام بنایا کہ بنارس جا کر دوا لے آؤں۔ لیکن والدہ صاحبہ نے کہا نہیں۔ تمہیں والد صاحب کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا ہے۔ خیر ماموں کے صاحبزادے جناب صادق صاحب کو بھیج دیا، جمعہ کی نماز پڑھ کر آیا۔ کچھ مہمان والد صاحب کو دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ وہ لوگ دیکھ کر گئے اور اس کے تھوڑی ہی دیر کے بعد والدہ نے کہا کہ عامر ادھر آؤ۔ دیکھتے ہی سب کچھ سمجھ میں آگیا۔ جلدی سے زمزم کا پانی پلایا اور کلمہ پڑھتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے چند سکنڈ میں اس دنیا سے اس عظیم ہستی کی روح پرواز کر گئی۔ إنا لله وإنا إليه راجعون، اللهم اغفرله وارحمه وارفع درجته، واجعله من الصديقين والشهداء والصالحين۔ آنکھیں بند کیں۔ ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ اسی دوران اللہ کے رسول ﷺ کی وہ حدیث یاد آگئی: "إِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ" (مسلم:928)

صبر کے علاوہ کوئی چارہ ہی کیا تھا، پھر فون اور میسیج کا سلسلہ شروع ہو گیا، سب سے پہلا میسیج

موصل، عراق سے ابو ہاشم صاحب کا آیا۔ سوچ کر دنگ رہ گیا کہ یہ لوگ تو خود ہی مصیبت میں ہیں لیکن ایک عالم کا اس دنیا سے جانا ہی سب سے بڑی مصیبت ہے۔

بھائی حافظ یاسر مدنی جو کہ اس وقت ممبئی میں تھے مسلسل والد صاحب کی خیریت معلوم کرتے رہتے تھے جب ان کو بتایا تو انھوں نے کہا کہ میں آجاؤں اس کے بعد ہی تدفین کی جائے، ان کے انتظار میں دوسرے دن بروز سنیچر ۲ ردسمبر بعد نماز عصر کا وقت رکھا گیا اور بھائی حافظ یاسر مدنی نے ہی آپ کی خواہش کے مطابق آپ کی نماز جنازہ پڑھائی، پھر آپ کو حسین آباد کی آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا آپ کی نماز جنازہ میں بہت کثیر تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور آپ کے درجات بلند فرمائے اور آپ کی بیماری کو درجات کی بلندی کا ذریعہ بنائے اور آپ کی کتابوں کو مسلمانوں کے لئے راہ ہدایت بنائے۔ آمین۔

پسماندگان میں آپ نے والدہ محترمہ بدر النساء، چار لڑکے ڈاکٹر فیض الرحمٰن (علیگ) مقیم جدہ، حافظ یاسر مدنی مدرس جامعہ اسلامیہ ممبرہ، ممبئی، مولانا طارق مدنی متعلم ماجستیر (ایم، اے) جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ، راقم عامر متعلم ایم، اے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، چار لڑکیاں، رمیثہ، عاتکہ، رشیدہ زیر تعلیم جامعہ ام القریٰ، عطیہ زیر تعلیم کلیۃ البنات ریاض، ایک پوتا مساعد، اور پانچ پوتیاں فرحت یاسمین، رفیعہ زینب، دردانہ، اروی اور نوال چھوڑے ہیں۔

آپ کی تین اولادیں بچپن میں ہی فوت ہوگئیں جن کے نام یہ ہیں: محمود، نجیب، نجمہ۔

اللہ تعالیٰ آپ کے تمام اعمال کو قبول فرمائیں اور اس کے بدلے اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔

آمین یارب العالمین. سبحان ربک رب العزة عما یصفون وسلام علی المرسلین والحمد لله رب العالمین

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے!

(از: مولانا جنید مکی، بنارس)

یکم دسمبر بروز جمعہ ۲۰۰۶ء بعد نمازِ عصر یہ جانکاہ خبر مولانا عبدالقیوم مکی سے بذریعہ فون ملی کہ مناظر اسلام حضرت العلام مولانا صفی الرحمٰن صاحب مبارکپوری اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ (إنا لله وإنا إليه راجعون)

میں نے فوراً علامہ مبارکپوری کے گھر فون کر کے اس خبر کی تصدیق کی اور ان کے گھر والوں کو اور مولانا کے سب سے چھوٹے صاحبزادے شیخ عامر کی تعزیت کی۔ اس کے بعد جمعیت کے ذمہ داران و متعلقین کو اس روح فرسا خبر سے آگاہ اور بعد نماز مغرب تعزیتی نشست کا اعلان کیا۔

نماز مغرب کے بعد میں نے علامہ مبارکپوری کی زندگی اور ان کی علمی ودعوتی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور ان کی تعلیمی وتبلیغی اور عملی زندگی کا خاکہ پیش کیا۔

۱۹۷۴ء میں جب مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ جامعہ سلفیہ بنارس آئے تو مجھے علامہ مبارکپوری سے تاریخ التشریع الاسلامی اور صحیح بخاری وغیرہ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اچھی طرح یاد ہے کہ آپ کے درس میں کبھی اکتاہٹ نہیں محسوس ہوئی۔ آپ کا درس صرف کتابی نہیں؛ بلکہ موضوع سے متعلق معلومات کا خزینہ ہوتا تھا۔ ایسے ایسے نکات بیان کرتے کہ ذہن ودماغ کے گوشے روشن ہو جاتے۔ جی چاہتا کہ درس کا سلسلہ دراز ہو جائے اور دل ودماغ کے دریچے کھلتے رہیں۔

جامعہ سلفیہ میں قیام کے دوران مارچ ۱۹۷۶ء کی بات ہے کہ کراچی میں عالم اسلام کی پہلی سیرت کانفرنس ہوئی جس کے اختتام پر رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے ساری دنیا کے قلم کاروں کو دعوت دی کہ وہ سیرت نبوی کے موضوع پر دنیا کی کسی بھی زندہ زبان میں مقالہ لکھیں۔ احباب، اساتذہ اور طلبہ کے پیہم اصرار پر آپ نے اس مسابقہ میں حصہ لیا۔ اس عالمی مقابلہ میں ایک ہزار

ایک سو بیاسی مقالے موصول ہوئے۔ جن کے مختلف پہلوؤں سے جائزہ لینے کے بعد آپ کی کتاب 'الرحیق المختوم' کو پہلا مقام دیا گیا۔ اور ساتھ میں پچاس ہزار ریال انعام کا مژدہ بھی سنایا گیا۔ اور مکہ مکرمہ کے نائب گورنر امیر سعود بن عبدالمحسن رحفظہ اللہ کے ہاتھوں آپ کو انعام سے نوازا گیا۔ آپ کی اس کتاب 'الرحیق المختوم' کو پوری دنیا میں اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کتاب کا تقریباً ستائیس زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور کتنی عربی اور اسلامی یونیورسٹی میں اس کتاب کو بحیثیت مطالعہ و درس مقرر کیا گیا ہے۔ سیرت نبوی سے شغف رکھنے والا کوئی بھی طالب علم یا باحث اس کتاب سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

اسی زمانے میں ہمارے محلّہ بجرڈیہہ میں جماعت اہلحدیث اور بریلوی مسلک کے درمیان وسیلہ مرجبہ کے موضوع پر مناظرہ چھڑ گیا۔ چونکہ علامہ مبارکپوری درس و تدریس، تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ میدانِ مناظرہ کے بھی شہسوار تھے۔ جہاں آپ نے اسلام کے خلاف اٹھنے والے باطل اعتراضات کا دندان شکن جواب قلم سے دیا، وہیں اپنی زبان کو بھی استعمال کیا۔ اس لیے وقت کے اکابر علماء کی نگاہِ انتخاب اس مناظرہ کے لیے آپ پر پڑی اور ۲۳ تا ۲۶ راکتوبر ۱۹۷۸ء چار دن مسلسل مناظرہ کے بعد دلائل و براہین کے ذریعہ آپ کی مضبوط گرفت کی وجہ سے مقابل کو منہ کی کھانی پڑی اور اسے مجبوراً حق کا اعتراف کرنا پڑا۔ یہ مناظرہ بہت مشہور ہے۔ جس کی روداد ''رزم حق و باطل'' کے نام سے کتابی شکل میں اسی وقت شائع کر دی گئی تھی۔ اور پھر اس کتاب کو فہیم بک ڈپو مئو نے کمپوز کرا کر شائع کیا ہے۔ جس کے پڑھنے سے صاحب الرحیق المختوم کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ علامہ مبارکپوری کے بیان کردہ دلائل کی حقانیت کو دیکھتے ہوئے ۴۹ آدمیوں نے اسی وقت کھل کر مذہب اہلحدیث قبول کر لیا۔ جس کی تفصیل ۵رنومبر ۱۹۷۸ء کے روزنامہ قومی مورچہ بنارس اور ۶رنومبر ۱۹۷۸ء کے ہفتہ وار تنویرنو بنارس میں دیکھی جا سکتی ہے۔

جامعہ سلفیہ ہی کے قیام کے دوران آپ نے جامعہ سے ۱۹۸۲ء میں ماہنامہ محدث شائع کیا اور ۱۹۸۸ء تک آپ اس کے ایڈیٹر رہے۔ آپ کے دورِ ادارت میں شائع شدہ محدث کا اداریہ

پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بالخصوص عالم اسلام کی تصویر کشی اور حالات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ اور متوازن تبصرہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ قیام بنارس کے دوران آپ نے پہلی بین الاقوامی سیرت کانفرنس امریکہ میں رابطہ عالم اسلامی کی نمائندگی کی۔ آپ دینی تعلیمی کونسل لکھنؤ کے رکن بھی رہے۔ اور مشرقی جمعیت اہلحدیث یوپی کے امیر بھی بنائے گئے۔

۱۴۰۹ھ میں اسلامک یونیورسٹی مدینہ منورہ کی دعوت پر آپ دیار رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں مرکز خدمۃ السنۃ النبویۃ سے جڑ گئے اور ۱۴۱۸ھ تک سیرت انسائیکلوپیڈیا کی تیاری میں شامل رہے۔ اس کے بعد مکتبہ دارالسلام ریاض کے مدیر عبدالمالک مجاہد صاحب کے پیہم اصرار پر ان کے ادارہ کی علمی سرپرستی اور وہاں سے شائع ہونے والی کتابوں کی نگرانی اور ان پر نظر ثانی فرماتے رہے اور یہ سلسلہ اخیر عمر تک چلتا رہا۔ آپ نے اس سلسلے میں ریاض کا آخری سفر ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ میں کیا۔ آپ جب ریاض پہنچے تو میں بھی اس وقت ریاض میں آپ کے چھوٹے داماد شیخ انعام الحق کے گھر مہمان تھا۔ آپ کے بڑے بیٹے اور ہمارے ہم سبق ڈاکٹر فیض الرحمن صاحب ایئرپورٹ سے آپ کو لے کر سیدھے وہیں پہنچے۔ ریاض کی وہ رات ہم لوگوں نے ساتھ ہی ایک کمرہ میں گزاری اور کئی اہم امور پر تبادلۂ خیال ہوا۔ دوسرے دن آپ اپنی قیام گاہ مکتبہ دارالسلام چلے گئے۔ میں ریاض کے دوران قیام میں اکثر آپ کی زیارت کے لیے جاتا تھا۔ ایک رات باتوں ہی باتوں میں مولانا نے ڈاکٹر فیض الرحمن صاحب کو میرے لیے سند اجازہ تیار کرنے کا حکم بھی دے دیا۔ اسی موقع پر ریاض ہی میں آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہونے لگی مجبوراً دو ہی ہفتہ کے بعد آپ کو ہندستان واپس آنا پڑا۔ آپ کے ساتھ آپ کے صاحبزادے ڈاکٹر فیض الرحمن بھی بحیثیت مرافق واپس ہوئے۔ پھر آپ مستقل طور پر صاحبِ فراش ہو گئے۔

مملکت سعودی عرب کے قیام کے دوران مولانا مختار احمد ندوی کے عہدۂ امارت سے مستعفی ہونے کے بعد ذمہ دارانِ مرکزی جمعیت کی طرف سے آپ سے بار بار اصرار کیا جاتا رہا کہ مرکزی جمعیت کی امارت کی ذمہ داری سنبھال لیں۔ پیہم اصرار کے نتیجے میں ۱۹۹۸ء میں آپ ایک مرتبہ مکہ

مکرمہ آئے اور مجھ سے کہا کہ میں ایک اہم موضوع پر تبادلۂ خیال کے لیے آیا ہوں۔ آج کی رات تمہارے ساتھ بیٹھ کر غور وخوض کریں گے۔ موضوع کی نزاکت کے پیش نظر میں نے کہا کہ آج کی رات برادرم شیخ محمد عزیر شمس کے یہاں گزاریں گے اور اس تبادلۂ خیال میں انہیں بھی شریک کر لیں۔

وہ ایک تاریخی رات تھی جس میں استاذ محترم علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری برادران محمد عزیر شمس، ڈاکٹر لیث محمد اور احقر موجود تھا۔ اور مسئلہ مرکزی جمعیت کی امارت کی پیش کش قبول کرنے اور نہ کرنے کا تھا۔ ہم لوگوں کے ذہن میں جو اندیشے تھے بیان کئے گئے۔ استاذ محترم پس وپیش میں تھے۔ آپ کی بے نفسی اور خوددار طبیعت ان سب جھمیلوں میں پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن جماعتی قیادت کے فقدان اور احباب واعوان کے مسلسل اصرار کے نتیجے میں کچھ شرائط طے کی گئیں کہ اگر یہ شرائط پوری ہوتی ہیں تو آپ اس منصب کو قبول کر لیجئے۔

غرض علامہ مبارکپوری نے اہل علم کے اصرار پر اس منصب امارت کو قبول کیا۔ اور آپ کے آتے ہی جماعتی سرگرمیاں جو تعطل کا شکار تھیں، ان میں بہت حد تک حرکت و بیداری پیدا ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند کے امیر ہونے کے بعد آپ نے جماعتی رفقاء کے ساتھ بنارس کا سب سے پہلے دورہ کیا تھا تو آپ کے ساتھ نائب امیر مولانا عبدالسلام رحمانی و ناظم اعلیٰ مولانا عبدالوہاب خلجی صاحبان موجود تھے۔ آپ کے اعزاز میں جمعیت الشبان المسلمین بنارس نے ۶/اگست ۱۹۹۸ء کو ایک عظیم الشان اجلاس کیا۔ پروگرام میں ڈاکٹر جاوید اعظم اور مشرقی جمعیت اہل حدیث یوپی کے ناظم اعلیٰ مولانا انور بستوی بھی موجود تھے۔ اس موقع پر علامہ مبارکپوری نے افرادِ جماعت کی اصلاح وتربیت کا جو خاکہ پیش کیا تھا کاش ذمہ داران جمعیت و جماعت اس پر کاربند ہوتے تو آج بہت حد تک اخلاقی واعتقادی سدھار ہو گیا ہوتا۔ علامہ مبارکپوری بعض وجوہ کی بنا پر اگست ۲۰۰۰ء میں مرکزی جمعیت کی امارت سے مستعفی ہو گئے۔

مملکت سعودی عرب کے قیام کے دوران بھی سعودی عرب کے دعوت سنٹر (شعبۂ جالیات) کی دعوت پر مملکت کے مختلف شہروں میں دعوتی وتبلیغی پروگراموں میں شرکت کرتے رہے۔ اور بے شمار

افراد نے آپ کی تقریروں وکیسٹوں کو سن کر شرک و بدعت سے توبہ کر کے صراط مستقیم کو اپنایا۔ کتنے عرب اہلِ علم آپ کی ملاقات ودیدار کے متمنی رہا کرتے تھے۔ میں نے حرم شریف میں باب بلال پر بارہا دیکھا کہ ہندستانیوں کے علاوہ غیر ملکیوں کو بھی معلوم ہو جاتا کہ علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری صاحب ''الرحیق المختوم'' تشریف فرما ہیں تو عقیدت مندوں کا ہجوم ہو جاتا اور اختلافی مسائل میں آپ کی رائے کو بطور فیصل تسلیم کرتے تھے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ مولانا صاحب مکہ مکرمہ میں میرے مہمان بنے۔ میری قیام گاہ مکہ کے معروف علاقہ عزیزیہ میں تھی۔ ام القری یونیورسٹی میں موجود مختلف ممالک کے اہل علم کو صاحب الرحیق المختوم کی آمد کی خبر ہوگئی تو شوقِ ملاقات میں ملنے والوں کا تانتا لگ گیا۔

علامہ مبارکپوری ایک باصلاحیت معلم ومبلغ ہونے کے ساتھ ایک منجھے ہوئے صاحب قلم بھی تھے۔ اسی لئے تدریسی وتبلیغی خدمات کی انجام دہی کے ساتھ ہمیشہ تصنیفی وتالیفی سلسلہ بھی جاری رکھا۔ عربی واردو تصنیفات وتعلیقات کی تعداد درجنوں سے زائد ہیں۔

مستقل تصنیفات کے علاوہ آپ کے بہت سارے وقیع اور علمی مقالات مختلف مجلّات میں شائع ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی قلمی نسخے غیر مطبوع آپ کے ذخیرۂ قرطاس میں موجود ہیں۔

مرحوم نے اپنے بعد ایک علمی خانوادہ چھوڑا ہے آپ کے پسماندگان میں اہلیہ محترمہ، چار لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں اور ماشاء اللہ سبھی لڑکے عالم دین اور لڑکیاں عالمہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو علامہ کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین۔

''اللهم اغفر للعلامة صفي الرحمٰن المباركفوري واغفرله وارحمه وعافه واعف عنه وأكرم نزله وأدخله في الفردوس الأعلىٰ مع الأنبياء والصالحين يارب العالمين''۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ

(از: عبدالوارث ساجد، پاکستان)

صدمہ تو ہر موت کی خبر پر ہوتا ہے لیکن کچھ خبریں بہت زیادہ صدمے والی ہوتی ہیں۔ انسان دنیا میں مرنے کے لیے ہی آتا ہے، تاہم کچھ انسانوں کی موت قوم وملت اور تحریکوں کے لیے انتہائی نقصان دہ ہوتی ہے۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ عظیم مبلغ، مصنف، شارح، مناظر اور داعی انسان تھے۔ انہوں نے تمام زندگی شجر اسلام کی آبیاری کے لیے وقف کیے رکھی۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ ایسے ہی عظیم انسانوں میں سے تھے جن کی موت ہزاروں انسانوں کو صدمے سے دوچار کر گئی، بلاشبہ ان کی موت سے وارثانِ انبیاء میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔

(یہاں موصوف کا لکھا ہوا میں نے بغرضِ مصلحت حذف کر دیا ہے۔ از مرتب)

6 جنوری 1999ء کی بات ہے، مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ مدینہ میں تھے کہ ان سے ایک آدمی نے فون پر بات کی:

"شیخ صاحب! آپ کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔

وہ گزارش کرتے ہوئے کہنے لگا۔ دونوں کے درمیان مسجد نبوی میں وقت طے ہو گیا۔ مقررہ جگہ پر مولانا پہنچے تو نوجوان (ونسان) مولانا سے لپٹ گیا، انہیں گلے لگایا اور عقیدت واحترام بجالایا۔

الشیخ کہتے ہیں:

میں نے پوچھا: آپ کون؟

وہ جواب دینے کی بجائے بولا:

آپ الشیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری ہیں۔

میں نے کہا: آپ مجھے کیسے پہچانتے ہیں؟ میں جانتا تھا کہ یہ اس نوجوان سے میری پہلی ملاقات

ہے،سوال بھی میں نے اسی لیے کیا تھا۔نوجوان نے جس عقیدت واحترام کا مظاہرہ کیا تھا اس کی یہی محبت مجھے دریافت کرنے پر مجبور کررہی تھی ،میرے سوال پر وہ بولا:

میں سیکڑوں آدمیوں میں سے آپ کو آسانی سے پہچان سکتا ہوں۔

میں نے کہا:''کیا آپ مجھے پہلے سے جانتے ہیں؟''

وہ بولا: آپ سے میری بالمشافہ پہلی ملاقات ہے۔ میں نے کہا: تو پھر آپ کیسے کہہ سکتے تھے آپ مجھے سیکڑوں آدمیوں میں سے پہچان سکتے ہیں۔

وہ بولا: میں آپ کی تصنیفات سے آگاہ ہوں اور میں آپ کو دیکھتے ہی جان گیا کہ ایسا شخص ہی ایسا کام کرسکتا ہے۔وہ لکھتا ہے:

میں نے مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ کو ایک جامع الصفات شخصیت پایا، وہ جمعیت اہلحدیث ہندستان کے امیر تھے، بہت سی کتب کے مصنف تھے اور دعوتی سرگرمیوں میں بھی مگن تھے۔ میں نے ان کی تازہ تصنیف کے متعلق پوچھا تو وہ بولے:

''عنقریب شرح المسلم آرہی ہے، ایسے ہی جیسے پہلے شرح بلوغ المرام منصۂ شہود پر آچکی ہے''۔

میں الشیخ کی کتاب 'الرحیق المختوم' سے متاثر تھا، اسی پر بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی یہ کتاب کتنی تعداد میں شائع ہوچکی ہے؟ وہ عاجزی سے بولے: الرحیق المختوم 18 زبانوں میں ترجمہ ہوکر چھپ چکی ہے۔تبھی مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری نے بتایا کہ ایک روز میں مدینہ میں تھا کہ ایک نوجوان مجھے ملا، وہ بوسنیا سے آیا تھا، اس نے کہا: ہم سرب درندوں سے جہاد میں مصروف تھے، ہم جبل العالی کے علاقے میں تھے کہ سرب فوج سے زبردست معرکہ بپا ہوگیا، جو بدر البوسنتہ کے نام سے مشہور ہے۔اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح عطا کی، ہم نے نہ صرف علاقے پر قبضہ کیا بلکہ ایک سو ساٹھ (160) سرب فوجی قید بھی کر لیے۔اتنی تعداد میں فوجی ہمارے لیے پریشانی بھی تھے، اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ ان کو ذبح کر دیا جائے۔ مجاہدین نے الشیخ صالح

عثیمین سے فتویٰ طلب کیا، ہم نے انھیں ان درندوں کے ظلم وستم بھی بتائے، شیخ نے ان کا ذبح کرنا جائز قرار دے دیا۔ یوں ہم نے ذبح کرنے کا پروگرام بنایا، مقررہ روز جب وہ ذبح کے لیے جانے لگے تو یہ خبر سن کر ایک بوسنوی عورت مجاہدین کے پاس آ گئی، وہ امیر سے کہنے لگی: مجھے خبر ہوئی ہے کہ آپ سرب درندوں کو ذبح کرنے والے ہیں؟ میں ان درندوں کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ اسے سرب قیدیوں کے درمیان لایا گیا تو وہ سرب فوجیوں کو غور سے دیکھنے لگی گویا کسی کی تلاش میں ہو، بالآخر ایک فوج کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ عورت نے حقارت سے اسے دیکھا پھر امیر المجاہدین کو بتانے لگی: یہ درندہ میرے بیٹے کا قاتل ہے، اس ظالم نے میرے بیٹے کو گرفتار کر کے میرے سامنے تشدد کا نشانہ بنایا پھر مجھے کہا کہ میں اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کروں، ایک ماں ایسا کیسے کر سکتی ہے۔ اس نے مجھ پر تشدد کیا اور مجھے مجبور کیا، جب میں کسی طرح بھی اس کام کے لیے تیار نہ ہوئی تو اس ظالم نے میری نظروں کے سامنے میرے بیٹے کا سر تن سے جدا کر دیا، میرے سامنے میرے بیٹے کی لاش تڑپ رہی تھی، اس کا خون زمین کو سرخ کر رہا تھا۔ یہ ظالم اس کا خون اٹھا کر کہنے لگا: اسے پیئو، میں نے انکار کیا تب اس نے مجھ پر تشدد کیا اور مجھے گوہر عصمت سے محروم کر دیا۔ تب اس عورت نے سرب درندے کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا۔

وہ نوجوان بولا انھی دنوں آپ کی کتاب 'الرحیق المختوم' ملی۔ یہ کتاب مجاہدین کے لیے رہنما ثابت ہوئی۔ کتاب میں نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کے جہادی واقعات نے بوسنوی مجاہدین کو یاد دلایا کہ پیارے نبی ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کس طرح جہاد کرتے تھے۔ یہ جہاد کے میدان میں ہمارے لیے استاد ہو گئی۔ گویا 'الرحیق المختوم' بوسنوی مجاہدین کے لیے زادِ راہ بن گئی۔ بوسنوی مجاہدین نے مقامی زبان میں اس کا ترجمہ کیا اور اس کی اشاعت عام کی۔ تب کتاب وہاں اس قدر مقبول ہوئی کہ مدارس میں پڑھائی جانے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ مجاہدین کے قائم کردہ ریڈیو اسٹیشن پر پوری کتاب نشر کی گئی۔

یوں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری کی مجاہدین کے دلوں میں کتنی محبت

تھی۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ نے ہندستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے ان تھک محنت کی، تدریس اور تالیف کے ساتھ ساتھ انہوں نے دعوت کا فریضہ بھی سرانجام دیا۔ انہوں نے مناظرے بھی کیے۔ ان کی انہی دعوتی سرگرمیوں کی بنیاد پر بہت سے لوگ نہ صرف حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ بلکہ بہت سے ایسے مسلمان جو بدعات کے شکار تھے وہ شرک چھوڑ کر عقیدۂ توحید سے سرفراز ہوئے۔ ان کا ایک مناظرہ بہت مشہور ہوا جو 1978ء میں بنارس کے محلہ بجرڈیہہ میں ہوا۔ یہ مناظرہ وسیلہ کے موضوع پر تھا، مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوریؒ کے مقابلے میں عبدالمصطفیٰ نامی ایک عالم تھا۔ دونوں طرف سے بڑے بڑے علماء شریک ہوئے، ہزاروں آدمی جمع تھے۔ مناظرہ شروع ہوا تو مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ نے انہیں ایسے دلائل دیے کہ مخالف مناظر بھری مجلس چھوڑ کر بھاگ گیا، نتیجہ یہ نکلا کہ 9 خاندانوں نے اور 49 آدمیوں نے شرک چھوڑ کر توحید کی دولت کو پالیا۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ انتہائی تواضع اختیار کرنے والے آدمی تھے، نرمی پسند تھے، بچوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے، نہ تکبر کرتے اور نہ اپنی مدح سرائی پسند کرتے، اپنے دشمنوں سے بھی شفقت اور نرمی سے پیش آتے۔ ۱۴۲۰ھ کے آغاز کی بات ہے وہ لیکچر دے رہے تھے، ان کے سامنے سیکڑوں سامعین بیٹھے تھے کہ اچانک ایک آدمی نے پوچھا:

''الشیخ! کیا نمازِ وتر نمازِ مغرب کی طرح ادا کی جاسکتی ہے؟''

صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ نے نرمی سے جواب دیا:

''وتر اور نماز مغرب میں فرق کرنا چاہیے، فرق یہ ہے کہ نماز مغرب میں دو رکعت کے بعد تشہد میں بیٹھتے ہیں جبکہ وتر میں تین رکعت کے بعد آخری تشہد ہوتا ہے''۔

مولانا ابھی اپنی بات مکمل نہ کر پائے تھے کہ دوسرا آدمی کھڑا ہوا اور قطع کلامی کرتے ہوئے بولا:

''شیخ! آپ غلط کہتے ہیں، جیسے آپ کہتے ہیں ویسے نہیں ہے؛ بلکہ سیدہ عائشہؓ سے ایک حدیث ہے کہ وتر بھی نماز مغرب کی طرح ادا کیا جاسکتا ہے۔

مولانا کچھ دیر خاموش رہے پھر نرمی سے بولے:

''جو میں جانتا ہوں وہ کہہ چکا ہوں جو حدیث آپ بتاتے ہیں وہ میری نظر سے نہ گزری ہے اور نہ میں نے سنی ہے، آپ بہتر جانتے ہوں گے''۔

لوگ جانتے تھے آدمی غلطی پر ہے اور اس نے نہ صرف مجلس کے آداب کی خلاف ورزی کی بلکہ شیخ سے گفتگو کا سلیقہ بھی درست نہ تھا اور مولانا جانتے تھے وہ غلطی پر ہے۔ پھر بھی حضرت نے شفقت اور نرمی کا رویہ اپنایا اور اسے یہی کہا کہ میں نہیں جانتا۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ نے قادیانیت کے فتنے کی سرکوبی کے لیے بھی کئی کارنامے سرانجام دیے۔ انہوں نے اس موضوع پر شہرۂ آفاق کتاب ''قادیانیت اپنے آئینے میں'' لکھی۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ اپنی زندگی کے آخری ایام میں دماغی عارضے میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اپنی وفات سے چار ماہ قبل بیماری ایسی بڑھی کہ وہ بستر پر جا لگے۔ بیماری آہستہ آہستہ بڑھتی گئی۔ وہ لوگوں کو پہچان نہ پاتے تھے۔ لیکن اللہ کی رحمت دیکھیے کہ اگر ایسی حالت میں کوئی ان سے مسئلہ پوچھتا تو اسے آیت اور حدیث کے ساتھ جواب دیتے اور آیت نمبر بھی صحیح صحیح بتاتے۔

دس ذوالقعدہ ۱۴۲۷ھ کو جمعۃ المبارک کی نماز کے بعد ہندستانی وقت کے مطابق دو بجے مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوریؒ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (1)۔

---

(1) بحوالہ ہفت روزہ 'الاعتصام' لاہور، پاکستان 2، 8 فروری 2007ء

کچھ یادیں کچھ باتیں

(از: ابواسامہ نیاز احمد انصاری، جالیات حوطہ بنی تمیم، سعودی عرب)

یکم دسمبر 2006ء بروز جمعہ 3 بج کر سات منٹ پر شیخ منصور احمد مدنی داعیہ دعوت وارشاد سنٹر قدیمہ ریاض سعودی عرب نے موبائل پر یہ مسیج بھیجا کہ علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ اب اس دنیا میں نہ رہے۔

یہ خبر کیا تھی بلکہ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سر پر پہاڑ گر پڑا ہو، مگر قضا وقدر کے سامنے ہر شئی ہیچ (انا للہ وانا الیہ راجعون) پڑھا، دوسرے ہی لمحہ اپنے دوست واحباب اور اپنے مکتب دعوہ وتوعیہ جالیات حوطہ بنی تمیم کے جملہ اراکین کو بذریعہ موبائل پیغام بھیج کر مطلع کیا، پھر کیا ہوا کہ تعزیتی جملے میرے موبائل پر شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری (رحمہ اللہ) کے تعلق سے آنا شروع ہو گئے (اس لئے کہ ان لوگوں کو مولانا کے صاحبزادوں کے نہ موبائل معلوم تھے نہ دیگر عنوان) شام ہوتے ہوتے بہت سارے ممبران مکتب میں بنفس نفیس تشریف لائے، علاوہ ازیں بہت سارے سعودی نوجوان جو شیخ صفی الرحمٰن صاحب کی شخصیت سے واقف تھے وہ بھی خبر سن کر مکتب میں آئے اور تعزیتی کلمات کہے اور ان کے حق میں دعائیں کیں۔

میرے مشفق استاد مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری:

جب میں جامعہ سلفیہ بنارس میں زیر تعلیم تھا تو گاہے بگاہے کچھا روڈ پر جیسا کہ بعض اساتذہ ٹہلنے کے لیے جایا کرتے تھے تو مولانا بھی کبھی کبھی جاتے تھے تو ان کے ساتھ جانے کا موقع مل جاتا تھا، تو مولانا اپنے انوکھے انداز میں بہت سارے قصے اور واقعات سناتے اور ہنساتے، کچھا روڈ تک کا سفر منٹوں میں ختم ہو جاتا اور اذان مغرب ہوتے ہوتے جامعہ واپس لوٹ آتے، میرا یہ سلسلہ یونہی ختم نہیں ہوا بلکہ ایک ایسا وقت بھی آیا جب آپ بحیثیت محقق اور سیرت نگار کے رابطہ عالم اسلامی مکہ

مکرمہ سے سیرت نبوی کے عالمی مقابلہ میں کتاب 'الرحیق المختوم' لکھ کر پوری دنیا میں پہلی پوزیشن حاصل کی تو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سعودی عرب نے اپنے شعبہ مرکز السیرۃ والسنۃ النبویۃ مدینہ منورہ میں باحث کی حیثیت سے مدینہ منورہ بلا لیا اور راقم بھی اس وقت ام القریٰ مکہ مکرمہ میں حصول علم کے لیے آچکا تھا۔ کبھی کبھی دوران عطلہ (چھٹی) دوست واحباب سے ملنے مدینہ منورہ چلا جاتا تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں مدینہ منورہ پہنچا تو وہ صبح کا وقت تھا، مولانا مرکز خدمۃ السیرۃ والسنۃ النبویۃ میں تشریف فرما تھے۔ وہاں پہنچا، مولانا سے ملاقات ہوئی، جیسا مولانا جامعہ سلفیہ میں میرے بخاری اور دیگر کتابوں کے استاد تھے، ایک استاد اور شاگرد کا تعلق لیکن بڑی بے تکلفی سے بات کیا کرتے تھے، اور میں بھی کبھی کبھی موقع کو غنیمت جان کر ان سے استفادہ کی کوشش کرتا۔

میں نے کہا: مولانا آپ نے سیرت نبویہ پر کتاب لکھ کر منظم طریقے سے کافی معلومات فراہم کردی ہے۔ لیکن بڑی مہربانی اگر آپ کل تھوڑا سا موقع دیں اس لئے کہ کل جمعرات کا دن ہے اور مرکز بھی بند رہے گا اور آپ بھی فرصت میں رہیں گے، آپ نے کہا کل کوئی کام نہیں ہے، کیا کوئی کام ہے؟ میں نے کہا میری خواہش یہ ہے کہ کل آپ کی مصاحبت میں بعض ان مقامات کو دیکھیں جس کا آپ نے اپنی کتاب الرحیق المختوم میں غزوات کے تعلق سے ذکر کیا ہے: مثلاً غزوہ احد، خندق، قلعہ کعب بن اشرف وغیرہ وغیرہ۔ آپ نے اس پر اپنی رضامندی ظاہر کی اور دوسرے دن ان مقامات کی تفصیل مولانا کی زبانی انہیں مقامات پر جا کر سنی اور دیکھی۔ اور شرح وتفصیل ایسی کہ قربان جایئے لگتا ایسا تھا کہ آپ اس وقت موجود تھے اور آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہے ہیں۔

مکتب حوطہ بنی تمیم میں آپ کی ضیافت اور تشریف آوری:

سننا اور ہے دیکھنا اور (شنیدہ کے بود مانند دیدہ) یوں تو مولانا کی کتاب عربی ہو یا اردو یا اس کے علاوہ جس زبان میں ہو، پڑھنے والا یہی محسوس کرتا ہے کہ پوری سین سامنے پیش ہو رہی ہے۔ جب الرحیق المختوم کا درس میں دے رہا تھا بہت سارے لڑکوں کو آپ کے حالات سے واقفیت ہوئی

اور انہیں یہ معلوم ہوا کہ مولانا سعودی عرب میں موجود ہیں تو ان لوگوں نے الحاح کیا کہ انہیں مکتب میں تقریر کے لیے دعوت دیں۔ ان لوگوں کے مسلسل اصرار پر میں مجبور ہو گیا، اور ایک دن ان لوگوں کی بات میں نے مولانا تک پہنچائی کہ آپ کو ہم لوگ اپنے مکتب میں مہمان بنانا چاہتے ہیں، آپ نے اس دعوت کو قبول کر لی، اور یہ بات ۲ ذوالحجہ ۱۴۱۹ھ بروز جمعہ کی ہے۔ اور مولانا دعوہ سنٹر شعبۂ جالیات اردو کی دعوت پر تشریف لائے۔

ویسے تو مولانا ایک روز قبل ہی میرے غریب خانے پر آ گئے تھے، ان کے ساتھ ریاض سے کچھ اور لوگ آئے تھے، اور دوسرے دن بعد نماز جمعہ حج کے موضوع پر آپ کی بڑی ہی جامع تقریر ہوئی، جس میں وافدین کافی تعداد میں اکٹھے ہوئے۔ علاوہ ازیں آپ کی تقریر کا جب اعلان سعودی طلبہ اور شائقین علم نے دیکھا تو ان لوگوں نے اصرار کیا کہ ہم لوگ چاہتے ہیں کہ بعد نماز عصر یا مغرب شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری کے ساتھ بیٹھیں اور ان سے کچھ استفادہ کریں، اس لئے کہ یہ بہت ہی سنہرا موقع ہے کہ سیرت نگار کے عالمی مقابلہ میں اول آنے والی کتاب کے مصنف اور محقق ہمارے علاقے میں موجود ہوں اور ہم ان سے استفادہ نہ کریں! مولانا کو یہ بات میں نے بتلائی، آپ نے بڑی ہی خندہ پیشانی کے ساتھ رضامندی ظاہر کی اور اسی دن بعد نماز مغرب مکتب کے وسیع ہال میں سعودی طلباء کا ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا اور سوال وجواب کا سلسلہ عشاء کی اذان تک چلتا رہا۔ ان تشنگان علم کے سوالوں کا جواب دیتے رہے، اور ان کی تشنگی کو بجھاتے رہے اور موقع موقع سے ہنساتے رہے۔

آپ کی مکتب دعوہ میں دوبارہ آمد:

جو لوگ مولانا کی مجلس یا درس میں بیٹھے ہوں گے ان کو یہ معلوم ہوگا کہ آپ کس طرح حاضرین سے مل جل کر رہا کرتے تھے۔ ہمارے مکتب میں شعبۂ جالیات اردو کے لوگوں کا دوبارہ اصرار شروع ہو گیا کہ ایک مرتبہ اور مولانا کو بلائیے۔ آپ نے ہماری اس دعوت کو دوسری بار قبول فرمایا اور پھر مکتب الدعوہ میں دوبارہ تشریف لائے اور بڑی ہی معلوماتی تقریر کی، تقریر کے بعد سوال وجواب

کا سلسلہ چلا۔ آپ بڑے ہی مدلل اور مبرہن طریقہ سے تمام سوالات کے جوابات دیتے بسا اوقات بعض حاضرین ایسے سوالات کر بیٹھتے اس زعم میں کہ یہ تو سیاسی سوال ہے اور مولانا کو سیاست سے کیا لینا دینا، لیکن جب جواب دیتے تو معلوم ہوتا کہ آپ کا تخصص ہی اسی موضوع پر ہے۔

اللہ اللہ کیا تھے مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری صاحب، آج ان کے نام کے ساتھ رحمہ اللہ لکھتے ہوئے قلم تھرتھرا اٹھتا ہے، ایک ایسی ہستی جسے رہتی دنیا تک لوگ یاد کریں گے جو بیک وقت مفسر ومحدث، محقق وسیرت نگار، مناظر اور خطیب، مدرس اور داعی، اور سب سے بڑی خوبی، کہ ہر شخص سے اس کے مرتبے اور حیثیت کے مطابق ملنے والے (جبکہ یہ خوبی بہت کم ہی لوگوں میں پائی جاتی ہے) آپ کے اندر موجود تھی (آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری)

ان کے انتقال کے بعد ایک مناسبت سے ایک سعودی کے یہاں ہم جملہ دعاۃ مکتب اکٹھا بیٹھے ہوئے تھے باتوں بات میں مولانا کا تذکرہ ہونے لگا۔ اس سعودی شخص نے بتلایا کہ آج سے تقریباً آٹھ سال قبل کی بات ہے میں الندوۃ العالمیۃ للشباب الاسلامی ریاض کی جانب سے گرمی کی چھٹی میں کچھ اپنے دوست واحباب کے ساتھ افریقہ دعوتی مشن پر گیا ہوا تھا۔ ایک روز میرے ایک ساتھی کے پاس ایک شخص آیا، اور اس نے کہا کہ شیخ! آپ کل سیرۃ الرسول ﷺ کے موضوع پر درس دیجیے گا؟ انہوں نے کہا: سیرت کے تعلق سے تو بروقت میرے پاس کوئی کتاب موجود نہیں ہے، اتنا اس کا سننا تھا کہ وہ فوراً اپنے گھر گیا اور ایک کتاب لایا اور اس نے کہا کہ یہ کتاب لیجیے۔ میں نے وہ کتاب لے کر اپنے پاس رکھ لی اور پھر اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ جب کتاب پڑھنا شروع کیا تو پوری رات اس کتاب کو پڑھتا ہی رہ گیا، حتی کہ فجر کی اذان ہوگئی۔ پھر دوسرے دن میں نے سیرت کا درس اسی کتاب سے دیا، جب شام ہوئی تو میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ فلاں کتاب جس کے مصنف المبارکپوری ہیں کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟ تو اس نے کہا کہ آپ کو میں نے فلاں دن جب آپ ہمارے یہاں حوطہ بنی تمیم تشریف لائے تھے تو میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ آج ہمارے یہاں مکتب دعوہ میں ہندستانی عالم ربانی ریاض سے اردو میں تقریر کرنے کے لیے آئے ہیں اور آج ہی

ہم سعودی طلبا نے مغرب بعد ان سے ملاقات کا ٹائم لے رکھا ہے، اور میں نے آپ سے کہا تھا کہ چلئے ان سے مل آتے ہیں۔ تو آپ نے اپنی مشغولیت ظاہر کی اور آپ نہیں گئے۔ اس دن جو شیخ آئے تھے وہی اس کتاب کے مؤلف اور مصنف تھے، اور وہی شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری صاحب الرحیق المختوم تھے۔ اتنا سنا تو اس آدمی نے کف افسوس ملا لیکن اب کیا کر سکتے تھے۔ مولانا کی شخصیت کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جو ان کی کتابوں کو پڑھا ہو یا آپ کی صحبت میں رہا ہو۔ بہر حال یہ عالمی شہرت کی حامل شخصیت اب اس دنیا میں نہیں رہی لیکن ان کی تصانیف اور مؤلفات وعلمی کارنامے ان شاء اللہ رہتی دنیا تک یاد کیے جائیں گے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اللہ رب العزت ان کے لواحقین کو صبر کرنے کی تلقین عطا فرمائے اور ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ (آمین)

آہ! آفتابِ علم وعرفان غروب ہوگیا!

(از: ڈاکٹر عبداللطیف الکندی، استاذ کلیہ سلفیہ سری نگر)

سری نگر میں جمعیت اہل حدیث جموں وکشمیر کی مجلس شوری کا دو روزہ اجلاس جاری تھا کہ یہ اندوہناک خبر ملی:

"جماعت کے ہر دلعزیز، فرید العصر، یگانہ روزگار، محدث دوراں، مناظر زماں، صاحب طرز ادیب، آفتاب علم وعرفان جناب علامہ شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ صاحب الرحیق المختوم سرزمین مبارک پور کے حسین آباد علاقے میں غروب ہوگئے اور پورے عالم اسلام کو سوگوار چھوڑ گئے"۔

إنا لله وإنا إليه راجعون.

یہ دنیا دوام کی جگہ نہیں بلکہ دار انتقال ہے۔ یہاں جو آیا جانے کے لیے ہی آیا مگر جانے والے اپنے انمٹ نقوش، قابل ذکر کارناموں اور امت مسلمہ کے لیے خیر خواہی والے کاموں سے بعد میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ عظیم انسان تھے جنھوں نے خدمت اسلام، خدمت انسانیت اور خدمت علم وعلماء کے لیے بہت عظیم الشان کارنامے انجام دے کر مرے۔ جب تک تعلیم وتعلم کا سلسلہ جاری رہے گا۔ سیرت مصطفیٰ اطراف عالم میں پڑھائی جاتی رہے گی آپ کی بے مثال شخصیت کا عکس طلبہ کے اذہان میں ثبت ہوتا رہے گا۔

میں نے ذاتی طور پر سب سے پہلے علامہ مرحوم کو جمعیت اہل حدیث جموں وکشمیر کی غالباً چھبیسویں کانفرنس (1982ء) کے اجلاس کے موقع پر دیکھا اور میں ان خوش نصیب طلبہ میں تھا۔ جنھیں ذمہ داران جمعیت نے جامعہ سلفیہ کے وفد کی خدمت کی ذمہ داری تفویض کی اس لیے میں ان کے سری نگر کے ایام میں برابر ان کے ساتھ رہا اور اس دوران ان کے اعلیٰ اخلاق، وسیع علم،

شفقت و ہمدردی اور مسلک حق کے ساتھ گہری وابستگی اور دعوت دین کا جذبہ ان میں اتم درجہ کا پایا۔

جامعہ سلفیہ میں بھی ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا اور جب میں 1987ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ گیا تو کچھ ہی مدت بعد آپ بھی جامعہ اسلامیہ اور "مجمع الملك فهد لطباعة المصحف الشريف" کے اشتراک وتعاون سے چلنے والے ادارے 'مركز خدمة السنة والسيرة النبوية" میں بطور باحث محقق عالم کے تشریف آور ہوئے اور دس سال تک وہاں پر سیرت انسائیکلو پیڈیا تیار کیا۔ یاد رہے کہ علامہ کو اس میدان میں 'الرحیق المختوم' کی تالیف کی وجہ سے پہلے ہی کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ اس دوران ہم سب طلبہ جامعہ اسلامیہ بھی ان کے علوم سے فیضیاب ہوتے رہے اور مدینہ کی کئی مساجد میں ان کے دروس سے استفادہ کا بھی موقع ملا۔

مولانا کا انداز بیان کافی موثر تھا۔ میں نے بھی حتی الامکان آپ سے خوب خوب استفادہ کیا۔ آپ کی تحریر کی طرح آپ کی تقریر میں بھی کافی سارا مواد ہوا کرتا تھا اور جو بھی آپ کے درس میں بیٹھتا آپ کا گرویدہ بن جاتا۔ آپ کی تالیف کردہ کتابوں سے ساری دنیا کے مسلمانوں نے استفادہ کیا اور رہتی دنیا تک استفادہ کرتے رہیں گے۔ کم وبیش آپ کی بیس کتابیں ہیں جو اپنے موضوع میں اپنی خاص انفرادیت رکھتی ہیں۔ کتابوں کے علاوہ آپ کے بے شمار مقالات بھی ہیں جو عربی اور اردو مجلات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

آپ دعوت وتبلیغ کے حوالے سے بھی بہت سے ملکوں کا سفر کر چکے ہیں جن میں بین الاقوامی سیرت کانفرنس امریکہ بھی شامل ہے۔ جبکہ کئی مقامی اور بین الاقوامی اداروں کے ممبر بھی رہے۔ 1998ء سے لے کر 2000ء تک مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے امیر کی حیثیت سے رہے۔

میری تمنا ہے کہ آپ کے کارناموں پر بہت کچھ لکھا جائے۔ کیونکہ آپ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ مولانا کے شاگردوں سے بجا طور پر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ آپ کی زندگی کے مختلف گوشوں پر خامہ فرسائی کر کے آنے والی نسلوں کے لیے آپ کے بارے میں معلومات فراہم کریں گے۔

یہ عظیم شخصیت بالآخر جمعۃ المبارک یکم دسمبر 2006ء مطابق ۱۰رذوالقعدہ ۱۴۲۷ھ کو اپنی آبائی بستی حسین آباد میں ہم سب کو داغ مفارقت دے کر عالم جاوداں کو سدھار گئے۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور ان کے جملہ لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ اور ان کے علم کو ان کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔

وما كان هلكه هلك واحد

ولكنه لبنيان قوم تهدما

وصلى الله على نبينا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين والحمد لله رب العالمين (1).

(1) بحوالہ پندرہ روزہ ترجمان دہلی، 1، 15 جنوری 2007ء۔

میرے مشفق استاد مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ

(از: محمد مظہر اعظمی، استاذ جامعہ عالیہ عربیہ مئو)

یکم دسمبر 2006ء کو عصر کی اذان ہو چکی تھی، گھڑی میں تقریباً تین بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو کسی نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا کہ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اس خبر نے مجھے کس قدر متاثر کیا، اس کی لفظوں میں تعبیر مشکل ہے۔ بہر حال عصر کی نماز کے بعد سب سے پہلے میں نے مولانا کا مختصر ڈاٹا تیار کیا اور فوراً روزنامہ راشٹریہ سہارا کے نمایندے کے حوالہ کیا تا کہ دوسرے دن اخبار کے ذریعہ ان لوگوں تک خبر پہنچ جائے، جہاں ٹیلی فون وغیرہ سے پہنچ نہ سکی ہو۔

مولانا کی رحلت نے مجھے زیادہ ہی مضطرب کر کے رکھ دیا، کیونکہ جامعہ سلفیہ بنارس میں تعلیم کے دوران مجھے کئی کتابیں مولانا سے پڑھنے کا موقع ملا، اور ان کے طریقہ تدریس سے میں زیادہ مطمئن اور متاثر ہوا۔ ان کی تدریس کی سب سے بڑی خوبی اور کمال یہ تھا کہ کتاب چاہے جس فن کی ہو، طلبہ کو کبھی بور نہیں ہونے دیتے اور ہمیشہ اس بات کو ملحوظ رکھتے کہ الفاظ و معانی اور عبارتوں کی توضیح وتشریح اس طرح کی جائے کہ دل کو چھو لے اور بات دل میں اتر جائے۔ یہ خواہش تو ہر ایک استاد کی ہوتی ہے مگر بہت کم لوگ ہیں جنہیں یہ ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ طلبہ کو مستعد اور چست رکھنے کے لیے کبھی کبھی علمی لطیفے بھی سناتے، جس کے بعد طلبہ نشاط و تازگی اور پوری دلجمعی و انہماک کے ساتھ درس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ جن دنوں آپ ہدایہ پڑھا رہے تھے، طلبہ زیادہ ہی مستفید و محظوظ ہوتے تھے۔ کیونکہ مصنف کے مقصود کی وضاحت کے بعد اگر مسئلہ کتاب وسنت سے کسی طرح متعارض ہوتا تو دلائل کی روشنی میں اس کا خوب اچھی طرح رد فرماتے، تا کہ طلبہ مصنف کے نظریہ سے واقف ہونے کے ساتھ شریعت کے صحیح موقف کو بھی جان سکیں۔

صحیح البخاری ج ۲ کا آغاز جب کتاب المغازی سے ہوا تو پھر آپ کا جوش وخروش قابلِ دید تھا۔ جب کسی غزوہ کی منظر کشی فرماتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ آنکھوں دیکھا حال بیان فرما رہے ہیں۔ نیز ہم طلبہ بھی ایسا ہی محسوس کرتے جیسے جنگ کا پورا نقشہ سامنے ہے اور ہم بنفس نفیس جنگ میں شریک ہیں۔ غزوات میں استعمال ہونے والے ہتھیاروں اور اسلحوں کے ذکر کے ساتھ ان کے ماہرین کا بھی ذکر فرماتے۔ آج کے ترقی یافتہ اور ماڈرن جنگی سامانوں، جنگی جہازوں، میزائل وغیرہ کے متعلق بھی بہت تفصیل سے بتاتے۔ ان اسلحوں کی خاصیت وصلاحیت کے ساتھ کس میزائل کی کتنی دور تک مار ہے یہ بھی بتاتے۔ ہم طلبہ سن کر عش عش کرتے کہ غزوات پر نگاہ رکھنے والا یہ شخص موجودہ دور کے جنگی اسلحوں کے متعلق کتنی وسیع اور عمیق معلومات رکھتا ہے۔

مولانا سے طلبہ کافی انسیت رکھتے اور قریب رہتے تھے۔ شام کے وقت جب کبھی ٹہلنے کے لیے جامعہ سے باہر جاتے تو کچھ طلبہ آپ کے ساتھ ہو لیتے اور راستے بھر آتے جاتے علمی سوال وجواب کا سلسلہ رہتا۔ گویا چلتا پھرتا مذاکرۂ علمیہ ہوا کرتا تھا۔ اسی لیے طلبہ کی خواہش ہوتی کہ آپ سے قریب رہیں اور زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں۔

جامعہ سلفیہ بنارس سے جب آپ کی ادارت میں ماہنامہ ''محدث'' کا اجرا ہوا تو آپ کا اداریہ اور عالم اسلام پڑھنے کے لیے طلبہ بے چین رہتے اور ہر ماہ کے محدث کا بڑی شدت سے انتظار کرتے اور پڑھنے کے بعد بسا اوقات کلاس میں پوچھتے تو آپ اپنے مخصوص انداز میں جواب عنایت فرماتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب اندرا گاندھی کا انتقال ہوا تو بعض علماء میت کے پاس قرآن پڑھ رہے تھے؛ بلکہ جب ارتھی کا جلوس شمشان کی طرف روانہ ہوا تو ساتھ ساتھ قرآن کی تلاوت کی آواز بھی آ رہی تھی جسے اس وقت ہم لوگ ریڈیو پر سن رہے تھے ان دنوں ٹی وی ابھی اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ اس واقعہ کے بعد آپ نے اداریہ میں تحریر فرمایا کہ کچھ لوگ سیکولر آیتیں پڑھ رہے تھے۔ اداریہ پڑھنے کے بعد میں نے کلاس میں پوچھا کہ سیکولر آیت سے کیا مراد ہے تو آپ نے فرمایا:

''ایسی آیتیں پڑھی جا رہی تھیں جو کافروں اور مشرکوں کے خلاف نہ ہوں''۔

مولانا کی خوبیوں کے ذکر کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ایک تاثراتی مختصر سے مضمون میں ان کے اوصاف کا احاطہ ممکن نہیں اور مجھ جیسے کم مایہ کے لیے تو ناممکن کے مترادف ہے۔

جامعہ اسلامیہ فیض عام مئو سے آپ نے فراغت حاصل کی تھی اور اس کے بعد اپنے اس مادر علمی اور جامعہ اثریہ دارالحدیث مئو میں تدریسی خدمات انجام دیا تھا، اس لیے آپ کے مئو سے گہرے روابط تھے۔ جب بھی اپنے گھر آتے تو ایک دو مرتبہ مئو ضرور تشریف لاتے اور ہم لوگوں کو شرف میزبانی بخشتے۔ فالج کے اثر کے بعد مئو کے بعض ڈاکٹروں کے زیر علاج رہے، اس لیے علاج کے لیے بھی آتے اور غریب خانہ کو عزت بخشتے۔ مئو سے کافی گہرے لگاؤ اور تعلق کے سبب یہاں سے آپ کے جنازہ میں شرکت کے لیے گیارہ بڑی بسیں گئی تھیں۔ اس کے علاوہ کافی تعداد میں معتقدین اپنی اپنی دو اور چار پہیوں کی گاڑیوں میں پہنچے تھے۔

آپ کی عظیم شخصیت اور وسیع تعلقات وروابط کی وجہ سے یہ امید تھی کہ معتقدین کی کافی بھیڑ ہوگی اور جب بھیڑ زیادہ ہوتی ہے تو بسا اوقات تدفین وغیرہ میں کافی دشواری پیش آتی ہے۔اس لیے مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی شیخ الجامعہ جامعہ اسلامیہ فیض عام مئو، مولانا شمیم احمد عمر شیخ الجامعہ جامعہ محمدیہ مئو، مولانا عبدالمبین فیضی استاذ جامعہ محمدیہ مئو، مولانا شفیق احمد ندوی استاذ جامعہ عالیہ عربیہ مئو، مولانا اقبال احمد محمدی سابق ناظم شہری جمعیت اہل حدیث مئو اور راقم الحروف تقریباً گیارہ بجے مولانا کے گھر پہنچے تاکہ انتظام وانصرام میں تعاون کیا جاسکے۔ ہم لوگ سب سے پہلے قبرستان گئے، جو آپ کے مکان سے تھوڑی دوری پر ہے۔ اس کے بعد قبرستان کے دکھن طرف اس میدان میں جہاں جنازہ کی نماز کے لیے صفائی اور صفوں کی درستگی کے لیے تیاری ہو رہی تھی۔

ظہر کی نماز مولانا کی مسجد میں ادا کی گئی مصلیوں کی تعداد سے اندازہ لگا کہ بہت سے لوگ پہنچ چکے ہیں اور اس کے بعد آپ کے جنازہ میں شرکت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہا جس کی وجہ سے عصر کی نماز میں اتنی بھیڑ ہوئی کہ اعلان کیا گیا کہ جو لوگ مسجد میں موجود ہیں وہ نماز پڑھ لیں،

باقی لوگ بعد میں پڑھیں گے۔

مولانا کا انتقال تو یکم دسمبر 2006ء دو پہر ڈھائی بجے ہوا تھا لیکن مولانا کے صاحبزادے مولانا یاسر (ہشام) مدنی کے آنے کا انتظار تھا، اس لیے 2 دسمبر 2006ء ساڑھے تین بجے جنازہ کی نماز کا وقت متعین کیا گیا تھا۔ مولانا کے صاحبزادے بذریعہ ہوائی جہاز تقریباً سوا تین بجے پہنچ گئے اور انہوں نے ہی اپنے والد محترم کے جنازہ کی نماز پڑھائی، جس میں قرب و جوار کے علاوہ ممبئی، دلی، لکھنؤ اور نیپال وغیرہ سے آئے ہوئے ہزاروں سوگواروں نے شرکت کی اور بچشم نم مولانا کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی خدمات کو قبول فرمائے، انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ (آمین)

شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ سے آخری ملاقات

(از: انصار زبیر محمدی، الجبیل، سعودی عرب)

شاید آ جائیں نئے عہد کی تعمیر میں کام
ٹوٹ جاؤں تو میرے ذات کے ٹکڑے چن لو

(فضا ابن فیضی)

استاذ الاساتذہ علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ عصر حاضر کی عبقری شخصیت، عالم اسلام کا دھڑکتا دل، پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات طیبہ کے عظیم و مستند سیرت نگار، علم و تحقیق کی معتبر کتاب اور مقبول وکامیاب رہنما تھے۔ عالمِ اسلام میں آپ کے شاگردوں کا سنہرا جال بچھا ہوا ہے۔ مولانا کے شاگردوں کی خصوصاً اور علماء اہل حدیث کی عموی طور پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مولانا کے اسلوب تدریس اور اسلوب بحث و تحقیق پر روشنی ڈالیں تاکہ ہماری نسل آپ کی زندگی کے مختلف گوشوں کو پڑھ کر احساس کمتری سے نکل سکے۔ اس لیے کہ شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ نے بیرونِ ہند کی کسی یونیورسٹی سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی؛ نہ ہی ہندستان کی کسی بڑی یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہے۔ بلکہ مکتب کی تعلیم مبارکپور سے حاصل کرنے کے بعد مئو کے ایک اہل حدیث ادارہ جامعہ فیض عام سے فراغت حاصل کی تھی۔ مگر اللہ نے آپ کو ان صلاحیتوں سے نوازا کہ عرب وعجم کی ایک بڑی تعداد نے آپ سے کسب فیض کیا۔ دنیا کی اعلیٰ یونیورسٹیوں کے عظیم اسکالرز بھی سیرت کے باب میں آپ کی نگارش سے بھرپور فائدہ اٹھاتے۔ علم حدیث کا طالب علم بلوغ المرام سے لے کر صحیح مسلم تک آپ کی شروحات سے فائدہ اٹھاتے۔ فن مناظرہ اور تاریخ کے تو آپ انتہائی ماہر تھے۔ رحمه الله رحمة واسعة وأسكنه فسيح جناته.

ہم وطن ہونے کے ناتے شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ سے میرا تعلق دورِ طالب علمی ہی سے قائم ہو

گیا تھا۔میرے وطن بندی کلاں اور مبارک پور کے درمیان ۱۳ اکلومیٹر کا فاصلہ ہے، جس کی وجہ سے علمائے مبارک پور سے اہل بندی کلاں کا بڑا گہرا رابطہ رہا ہے۔ خصوصاً شیخ الحدیث عبیداللہ رحمانی رحمہ اللہ تو سند تسلیم کیے جاتے تھے۔ علمائے مبارکپور کو بھی میرے گاؤں بندی کلاں سے بڑی الفت تھی، اس لیے کہ ضلع اعظم گڑھ اور مئو کے اس دیار میں بندی کلاں خالص اہل حدیث بستی ہے۔

میں 1993ء کے اواخر میں ۱۴۱۴ھ میں سعودی عرب آیا۔ یہاں آنے کے بعد مکتب دعوۃ الجالیات سے جڑ گیا۔ دعوتی زندگی میں متعدد مراحل اور نشیب وفراز آئے۔ مختلف قسم کے پیچیدہ اور الجھاؤ پیدا کرنے والے سوالات کا سامنا ہوتا۔ خصوصاً اہل باطل کے پاس شکوک وشبہات کچھ زیادہ ہی رہتے تھے۔ ان دنوں شیخ مدینہ یونیورسٹی میں تھے۔ شام کو آپ کے گھر والے نمبر پر رابطہ کرتا، سوال پیش کرتا اور فوراً جواب مل جاتا۔ بعض دفعہ تحریری سوال بھیجتا اور ہفتہ دس دن میں جواب آجاتا۔

شعبان ۱۴۱۴ھ میں سعودی وزارت اسلامی امور کی طرف سے سعودی عرب میں جب دعاۃ کا پہلا ٹریننگ کورس منعقد ہوا تو اس میں مملکت سعودی عرب کے سارے دعاۃ شریک ہوئے۔ مجھے بھی شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ کورس حاتم طائی کے شہر حائل میں منعقد ہوا، جو ایک ہفتہ تک جاری رہا۔ اس میں عالم اسلامی کی معزز ہستیوں نے شرکت کی اور دعاۃ کو اپنے تجربات سے نوازا۔ خصوصاً پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی ظہیر، ڈاکٹر وصی اللہ محمد عباس، ڈاکٹر محمد لقمان سلفی اور شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ نے بطور خاص خطاب فرمایا۔ یہ پروگرام شیخ رحمہ اللہ کی کاوشوں کا ثمرہ تھا جس کی تنفیذ برادرم شیخ سید معراج ربانی اور ان کے رفقاء نے کی تھی۔ جنھوں نے اسی سال اپنے دعوتی سفر کا آغاز کیا تھا، پروگرام کے آخر میں حائل کے گورنر پرنس مقرن بن عبدالعزیز آل سعود حفظہ اللہ (جو بعد میں مدینہ منورہ کے گورنر رہے اور اس وقت سعودی محکمہ خفیہ کے سربراہ ہیں) نے سرٹیفیکیٹ اور تحفہ تقسیم کیا۔

راقم الحروف نے اس پروگرام میں آپ کے دیے گئے تمام لکچروں کو کیسٹ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا، اور پھر شیخ کے پاس مراجعہ کے لیے بھیجا، چند ہفتوں بعد آپ نے مراجعہ کر کے واپس بھیج

دیا۔ جو ابھی تک غیر مطبوع ہے۔ اگر کوئی صاحب چھاپنا چاہیں تو مجھ سے رابطہ قائم کریں۔

مدینہ میں آپ کے قیام کے دوران حرم شریف کا ''باب الرحمۃ'' ملاقات واستفسار کا آسان ذریعہ تھا۔ میری کتاب ''بچوں کی تربیت کیسے؟'' جس کے ہندستان وسعودی عرب میں متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، یہ نام آپ ہی نے منتخب کیا تھا۔

غالباً ۱۴۱۶ھ میں آپ کا عقد جامعہ اسلامیہ سے ختم ہو گیا۔ اس کے بعد آپ مکتبہ دارالسلام سے جڑ گئے۔ جامعہ اسلامیہ اور مکتبہ دارالسلام کی ملازمت کے درمیان ایک ماہ کا وقفہ آپ نے جالیات کے مدیر سلیمان الـخـنـیـنـی نے بڑے اصرار کے ساتھ آپ کو اپنے یہاں کام پر راضی کر لیا۔ زلفی ریاض سے دوسو کلومیٹر کے فاصلہ پر کٹر قسم کے بدوؤں کا شہر ہے۔ لیکن اس شہر نے چوٹی کے علماء بھی پیدا کیے ہیں۔ شیخ عبداللہ الغدیان رکن سپریم کونسل علماء کمیٹی، شیخ عبدالمحسن بن حمد العباد سابق وائس چانسلر مدینہ یونیورسٹی، شیخ محمد بن ابراہیم الحمد حفظہم اللہ یہاں کی مایہ ناز ہستیاں ہیں۔

چنانچہ جب آپ نے مدینہ منورہ سے زلفی کا ارادہ کیا تو بریدہ میں آپ کا پروگرام ترتیب دیا گیا، جسے آپ کے ایک شاگرد مولوی توفیق احمد اثری، برادرم ازہر عبدالرحمٰن رحمانی، عبداللہ عبدالرؤف بنارسی اور راقم نے ترتیب دیا تھا۔ مولوی توفیق نے مولانا کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ مدینہ سے القصیم تشریف لائیں اور پروگرام کے بعد گاڑی سے زلفی پہنچا دیا جائے گا۔ جمعہ بعد مرکز توعیۃ الجالیات کے ہال میں آپ کا خطاب ہوا اور پھر عصر کی نماز کے بعد مولانا کو زلفی پہنچا دیا گیا۔ اس سفر میں راقم بھی ساتھ تھا۔ راستے میں بہت سارے علمی نکات آپ نے بیان کیے جو کہ آپ کا مخصوص طرز تھا۔ زلفی میں آپ کے قیام کے دوران ایک ہفتہ بعد پھر میں نے آپ کی زیارت کی اور یومیہ دروس میں شریک ہوا۔

۲۶ رمضان المبارک کو جب عید کی چھٹیاں شروع ہوئیں تو آپ پہلے الغاط تشریف لے گئے جہاں شیخ مقصود الحسن صاحب نے آپ کی ضیافت کی اور پھر آپ مدینہ اپنے بچوں کے پاس واپس لوٹ آئے۔

اس کے بعد آپ مستقل طور پر مکتبہ دارالسلام سے جڑ گئے، جہاں رہ کر آپ نے دارالسلام کی علمی وتحقیقی کتابوں پر مراجعہ واشراف کیا اور آخر وقت تک اس سے جڑے رہے۔

۱۶،۱۴۱۵ھ میں جب علی میاں ندوی نے اہل حدیث ہند کے خلاف سعودی عرب میں خطوط بھیجے۔اس کا پردہ جلد ہی فاش ہوگیا۔ریاض میں قیام کے دوران آپ نے ایک دن مجھے فون کر کے حکم دیا کہ علی میاں کی خط کی کاپی فیکس کردوں، دارالسلام کی فیکس بھی لکھوادیا،فیکس بھیجنے کے بعد میں نے مولانا سے پوچھا کہ آپ اس خط کو لے کر کیا کریں گے؟ آپ نے جواب دیا: میں علی میاں ندوی سے صرف اتنا پوچھوں گا:

”اے سیرتِ سید احمد شہید کے مصنف !اس خط کے ذریعہ آپ نے دینِ اسلام کی کون سی خدمت انجام دی ہے؟!“۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم وبصیرت کے ساتھ جرأت وشجاعت سے بھرپور نوازا تھا۔1978ء مناظرۂ بجرڈیہہ آپ کی جرأت وفراست اور شجاعت کی واضح مثال ہے۔

مدینہ منورہ میں قیام کے دوران آپ پر فالج کا حملہ ہوا، وقت پر اسپتال پہنچادیے گئے، اللہ نے آپ کو شفا عطا کی۔ پھر ریاض میں دوسرا حملہ ہوا اور پھر سخت کمزوری کی وجہ سے آپ اپنے وطن حسین آباد مبارکپور منتقل ہوگئے۔میں جب بھی چھٹیاں گزارنے وطن جاتا آپ سے ملاقات کر کے ہی آتا۔بسا اوقات بہت سارے سوالات کے ساتھ حاضر ہوتا، شیخ کے مہمان خانہ میں مجلس منعقد ہوتی اور شیخ رحمہ اللہ سے میں سوال کرتا اور آپ جواب دیتے۔

29 اکتوبر 2006ء بروز اتوار میں نے آپ کی آخری زیارت کی۔آپ کے صاحبزدگان میں عزیزی عامر سلمہ گھر پر موجود تھے، صبح 11 بجے کا وقت تھا، میں نے دستک دی اور عامر صاحب سے گزارش کی کہ مولانا سے ملاقات کرائی جائے۔مولانا گھر کے اندرونی حصہ میں صاحبِ فراش تھے۔ان دنوں آپ کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے سے معذور تھے،نلیوں سے غذا پہنچائی جاتی تھی، میں نے سلام کیا، اپنا نام بتایا، چند لمحہ بعد آپ نے لب ہلایا۔عزیزی عامر نے بتایا کہ ابا نے آپ کو

پہچان لیا ہے اور سلام کا جواب دے رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھا رہا اور پھر واپسی کی راہ لی۔ حیات وموت کی کشمکش کے اس لمحہ میں بھی آپ کے چہرے پر مسکراہٹ اور جگمگاہٹ تھی، گویا نگاہوں سے آپ یہ کہہ رہے ہوں کہ ؎

چہروں پہ سب کے گردِ ہنر چھوڑ جاؤں گا

جاتے ہوئے نشانِ سفر چھوڑ جاؤں گا

راتوں کی داستاں ہوں مگر ہوں گا جب تمام

لوحِ افق پہ حرفِ سحر چھوڑ جاؤں گا

(پسِ دیوارِ حرف، ص:۱۸۱، فضا ابن فیضی)

• ۱۰ ذوالقعدۃ ۱۴۲۷ موافق یکم دسمبر 2006ء جمعہ بعد جبیل دعوۃ سنٹر کا نواں سالانہ اجلاس عام اپنی آب وتاب کے ساتھ شروع ہو چکا تھا۔ منطقہ شرقیہ خصوصاً دمام وجبیل میں ریکارڈ توڑ بارش ہو رہی تھی۔ اجلاس سے خطاب کرنے کے لیے عالم اسلام کے مستند معروف علمائے کرام اسٹیج پر تشریف فرما تھے۔ شیخ محمد منیر قمر سیالکوٹی، شیخ معراج ربانی، شیخ عبدالمالک مجاہد اور مولانا کے انتہائی عزیز شاگرد برادرم شیخ ظفر عدیل نور الحق حفظہم اللہ اجلاس کے مقرر خصوصی تھے۔ مبارکپوری کے ہی خاندان کے چشم وچراغ شیخ غازی عزیر حفظہ اللہ کی صدارت میں اجلاس کی پہلی نشست کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ شیخ رحمہ اللہ کے قریبی دوست مکتبہ درالسلام ریاض کے مدیر عبدالمالک مجاہد کا خطاب ہو رہا تھا کہ شیخ حافظ عابد الٰہی ظہیر (برادر علامہ احسان الٰہی ظہیر) نے موبائل پر رابطہ کیا۔ باہر آ کر جب گفتگو شروع کی تو آپ نے یہ اندوہناک اور المناک خبر دی کہ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری فوت ہو گئے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

خبر بڑی المناک تھی۔ میں نے فوراً اپنے دوست برادرم ازہر عبدالرحمٰن رحمانی کو فون کیا، آپ نے ریسیور اٹھاتے ہی آواز پہچان کر کہا: ''احسن اللہ عزاء کم فی شیخ صفی الرحمن''.

اس وقت وہ لال گوپال گنج میں تھے، خبر آدھے گھنٹے کے اندر ساری دنیا میں پھیل گئی۔

میں نے اسٹیج پر آکر شیخ غازی عزیر حفظہ اللہ کو یہ خبر سنائی اور درخواست کی کہ سامعین کو اطلاع دے دی جائے۔ اس لیے کہ شیخ رحمہ اللہ اس اجلاس عام سے بارہا خطاب کر چکے تھے۔ عوام وخواص آپ کو پڑھنے کے ساتھ یہاں سنتے بھی تھے۔ شیخ اہل جبیل کے سوالوں کا جواب بھی دیا کرتے تھے۔ شیخ غازی عزیر صاحب نے مجھے حکم دیا کہ میں اعلان کردوں، میں نے دیکھا کہ شیخ کی آنکھیں اشک بار تھیں، اصرار کے باوجود آپ نے اعلان کرنے اور خبر دینے سے معذرت کردی۔ چنانچہ جب ڈیڑھ بجے اجتماع کی پہلی تقریر سے مولانا عبدالمالک مجاہد صاحب فارغ ہوئے تو راقم الحروف نے عوام کو یہ روح فرسا خبر سنائی کہ دوستو! دفاع نبی ﷺ کے موضوع پر آپ نے شیخ عبدالمالک کا خطاب سنا۔ مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک عظیم سیرت نگار، اہلِ علم، اہلِ قلم اور اہلِ زبان کو دفاعِ نبوی ﷺ کے لیے قیمتی ہتھیار فراہم کرنے والی شخصیت، الرحیق المختوم کے مصنف شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ خبر سن کر علماء وعوام کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں، ہر چہرے سے اداسی ظاہر ہونے لگی، گویا:

غنچے خموش پھول پریشان چمن اُداس
کیا کہہ گئی ہے موجِ صبا سوچنا پڑا

شیخ عبدالمالک مجاہد نے تقریر سے فارغ ہونے کے باوجود پانچ منٹ کا وقت مانگا، اور اس وقفہ میں مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ کے متعلق اپنے چند واقعات بیان کیے۔ شیخ عبدالمالک مجاہد نے بتایا کہ مجھے جب کسی حدیث کی ضرورت پڑتی تو پہلے مولانا سے پوچھتا۔ مولانا کتاب، باب اور مکمل حوالہ کے ساتھ بتادیا کرتے۔ آپ کی موجودگی میں کمپیوٹر دیکھنے کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی۔

عصر کی نماز سے قبل الجبیل شہر کے معروف سلفی عالم شیخ محمد بن رمزان الہاجری حفظہ اللہ اپنے ایک وفد کے ساتھ تشریف لائے اور تمام علمائے اہل حدیث سے شیخ کی وفات پر تعزیت کی۔ علمائے اہل حدیث ہند وپاک کا مقام ومرتبہ بیان کیا، ان کی خدمات کو سراہا۔

عشاء بعد اجلاس کی آخری نشست سے خطاب کرتے ہوئے برادرم شیخ معراج ربانی ﷾ نے فرمایا کہ دوستو! مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آج ہم ایک عظیم و معروف سیرت نگار سے محروم ہو گئے۔ علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ ہمارے روحانی اور علمی باپ تھے۔ ہم سب ان کی روحانی اولادیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آپ کے پسماندگان کو ان کا جانشین بنائے۔ آمین

اسی دن رات ساڑھے گیارہ بجے شب کی آخری نشریات میں عالم عرب کا معروف چینل المجد ٹی وی نے تقریباً پانچ منٹ تک آپ کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالی۔ سعودی عرب کے تمام اخبارات نے آپ کی خبرِ وفات کو نمایاں حرفوں میں شائع کیا اور آپ کی وفات کو امت مسلمہ کے لیے ایک بڑا خسارہ قرار دیا۔

اردو نیوز جدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق آپ کی نماز جنازہ آپ کے صاحبزادے برادرم شیخ یاسر (ہشام مدنی) نے پڑھائی، جن کے نام پر آپ کی کنیت تھی۔ ماہنامہ محدث بنارس کی ادارت کے دوران آپ کے متعدد مقالات ابوہشام اعظمی کے نام سے شائع ہوئے۔ آپ کی تدفین آبائی قبرستان میں ہوئی۔ کم و بیش ایک لاکھ لوگوں نے جنازہ میں شرکت کی۔ اعظم گڑھ کمشنر کے علاوہ سرکاری افسران بھی موجود تھے۔ جنازہ کے وقت شاہراہ بند کر دی گئی (1)۔

مئو، مبارکپور، بنارس اور بستی و گونڈہ سے علماء و دانشوران اور مفکرین و دعاۃ کی ایک بڑی تعداد نے جنازہ میں شرکت کی۔ عالمِ اسلام کے ممتاز علماء و طلبہ نے وفات کی خبر پا کر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔

چمن ہرے ہیں اہل دانش اپنی پلکوں سے مجھے
یہ کہاں میں ٹوٹ کر بکھرا اپس دیوار حرف ☆

(1) اردو نیوز جدہ، اتوار 3 دسمبر 2006ء۔

☆ یہ مضمون پندرہ روزہ ترجمان دہلی 16، 28 فروری 2007ء میں شائع ہو چکا ہے۔

والدِ محترم کے سایۂ عاطفت میں!

(از: عطیہ صفی الرحمٰن مبارکپوری، ریاض)

مبارکپور ضلع اعظم گڑھ کا ایک معروف صنعتی اور تجارتی علمی وادبی قصبہ ہے۔ اس ارضِ مبارکپور کی یہ خاصیت ہے کہ اس نے اپنی کوکھ سے بڑے بڑے سورماؤں کو جنم دیا۔ اسی لئے کسی نے اسے ''ارضِ علماء'' سے تعبیر کیا ہے۔ اسی ارضِ مبارکپور نے جہاں اتنے نجوم وقمر کو جنم دیا، انہیں کی فہرست میں ایک نام والدِ محترم مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمه الله رحمة واسعة کا آتا ہے۔

اسی قصبہ مبارکپور سے شمال کی جانب تقریباً دو کلومیٹر کی مسافت پر ایک چھوٹی سی بستی ''حسین آباد'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ والدِ محترم اسی بستی میں 1942ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے چچا مولانا عبدالصمد صاحب کا شمار کبارِ علمائے مبارکپور میں ہوتا تھا اور آپ کے چچا حافظ یونس اس وقت کے نامور حافظ تھے۔ ان کی وفات کے وقت ان کے گرد گھر کی عورتیں اور مرد موجود تھے۔ انہوں نے عورتوں سے کہا:

''ہٹ جاؤ اور پردہ کرو!!..... میرے سامنے یہ کتنا اچھا آم ہے جو پک چکا ہے ذرا توڑ کر دینا''۔

اس کے بعد انتقال کر گئے۔

جس طرح والدِ محترم کے سات بھائی تھے۔ اسی طرح آپ کے والد (عبداللہ) کے بھی سات بھائی تھے۔ لیکن اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ان میں سے صرف آپ کے والد عبداللہ ہی زندہ بچ سکے۔ باقیوں میں سے کوئی زمانۂ طالبِ علمی میں انتقال کر گیا تو کوئی کہیں، تو کوئی گھر پر، جبکہ ایک چچا ابراہیم نے انگریزی حکومت کے زمانے میں کفار سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔

والدِ محترم کے دادا اپنے سامنے چھ بچوں کی جدائی سے دل برداشتہ تھے۔ بالآخر ان کا بھی وقت آن پہنچا اور داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اس طرح ان تمام لوگوں کے یتیم بچوں کی ذمہ داری آپ کے

والد محترم (عبداللہ) کے کندھوں پر آ گئی۔ غربت وتنگ دستی کے باوجود آپ کے والد محترم عبداللہ نے اپنے تمام بچوں کو دینی تعلیم دلانے اور حفاظ قرآن بنانے کی کوشش کی۔ مگر ان میں سے صرف تین ہی اپنی تعلیم مکمل کر سکے؛ ایک والد محترم، دوسرے چچا مولانا عزیز الرحمٰن مدنی رحمہما اللہ تیسرے حافظ عبدالحنان صاحب جو حفظِ قرآن کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ باقی اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر دنیاوی کاروبار میں مشغول ومصروف ہو گئے۔

والد محترم کا تعلیمی دور نہایت تابناک رہا۔ وہ اپنے تمام امتحانوں میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوتے رہے۔ مدرسہ عربیہ فیض عام سے فراغت کے بعد مختلف جگہوں پر درس وتدریس، خطبۂ جمعہ اور جلسے جلوس ومناظرے میں مشغول ہو گئے۔ وہ بیک وقت ایک اچھے مقرر، خطیب، مفسر محقق اور مصنف تھے۔ ان کی عالمی ایوارڈ یافتہ کتاب 'الرحیق المختوم' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

میں والد محترم کی سب سے چھوٹی اولاد ہوں، اس ناحیہ سے مجھے ان کے ساتھ زندگی گزارنے کا موقع بہت کم نصیب ہو سکا۔ جس وقت میرے شعور بیدار ہوئے اس وقت وہ مدینہ منورہ میں "مركز خدمة السنة والسيرة النبوية" سے منسلک تھے۔ یہ غالباً 1989، 1990 کی بات ہے۔ اس وقت وہ فیملی کے ساتھ رہ رہے تھے اور مکان چونکہ مسجد نبوی سے بالکل قریب تھا اس لئے عموماً مغرب وعشاء اور فجر کی نمازیں مسجد نبوی ہی میں ادا کیا کرتے تھے۔ اس وقت میں اور مجھ سے بڑے بھائی عامر اتنے ہی بڑے تھے کہ باآسانی پیدل چل سکتے تھے۔ ہم دونوں ان کے ہاتھوں کی ایک ایک انگلی تھام لیتے اور چلتے رہتے۔ جیسے ہی گنبد خضراء نظر آتا۔ میں کہتی کہ نبی کریم ﷺ کا گنبد نظر آنے لگا سب لوگ جلدی جلدی ان پر درود وسلام پڑھو۔ اور خود بھی پڑھنے لگتی۔ یہ میرا روزانہ کا معمول بن گیا تھا۔ بعد میں والد محترم اس بات کو بہت زیادہ یاد کیا کرتے تھے۔

شب وروز اسی طرح گزر رہے تھے کہ ایک روز اچانک دادا جان کے انتقال کی خبر پہنچی۔ والد محترم جامعہ سے لوٹے تو میں خوشی ومسرت کے ساتھ ان کی طرف لپکی، مگر اس دن ان کے چہرے پر خوشی نمودار نہ ہو سکی۔ بعد میں انہوں نے گھر کے افراد کو خبر دی اور خود دیوار سے ٹیک لگا کر کمبل سینے

تک ڈال کر بیٹھ گئے۔ اداس اور غم زدہ چہرہ، مفکرانہ انداز اور بڑی بڑی روشن آنکھوں میں طغیانی عیاں تھی۔ میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے کمرے کے اندر آتی اور انہیں اسی انداز میں بیٹھے دیکھ کر واپس چلی جاتی۔ مجھے ان کے غم کا اندازہ نہ تھا۔ مگر جب ہندستان لوٹ کر گئی تو وہاں دادا جان کو نہ پا کر ایک دھچکا سا لگا۔ اور یہ واقعہ ذہن میں ثبت ہو کر رہ گیا۔

والد محترم جب گرمیوں کی چھٹی میں ہندستان جاتے تو ان کا روزانہ کا معمول تھا کہ وہ ناشتہ کے فوراً بعد تحقیق و تالیف کا کام لے کر بیٹھ جاتے۔ تقریباً ظہر تک ان کا یہی معمول ہوتا تھا۔ پھر کھانا کھا کر تھوڑا سا آرام کرتے اور عصر کے بعد کا وقت مہمانوں کے ساتھ گزارتے۔ مغرب کے بعد گھر کے تمام لوگ ان کے ساتھ بیٹھ جاتے۔ گھر کے بڑوں سے گھریلو باتیں کرتے جبکہ ہم چھوٹوں کو موسی وفرعون یا کسی دوسرے نبی کے قصص سناتے اور اس میں بھی مذاق کا پہلو نہ چھوڑتے۔ ایک جملہ جو مجھے یاد رہ گیا وہ یہ ہے کہ "موسیٰ کا گھونسہ قبطی کو پڑا اور وہ مر گیا"، "دیکھا موسیٰ کا گھونسہ" اور ہم سب ہنس پڑتے۔

والد محترم لڑکیوں کے حجاب کے سلسلے میں بہت سخت تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جس وقت میں کلیۃ فاطمۃ الزہراء کی دوسری جماعت میں پڑھتی تھی، میری سہیلیوں نے نقاب لگانا شروع کر دیا تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی میرے اندر بھی نقاب لگانے کا شوق پیدا ہوا۔ اس سے پہلے میں یہ عرب کی چھوٹی بچیوں کی طرح نقاب لگا کر اوپر سے اسکارف باندھ لیا کرتی تھی۔ لیکن مردوں کو دیکھ کر منہ ڈھانک کر چلنے کا جو شوق پیدا ہوا وہ کم نہ ہو سکا۔ میں ہوسٹل میں رہتی تھی۔ ویک اینڈ پر جب گھر آئی تو میں نے والدہ سے نقاب بنوانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ والدہ میری باتیں سنی ان سنی کر رہی تھیں جب کہ میرا ضد عروج پر پہنچ رہا تھا۔ والد محترم اس وقت نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے، اتنے میں والد محترم نماز پڑھ کر گھر میں داخل ہوئے۔ اور مجھ سے پوچھنے لگے: کس بات کا ضد کر رہی ہو۔ والدہ نے صورت حال سے آگاہ کیا۔ بولے:

"وہ نقاب کے لیے ضد کر رہی ہے اور تم اس کو منع کر رہی ہو؟ اس کے لیے ابھی نقاب بنواؤ"۔

چنانچہ حکم کی فوراً تعمیل ہوئی اور میں اس وقت سے نقاب پہننے لگی۔ وللہ الحمد۔ جبکہ والدہ کا کہنا تھا کہ "تھوڑا اور بڑی ہو جانا تو پہننا۔"

میں نے دینداروں اور علمائے کرام کے گھروں میں دیکھا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو رشتہ داروں یا قریبی لوگوں سے پردہ کرنے میں کوتاہ نظر آتے ہیں۔ والد محترم اس معاملے میں بہت محتاط تھے۔ ہم بہنوں کو کسی قریبی رشتہ دار سے سامنا تو دور، کوئی بات کرنے کی بھی اجازت نہ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ چچا کے ایک لڑکے (جو ابھی بہت بڑے نہ ہوئے تھے) امی کو آواز دیتے ہوئے باہری دروازے سے کچھ اندر آ گئے تو والد محترم غضبناک ہو کر اپنی جگہ سے اٹھے اور ڈانٹتے ہوئے بولے:

"باہر چلو باہر چلو، اور باہر سے اجازت طلب کر کے آؤ"۔

وہ بیچارے اس قدر شرمندہ ہوئے کہ پھر بڑی مشکل سے والد محترم کا سامنا کرتے تھے۔

والد محترم اپنی بچیوں کا رات میں کہیں رکنا بھی بہت ناپسند کرتے تھے۔ کسی سہیلی کی شادی ہو یا خود اپنے خاندان اور گھرانے میں شادی ہو۔ ساری ہنگامہ آرائیاں ایک طرف، ان کی بات کا وزن ایک طرف۔ اسی طرح نماز کی پابندی خود بھی کرتے تھے اور ہم لوگوں کو بھی اس کی بڑی تاکید کیا کرتے تھے۔ اپنے متعلق ایک بار میں نے ان کو کہتے ہوئے سنا:

"میرے ساتھ اللہ کا یہ فضل ہے کہ جیسے ہی موذن کی اذان میرے کانوں میں پڑتی ہے، آنکھ کھل جاتی ہے"۔

اور کہتے:

"جس دن قیلولہ کرنے میں تاخیر ہو جاتی ہے تو مجھے نیند نہیں آتی کہ ابھی نماز کے لیے اٹھنا ہے"۔

اسی طرح امانت کے متعلق کہتے:

"جب تک صحیح سلامت امانت امانتداروں تک نہ پہنچ جائے مجھے چین نہیں ملتا اور اس کی فکر لگی رہتی ہے"۔

جب تک ان پر بیماری نے غلبہ نہیں پایا تھا بڑے انہماک سے اپنے کام میں مشغول رہتے تھے

اوراس میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ چائے کے عادی تھے۔کئی بار میں نے دیکھا کہ والدہ یا بہنیں خاموشی سے ان کے قریب چائے رکھ جاتیں اور وہ لکھنے میں اس قدر مشغول ہوتے کہ یہ دھیان ہی نہ دیتے کہ چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ جب دھیان دلایا جاتا تو کہتے:

''اف! یہ کہہ دینا چاہیے کہ چائے آچکی ہے''۔

پھر کئی بار میں نے دیکھا کہ والدہ چائے رکھنے کے بعد مجھ سے کہتیں کہ تم ہی کہو کہ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ میں کچھ ایسے مزاحیہ جملے بولتی کہ وہ نہ چاہتے ہوئے ہنس دیتے اور کہتے:

''تمہارا نام تو فریحہ ہونا چاہیے تھا''۔

پھر عربی یا فارسی یا علامہ اقبال کا کوئی شعر گنگناتے اور ساتھ ساتھ چائے بھی پیتے جاتے۔

ہاتھ سے بنائے گئے پھول، کڑھائی، پینٹنگ اور ہر قسم کی دستکاری کو بہت پسند کرتے اور ایسے ہنر کو خوب سراہتے، مختلف زاویے سے دیکھتے اور جانچتے کہ کیسے بنایا گیا ہے۔ ایک مرتبہ فاطمہ کلیۃ الزہراء مئو کے اندر طالبات کی دست کاری کی نمائش ہوئی، جس میں اولیٰ سے لے کر جماعت سابعہ تک کی طالبات نے مختلف قسم کے ہنر کو بڑی خوبصورتی سے سجا کر پیش کیا۔ اثنائے امتحان بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور جب ششماہی تعطیل ہوئی تو والد صاحب مجھے بلانے گئے انہیں بھی اس نمائش کو دیکھنے کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور پسند کیا، طالبات کے ہنر کی داد دی کہ اسی اثنا میں ایک شخص نے کہا کہ یہ سب کسی سے بنوایا اور خریدا گیا ہے، ان طالبات کو اتنا سلیقہ کہاں کہ وہ ایسے نفیس کام کر سکیں۔ والد محترم کو یہ بات بری لگی اور انہوں نے کہا کہ میں بالکل یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ ان طالبات نے بنایا ہے اور وہ اس لائق ہیں کہ ایسے کام سرانجام دے سکیں۔ اور میں نے بارہا اپنی بچیوں کو ایسے کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی تھی کہ ایک ایک چیز کو کلیہ کی طالبات نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔

دادی جان والد محترم کا بہت زیادہ احترام کیا کرتی تھیں، ان کے سامنے عام طور سے خاموش رہنا پسند کرتی تھیں اور اگر والد محترم تخت پر بیٹھے ہوتے تو کبھی بھی ان کے بالمقابل بیٹھنا پسند نہ

کرتیں؛ بلکہ زمین پر بیٹھنے کو ترجیح دیتی تھیں۔ مسلک اہل حدیث کے علاوہ وہ کسی اور مسلک پر تھیں۔مگر والد صاحب کے پڑھ لینے کے بعد مسلک اہل حدیث پر پختہ ہو گئیں۔اور کہا کرتیں کہ میرا بیٹا اتنے بڑے عالم دین ہیں وہ غلط باتیں نہیں بیان کر سکتے اور کہتیں کہ مجھے بہت فخر ہے کہ میں اتنے بڑے عالم دین کی ماں ہوں۔والد محترم کے بچپن کے دو چار واقعات کو اپنی زندگی میں بہت بیان کرتی تھیں۔ اگست 1998ء میں دادی جان کی وفات کے بعد جب ان واقعات کا تذکرہ والد محترم سے کیا جاتا تو وہ اس قدر رونے لگتے کہ سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔

والد محترم غریب غرباء کا بہت خیال کرتے تھے۔ پہلے ان کے حصے کا نکال کر پھر اپنوں پر خرچ کرتے۔لیکن تندرست اور ہٹے کٹے شخص کا سوال کرنا نہایت برا سمجھتے تھے اور عموماً ایسے مواقع پر خاموش ہو جاتے یا پھر کتاب وسنت کی روشنی میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتے۔اگر ایسا شخص کمائی کرنے لگ جاتا تو بہت خوش ہوتے۔بارہا ایسا دیکھنے میں آیا کہ اگر کوئی شخص اچھی نوکری کر رہا ہے تو لوگ حسد کرنے لگتے ہیں۔ایسے لوگوں سے دکھی ہو کر بار بار یہ جملہ دہراتے:

''اگر کسی کی روزی روٹی چلتی رہے تو اس کے جڑ میں نہیں لگنا چاہیے۔رزق تو اللہ دیتا ہے مگر اس کے لیے اسباب تلاش کرنا پڑتا ہے۔کوئی یہ نہیں جانتا ہے کہ کل ہم پر کیا وقت آ پڑے گا''۔

اور قرآن کی یہ آیت تلاوت کرتے:

﴿وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَاذَا تَكْسِبُ غَدًا﴾

والد محترم گھر کی عورتوں کو ہمیشہ یہ نصیحت کرتے کہ کبھی بھولے سے بھی کسی پر بددعا نہ کرنا اور اس کی بڑی تاکید کرتے تھے۔خود اپنے بعض حاسدین کے متعلق یہ جانتے ہوئے کہ وہ ایسے اور ایسے کہتے ہیں، کبھی پلٹ کر اُف تک نہ کہا۔مجھ سے کہتے:

''تم ہمیشہ حاسدین کے حسد سے پناہ مانگنا اور زندگی عیش کا نام نہیں۔زندگی میں کبھی تھک کر بھی عیش تلاش نہ کرنا اور میری یہ نصیحت پلو (آنچل) سے باندھ لو''۔

1995ء میں پہلی بار آپ پر فالج کا حملہ ہوا۔جامعہ اسلامیہ سے ڈیوٹی کر کے واپس ہوتے تو

عصر بعد تحقیق و تالیف کا کام کرنے میں لگ جاتے تھے۔ اس دن تفسیر قرآن کی تصحیح میں جٹے ہوئے تھے، جسے نہایت جلدی بازی میں ادارہ دارالسلام کے لیے پوسٹ کرنا تھا۔ لکھتے لکھتے رات کے نہ جانے کس پہر پورا کر کے اٹھے، تھکن سے چور تھے، ٹھنڈے پانی کی طلب محسوس ہوئی تو اتنا ٹھنڈا پانی پی گئے جو اُن کے لیے مضر ثابت ہوا۔ صبح اٹھتے ہی کہنے لگے:

''مجھے اپنے داہنے طرف جسم ہلکا محسوس ہو رہا ہے''۔

مگر حسب عادت جامعہ چلے گئے۔ جب لوٹے تو بیماری شدت اختیار کر چکی تھی۔ فوراً ہاسپٹل روانہ ہو گئے جہاں انہیں فوری طور پر بھرتی کر لیا گیا۔ آٹھ روز ہاسپٹل میں گزارنے کے بعد چھٹی ملی۔ گھر آئے سبھی ان کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ وہ لیٹے ہوئے مفکرانہ انداز میں ایک ایک کا چہرہ دیکھتے۔ پھر میرے چہرے پر نگاہیں جما دیں۔ وہ جانے کیا سوچ رہے تھے۔ میرا دل بھر آیا اور میں وہاں سے اٹھ گئی۔ بعد میں والدہ سے کہتے:

''میں اپنی بیماری کے ایام میں یہ بہت سوچتا تھا کہ اگر میں نہ رہا تو تم اتنے بچوں کو لے کر کیسے جاؤ گی اور کیا کرو گی؟''۔

پھر اللہ کے فضل سے قدرے بہتر ہو گئے۔ اور دیکھنے والے یہ اندازہ نہ لگا سکتے تھے کہ کبھی انہیں فالج بھی لگی تھی۔

مگر دوسری مرتبہ جب ان پر بیماری نے غلبہ پایا تو حافظے میں قدرے تغیر آ گیا تھا۔ صحت بھی پہلے جیسی نہ رہی تھی۔ کبھی کبھی بہت زیادہ غضبناک ہو جاتے تھے۔ بچوں سے بھی کافی لگاؤ رکھنے لگے تھے۔ غرض بہت ساری تبدیلیاں رونما ہو گئیں تھیں۔ جب ان سے کہا جاتا کہ اب آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں کمائی اور ادھر ادھر سفر کرنا چھوڑ دیں تو بہت غصہ ہوتے تھے۔ اور کہتے:

''جب تک میرے دم میں دم ہے میں خود کمائی کر کے کھاؤں گا''۔

اور بضد ہو کر ریاض آ جاتے۔ میرے یہاں آ جانے کے بعد میرے گھر میں سکونت اختیار کرتے اور معاملات میں مشورے کرتے اور میری رائے کو ترجیح دیتے۔ اور یہ میری خوش بختی ہے

کہ اس طرح مجھے بہت خدمت کا موقع مل جاتا تھا۔

پچھلے سال عید کے بعد اور بقر عید سے پہلے جب تشریف لائے تو میرے یہاں آئے، میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو نہ دیکھ سکے کیونکہ ان کی نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ چہرہ تھکن سے چور تھا اور سرخ ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا اپنی اولاد کو دیکھ کر اپنی تھکن اتار لینا چاہتے ہیں۔ مجھے کچھ شرمندگی کا احساس ہوا تو میں نے بہ آواز بلند سلام کیا تب کہیں جا کر جواب دے سکے۔

پھر ان کی روانگی سے دو روز قبل ان سے ملاقات کے لیے دارالسلام کے سکن میں گئی جہاں وہ ایک چارپائی پر تنہا لیٹے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر اٹھنے لگے تو میں نے اشارے سے منع کیا مگر وہ اٹھ بیٹھے۔ آج ان کے چہرے پر تھکن کا آثار نہ تھا بلکہ ہر تھکن سے مبرا نورانی چہرہ دیکھ کر مجھے بھی اطمینان ہوا کہ شاید بیماری ساتھ چھوڑ رہی ہے۔ بچوں کو دیکھ کر مسکراتے اور بلاتے۔ وقفے وقفے سے مجھ سے بھی دو چار باتیں کر لیتے۔ عموماً آج وہ خاموش مگر نہایت خوش تھے۔

جب میں واپس ہونے لگی تو جانے آج کون سی کشش تھی جس نے دو تین دفعہ باہر نکلنے اور پھر واپس آنے پر مجبور کیا۔ میرے دل میں یہ بات بھی کھٹکا کرتی تھی کہ والد محترم ہر وقت بیمار رہتے ہیں نہ جانے اب پھر کب ان سے ملاقات ہوگی۔ مگر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ جس روز رات میں ان کو ہندستان جانا تھا عشاء کے بعد میرے گھر تشریف لائے، بڑے بھائی ان کے ساتھ تھے (ہمیشہ سے پردیس رہتے تھے، انکی یہ عادت تھی کہ گھر سے نکلتے ہوئے جب اپنا آخری قدم نکالتے تو ایک منٹ کے لیے مڑتے، باری باری تمام اہل خانہ کو الوداعی نگاہوں سے دیکھتے اور پھر دھیرے دھیرے آگے بڑھ جاتے) تھوڑی دیر کے بعد جب جانے لگے تو مجھ پر الوداعی نگاہ ڈال کر باہر نکلے۔ میرا دل بھر آنے لگا تو میں دوسرے دروازے کی دوربین سے دیکھنے لگی بھائی ان کو جوتا پہنا کر کندھوں کے پاس سے سہارا دے کر باہر لے جا رہے تھے۔ حتیٰ کہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اور یہی میری ان سے آخری ملاقات تھی، اس کے بعد میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی اور نہ ان کی زندگی نے وفا کی کہ میں آپ کا آخری دیدار کر سکتی۔

میں نے والد محترم کی وفات سے دو چار روز قبل ایک خواب دیکھا کہ ایک نہایت خوبصورت محرابوں والا اور پیلی لائٹوں والا محل ہے جس میں آپ کی آمد کا انتظار ہے۔ میں اور بہت ساری خلائق جمع ہیں۔ پوچھا گیا: کون آرہا ہے؟ کس کا انتظار ہے؟ جواب ملا: مولانا کا، شیخ کا۔ کہ اتنے میں آپ تشریف لائے اور کسی کی طرف توجہ کیے بغیر ایک محرابی دروازے سے اندر داخل ہو گئے جو محل کے بیچوں بیچ تھا۔ یہ خواب دیکھ کر مجھے آپ کی وفات کا پختہ یقین ہو گیا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد میں نے ایک اور خواب دیکھا کہ آپ ایک ٹیبل کے گرد بیٹھے ہیں جس پر انواع واقسام کی مٹھائیاں ہیں جنہیں آپ بڑی رغبت کے ساتھ کھا رہے ہیں۔

اے اللہ! ہم تجھ سے بڑی عاجزی کے ساتھ دعا کرتے ہیں کہ تو انہیں اپنی رحمت کے سائے میں رکھ، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔ آمین۔

تیسری اور آخری بار آپ کی بیماری بہت شدت اختیار کر گئی تھی۔ بالآخر یکم دسمبر 2006ء بروز جمعہ سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مجھے کئی لوگوں سے یہ پتہ چلا ہے کہ وہ آخری دم تک مجھ سے ملاقات کے خواہش مند تھے۔ مگر اللہ نے مقدر میں ہماری آخری ملاقات نہ لکھی تھی۔ اور میں دل میں ہزار ہا حسرت لیے آپ کے آخری دیدار کے لیے عمر بھر کے لیے تڑپتی رہ گئی۔ اے اللہ! تو کسی پر ظلم نہیں کرتا، ہر چیز کی مصلحت اور بہتری کو تو سمجھتا ہے، ہم تیرے فیصلے پر سر تسلیم خم کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ تو مجھے صبر ایوبی عطا کر اور اس کا بہترین نعم البدل عطا کر۔ اے اللہ! تو ان کی مغفرت فرما، ان کے درجات بلند کر۔ ان کی قبر کو منور کر، ان کے نیک اعمال کو ان کی نجات کا ذریعہ بنا۔ انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کے ساتھ ان کے مرتبہ کو بلند کر اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ (آمین ثم آمین)

شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ

شخصیت۔حیات وخدمات۔یادیں (1)

(از: پندرہ روزہ ترجمان دہلی)

موت اس کی ہے کرے جس پہ زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾

''اس سرزمین پر جو بھی ہے ختم ہونے والا ہے، صرف تیرے رب کا چہرہ باقی رہے گا جو جاہ وجلال اور عزت واکرام والا ہے''۔ (رحمٰن:۲۶،۲۷)

حیات جاودانی صرف دارِ آخرت اور بقاودوام اللہ کی ذات کو حاصل ہے، ہر ذی روح کو اس دنیائے فانی سے عالم ابدی کا سفر کرنا ہے کیونکہ موت اللہ تعالیٰ کا حتمی اور اٹل فیصلہ ہے۔ایسے موقع پر ہم وہی بات کہیں گے جو رسول اکرم ﷺ نے کہی تھی:

''آنکھیں اشک بار ہیں، دل غمگین ہے، ہم وہی کہتے ہیں جو ہمارے رب کو پسند ہے اور ہم آپ کی جدائی میں غمزدہ ہیں''۔

اس دورِ قحط الرجال میں جب کوئی عالم دین اور داعی الی اللہ رخت سفر باندھ لیتا ہے تو دنیا تیرہ وتار نظر آنے لگتی ہے۔ایسے عالم اور داعی کی وفات سے علم نبوی کے آثار مٹنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

---

(1) پندرہ روزہ ترجمان دہلی 1، 15 جنوری 2007ء میں یہ مضمون شائع ہوا ہے۔مگر مضمون نگار کا نام مکتوب نہیں ہے۔بلا نام ہی شائع کر دیا گیا ہے۔نہ معلوم یہ کوتاہی ترجمان کے ذمہ داروں کی طرف سے ہے یا مضمون نگار اپنا نام ہی لکھنا بھول گیا ہے۔میں نے دو تین دفعہ دہلی بھی فون کر کے معلوم کیا مگر نام کا پتہ نہ چل سکا۔ممکن ہے کتاب کی طباعت کے بعد مضمون نگار کے نام کا انکشاف ہو۔بہر حال اگر نام کا پتہ چلا تو انشاء اللہ آیندہ ایڈیشن میں لکھ دیا جائے گا۔فی الحال ترجمان کے حوالے سے اسے شائع کیا جا رہا ہے۔از مرتب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

”إِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ الْعِبَادِ، وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ حَتّٰى إِذَا لَمْ يُبْقِ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُوسًا جُهَّالًا، فَسُئِلُوا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا“.

”واقعی اللہ تعالیٰ علم بندوں کے سینوں سے نہیں نکالتا ہے بلکہ علم کو علماء کے کوچ کرنے کے ساتھ اٹھالیتا ہے۔ یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین پر کوئی عالم باقی نہ رہے گا تو لوگ جاہل رہنماؤں سے مسئلے دریافت کریں گے اور وہ انہیں بغیر علم کے فتویٰ دیں گے، اس طرح وہ خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے“(1)۔

مولانا مبارکپوری کی وفات اس حدیث نبویؐ کے مصداق ہے۔ اس لیے کہ آپ کی موت سے علم کا ایک ستون گر گیا۔ آپ کی پوری زندگی علومِ نبوت کی تحصیل اور اس کی نشر واشاعت میں گزری۔ اسلام کا مخلص داعی و مناظر؛ امت مسلمہ کا بے لوث خادم اور قوم و جماعت کا سچا رہنما آج ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے اپنی مایہ ناز کتاب 'الرحیق المختوم' کے ذریعہ عالمی پیمانے پر جو شہرت پائی، وہ محتاج بیان نہیں۔ آپ کی شخصیت سے متاثر ہو کر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے جنرل سیکرٹری فضیلۃ الشیخ عمر محمد فلاتہؒ نے آپ کو جامعہ اسلامیہ کے ایک علمی و تحقیقی شعبہ ”مرکز خدمۃ السنۃ والسیرۃ“ میں باحث و محقق کی حیثیت سے مدعو کیا۔ جس وقت آپ جامعہ اسلامیہ تشریف لے گئے راقم السطور جامعہ اسلامیہ میں زیر تعلیم تھا۔ آپ سے اکثر طلبائے جامعہ مسجد نبوی کے اندر باب الرحمۃ کے پاس مظلات کے نیچے بعد صلاۃ مغرب حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے اور کافی دیر تک سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس طرح آپ سیرت مبارکہ و مطہرہ کی عطر بیزیوں کے ذریعہ مشام روح و جاں کو معطر کرتے اور تشفی و تسلی بخش جواب سے بہرہ ور کرتے کبھی کبھی تفریح طبع کے طور پر قصے اور واقعات بھی سنایا کرتے تھے لیکن انداز بیان بڑا ہی انوکھا اور اچھوتا ہوتا۔ اللہ

(1) بخاری:100، مسلم: 2673۔

تعالیٰ نے آپ کو وافر مقدار میں علم سے نوازا تھا۔ باطل افکار ونظریات کے خلاف آپ کا قلم تیر وتفنگ اور شمشیر برہنہ کے مانند تھا۔

آپ بلند پایہ محقق، مناظر اور موثر خطیب ومقرر اور ایک کہنہ مشق مدرس تھے گویا آپ کی ذات منبع علم وعرفان وآسمان علم وعمل کا درخشندہ ستارہ تھی جو یکم دسمبر 2006ء بروز جمعہ ڈھائی بجے دن میں ہمیشہ ہمیش کے لیے غروب ہوگیا اور اپنے پیچھے ہزاروں سوگواروں کو چھوڑ گئے۔ آپ کے سانحۂ ارتحال سے ملت اسلامیہ خصوصا جماعت اہل حدیث یتیم ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ آپ کی بشری خطاؤں کو درگزر کرتے ہوئے دینی خدمات کو قبول فرما کر جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے۔

مثل دیوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستان ہو ترا

حلیہ:

گول پرنور چہرہ، اس پر گھنی داڑھی، موتیوں جیسے چمکتے دانت، گندمی رنگ، چوڑا چکلا سینہ، بڑی بڑی آنکھیں، گٹھیلا بدن، متوسط قد۔ یہ اس بطلِ جلیل، سلطانِ قلم، شہنشاہِ اقلیم سخن وخطابت علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری کا وصف ہے جن کی جدائی کے صدمہ سے امت اسلامیہ آج دوچار ہے۔

مناظرات:

مولانا کو فن مناظرہ میں پوری مہارت اور قوتِ تامہ حاصل تھی۔ ان کی مناظرانہ تحریروں کے مطالعہ اور جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس فن کے امام تھے۔ 1978ء میں بنارس کے محلہ بجرڈیہہ میں اہلِ بدعت کے ساتھ آپ کا تحریری مناظرہ بڑی شہرت رکھتا ہے، جس میں آپ نے اپنے حریف کو چاروں شانے چت کر دیا تھا اور اس کو یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہونا پڑا تھا کہ قبروں پر بتاشہ چڑھانا اور اگربتی سلگانا ناجائز ہی ہے۔

اس مناظرے میں موصوف نے مخالف کی کتابوں اور فقہ حنفی کی کتابوں کے حوالے سے قبر پرستی اور قبر پر عرس وچادر چڑھانے کو ایسے زوردار دلائل سے رد کیا تھا کہ بریلوی مناظر کے دانت کھٹے

ہو گئے تھے۔ بعد میں اس مناظرے کی پوری روداد ''رزم حق و باطل'' کے نام سے شائع ہوئی تھی۔

اسی طرح منکرین سنت کو بھی آپ نے ایسا کاری زخم دیا کہ ان سے کچھ جواب نہ بن سکا۔ پھر اخیر میں آپ نے ان کے تمام دعوؤں کو قرآن کی آیات کے ذریعہ ایسے مضبوط طریقے سے رد کیا کہ ان کو حقیقت تسلیم کرنی پڑی۔ اس موضوع پر آپ کی تالیف ''انکارِ حدیث حق یا باطل'' مختصر مگر بہت ٹھوس ہے۔

خطابت وتقریر:

موصوف کے اندر خطابت کا زبردست ملکہ تھا۔ آپ نہایت پروقار سنجیدہ لب ولہجہ میں اپنی بات سامعین کے سامنے رکھتے جسے قرآن وحدیث کے نصوص سے مدلل فرماتے اور عام گھسے پٹے موضوعات سے ہٹ کر ایسے موضوعات کو اپناتے جن کی حالات کے لحاظ سے ضرورت ہوتی۔ چنانچہ کبھی توسیلہ کے موضوع پر تو کبھی مسلمانوں میں مغربی قوموں بالخصوص یہودیوں کے اثرات کی دراندازی پر اصلاحی خطاب فرماتے، کبھی عقائد کے دوسرے موضوعات کو اپناتے۔ بیان اتنا شیریں اور دلنشیں ہوتا کہ لگتا کہ دریا کا پانی ہے جو سبک خرامی سے بہتا چلا جا رہا ہے یا ساون کی برسات ہے کہ رِم جھم پانی برس رہا ہے اور طبیعتوں کو تراوٹ حاصل ہو رہی ہے۔

اخلاق وعادات:

آپ اسلامی اخلاق وآداب کے پیکر تھے، ملنے جلنے والوں سے خندہ پیشانی سے ملتے اور سوالات کے تشفی بخش جوابات دیتے۔ مبتدی ومنتہی تمام طلبہ آپ سے استفادہ کرتے۔ جامعہ سلفیہ میں تدریسی خدمات کے دوران بعد نماز جامعہ کی فیلڈ میں دیر تک کھڑے رہتے۔ طلبہ گھیر کر سوالات کرتے اور یہ ان کے جوابات دیتے۔ کبھی لطیفے سنا کر طلبہ کا دل جیتتے۔ قیام کا سلسلہ آدھ پون گھنٹہ تک جاری رہتا۔ اس کو طلبہ اسٹینڈنگ کانفرنس سے موسوم کرتے تھے۔

آپ کے انتقال سے علمی دنیا میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر ہونا آسان نہیں ہے، لیکن اللہ کی رحمت سے مایوسی بھی نہیں۔ اللہ رب العالمین سے دعا ہے کہ وہ آپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور انبیاء، صلحاء، صدیقین کے ساتھ حشر فرمائے۔ (آمین)

علامہ مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ

(از: جناب قاضی محمد رمضان صدیقی)

عالمِ اسلام کے عظیم عالمِ دین علامہ صفی الرحمن مبارکپوری بھارت میں انتقال کر گئے۔ موصوف پچاس سے زائد علمی و دینی کتب کے مصنف تھے۔ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے زیر انتظام سیرۃ النبی ﷺ کے انعامی مقابلے میں مقالہ لکھنے میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور پچاس ہزار ریال انعام حاصل کیا۔ ان کی اس کتاب نے پوری دنیا میں شہرت پائی۔ عربی زبان میں لکھا ہوا یہ مقالہ بعنوان ''الرحیق المختوم'' اردو و انگریزی اور دیگر کئی زبانوں میں شائع ہوا۔

بھارت میں ضلع اعظم گڑھ کے قصبہ مبارکپور کے علماء نے جس طرح علمِ قرآن و حدیث کی جستجو کی، اس سے بڑھ کر اسے دنیا بھر میں عام کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ کتبِ ستہ کی مشہور کتاب جامع ترمذی کی مبسوط شرح تحفۃ الاحوذی اور علامہ تبریزی ﷫ کی مشہور حدیث کی کتاب مشکاۃ شریف کی شرح مرعاۃ المفاتیح اسی سرزمین کے اہلِ علم کا علمی کارنامہ ہے۔ سرزمین مبارکپور کے چشم و چراغ علامہ صفی الرحمنؒ نے امام ابن حجر کی مشہور کتاب بلوغ المرام کی عربی شرح اِتحاف الکرام لکھی جسے پاکستان میں بزبان اردو دارالسلام لاہور نے خوبصورت انداز میں شائع کیا۔ علم حدیث کی تمام خوبیوں سے یہ کتاب مزین ہے۔ علامہ مبارکپوری نے بکھرے موتی اکٹھے کر کے ایک تسبیح کے دانوں کی طرح جمع کر دیا ہے۔

علامہ موصوف قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ ائمہ کرام کی فقہ سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ انھیں تمام ائمہ کرام کی آراء اور دلائل پر عبور حاصل تھا۔ وہ ایک بار پاکستان تشریف لائے تو انہوں نے پاکستان میں عموماً، پنجاب اہل حدیث مدارس کا خصوصی دورہ کیا۔ لاہور میں دارالدعوۃ السّلفیہ اور دارالعلوم تقویۃ الاسلام (مدرسہ غزنویہ) کے علاوہ فیصل آباد کے مشہور قصبہ ماموں کانجن کی دینی

وعلمی دانش گاہ (یادگار سید ین شہیدین) جامعہ تعلیم الاسلام تشریف لے گئے۔ جامعہ کے وسیع گراسی پلاٹ میں اساتذہ، طلبہ اور منتظمینِ جامعہ جو پھولوں کے جلو میں تشریف فرما تھے، سے علامہ مبارکپوری نے نہایت عالمانہ، مفسرانہ، محدثانہ اور مفکرانہ خطاب فرمایا اور جامعہ میں اس پذیرائی پر صدر جامعہ علامہ عبدالقادر ندوی، ممتاز اہلِ قلم قاضی محمد اسلم سیف فیروزی، ناظمِ جامعہ، اساتذہ اور طلبہ کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد وہ اپنے دلِ بے تاب اور محبتوں کو لے کر بالاکوٹ کی طرف عازمِ سفر ہوئے تاکہ شہیدین کی عظیم قربانیوں کے نقوش دیکھ سکیں۔ جنہوں نے اپنے لہو کی قربانی دے کر برصغیر سے انگریز شاطر کو نکالنے کی بنیاد رکھی تھی اور سبق دے گئے کہ

''جان جاتی ہے جائے مگر تاجدارِ انبیاء ﷺ کے دین پر حرف نہ آئے''۔

وہاں سے واپس لاہور تشریف لائے۔ شہیدِ ملت علامہ احسان الٰہی ظہیرؒ کا چوک دالگراں میں خطاب سنا۔ بعدازاں وہ اپنے وطن واپس چلے گئے۔ انہیں سعودی حکومت نے ریسرچ کے لیے سعودی عرب میں طلب کر لیا۔ عرصہ دراز تک وہ یہ خدمات سرانجام دیتے رہے کہ ماہ دسمبر 2006ء کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (1)۔

(1) بحوالہ ہفت روزہ اہلحدیث لاہور، پاکستان۔ 27 محرم الحرام 1428ھ۔

نامور سیرت نگار رخصت ہوگئے!

(از: پروفیسر عبداللہ ناصر رحمانی، پاکستان)

اس ماہ ذیلقعدہ ایک شہر الحزن کے طور پر گزرا۔اس میں امت مسلمہ بالعموم اور اہلحدیث بالخصوص پے در پے دو صدمات سے دوچار ہوئے پہلے عالم اسلام کی علمی شخصیت مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری اور پھر استاد العلماء قاری عبدالخالق رحمانی رحمہما اللہ ہمیں داغ مفارقت دے کر اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون

اول الذکر مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ کی وفات کی اطلاع ہمیں عاقل بھائی نے موبائل پر دی، جبکہ ہم کراچی سے حیدرآباد مدرسہ تعلیم القرآن والحدیث حیدرآباد میں درسِ صحیح بخاری کے لیے جا رہے تھے۔ عاقل بھائی جو جدہ میں مقیم ہیں کا اصل تعلق ہندستان کے شہر دیوبند سے ہے، اس ناطے سے وہ دیوبندی ہیں (باعتبار مسکن ومولد نہ کہ باعتبار مسلک) مسلکی اعتبار سے وہ بڑے پکے اور کھرے اہلحدیث ہیں وللہ الحمد۔

عاقل بھائی شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ کے خصوصی نیازمندوں میں سے ہیں۔ شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ ہندستان کے اس علاقہ سے تعلق رکھتے تھے جس نے نامور علماء ومحدثین پیدا کیے۔ مثلاً صاحب تحفۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ وغیرہ۔

شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ ہندستان کے مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے اور ان کی عمر کا بیشتر آخری حصہ سعودی عرب میں گزرا، جہاں وہ مختلف حوالوں سے خدمت علم میں مصروف رہے۔ کچھ عرصہ مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند کے امیر بھی رہے، لیکن پیرانہ سالی کی بنا پر از خود منصبِ امارت سے معذرت کرلی۔ شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ کا ایک عظیم علمی کارنامہ سیرت کے موضوع پر ان کی عظیم کتاب 'الرحیق المختوم' ہے۔ یہ کتاب سیرت نگاری کے بین الاقوامی مقابلہ میں اول انعام یافتہ قرار دی گئی جس نے ہم اہلحدیث کے سرفخر سے بلند کردیے اور بدخواہوں کے

منہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیے۔ جو اہل حدیث کو گستاخ رسول کہتے ہیں۔

الرحیق المختوم جس کا دنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، کا مطالعہ کرنے والے اس امر کے معترف ہیں کہ اس کے ایک ایک جملے سے محبت رسول ﷺ ٹپکتی ہے، اور یہی محبت سرمایۂ اہل حدیث ہے۔ کیونکہ اہل حدیث رسول اللہ ﷺ سے وہ حقیقی محبت کرتے ہیں جو عند اللہ مطلوب ہے اور قرآن وحدیث کے متقاضی ہیں۔ فجزاه الله عنا وعن المسلمين خير الجزاء.

شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ سے میری سعودی عرب میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں، میں نے انہیں سادگی، تواضع، وقار اور اخلاق حمیدہ کا پیکر پایا۔

شیخ صاحب کے مختلف درس سننے اور مستفید ہونے کا موقع بھی ملا۔ ان کے علمی استحضار اور قوتِ استدلال کی داد دینی پڑتی ہے، لیکن ایک چیز جس سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا وہ ان کا نصوصِ کتاب وسنت پڑھنا اور ان کا انتہائی سلیس ترجمہ کرنا ہے اور یہ ایک بڑا فن ہے۔ کیونکہ قرآن مجید جو کہ خیر الکلام اور حدیث جو کہ اس ہستی کا فرمان ہے جو افصح العرب تھی اور جنہیں جوامع الکلم دیے گئے تھے، کا فی البدیہہ اس قدر سلاست اور روانی سے ترجمہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی توفیق ہے۔

شیخ صاحب کی سادگی اور تواضع کی مثال یہ ہے کہ میں نے 1994ء کے سفر حج کے موقع پر قیامِ مدینہ منورہ کے دوران ٹیلی فون پر رابطہ کر کے چند اہم امور پر گفتگو کے لیے ایک خصوصی ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تو آپ فوراً اس ہوٹل میں تشریف لے آئے جس میں میرا قیام تھا۔ بلکہ اس موقع پر ایک لطیفہ بھی سامنے آیا جو ان کی طبیعت کی لطافت اور مزاح کی دلیل ہے۔ میں نے انہیں ایک بڑے گلاس میں مشروب پیش کیا اور خود ایک چھوٹے گلاس میں پینے لگا تو فرمایا: ''یہ تو ''قسمة ضيزى'' ہے۔ شیخ صاحب سے دوسری ملاقات مکہ مکرمہ میں میرے ہوٹل کے کمرہ میں ہی ہوئی۔

شیخ صاحب کی سیرت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ حتی الوسعت مالی امانات کو اپنے ہاتھ میں لینے سے سخت اجتناب کیا کرتے تھے۔ کیونکہ امانات کا معاملہ نہایت ہی سنگین ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ آج شیخ صاحب دنیا میں موجود نہیں لیکن ان کی بیسیوں تصنیفات،

سیکڑوں شاگرد اور ہزاروں، بلکہ لاکھوں مستفیدینِ دروس ان کے صدقہ جاریہ کے طور پر موجود ہیں۔

مشاہیر اہل علم کے جنازے بھی بڑی عظمت وہیبت کا موقع ہوتے ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا تھا:

"بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ يَوْمَ الْجَنَائِزِ".

یعنی میرے اور تمہارے درمیان جنازے کے دن ہی فیصلہ ہوگا کہ کس کے چاہنے والے زیادہ ہیں اور کس کے کم۔ کس کی عظمت لوگوں کے دل میں کتنی ہے اور کون حق پر ہے، اس کا اندازہ ہمارے تمھارے جنازے ہی سے لگایا جاسکتا ہے۔

ہم نے شیخ صفی الرحمٰن کا جنازہ غائبانہ حیدرآباد سندھ میں تکمیلِ بخاری کے درس کے بعد پڑھا جس میں سندھ بھر کے سیکڑوں علماء اور طلبۃ العلم اور عوام کا ایک جم غفیر موجود تھا۔

"اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه".

شیخ صفی الرحمٰنؒ کے انتقال کا صدمہ ابھی تازہ ہی تھا کہ ایک دوسرے المیہ سے جماعت اہل حدیث کو دوچار ہونا پڑا اور وہ تھا خطیب عالم اسلام استاد العلماء قاری عبدالخالق رحمانیؒ کے سانحۂ ارتحال کی خبر (1)۔

(1) بحوالہ ماہنامہ شہادت، فروری 2007ء، اسلام آباد، پاکستان۔

شیخ مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا ایک پہلو

(از: عمر فاروق عبدالستار مکی، مکہ مکرمہ)

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے!

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ ایک طویل علالت کے بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے اور اس دارِ فانی سے دارِ بقا کو کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا کے انتقال کی خبر اس وقت آنا شروع ہوئی جب میں مسجد الحرام میں خطبہ جمعہ سن رہا تھا اور موبائل کو صامت کر دیا تھا۔ لیکن بار بار گھر سے فون آنا شروع ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ شاید میرے گھر یا مولانا کے گھر کوئی حادثہ ہو گیا ہے اور قبل اس کے کہ میں اتصال کروں، جمعہ کی نماز ختم ہوتے ہی اہلیہ کا فون آیا کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا اور یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری، کیونکہ مجھے اطمینان ہو چلا تھا کہ مولانا تیزی کے ساتھ روبصحت ہو رہے ہیں۔ اور جمعہ ہی کے دن صبح میں گھر پر اتصال کیا تھا تو معلوم ہوا کہ مولانا کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر ہے۔

اچانک موت کی خبر سن کر دل کو یقین نہیں ہو رہا تھا لیکن دل کو کسی طرح تسلی دی کہ موت قدرت کا ایک اٹل فیصلہ ہے، جس سے کسی حال میں بھی مفر نہیں، کسی نہ کسی لمحہ اس سے دوچار ہونا ہی ہے۔

اب مولانا تو نہ رہے لیکن ان کی گرانقدر خدمات ان شاء اللہ تا قیامت ان کو جاوداں رکھیں گی اور آنے والی نسلیں ان کی علمی خدمات سے مستفید ہوتی رہیں گی اور یہ ان کے لیے صدقہ جاریہ کا سبب بنے گی۔

جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"إِذَا مَاتَ الإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلاثٍ: صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، وَعِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، وَوَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ".

"جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، مگر تین اعمال جاری رہتے ہیں: پہلا صدقہ جاریہ، دوسرا جس علم سے نفع پہنچ رہا ہو، تیسرا صالح اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی ہے"(1)۔

مولانا کا تعلق ایک علمی خانوادے سے تھا۔ مولانا کے چچا مولانا عبدالصمد صاحب مبارکپوری تھے جو جوانی کے ایام میں ہی موت کی نظر ہو گئے۔ جن کی دینی خدمات اہل حدیث امرتسر میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اور آپ کے بھائی عزیز الرحمٰن مدنی چند سال قبل داغِ مفارقت دے گئے اور آپ کی پھوپھی شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری صاحب مرعاۃ المفاتیح کے عقد سعید میں تھیں۔

مولانا کے طالب علمی کا دور جیسا کہ ان کے گھر کے لوگوں نے بتایا کہ بہت تنگدستی کا دور تھا۔ گھر کی آمدنی بہت محدود تھی، لیکن مدارس کی تعلیم وتعلم نے مولانا کو آگے بڑھنے کا موقع دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر مدارس میں مفت تعلیم اور قیام وطعام کا انتظام نہ ہوتا تو شاید آج علماء کی تعداد انگلیوں پر گنی جاتی، لیکن مفت تعلیم وتعلم نے غریبوں کو بھی اس میدان میں بھرپور آگے بڑھنے کا موقع عطا کیا؛ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ آج اکثریت ایسے ہی علماء کی ہے جو کسی غریب گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔

مولانا فراغت کے بعد فوراً تدریسی مشغلہ سے جڑ گئے اور پھر تصنیف وتالیف کا لامتناہی سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ لیکن اس کے بعد ان کی اور ان کے گھر کے لوگوں کی روزمرہ کی زندگی میں کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آیا۔ ان کے گھر کے ایک فرد نے ان کی معاشی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ کبھی کبھی لکھنے کے لیے ان کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہوتا کہ اس سے سیاہی خرید سکیں تو گھر میں جو چاول کھانے کے لیے ہوتا اسی کو جلا کر راکھ بنا لیتے اور پھر اس کو سیاہی کے طور پر لکھنے کے لیے استعمال کرتے!!

(1) مسلم: 1631۔ ترمذی: 1376۔ الفاظ ترمذی کے ہیں۔

مولانا جہاں زبردست علمی صلاحیت کے مالک تھے وہیں وہ بعض عصری ہنر سے بھی واقف تھے۔ طالب علمی کے دوران چھٹیوں میں کپڑا بننے کا کام بھی کیا کرتے تھے اور وقتاً فوقتاً چڑیوں کا شکار بھی کیا کرتے تھے اور اپنے بچے اور بچیوں کا کپڑا بھی خود ہی سلتے تھے۔

میری اہلیہ نے ایک بار ان کے تعلیمی انہماک پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ جب والد صاحب کوئی کتاب پڑھتے یا لکھنا شروع کرتے تو اس قدر مشغول ہوتے کہ ان کے اردگرد کیا ہو رہا ہے ان کو اس کا کچھ احساس نہیں ہوتا تھا!! ہم لوگ ان کے پاس چائے بنا کر رکھ دیتے اور جب تک ان کو خبر نہ کی جاتی ان کو معلوم نہ ہوتا کہ کوئی چیز میرے پاس رکھی گئی ہے!!

یہ تھیں ان کی زندگی کی بعض جھلکیاں۔

ویسے تو مولانا کی زندگی کا ہر پہلو قابلِ ذکر ہے۔ مگر میں نے ان سارے پہلوؤں سے ہٹ کر صرف چند ایک جھلکیاں منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ دراصل مولانا کی زندگی گوناگوں خوبیوں سے پُر ہے۔ خاص کر ان طالبانِ علومِ نبوت کے لیے ان کی زندگی میں بہترین نمونہ اور اسوہ ہے جو غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ آج کے اس مادی دور میں مال وزر کا علم کے حصول میں نمایاں کردار ہے۔ مگر مولانا کی زندگی سے یہ واضح ہے کہ اگر اس مادی دور میں بھی کوئی غریب لڑکا اپنی قابلیت اور علمی صلاحیت سے دنیا کو اپنے سامنے سرنگوں کرانا چاہے تو کرا سکتا ہے اور اپنی محنت و مشقت اور جہدِ مسلسل سے اعلیٰ کامیابی کی منازل طے کر سکتا ہے۔

میں چونکہ مولانا کا داماد ہوں اور ان کی زندگی کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہوں، اس لیے میں مولانا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کے بعد خاص کر طلبہ کو یہ پیغام دینا چاہوں گا کہ وہ مولانا کی سوانح پڑھیں اور ان کی کتابوں کا مطالعہ کر کے اپنی زندگی کا لائحۂ عمل بھی تیار کریں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور امت کو ان کا بہترین نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین

اَللّٰھُمَّ اسْقِهِ "مِنْ رَحِيقٍ مَخْتُومٍ"

(از: حافظ احمد شاکر، مدیر ہفت روزہ 'الاعتصام' لاہور)

ہفتہ رفتہ کی بہت اندوہناک خبر "الرحیق المختوم" کے مصنف مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ طویل علالت کے بعد اپنے وطن مالوف حسین آباد جو کہ مبارک پور سے ایک کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، میں بروز جمعۃ المبارک مؤرخہ ۹ ذیقعدہ ۱۴۲۷ھ بمطابق یکم دسمبر 2006ء انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مبارک پور برصغیر کے مردم خیز علاقوں میں سے ایک بہت ہی زرخیز خطہ ہے۔ یہ خطہ مولانا عبدالسلام مبارکپوری مصنف سیرۃ البخاری، تحفۃ الاحوذی کے مصنف جلیل مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ، مرعاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح کے مصنف شہیر شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوریؒ جیسی عظیم ہستیوں کا مولد و مسکن رہا ہے۔ مولانا صفی الرحمانؒ بھی اسی خطے کے فرزند ارجمند اور خاندانی علم و آگہی کے گلِ سرسبد تھے۔

مولانا رحمہ اللہ سے پہلی ملاقات اکتوبر 1980ء میں جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حرمین شریفین کی پہلی زیارت نصیب کی تھی، حرم مکی میں ہوئی۔ اس وقت "الرحیق المختوم" کے اوّل انعام پانے کی خبر چہار دانگ عالم میں پھیل چکی تھی۔ اس لیے ملاقات ہوتے ہی اہل حدیث مصنف کی سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر غیر مطبوعہ کتاب شائع کرنے کی دیرینہ خواہش زبان پر آ گئی۔ جسے مولاناؒ نے کمال تلطف و مہربانی سے قبول فرما لیا۔ اس کے بعد مولانا مرحوم سے میں باضابطہ رابطہ تو نہ رکھ سکا اور نہ ہی کر سکا لیکن مولانا نے میری درخواست یاد رکھی اور وعدہ ایفا کرنے کے لیے انہوں نے 1984ء میں بنفس پاکستان کو قدومِ میمنتِ لزوم سے مشرف فرمایا، اور اس کا مسودہ المکتبۃ السلفیۃ کے سپرد کر دیا۔ جسے بتوفیقہ تعالیٰ اجر و ثواب بلکہ ہر مسلمان کی شفاعت کی خواہش کے ساتھ ہر ممکن حد

تک اعلیٰ وعمدہ معیار کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے المکتبۃ السلفیۃ اس کی اشاعت کی سعادت سے بہرہ ور رہوا۔

کم وبیش بیس سال کے طویل عرصے میں مولانا سے ان گنت ملاقاتیں ہوئیں۔ 1992ء میں ان کی رہائش حسین آباد جا کر ان کی میزبانی کا حظ بھی اٹھایا۔ اس کے بعد مدینہ منورہ میں ان کی رہائش اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے شعبہ خدمۃ السنۃ والسیرۃ میں بھی شرف ملاقات رہا۔ مولانا رحمہ اللہ کمال کے سخن فہم، حاضر جواب، استحضارِ علم کی دولت سے مالا مال، چاک وچوبند اور نہایت منتظم مزاج شخصیت تھے۔ 'الرحیق المختوم' کو اللہ تعالیٰ نے خلق خدا میں جس قبولیت سے نوازا اس کی مثال کم ہی ملتی ہے کیونکہ مولانا نے نبی ﷺ کی سیرت کے اس پہلو کو اجاگر کیا جس کی طرف مصنفین کی عموماً توجہ کم ہی رہی، یعنی نبی اکرم ﷺ کے غزوات، سریات، آپ کی جنگی مہارت اور حکمت عملی۔ اس موضوع کی طرف اللہ تعالیٰ نے ان کی راہ نمائی اس وقت فرمائی جب مسلم امہ کو اس کی ہی ضرورت تھی اور واقعتاً 'الرحیق المختوم' پڑھ کر جہاں اس کے قاری کا جذبہ بیدار ہوتا ہے وہاں اس کے سامنے اسلام کا نظریۂ تبلیغ بھی سامنے آجاتا ہے اور اس کے جنگی اصول بھی۔ اور ہماری اطلاع کے مطابق یہ کتاب بہت سے مسلمانوں کی ہدایت کا سبب بھی بنی۔

یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام میں 'الرحیق المختوم' ہی سے ان کی شہرت کو چار چاند لگے اور یہی کتاب ان کی وجہ تعارف بنی۔ اور ہمیں یقین ہے کہ یہ سب کچھ نتیجہ ہے بارگاہِ صمدی میں اس کتاب کی مقبولیت کا۔ قارئین یہ جان کر حیران ہوں گے کہ اردو کے علاوہ اس کا انگلش، بنگلہ، صومالی اور دیگر زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے اور طبع بھی۔

اس کتاب سے پہلے بھی ان کی بعض تصنیفات، مقالات، ترجمے اور مناظرے طبع ہو چکے تھے اور اس کے بعد بھی مولانا نے دارالسلام الریاض کی اکثر مطبوعات کا اشراف فرمایا اور حقیقت ہے کہ برادرِ عزیز مولانا عبدالمالک مجاہد حفظہ اللہ نے مولانا کی خدمت بھی خوب کی اور ان کے قیمتی وقت کو ضیاع سے بچا کر اس امت کو اس کا فائدہ بھی خوب پہنچایا۔ 'الرحیق المختوم' طبع ہونے کے

بعد مصنف 'الرحیق المختوم' ان کے نام کا جزء بن گیا تھا۔

المکتبة السلفية، اس کے کارکنان، دارالدعوۃ السلفیہ کے اراکین، ہفت روزہ الاعتصام کے رفقائے کار کے علاوہ پاکستان کے مسلمان عموماً اہل حدیث خصوصاً اس صدمے سے نہایت متاثر اور غمگین ہیں۔ راقم الحروف سے بہت سے احباب نے اظہار تعزیت کیا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ دنیا میں ان کی کتاب کی مقبولیت کی طرح ان کو اپنے مقبول بندوں میں شامل فرمائے۔ بشری لغزشوں سے درگزر فرما کر بلندئ درجات سے نواز کر ان کو اعلیٰ علیین میں انبیاء، شہداء وصالحین کا ساتھ نصیب فرمائے[1]۔ یرحمه الله عبداً قال آمینا.

(1) دیکھئے: ہفت روزہ 'الاعتصام' لاہور، پاکستان۔ 8 تا 14 دسمبر 2006ء۔

اہل اللہ کی رحلت

(از: ہفت روزہ اہلحدیث، پاکستان)

مسلک اہل حدیث کے بہت بڑے عالم جناب مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ گزشتہ دنوں رضائے الٰہی سے وفات پاگئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ کو باوجود درمکانی کے پاکستان کے تمام اہل علم تو جانتے ہی ہیں، سیرۃ النبی ﷺ پر ان کی بے مثال کتاب 'الرحیق المختوم' کے حوالے سے مسلک اہل حدیث کے حاملین عام افراد بھی اچھی طرح سے آگاہ ہیں۔ مولانا محترم کے خیالات زندگی کے حوالے سے جماعتی رسائل میں بہت سے اہلِ قلم لکھ چکے ہیں یا لکھ رہے ہیں، میں یہاں ان کی دسمبر 1985ء میں پاکستان آمد پر جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن میں تشریف آوری کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

آپؒ بہترین مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ اتنے ہی اچھے مدرس بھی تھے۔ 1985ء میں آپؒ جامعہ سلفیہ بنارس بھارت میں پڑھا رہے تھے اور آپ کے اس دورے میں جامعہ سلفیہ بنارس کے ایک اور مدرس مولانا محمد مستقیم سلفی بھی آپ کے ساتھ تھے۔ جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن کی انتظامیہ کی دعوت پر آپ 2 دسمبر 1985ء کو جامعہ میں تشریف لائے۔ یہاں آپ نے جامعہ کے اساتذہ، اس کے منتظمین اور مجلس کے طلبہ سے خطاب فرمایا، جامعہ کی شاندار لائبریری دیکھی اور Vistors Book (کتاب تاثرات) پر مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''اللہ تعالیٰ کا بے پایاں فضل وکرم ہے کہ محض اس کی توفیق سے راقم الحروف کو جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن کی زیارت نصیب ہوئی۔ اس کے درو بام دیکھ کر خوشی ومسرت کا جو احساس ہوا اسے الفاظ کا جامہ پہنانا مشکل ہے، اس کی ظاہری جاذبیت سے اس کی یہ باطنی یا داخلی خصوصیت بے حد اہم ہے۔ اسے جماعت مجاہدین سے بے حد گہرا ربط رکھنے

والے جناب صوفی عبداللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے وجود بخشا ہے اور یہ ان کی مخلصانہ مساعی کا ایک ٹھوس ثمرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس ادارہ کو قائم و دائم رکھے اور اسے امت کی تعمیر اور رشد و ہدایت کا مرکز بنائے اور اس کے منتظمین و متعلقین کو بیش از بیش توفیق عطا فرمائے (آمین)"۔

دستخط بزبان اردو

مولانا مرحوم علم و عمل کا پیکر تھے، سیرت نگاری کے عالمی مقابلہ میں پہلی پوزیشن کے بعد آپ ہر سال حج کے لیے تشریف لے جاتے تھے اور یہ اللہ کی طرف سے آپ کے لیے بہت بڑی سعادت تھی۔ ایامِ حج میں اکثر پاکستانی علماء کی آپ سے ملاقات ہوتی اور سچی بات ہے کہ پاکستانی علماء سے آپ کی اس مسلسل میل ملاقات کی وجہ سے آپ کا ذکر اکثر و بیشتر علماء کی مجلس میں ہوتا رہتا تھا اور آپ کی وفات حسرت آیات پر اسی بنا پر بھارت سے بھی بڑھ کر پاکستان میں دکھ محسوس کیا گیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

ان کی وفات پر جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن میں غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی اور جامعہ کے مہتمم مولانا عبدالقادر ندوی حفظہ اللہ کی صدارت میں ہنگامی اجلاس کیا گیا جس میں شیخ الحدیث مولانا حافظ محمد بنیامین طور حفظہ اللہ، تمام اساتذۂ کرام اور ماموں کانجن کے سابق چیئرمین رانا شمیم احمد خان نے شرکت کی۔ ندوی صاحب نے نہایت اچھے الفاظ میں ان کا تذکرہ کیا۔ جامعہ سے ان کے تعلق پر روشنی ڈالی (1)۔ اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه۔

(1) دیکھئے: ہفت روزہ اہلحدیث، پاکستان۔ جنوری 2007ء کا آخری شمارہ۔ یہ مضمون انٹرنیٹ سے لیا گیا ہے۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری۔تعارف وخدمات

(از: ہفت روزہ 'الاعتصام' لاہور 20 دسمبر 1985ء)

[مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری بنارس، ہند سے 29 نومبر 1985ء کو مولانا محمد مستقیم سلفی صاحب کے ساتھ لاہور تشریف لائے اور 10 دسمبر 1985ء کو واپس ہندستان تشریف لے گئے۔ 9 دسمبر کی شام کو مولانائے محترم کے اعزاز میں ''دارالدعوۃ السلفیہ'' لاہور نے ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا تھا، جس میں لاہور کے علاوہ پنجاب کے مختلف شہروں سے احبابِ جماعت اور علماء وزعماء کی ایک کثیر تعداد نے شرکت فرمائی۔اس تقریب میں مہمانِ خصوصی مولانا مبارک پوری حفظہ اللہ نے ہندستان میں جماعت اہل حدیث کا ماضی، حال اور مستقبل کے عنوان سے جامع خطاب فرمایا۔ان کے خطاب سے قبل راقم نے حسب ذیل سطور میں مہمان گرامی قدر کا مختصر تعارف پیش کیا۔حافظ صلاح الدین یوسف]

ہماری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ آج ہم عالمِ اسلام کی ایک ممتاز شخصیت، صاحبِ علم وفضل بزرگ اور نامور مصنف کا استقبال کر رہے ہیں۔ میری مراد اِس سے مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری دام ظلہ ہیں۔

مبارکپور کا علاقہ اہل علم میں معروف ہے کہ ہند کی یہ سرزمین بڑی مردم خیز رہی ہے۔اور اب بھی ہے اور ہماری دعا ہے کہ تا قیامت رہے۔بالخصوص جماعت اہل حدیث کے لیے مبارکپور کا نام:

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

کا مصداق ہے۔کیونکہ ہماری جماعت کے بہت سے اکابر کا تعلق اسی مبارک پور سے ہے۔ مثلاً مولانا عبدالسلام مبارکپوری رحمہ اللہ مصنف ''سیرۃ البخاری''، مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری مصنف ''تحفۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی''۔جس نے عرب وعجم کے علماء سے خراج تحسین حاصل کیا۔اس کے علاوہ ان کی متعدد اہم علمی وتحقیقی تالیفات ہیں۔جیسے ''تحقیق الکلام فی وجوب قراءۃ الفاتحۃ خلف الامام'' اور ''ابکار المنن فی جواب آثار السنن'' وغیرہ۔مولانا عبدالصمد مبارکپوری

مرحوم، جو ہمارے مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری، آج کی تقریب کے مہمان خصوصی کے تایا تھے، ان کی ایک اہم کتاب ''تائیدِ حدیث بجواب تنقیدِ حدیث'' ہے۔ جو مشہور منکر حدیث حافظ محمد اسلم جیراج پوری کے جواب میں ہے۔ یہ کتاب بالاقساط مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کے ہفتہ وار پرچہ ''اہل حدیث'' امرتسر میں شائع ہوئی ہے۔ اسی طرح ایک اور کتاب ''شانِ حدیث'' ہے جو حجیت حدیث پر ایک مفصل اور بڑی اہم کتاب ہے، تاہم یہ ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ مولانا عبیداللہ رحمانی شیخ الحدیث حفظہ اللہ تعالیٰ، جن کی ''مرعاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح'' نے ''کم ترک الأولون للآخرین'' کے مقولے کو ایک حقیقت ثابت کر دیا ہے۔

برصغیر پاک وہند میں اہل حدیث کی ماضی قریب کی یہ عظیم علمی شخصیات ہیں جو اہل حدیث کی تاریخ کا عظیم سرمایہ اور مایۂ صد فخر وناز ہیں اور جن کے بارے میں ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں۔

أولئک آبائي فجئني بمثلهم

إذا جمعتنا یا جریرُ المجامع

اسی آسمانِ علم وعمل کے ایک کوکبِ درخشاں، اسی سرزمینِ مبارک پور کے ایک ذرۂ تاباں اور اسی خانوادۂ علم وفضل کے ایک روشن چشم وچراغ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری دامت برکاتہم ہیں۔ جن کو اس مشہور سرزمین سے صرف خلقی نسبت ہی نہیں اور اس نامور خانوادۂ علمی سے صرف نسبی تعلق ہی نہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ خود بھی اس سرزمین کی صفتِ مردم خیزی کا ایک زندہ جاوید ثبوت ہیں اور اپنے نامور خاندان کی علمی ودینی روایات کے حامل اور امین ہیں۔ کَثَّرَ اللّٰهُ أَمْثَالَهُمْ.

اکثر اہل علم جانتے ہیں کہ آج سے چند سال قبل رابطہ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) کے زیر اہتمام سیرت پر لکھی گئی کتابوں کا ایک عالمی مقابلہ ہوا۔ مولانائے محترم ہمارے مہمان خصوصی، مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری نے بھی اس مقابلے میں شرکت فرمائی اور عربی زبان میں 'الرحیق المختوم' کتاب تالیف کی اور سیرت کے عالمی مقابلے کے لیے سعودی عرب روانہ فرما دی۔ اس عالمی مقابلے میں ان کی یہ کتاب اول نمبر پر آئی اور انہیں حرمین شریفین بلا کر پہلا انعام عطا کیا گیا۔

این سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اس لحاظ سے مولانائے محترم ان باکمال ہستیوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے ایک عجمی ملک اور خالص عجمی ماحول میں رہتے ہوئے عربی زبان وادب اور عربی انشا وتحریر میں یہ کمال پیدا کیا کہ عرب کے اہلِ علم واہلِ قلم نے بھی اس کی داددی اور اس کو نہ صرف سراہا؛ بلکہ اسے سزاوارِ انعام قرار دیا۔ یہ کتاب پونے چھ سو صفحات پر مشتمل رابطۂ عالمِ اسلامی کی طرف سے چھپ کر عام تقسیم ہو رہی ہے۔ یہ بات مزید مسرت کا باعث ہے کہ مولانائے محترم نے اپنی اس سیرت کی کتاب کو اب اردو کے قالب میں بھی ڈھال دیا ہے اور اسے ''مکتبہ سلفیہ'' لاہور کو اشاعت کے لیے دے دیا ہے۔ جسے اب یہ مکتبہ اپنے روایتی معیار اور حسن وخوبی کے ساتھ انشاء اللہ شائع کرے گا۔

عربی انشا وتحریر کے ساتھ مولانا موصوف اردو کے بھی ایک منجھے ہوئے ادیب اور صاحبِ قلم ہیں۔ اور ماہنامہ ''محدث'' بنارس کے مدیر ہیں، جس میں ان کی فکر انگیز تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں اور قارئین ''الاعتصام'' جن سے بخوبی واقف ہیں۔ کیونکہ متعدد مرتبہ ان کی نگارشات ''الاعتصام'' کے صفحات میں شائع ہو چکی ہیں۔

مولانائے محترم ایک کامیاب مناظر بھی ہیں۔ آج سے چند سال قبل قبر پرستی اور اس سے متعلقہ مشرکانہ اور بدعتانہ امور پر مولانا موصوف کا ایک مناظرہ بنارس ہی کے ایک محلے بجرڈیہہ میں ہوا، جس کا یہ اثر ہوا کہ اس مناظرے میں شریک فریقِ ثانی کی ایک خاصی تعداد اہل حدیث ہوگئی اور یوں مولانا کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے ان کو شرک وبدعت کی تاریکیوں سے نکال کر توحید وسنت کی روشنی نصیب فرمائی۔ اس مناظرے کی روداد ''رزم حق وباطل'' کے نام سے کتابی شکل میں چھپ گئی ہے اور عنقریب یہ کتاب پاکستان میں بھی انشاء اللہ شائع ہوگی۔

جامعہ سلفیہ بنارس، جماعت اہل حدیث ہند کی عظیم مرکزی درس گاہ ہے، جس میں سیکڑوں طالب علم زیر تعلیم ہیں۔ اس کے علاوہ جامعہ کے زیر اہتمام دو ماہنامے نکلتے ہیں۔ ایک عربی میں، جس کا نام ''مجلة الجامعة السلفية'' ہے۔ دوسرا اردو میں جس کا نام ''محدث'' ہے۔ مزید

برآں اردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں میں جامعہ کا شعبۂ تصنیف وتالیف، کتابوں کی ترتیب وتصنیف اور اشاعت کا کام خاصے وسیع پیمانے پر اور بڑے وقیع انداز سے سرانجام دے رہا ہے اور درجنوں کتابیں اس کے اہتمام میں شائع ہو کر اہل علم سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اسی شعبے نے مولانا صفی الرحمٰن کے ساتھی، مولانا محمد مستقیم سلفی، جو ان کے ساتھ پاکستان تشریف لائے ہوئے ہیں اور اس تقریب سعید میں وہ موجود ہیں۔ ان کو علمائے اہل حدیث کی تصنیفی خدمات کو مرتب کرنے کے کام پر لگایا ہے۔ اور مولانا سلفی بڑی محنت وجانفشانی سے اس کام پر لگے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو توفیق دے کہ وہ اس کام کو بہ احسن طریق پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں۔

جامعہ سلفیہ بنارس کے تدریسی امور اور مجلّات مذکورہ کی نگرانی وادارت اور اس کے اہتمام میں چھپنے والی تمام کتابوں کی نظر ثانی وغیرہ ان تمام امور ومعاملات میں مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری حفظہ اللہ ہمہ تن مصروف اور متوجہ رہتے ہیں اور ان کا بیشتر وقت انہی پر صرف ہوتا ہے۔ بلکہ استفتاءات واستفسارات کے لیے بھی مولانائے محترم کو وقت نکالنا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے مولانا موصوف کی شخصیت

اے کہ مجموعہ خوبی بہ چہ نالت خوانم

کی مصداق ہے۔ وہ محدث وفقیہ بھی ہیں، مصنف وصحافی بھی، خطیب ومناظر بھی ہیں اور ماہر منتظم بھی، اور بین الاقوامی شہرت کے مالک بھی۔

ولیس علی اللہ بمستنکر　　　إن یجمع العالم فی واحد

مولانا موصوف چونکہ ایک مدرس اور شیخ الحدیث ہیں۔ اس لیے زیادہ وقت تدریسی مصروفیات میں گزرتا ہے۔ علاوہ ازیں تبلیغ ودعوت اور فرقِ باطلہ سے مناظرہ وغیرہ میں بہت سا وقت صرف ہو جاتا ہے۔ اور اب تقریباً تین سال سے ماہنامہ ''محدث'' کی مستقل ادارت بھی مولانا موصوف ہی کے ذمے ہے۔ لیکن اس کے باوجود متعدد کتابیں بھی تالیف کی ہیں (1)۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری صاحب کو حضرت الشیخ الفاضل مولانا محمد عطاء اللہ حنیف صاحب،

(1) یہاں کتابوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ میں نے اسے حذف کر دیا۔ از مرتب

جو اس ادارے "دارالدعوۃ السلفیۃ" کے بانی اور نگران ہیں، سے غایت درجہ غائبانہ عقیدت تھی۔ اور حضرت الشیخ کی زیارت اور ان سے استفادے کے لیے سخت مضطرب اور بے قرار تھے، ان کا موجودہ پاکستانی دورہ دراصل حضرت الشیخ دام ظلہ سے بے انتہا محبت اور عقیدت ہی کا نتیجہ اور مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے حضرت الشیخ کی محبت میں ان کی زیارت کے لیے اتنا دور دراز کا پرصعوبت سفر اختیار فرمایا۔ جس سے ان کو تو ان کا مقصد حاصل ہو گیا لیکن ہم جیسے مشتاقانِ دید کو مفت میں مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری کی زیارت کا شرف حاصل ہو گیا۔ فللہ الحمد والمنۃ

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اس استقبالیہ کا انعقاد اگرچہ مولانا موصوف کی آمد کی خوشی میں ہوا۔ لیکن مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ اس استقبالیے کے ساتھ ہی مولانا کا سفر پاکستان بھی اختتام پذیر ہو رہا ہے اور کل کو مولانا مراجعت فرمائے وطن ہو جائیں گے۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد

تاہم ہمیں امید ہے کہ اب در آمد وا ہو چکا ہے، اور مولانائے محترم اور دیگر علمائے ہند ہمیں اپنی زیارت سے مشرف اور اپنے خطابات و خیالات سے براہِ راست مستفید فرماتے رہیں گے۔ ویرحم اللہ عبداً قال آمینا۔

اور آخر میں مہمان گرامی قدر کو الوداع کہتے ہوئے ہم اپنے دل میں جو جذبات پاتے ہیں اس کو ایک فارسی شاعر نے یوں قالب میں ڈھالا ہے، اسی کا سہارا ہم بھی لیتے ہیں (1):

اے ہم نفسانِ محفلِ ما
رفتید و لے نہ از دلِ ما

(1) ہفت روزہ 'الاعتصام' لاہور، پاکستان۔ 20 دسمبر 1985ء

یادوں کے سنہرے دریچوں سے

(از: محمد طارق سہراب، سابق استاد جامعہ سلفیہ بنارس)

چمن میں پھول کا کھلنا تو کوئی بات نہیں
زہے وہ پھول جو گلشن بنائے صحرا کو

''یوں تو چمن میں بے شمار پھول کھلتے ہیں، لیکن کبھی کبھی چمن میں ایک ایسا بھی خوش نصیب پھول کھل اٹھتا ہے جو اپنی خوشبوؤں سے پوری فضا کو معطر کر دیتا ہے''۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری بھی سطح ارض پر ان مایہ ناز ہستیوں میں سے تھے جنھوں نے شمع اسلامی کی درخشاں شعاؤں کو دور دور تک بکھیرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ گرچہ مولانا آج ہمارے مابین نہیں لیکن آپ کے علمی کارناموں کی کرنیں آج بھی تاریک فضاؤں کو چیرتے ہوئے دور دور تک ضیا کر رہی ہیں۔ کچھ لوگ دوسروں کے چراغ سے اپنا چراغ روشن کرتے ہیں اور سمجھ نہیں پاتے کہ اس چراغ کی حقیقت کیا ہے۔ لیکن مولانا کے اندر یہ چیز میں نے نہیں پائی۔ ان کے اندر کا مادہ جستجو غالباً شروع سے ہی چراغ مصطفوی سے روشن تھا اور وہ چاہتے تھے کہ اس شمعِ ابدی کی لو (روشنی) پوری دنیا تک پھیل جائے۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ سے ایک دو نہیں بلکہ متعدد اوقات میں متعدد بار ملاقات ہوئی اور ہر ملاقات میں انہیں میں نے دائرہ اسلامی میں سرشار محبت کا علمبردار پایا۔ کچھ خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جن سے اللہ تبارک وتعالیٰ کسی کسی کو نوازتا ہے۔ اللہ کے فرمان:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً﴾

''اے ایمان والو! اسلام میں مکمل طور سے داخل ہو جاؤ''۔ (البقرة:208)

کی روشنی میں اگر مولانا کی زندگی وکارناموں کا تجزیہ کیا جائے تو ان میں آپ کو زیادہ خوبیاں ہی خوبیاں نظر آئیں گی۔ چونکہ میں جامعہ سلفیہ بنارس الہند میں آپ کا Colleague رہا ہوں اور یہ

بات بھی صحیح ہے کہ اکٹھا کام کرنے والے ایک دوسرے کے رگ و پے سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں جتنا کہ شاید دوسرے نہ رکھتے ہوں۔ اس مختصر سے مضمون میں اپنے عنوان کے تحت یہ واضح کرنے کی کوشش کروں گا کہ مولانا کو معاملات و واقعات کی روشنی میں میں نے کیسا محسوس کیا! مجھے امید ہے کہ میری درج ذیل تحریروں سے آپ کو بھی یہ اندازہ لگانے میں یقیناً آسانی ہوگی کہ مولانا کس طرح کے عامل تھے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو کس طرح کے افکار و خیالات و خوبیوں سے نوازا تھا۔

ماہ اگست 1981ء میں میری تقرری جامعہ سلفیہ بنارس میں بحیثیت ایک انگریزی استاد ہوئی اور تقرری کے بعد جب طلبہ سے سابقہ ہوا تو بیشتر طلبہ کو باریش پایا جبکہ مجھے ریخیں آ رہی تھیں اور میں اپنی جولانی کیفیت کے ساتھ جوانی کی دہلیز پر قدم رنجہ ہو رہا تھا۔ بہرنو جامعہ سلفیہ کے ٹیچنگ اسٹاف میں شمولیت کے بعد آہستہ آہستہ وہاں کے ان اساتذۂ کرام سے بھی ملاقات ہوتی گئی، جن کا نام میں اخباروں اور جریدوں میں پڑھا کرتا تھا۔ اسی اثنا وہاں کے شیخ الجامعہ مولانا عبدالوحید رحمانیؒ کے کمرے میں ایک دن جب میری ملاقات شیخ الحدیث مولانا شمس الحقؒ و بعدہ مولانا رئیس الاحرار ندوی اور شیخ انیس الرحمٰن العمری کے ساتھ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری سے ہوئی تو اس دن مجھے اس قدر خوشی ہوئی کہ صحیح معنوں میں وہ مناظر چند لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ خوشی کی وجہ تو یہ تھی کہ ان اشخاص کا نام اکثر و بیشتر ہند کے جریدوں میں پڑھا کرتا تھا اور آج انہیں دیکھ رہا تھا۔

جب ان شیوخ حضرات کو معلوم ہوا کہ میں خطیب المشرق مولانا محمد سہراب خان فیضی کا بیٹا ہوں تو ان بزرگوں نے میرے گھر والوں کو بہت دعائیں دیں کیونکہ والد صاحب کا 1979ء میں ہی انتقال ہو چکا تھا۔ مولانا مصلح الدین جیراجپوری چونکہ والد صاحب کی زندگی میں ان سے کافی مانوس تھے اور مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ اسی جامعہ سے فارغ تھے جہاں سے والد محترم تھے۔ اس لیے ان اکابرین کے ساتھ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں اپنے چمن اسلامی میں آزادانہ ملازمت کرتے ہوئے کچھ سیکھ رہا ہوں۔ الختصر شیخ الجامعہ کے دفتر میں بیٹھ کر جہاں سبھی مذکورہ اشخاص مجھے آگے رواں دواں رہنے کی ترغیب دے رہے تھے وہاں علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری ان کے جانے کے بعد میرے اور شیخ الجامعہ مولانا عبدالوحید رحمانیؒ کے ہمراہ بیٹھے میری جانب متوجہ ہوئے اور پھر کیا

کہنا تھا اپنی اخلاص کی خوشبو سے معطر کرتے ہوئے چند ہی منٹوں میں مجھے اپنا گرویدہ بنا لیے۔

اب صبح وشام مسجد آتے جاتے مولانا سے میری ملاقات ہونے لگی اور پھر کچھ دنوں کے بعد ہم دونوں کا معمول یہ ہو گیا کہ جامعہ سلفیہ کی عظیم الشان مسجد میں نماز فجر کی ادائیگی کے بعد ہم لوگ جامعہ کے گیٹ سے باہر ہو کر گردونواح کے میدان میں ٹہلنے کے لیے چلے جاتے۔ لیکن ان لمحات میں جو خاص باتیں قابل غور ہوتیں وہ یہ کہ مولانا جیسی قد آور شخصیت جن کی شہرت کے چرچے دور دور تک تھے، ان میں انتہائی سادگی اور اپنوں میں ایک دوسرے سے محبت کا جذبہ پایا۔ کچھ لوگوں کو جب تھوڑی سی شہرت مل جاتی ہے تو وہ اپنے ناتواں ساتھی کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن مولانا کی بات کیا کہوں، اگر مجھے مسجد پہنچنے یا مسجد سے نکلنے میں تاخیر ہوتی تو مولانا میرا انتظار کرتے، دورانِ چہل قدمی مولانا سے جو باتیں ہوتیں ان کا تعلق عالم اسلام سے ہوتا۔

اکثر و بیشتر کہا کرتے:

”ماسٹر صاحب! میری خواہش یہی ہوتی ہے کہ مجھے زیادہ سے زیادہ واقفیت اس بات کی ہو کہ عالم اسلام میں کیا کچھ ہو رہا ہے؟ اور عالم اسلام میں جو مسائل درپیش ہیں ان کا حل کیسے ممکن ہے؟“۔

ایک بار دوران چہل قدمی مولانا کی تدبرانہ باتوں کو سنتے ہوئے میں نے ان سے کہا کہ نظام حکومت اگر آپ جیسے قائدین کو سونپ دی جائے؟ تو مولانا نے مسکراتے ہوئے کہا:

”حل ممکن ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ معاملات کا حل اسلام کی روشنی میں ہی تلاش کیا جائے اور پھر یہ کہ سوچنے والا مسلمان بھی عملی مسلمان ہو“۔

آج مولانا کی غیر موجودگی میں ان کی کتابوں اور کارناموں سے ان کی زندگی کا جائزہ لیں تو یقیناً آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ مولانا عملیات کے علمبردار تھے۔

کبھی کبھی دوران چہل قدمی مولانا اپنی زندگی کے مختلف ادوار کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالتے لیکن یہاں بھی میں ان کے اندر جھانک کر یہی محسوس کرتا کہ گفتگو کے ہر پہلو میں اسلامی فکر وافکار کی بھرپور جھلک نمایاں ہے۔ کبھی کبھی جب وہ متعدد جگہوں پر اپنی ملازمت کی باتیں کرتے تو بے تکلفی

میں میں پوچھ بیٹھتا کہ مولانا فلاں فلاں پوسٹیں کیوں چھوڑ دیں اور پھر فلاں مقام کو کیوں آراستہ کیا؟ تو ان کا جواب ہوتا:

''ابھی اتنی کم عمری میں جو آپ کو نوکری مل گئی ہے تو آپ نہیں سمجھیں گے۔ ہاں لیکن جب آگے بڑھو گے تو تجربہ خود بخود ہو جائے گا''۔

اس طرح کی گفتگو میں آپ (مولانا) یہی فرماتے:

''اللہ اپنے بندوں کو نوازتا ہے اور مرتبے عطا کرتا ہے، اپنا کام ہے کوشش کرنا اور اس کا شکر ہے کہ اس نے مجھے نوازا''۔

قارئین کرام! اس طرح آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اللہ کے کتنے شکر گزار تھے۔ کبھی کبھی مولانا کی گزران خاردار وادیوں سے ہوا، جہاں سے تونگری کی خوشگوار وادیوں کا سیر کرنا سب کے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن مولانا کا یہ قول کہ ''کوشش کرے انسان مسلمان بن کر تو اللہ نوازتا ہے''۔ مولانا پر ہی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ مولانا کو تحریر و تقریر کی دنیا میں تو ہندستان والے جانتے ہی تھے لیکن مولانا نے اپنی نیک نیتی اور ان تھک کوششوں سے 'الرحیق المختوم' کا دیباچہ پیش کیا اور پھر عالمی سطح پر اس کتاب کی شہرت ہوئی تو اللہ نے انہیں ہند کے ساتھ ساتھ بیرون ہند میں بھی شہرت عطا کی۔ جب عالمی سیرت نگاری کے مقابلہ میں حصہ لیتے ہوئے مولانا نے سیرت کی یہ کتاب 'الرحیق المختوم' عربی زبان میں لکھ کر پیش کیا تو سبھی جانتے ہیں کہ یہ کتاب اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے اور مولانا کو عالمی سیرت نگاری حیثیت سے پہلا انعام ہوا۔ لیکن اس موقع پر جو خاص بات دیکھنے میں آتی ہے وہ یہ کہ مولانا کے پاس جب لوگ خوش خبری دینے آئے تو مولانا نے خوشی کے موقع پر کوئی ایسا کام نہیں کیا جو اسلام کے دائرہ سے ہٹ کر ہو بلکہ حسب معمول سادہ بیانی کے ساتھ یہ کہا:

''میں اللہ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے توفیق عطا کی''۔

مولانا کی کتنی باتوں کا احاطہ کروں۔ ایک دن کی بات ہے سردی اختتام پر تھی، گرم ہواؤں کا ظہور نہیں ہوا تھا۔ سورج کی شعائیں جامعہ سلفیہ کے میناروں سے گزرتے ہوئے جامعہ کے کمپاؤنڈ سے لگے دفاتر اور کمروں کو فیضیاب کر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں میرے پاس چپراسی حبیب اللہ آتا

ہے اور کہتا ہے کہ آپ کو مولانا صفی الرحمٰن یاد کر رہے ہیں۔ اس وقت مولانا جامعہ سے شائع ہونے والا جریدہ ''محدث'' کے ایڈیٹر بھی تھے۔ مولانا کا معمول تھا کہ رات گئے تک اپنے خصوصی دفتر جو شیخ الجامعہ مرحوم کے آفس کے ساتھ میں تھا، میں بیٹھ کر محدث کی ادارت و تصنیفی سرگرمیوں میں مصروف رہتے۔ میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ مسیحی اشخاص دلی سے آکر مولانا کے پاس بیٹھے ہیں اور اسلام کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ وقفہ صفر کے بعد مولانا نے مجھے سامنے کی ایک کرسی پر بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا اور کہا کہ ''ماسٹر صاحب! ان مہمانوں سے پوچھیں کہ یہ لوگ کس موضوع پر مجھ سے بات کرنا چاہیں گے اور پھر یہ کہ میں جو کہوں بالکل اسی انداز میں اس کا ترجمہ کر کے انہیں انگریزی میں سمجھائیں''۔ سلسلہ شروع ہوا اور قریباً ڈیڑھ گھنٹے مسیحی اشخاص سوالات کرتے رہے اور میں ترجمانی کے فرائض انجام دیتا رہا۔ متعدد سوالوں میں ایک اہم سوال یہ تھا کہ یہ آپ کیسے کہتے ہیں کہ اسلام مذہب پوری دنیا کے لیے ہے اور قرآن سے پہلے جو آسمانی کتابیں ہیں وہ آمیزش کی وجہ سے منسوخ کر دی گئیں۔ اللہ اس کے لیے مولانا کو جزائے خیر دے، آپ نے جس انداز سے اس کا جواب دیا وہ سب مولانا کے قائل ہی نہیں ہوئے بلکہ یہ کہتے ہوئے ان کے مداح بھی ہو گئے کہ اس سے پہلے تو اتنی ساری باتیں کسی نے اس واضح انداز سے بتائیں بھی نہیں تھیں۔ المختصر اس موقع پر جتنی بھی مولانا کی حقیقت بیان کروں کم ہے۔ پس یہ سمجھیں کہ آپ بناوٹ و تصنع سے عاری سچے عاشق رسول تھے۔ آپ نے مسیحیوں کو حضور ﷺ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا جو ثبوت پیش کیا وہ اتنا مدلل ہے کہ اس سے کوئی انکار کر ہی نہیں سکتا۔

رابطہ عالم اسلامی کی درخواست پر آپ کو امریکہ کے شہر لاس اینجلس میں 1982ء میں ایک منعقدہ کانفرنس میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ جب وہاں سے واپس لوٹے تو مجھ سے کہنے لگے کہ ''مجھے لاس اینجلس میں آپ یاد آرہے تھے''۔ میں نے پوچھا: کیسے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ''وہاں انگریزی جاننے والے زیادہ تھے جو انگریزی میں کچھ مزید سوالات کرنا چاہتے تھے تو مجھے آپ اور آپ کی باتیں یاد آئیں کہ مسلمان بچوں کو انگریزی پڑھنا چاہیے''۔

اس گفتگو سے بھی ہم یہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مولانا ایک مجاہدِ اسلام کی طرح جہاں بھی گئے

اپنے اسلامی خیالات کو عالمِ عمل کی عملی وادیوں میں بکھیرتے رہے۔ ایک بار بنارس میں منعقدہ تھیو سفیکل سوسائٹی کی کانفرنس جس میں 65 ممالک سے وفود آئے تھے، مجھے انگریزی زبان میں ایک مقالہ بعنوان "Islam and Human Fraternity" ''اسلام اور اسلامی بھائی چارہ'' پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ لندن کے رسالوں میں بھی میرے اس مقالے کا تذکرہ ہوا، لیکن بعد میں مولانا نے مجھ سے جو کچھ کہا دلچسپ بات تھی۔ آپ نے مجھ سے پوچھا: ''مقالہ پڑھتے وقت کپ کپی تو نہیں تھی؟'' لیکن جب میں نے جواب میں یہ کہا کہ مولانا یہ تو اسلام کی باتیں تھیں کپ کپی کیوں ہوتی۔ تو یقین مانیں کہ مولانا اس قدر خوش ہوئے کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ اس گفتگو سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مولانا اسلام کے نام پر اسلامی عمل سے کس قدر خوش ہوتے اور خواہش رکھتے کہ ایک مسلم نوجوان اپنے قول وفعل سے اسلام کی ایک جھلک پیش کرے۔

ہندستان میں ایک غیر مسلم تنظیم کا نام JESIS ہے۔ بنارس میں منعقدہ JESIS کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے شیخ الجامعہ مولانا عبدالوحید رحمہ اللہ نے مجھ سے کہا کہ ہندی میں اسلامی تعلیمات پر روشنی ڈالنے کے لیے آپ کو جانا ہے اور صفی الرحمٰن صاحب بھی تمہارے ساتھ ہوں گے۔ حکم کے تحت مغرب کے بعد جامعہ کی گاڑی میں بیٹھ کر مولانا کے ہمراہ JESIS کانفرنس میں پہنچا۔ وہاں کی ہندو انتظامیہ نے ہم دونوں کو بڑے احترام سے بٹھایا۔ میں نے تو جو بات کہی وہ کتابی تھی۔ لیکن مجھے یاد ہے مولانا نے جب اپنی تقریر شروع کی تو وہاں مجلس میں موجود بدھسٹ، عیسائی، ہندو وغیرہ کوئی بشر ایسا نہیں تھا جس کی توجہ آپ کی طرف نہ ہو۔ جس طرح ابلتے پانی میں کھلبلاہٹ ہوتی ہے، لوگوں میں ویسی ہی اضطرابی کیفیت تھی۔ یہ سمجھنے کے لیے کہ مولانا اب کیا کہہ رہے ہیں۔ یہاں مولانا مثبت انداز میں اپنی باتیں پیش کر رہے تھے۔ لیکن غالباً سب کا ماحصل یہی تھا کہ سورج کے طلوع ہونے کے بعد تاریکیاں مٹ جاتی ہیں۔ تو جس طرح سورج کی افادیت اور اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح اسلام کے وجود کو ہمیں تسلیم کرنا ہوگا۔

اس طرح کے واقعات تو بہت ہیں لیکن تمام باتوں کا احاطہ نہیں ہوسکتا۔ میں نے 1981ء سے 1987ء تک جامعہ میں بحیثیت انگریزی استاد فرائض انجام دیے۔ جہاں تک مولانا سے میری

وابستگی کی باتیں ہیں تو میں واقعی اس سلسلے میں بہت ہی خوش قسمت ہوں کہ مولانا سے قربت کی ایک دو نہیں بلکہ درجنوں وجوہات ہیں۔ مولانا نے بھی اس جامعہ سے فراغت کی تھی جہاں سے میرے والد محترم مولانا محمد سہراب خان رحمہ اللہ نے فراغت حاصل کی تھی۔ جب مولانا نے جامعہ سلفیہ کے کمپاؤنڈ میں دوسری یا تیسری ملاقات میں مجھ سے ابا جان کے بارے میں پوچھا اور جب میں نے انہیں والد محترم کا نام بتاتے ہوئے یہ بتایا کہ مختار احمد ندوی صاحب آپ کو اس کی مزید تفصیل بتائیں گے تو لگے کہنے کہ میں بھی واقف ہوں اور پھر اس کے بعد مولانا میرے اور میرے بھائیوں کے حق میں دعا گو رہے۔ ایک بار مولانا کے ہمراہ علی گڑھ کا سفر کر رہا تھا۔ مولانا کو ان کے صاحبزادے سے ملنا تھا جو علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے اور مجھے اپنے بھائیوں سے۔ دورانِ سفر مولانا کو کیا محسوس کیا اس کی ایک جھلک دیکھیں!!

ریل گاڑی بنارس کینٹ اسٹیشن سے چلتی ہے۔ گاڑی میں سوار ہونے کے بعد مولانا پوچھتے ہیں کہ ''آپ نے مغرب کی نماز پڑھی ہے یا نہیں؟'' مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ میں نے کیا کہا تھا؛ پر مجھے اتنا ضرور احساس تھا کہ جب مولانا ساتھ ہیں تو مجھے بھی محتاط ہونا چاہیے۔ جب ہماری گاڑی الہ آباد سے چلی تو کھانا کھانے کا ارادہ ہوا۔ مولانا نے کہا کہ نہیں پہلے نماز پڑھ لی جائے تب کھانا کھایا جائے۔ چونکہ ہم دونوں کا برتھ ریزرو تھا، اس لیے بھیڑ کے باوجود بھی کوئی دقت نہیں تھی۔

ہم لوگ کچھ کہتے سنتے سفر کر رہے تھے۔ پھر اچانک مولانا نے یاد دہانی کرائی کہ نماز عشاء پڑھ لی جائے اور ساتھ ہی کہا کہ آپ نگاہ رکھیں پہلے میں وضو کر کے آجاؤں تو آپ وضو کے لیے جائیں۔ اور پھر ایسے ہی ہوا، یکے بعد دیگرے وضو اور نماز عشاء ادا کر لی گئی۔ اگر دیکھا جائے تو یہ سفر کئی طرح سے بابرکت ثابت ہو رہا تھا۔ مولانا کا تقویٰ عالمِ سکوت پر محیط ہوا اور غیر مسلم مولانا سے کچھ قریب ہونے لگے۔ جس کی وجہ سے مولانا کو بھی ایک اچھا موقع ملا کہ وہ غیر مسلم بھائیوں میں اپنے اسلامی مشن کی تکمیل کریں۔ علی الصباح جب گاڑی علی گڑھ پہنچی تو میں نے مولانا سے کہا کہ میرے بھائی شاداب، عاصم اور سہیل میرا انتظار کرتے ہوں گے۔ لہٰذا آپ میرے ساتھ ہی چلیں، چائے نوشی کے بعد آپ کو روانہ کر دیا جائے گا۔ مولانا انکار بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ان کی زندگی میں میں ان سے بہت قریب ہو چکا تھا۔ بہر نو مولانا میری درخواست پر میرے بھائیوں کے

کمرے میں تشریف لائے۔ یہاں پر پہلے سے ہی تمام انتظامات تھے۔ چونکہ مولانا سے بھائیوں کی پہلی ملاقات تھی۔ مولانا نے بعدازاں مجھ سے کہا کہ میں نے آپ کے بھائیوں کو آپ ہی جیسا پایا۔ میں نے کہا: مولانا کوئی گستاخی تو نہیں ہوئی؟ تو انہوں نے کہا:

"نہیں نہیں مجھے بہت اچھا لگا، یہ آپ کے والدین کی نیکیاں ہیں جو اللہ نے آپ کو عطا کیا ہے۔ اللہ آپ کے سبھی بھائیوں کو اپنے مقاصد میں کامیاب کرے"۔

ہندستان سے ریاض آنے کے بعد مولانا سے میری ملاقات ایک عرصہ دراز کے بعد مکتبہ دارالسلام میں ہوئی۔ مولانا کی آمد سے ایک دن پہلے مجھے بتایا گیا تھا کہ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری صاحب کل یہاں پہنچنے والے ہیں۔ ان کی آمد کی جب خبر ملی تو ان سے ملنے گیا۔ جیسے ہی میری نگاہ ان پر پڑی میں انہیں دیکھ کر بے حد متعجب ہوا کہ انہیں میں نے جامعہ سلفیہ بنارس میں کتنا فربہ، لحیم وشحیم دیکھا تھا اور اب یہاں وہ اتنے نحیف اور کمزور؟!!

پھر میں نے مولانا سے سلام کے بعد اپنا تعارف کرایا اور جامعہ سلفیہ میں گزرے اپنے ایام کی باتیں یاد دلائیں تو مولانا مجھے پہچان گئے۔ اس کے بعد جب تک مولانا دارالسلام میں رہے اور میں وہاں کام کرتا رہا، گاہے بگاہے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان سے استفادے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر اب مولانا کی حالت وہ نہیں تھی جس کا میں تجربہ جامعہ سلفیہ میں کر چکا تھا۔ جب ریاض میں میری آپ سے ملاقات ہوئی تو آپ پر دو مرتبہ فالج کا حملہ ہو چکا تھا اس لیے آپ کافی کمزور ہو چکے تھے اور آپ بمشکل ہی چل پاتے تھے۔

مولانا جب ہندستان گئے تو پھر یکا یک یہ خبر آئی کہ آپ یکم دسمبر 2006ء بروز جمعہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس خبر سے عالمِ اسلام کے علاوہ پوری دنیا میں مولانا کے عقیدتمندوں میں ہلچل مچ گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ چند بے ربط تاثراتی باتیں ہیں جو عزیز القدر رضوان اللہ ریاضی سلمہ کی فرمائش پر معرضِ تحریر میں آگئیں۔ ورنہ مولانا کی شخصیت اس قدر عظیم خوبیوں کی مالک ہے کہ اس پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ اللہ ہم سب کی مغفرت فرمائے۔ آمین

والد گرامی۔حیات وخدمات

(از: طارق صفی الرحمٰن مبارکپوری، جامعہ اسلامیہ مدینہ)

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على أشرف الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله وصحبه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين وبعد:

جماعت اہل حدیث کے مشہور عالم، محقق ومفسر، محدث، سیرت نگار اور مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند کے سابق امیر، والد محترم علامہ شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ وتغمدہ بواسع رحمتہ، بروز جمعہ بتاریخ یکم دسمبر 2006ء مطابق ۱۰ ذی القعدہ ۱۴۲۷ھ اپنے گاؤں حسین آباد مبارک پور میں انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ آپ کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور آپ کے اعمال صالحہ کو قبول فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

آپ کی کنیت ابو ہشام تھی اور شجرۂ نسب یوں تھا: صفی الرحمٰن بن عبداللہ بن محمد اکبر بن محمد علی بن عبدالمؤمن بن فقیر اللہ مبارکپوری اعظمی۔

آپ ہندستان کے شمال اتر پردیس (یوپی) کے ضلع اعظم گڑھ کے مشہور قصبے مبارک پور کے ایک گاؤں حسین آباد میں 6 جون 1942ء کو پیدا ہوئے۔ ایک علمی ودینی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے چچا محترم مولانا عبدالصمد رحمانی رحمہ اللہ جید عالم دین تھے۔ تحفۃ الاحوذی کی تالیف اور مقدمہ میں جن علمائے کرام نے حصہ لیا، ان میں آپ کے چچا مولانا عبدالصمد رحمانی رحمہ اللہ بھی تھے۔ آپ کے دوسرے چچا محمد یونس حافظ قرآن تھے اور قرب وجوار میں کافی مشہور تھے۔ آپ کا گھرانا دینداری میں بھی کافی مشہور تھا۔ ہندو عورتیں جب آپ کے گھر کے پاس سے گزرتی تھیں تو آپ کے دادا کے خوف ودبدبہ اور ہیبت کی وجہ سے اپنے پازیب، گھنگرو اتار دیتیں، تاکہ ان کی جھنکار کی آواز آپ کے دادا کے کانوں میں نہ پڑے۔ آپ کے والد محترم بھی اگرچہ عالم دین نہ تھے لیکن نماز اور دیگر دینی امور کے نہایت پابند تھے۔

آپ نے اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز اپنے گھر سے کیا۔ قرآن مجید کے چند پارے چچا اور پھوپھی سے پڑھے۔ پھر پرائمری کی تعلیم کے لیے مدرسہ عربیہ دار التعلیم صوفی پورہ مبارک پور میں داخل ہوئے اور وہاں آپ نے چھ سال کا عرصہ گزارا، پھر وہاں سے مدرسہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں تشریف لے گئے۔ یہاں آپ نے نحو وصرف اور بعض دوسرے علوم کی تعلیم حاصل کی۔ مدت تعلیم دو سال رہی، اس دوران آپ نے اساتذہ وطلبہ میں اپنی ذہانت کا جھنڈا گاڑ دیا۔ اس وقت مبارک پور کے معاشی حالات کافی خراب تھے۔ معاشی تنگی کی وجہ سے اہالیانِ مبارکپور اپنے لڑکوں کو تعلیم سے ہٹا کر روزی روٹی کے کاموں پر لگاتے تھے۔ انہی حالات میں ہمارے دادا رحمہ اللہ اس مدرسہ میں تشریف لے گئے تو آپ کے استاد کہنے لگے کہ عبداللہ! اس بچے (یعنی والد گرامی) کو تعلیم سے نہ ہٹانا چاہے تمہارے حالات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہو جائیں۔ اس مدرسہ میں اساتذہ آپ کو 50 میں سے ساڑھے پچاس اور 51 نمبر دیا کرتے تھے اور دوسرے طلبہ کے اعتراض پر کہتے کہ یہ بچہ زائد نمبر کا زیادہ حقدار ہے۔

یہاں آپ دو سال کا عرصہ گزار کر مئو تشریف لے گئے اور وہاں مدرسہ فیض عام مئو میں داخلہ لیا۔ یہ مدرسہ اس وقت ٹھوس اور پختہ دینی تعلیم میں کافی شہرت رکھتا تھا۔ یہاں عربی قواعد، تفسیر، علومِ حدیث، مصطلح، فقہ واصول فقہ اور دیگر شرعی علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی۔ یہاں تک کہ جنوری 1961ء میں آپ نے مدرسہ مذکورہ سے تخرج حاصل کیا اور آپ کو سند اجازت دی گئی۔

آپ مدارسِ مذکورہ کے تمام امتحانات میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے اور اپنے کلاس میں ہمیشہ پہلی پوزیشن پر رہے۔ آپ نے الہ آباد بورڈ کے تمام امتحانات میں بھی حصہ لیا اور ان میں امتیازی نمبروں سے کامیاب رہے۔

مدرسہ فیض عام مئو سے فراغت کے بعد الہ آباد اور ناگپور کے مضافات میں دو سال تک درس وتدریس اور تقریر وخطابت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ بعدہ مارچ 1963ء میں مدرسہ فیض عام کے ناظم نے آپ سے تدریسی خدمات انجام دینے کی درخواست کی۔ آپ مئو تشریف لائے اور وہاں درس وتدریس میں مشغول ہوگئے، لیکن ابھی دو سال کا عرصہ بھی نہ گزر پایا تھا کہ حالات

کے تئیں مجبور ہو کر جامعہ الرشاد اعظم گڑھ چلے گئے۔ وہاں ایک سال کا عرصہ گزارنے کے بعد جامعہ اثریہ دارالحدیث کی گزارش پر آپ مئو تشریف لائے اور یہاں جامعہ میں درس وتدریس کے ساتھ ساتھ نائب مدرس کی حیثیت سے جامعہ کے داخلی اور تعلیمی معلامات کو بحسن وخوبی نمٹاتے رہے۔ پھر اراکین وذمہ داران جامعہ کے درمیان شدید اختلافات کی وجہ سے آپ نے یہاں سے استعفیٰ دے دیا۔

جامعہ اثریہ دارالحدیث سے استعفیٰ دینے کے بعد آپ سیونی (مدھیہ پردیش) کے مدرسہ فیض العلوم کے ناظم کی گزارش پر وہاں تشریف لے گئے۔ آپ نے وہاں جنوری 1969ء سے درس وتدریس کے فرائض انجام دینے شروع کیے۔ آپ یہاں بحیثیت نائب ناظم اور صدر مدرس مدرسہ کے تمام داخلی اور خارجی معاملات کو بھی نمٹاتے رہے۔ یہاں آپ نے دعوتی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سیونی کے جامع مسجد میں آپ خطبۂ جمعہ دیا کرتے تھے اور اطراف ونواح میں مسلمانوں کے درمیان ہمیشہ تقریروں کے لیے جایا کرتے تھے۔ یہیں آپ نے کبار علمائے کرام اور دعاۃِ عظام سے ملاقات کی۔ اور ان کی نصیحتوں اور تجربوں سے مستفید ہوئے۔

آپ سیونی میں قیام کے دوران تقریر وخطابت اور شعلہ بیانی میں کافی مشہور تھے۔ علی گڑھ میں فسادات کے بعد آپ کی سیونی میں تقریر رکھی گئی تو ڈی ایم کی طرف سے آپ کو جیل میں نظر بند رکھنے اور وقتِ اجلاس ختم ہونے تک جیل میں روکے رکھنے کی ہدایت دی گئی۔ چنانچہ آپ کو تقریر سے ایک دن قبل ہی تھانہ بلایا گیا، تھانہ جانے کے بعد آپ کو روک لیا گیا۔ لوگوں کو اطلاع ہوئی تو فوج درفوج تھانے کا رخ کیا اور درخواستیں دینا شروع کر دیں۔ لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہجوم تھا۔ درخواستوں اور ہجوم کے پیش نظر آپ کو رہا کر دیا گیا۔ آپ نے وہیں تھانہ کے احاطہ سیونی میں آپ نے ایک کمیٹی قائم کی جو مسلمانوں کے حالات کا تجزیہ کرتی اور ان کی ترقی کے لیے راہ ہموار کرتی۔ اللہ کے فضل وکرم سے اس کا بہت اچھا اثر رہا۔ مسلمانوں کے حالات میں ہر پہلو سے سدھار آیا۔

ابھی سیونی میں چار سال ہی گزارے تھے کہ مدرسہ عربیہ دارالتعلیم کے اراکین نے وطن لوٹنے پر مدرسہ میں تدریس وادارت کے لیے اصرار شروع کر دیا۔ ان کے اصرار سے مجبور ہو کر آپ

1972ء کے اواخر میں تدریس وادارت سنبھالی۔ دو سال کے بعد جامعہ سلفیہ کے ناظم اعلیٰ جناب عبدالوحید رحمانی رحمہ اللہ نے مذکورہ مدرسہ کے ناظم کو خط لکھ کر آپ کے جامعہ سلفیہ منتقل کیے جانے کی گزارش کی۔ چنانچہ آپ وہاں سے اکتوبر 1974ء میں جامعہ سلفیہ بنارس تشریف لے آئے۔

جامعہ سلفیہ میں آپ نے 14 سال تک مختلف علمی، تدریسی، تعلیمی اور دعوتی خدمات انجام دیے۔ اس مدت میں آپ نے تالیف وتصنیف کا میدان سنبھالا۔ ان ایام میں آپ نے 'تذکرہ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب، فتنۂ قادیانیت اور مولانا ثناء اللہ امرتسری، اور قادیانیت اپنے آئینے میں' اور دیگر کتابیں تالیف کیں۔ اسی دوران رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کی سیرت کے موضوع پر انعامی مقابلے کا اعلان ہوا۔ اساتذہ اور طلبہ کے نہایت اصرار پر آپ نے اپنی مشہور کتاب 'الرحیق المختوم' کی تالیف شروع کی۔ لیکن وقفہ وقفہ سے تعطل کا شکار ہوتی رہی اور مشغولیات کے پیش نظر آپ نے کئی مرتبہ ترکِ تالیف کا ارادہ بھی کیا۔ لیکن رب کریم کی مرضی کچھ اور تھی، چنانچہ آپ کے اساتذہ کا اصرار تھا کہ آپ اس تالیف کو مکمل کریں، انعام ملے نہ ملے۔ لیکن ایک علمی کام ہو جائے گا۔ اسی بات کو مدنظر رکھ کر آپ نے خوب محنت کی، جیسے ہی جامعہ کے کام سے فارغ ہوتے کتاب لکھنے میں لگ جاتے۔ چھٹی کے ایام میسر ہوئے تو وقت کو غنیمت جانا۔ دن کیا رات، ہر وقت لکھتے رہتے۔ رات کو لکھتے لکھتے صبح ہو جاتی، چند گھنٹے آرام کرنے کے بعد دوبارہ کتابوں میں مشغول ہو جاتے۔ یہاں تک کہ آپ نے وقت مقررہ سے پہلے ہی مکمل کر کے حوالۂ ڈاک کیا۔

آپ نے جامعہ سلفیہ میں تدریسی فریضہ بھی انجام دیا۔ آپ صحیح بخاری، تاریخ التشریع الاسلامی اور فقہ کی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ فروری 1982ء میں جب ماہنامہ "محدث" کا اجراء ہوا تو اس کی ادارت بھی آپ کے ذمہ دی گئی، آپ نے اس میں مختلف موضوعات پر سیکڑوں مضامین لکھے۔ آپ کا اداریہ بڑا زبردست ہوا کرتا تھا۔ عوام وخواص میں آپ کے اداریے اور مضامین یکساں مقبول تھے۔ آپ برابر اس کے ایڈیٹر رہے یہاں تک 1988ء میں مدینہ منورہ کا رخ کیا۔

بنارس میں قیام کے دوران آپ نے بریلوی وبدعتی علماء سے مناظرہ کیا جو مناظرۂ بجرڈیہہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مناظرہ چار روز تک جاری رہا۔ بالآخر بریلوی جماعت کو شکست فاش ہوئی۔

شکست کا منہ دیکھتے ہی علماء بریلویہ نے میدان علم سے فرار اختیار کیا۔ جب کہ علماء اہلحدیث جن میں مولانا شمس الحق صاحب اور مولانا مصلح الدین صاحب اور والد محترم مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری صاحب ؒ آخری وقت تک اسٹیج پر رہے۔ بریلوی بدمعاشوں کے پتھراؤ کے باوجود للکار للکار کر کہتے کہ ہم اہل حق ہیں اسٹیج سے نہیں ہٹ سکتے، ہم اپنی گردنیں راہ حق میں کٹا سکتے ہیں لیکن جھکا نہیں سکتے۔ بالآخر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل حق کو کامیابی سے سرفراز کیا۔ اس مناظرہ کی روداد آپ نے رزم حق وباطل کے نام سے ترتیب دی ہے۔ آپ نے اس میں فریقین کے اقوال اور دلائل کو من وعن نقل کر دیا ہے تاکہ قارئین کتاب خود حق وباطل کا فیصلہ کر سکیں۔

آپ حج کمیٹی کے ممبر بھی تھے، بنارس ومضافات بنارس سے لوگ آپ کے پاس فارم حج پر تصدیق کرانے کے لیے آتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے وزیر اعلیٰ کی درخواست پر حج فارم کی قرعہ اندازی بھی کی۔ تقریباً پانچ سال تک آپ ممبر رہے اس کے بعد یہ کام مولانا عبدالوحید رحمانی صاحب کے ذمہ کر دیا تھا لیکن انہوں نے دوبارہ والد گرامی کے سپرد کر دیا۔

جامعہ سلفیہ بنارس میں آپ ان تمام مشغولیات میں مصروف تھے کہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے مرکز خدمۃ السنۃ والسیرۃ النبویۃ کے مدیر نامور عالم دین جناب علامہ عمر محمد فلاتہ ؒ نے آپ کو مرکز میں اپنی خدمات پیش کرنے کی دعوت دی۔ آپ نے قبول فرمایا اور اگست 1988ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ وہاں آپ نے کم وبیش دس سال کا عرصہ مختلف علمی ودعوتی کاموں میں گزارا، جس کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

۱۔ مرکز خدمۃ السنۃ والسیرۃ میں سیرت نبوی کے کئی خطے تیار کیے۔

۲۔ اسی طرح آپ نے حرمین شریفین (مسجد حرام ومسجد نبوی) کے انسائیکلو پیڈیا کے لیے آپ نے کئی خطے تیار کیے۔

۳۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں آپ نے معلومات اور حدیثیر کتب تسعہ، ابن سعد وغیرہ سے جمع کیں اور ان کو ''تصنیف'' کی ترتیب پر مرتب کیا۔

۴۔ آپ نے حرم مکی کے انسائیکلو پیڈیا کے لیے مفصل معلومات جمع کیں۔

۵۔ صحاح ستہ اور مسند امام احمد سے سیرت کی حدیثوں کی فہرست بنائی۔

۶۔ صحیحین (بخاری و مسلم) اور جامع ترمذی سے سیرت کی احادیث کو اکٹھا کیا اور سیرت کے موضوعات کے مطابق مرتب کیا۔ پھر ہر عنوان کے ذیلی عناوین بھی ڈالے۔

۷۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرۂ نسب کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین سے آدم وحوا علیہما السلام تک تیار کیا۔ پہلے آپ کے والد گرامی کے نسب سے آدم وحوا تک پھر آپ کی والدہ ماجدہ کے نسب سے آدم وحوا علیہما السلام تک۔ پھر ان دونوں نسب ناموں میں جو والدین (ماں باپ) آتے ہیں ان کے نسب سے آدم وحواؑ تک۔

۸۔ آپ نے البشارۃ بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم عند البوذیین، البشارۃ بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم عند الھندوس اور البشارۃ بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم عند الفرس کی تالیف کو تکمیلی شکل دی۔ ان کتابوں میں آپ نے ان مذہبوں کی کتابوں سے اقتباس نقل کرکے ان کی توضیح وتشریح کی ہے۔

۹۔ آپ نے ''السیرۃ النبویۃ لابن ہشام'' کے لیے کمپیوٹر میں رموز ارقام ترتیب دیے۔

۱۰۔ اس کے علاوہ آپ نے بہت سے دوسرے کام بھی انجام دیے جن میں متعدد کتابوں کے بارے میں مکمل رپورٹ تیار کرنا، حرمین شریفین کے لیے مراجع ومصادر کی کتابوں کی لسٹ تیار کرنا وغیرہ شامل ہے۔

آپ پر مدینہ منورہ میں 1994ء میں پہلی بار فالج کا حملہ ہوا۔ رات کو آپ کافی دیر تک لکھتے رہے، سوتے وقت آپ نے نہایت ٹھنڈا اور برفیلا پانی پیا اور سو گئے۔ نماز فجر کے لیے گئے تو آپ نے محسوس کیا کہ آپ کا بایاں پاؤں اپنے مقام پر نہیں پڑ رہا ہے۔ واپس آئے تو والدہ سے تذکرہ کیا اور سوچا کہ ایک کروٹ سونے کی وجہ سے شاید پاؤں برابر نہیں پڑ رہا ہے، حرکت سے یہ شکایت دور ہو جائے گی۔ پھر آپ جامعہ اسلامیہ چلے گئے۔ تقریباً ساڑھے نو دس بجے آپ تشریف لائے اور پاؤں کی شکایت کی وجہ سے مجھے ساتھ لے کر مختلف اداروں میں گئے۔ پھر جامعہ کے ہسپتال تشریف لائے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرتے ہوئے مستشفیٰ الملک فہد (کنگ فہد ہاسپٹل) ریفر کر دیا۔ وہاں ڈاکٹروں کی ٹیم نے آپ کا چیک اپ کیا اور ایڈمٹ کر لیا۔ تقریباً دس روز ہسپتال میں رہ کر آپ گھر

تشریف لائے۔ کچھ دنوں تک عصا کے سہارے چلتے رہے۔ پھر آپ مکمل طور پر صحت یاب ہو گئے۔ اور عام آدمی کو اندازہ ہی نہ ہوتا کہ آپ کبھی اس مرض کا شکار ہوئے تھے۔

اس مرض کے بعد آپ ایک بار پھر علمی و دعوتی کاموں میں لگ گئے۔ آپ تقریباً ہر ہفتہ کسی نہ کسی کیمپ میں تشریف لے جاتے اور مختلف دینی موضوعات پر آپ کی تقریریں ہوتی۔ عام طور سے یہ پروگرام جمعرات یا جمعہ کے دن بعد نماز عشاء شروع ہوتا۔

آپ کا معمول یہ تھا کہ آپ نمازِ فجر سے فارغ ہو کر لکھنے بیٹھتے اور تقریباً سات بجے تک لکھتے رہتے، پھر ناشتہ کر کے جامعہ اسلامیہ روانہ ہو جاتے۔ واپس آتے ہی لکھنے بیٹھ جاتے اور تھوڑی دیر بعد کھانا تناول فرما کر آرام کرتے، نماز عصر سے فارغ ہو کر دوبارہ لکھتے اور اذان مغرب سے کچھ پہلے تک لکھتے رہتے۔ مغرب و عشاء کی نمازیں ہمیشہ مسجد نبوی میں ادا کرتے اور درمیانی وقت باب الرحمہ کے قریب گزارتے۔ توسیع سے قبل آپ شیڈ کے نیچے تشریف رکھتے جبکہ توسیع حرم کے بعد آپ باب نمبر چار کے قریب ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے۔ اساتذہ وطلبہ اور عوام الناس آپ کے پاس آتے اور مسئلہ و مسائل بحث اور مختلف سوالات کرتے۔ بعض مدرسینِ جامعہ اسلامیہ آپ کے پاس کتب احادیث بھی پڑھتے۔ بعد نماز عشاء آپ مسکن پر تشریف لاتے اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتے اور رات دیر تک آپ اپنے علمی کاموں میں مصروف رہتے۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں سیرت نبوی ﷺ کی خدمت کے دوران آپ سے مجمع الملک فہد لطباعۃ المصحف الشریف (کنگ فہد قرآن کمپلکس) کی جانب سے تفسیر عثمانی پر ایک مفصل رپورٹ تیار کرنے کی درخواست کی گئی۔ یہ تفسیر اس وقت مجمع سے طبع ہو کر حجاج وزائرین میں تقسیم ہوتی تھی۔ اور اہل حق علماء وعوام کی طرف سے اس میں موجود غلطیوں پر برابر مجمع کو متنبہ کیا جاتا رہا ہے۔ آپ نے اس سلسلے میں ایک تفصیلی رپورٹ تیار کی اور مترجم ومفسر کی زندگی کا مختصر خاکہ اور ان کے عقائد کو بیان کیا۔ پھر تفسیر میں موجود غلطیوں کی مکمل نشاندہی کی۔ پہلے آپ ان کے ترجمہ وتفسیر کا عربی ترجمہ کرتے پھر صحیح ترجمہ وتفسیر بیان کرتے اور اس کا عربی واردو ترجمہ ذکر کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس رپورٹ کے ذریعے ان کے سامنے حق وباطل کو عیاں کر دیا اور اس کی طباعت وتقسیم بند کر کے

موجودہ تفسیر ''تفسیر احسن البیان'' کی طباعت وتقسیم شروع کردی۔

آپ نے مدینہ میں قیام کے دوران مختلف کتابیں تالیف کیں جن میں روضۃ الانوار اور اس کا ترجمہ ''تجلیات نبوت اور ''منۃ المنعم شرح صحیح مسلم'' خاص طور سے قابل ذکر ہیں، اس کے علاوہ آپ نے کئی کتابوں کے اردو ترجمے اور لاتعداد کتابوں پر نظر ثانی فرمائی۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ سے ایگریمنٹ ختم ہونے کے بعد آپ مکتبہ دارالسلام ریاض تشریف لے گئے۔ آپ نے وہاں کئی علمی کتابیں تصنیف کیں اور بہت سی دیگر کتابوں پر اشراف کیا۔ ان میں المصباح المنیر فی تہذیب تفسیر ابن کثیر اور ریاض الصالحین پر تعلیق وغیرہ شامل ہے۔

آپ پر ریاض میں قیام کے دوران دوبارہ فالج کا حملہ ہوا۔ آپ کو مستشفیٰ عبید میں داخل کیا گیا اور اس کے بعد مستشفیٰ خالد میں داخل کر دیے گئے جہاں آپ کا علاج ہوتا رہا۔ بعدازاں آپ کچھ دنوں کے لیے مدینہ منورہ تشریف لائے۔ آپ مستقل علاج ومعالجہ کے شکار رہے لیکن مکمل طور پر صحت یاب نہ ہوسکے، فالج کا اثر آپ کے دائیں حصہ پر واضح طور پر محسوس کیا جاتا تھا۔ آپ چونکہ شوگر اور بلڈ پریشر کے بھی مریض تھے اس لیے طبیعت کبھی بوجھل ہوجاتی تو کبھی افاقہ ہوجاتا۔ اس مرض کے بعد آپ کو آرام کی ضرورت زیادہ رہتی لیکن پھر بھی علمی ودعوتی کاموں میں مشغول رہتے۔

آپ کو ریاض میں قیام کے دوران ہی جمعیت اہل حدیث ہند کا امیر منتخب کیا گیا۔ ذمہ داران جمعیت کے نہایت اصرار پر آپ نے اس ذمہ داری کو قبول فرمایا۔ آپ ہمیشہ اس عہدے کے تعلق سے فرماتے کہ لوگوں نے میرے اوپر کانٹوں کا تاج رکھ دیا ہے۔ آپ کو جلد ہی اس بات کا بھی احساس ہوگیا کہ یہ ایک نامعقول ذمہ داری ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے تھے کہ یا تو میں جمعیت کے لائق نہیں ہوں یا پھر جمعیت میرے لائق نہیں ہے۔ بالآخر آپ نے دفتر جمعیت میں اپنا استعفیٰ پیش کردیا۔

آپ 19 جولائی 1998ء سے 3 اگست 2000ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کی امارت کے دوران آپ کو سعودی حکومت کی طرف سے سعودی حکومت کے قیام کے صد سالہ جشن میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ آپ اس میں شریک ہوئے، آپ کو سونے کے میڈل اور دوسرے تحفوں سے نوازا گیا۔ یہ جشن اور پروگرام کئی دنوں تک چلتا رہا۔ اس دوران

آپ کو مسجد حرام، مکہ مکرمہ اور سعودی عرب کے مختلف شہروں کی تاریخی مقامات کی زیارت کرائی گئی۔
فالج کے حملہ کے بعد آپ کمزور ہو گئے۔ چنانچہ بیماری اور کمزوری کی وجہ سے اکثر آپ مدینہ منورہ اور مبارکپور میں قیام کرتے۔ ذوالقعدہ ۱۴۲۶ھ میں آپ وطن مالوف مبارکپور تشریف لائے، تقریباً چھ ماہ کے قیام کے بعد دوبارہ 9/جون 2006ء کو آپ سعودی عرب کے لیے روانہ ہونے والے تھے کہ اچانک 4/جون 2006ء بروز اتوار آپ پر پھر تیسری دفعہ فالج کا حملہ ہوا اور آپ بالکل صاحب فراش ہو گئے۔ آپ کو بنارس کے ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ ابتدائی ایام میں حالت کافی نازک تھی، پھر دھیرے دھیرے حالت خطرے سے باہر ہوئی اور آپ کو ڈسچارج کر دیا گیا۔ لیکن بستر نے آپ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ مبارک پور واپسی کے بعد ہفتہ دو ہفتہ پر آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جایا جاتا۔ کمزوری مسلسل بڑھتی جا رہی تھی اور بدن دن بدن لاغر ہوتا جاتا۔ رب کریم کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بالآخر یکم دسمبر 2006ء بروز جمعہ دوپہر پونے تین بجے آپ نے رحیم وکریم کی دعوت پر لبیک کہا اور اس دار فانی سے دار بقا کو کوچ کر گئے۔ إنا لله وإنا إليه راجعون۔

آپ کی نمازِ جنازہ حافظ مولانا یاسر مدنی نے بروز سنیچر بعد نماز عصر پڑھائی۔ اس کے بعد آپ کو حسین آباد کے قبرستان میں آپ کے آبائی مقام پر مولانا عبدالصمد رحمانی رحمہ اللہ کے جنوب میں سپرد خاک کیا گیا۔ جنازہ میں لوگوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے اور آپ کے مرض کو گناہوں کا کفارہ اور درجات کی بلندی کا ذریعہ بنائے اور آپ کی کتابوں کو آپ کے لیے صدقہ جاریہ اور مسلمانوں کے لیے شمع ہدایت بنا دے۔ آمین۔

پسماندگان میں آپ نے اہلیہ بدر النساء، چار لڑکے: ڈاکٹر مولانا فیض الرحمٰن علیگ، حافظ مولانا یاسر مدنی (مدرس جامعہ اسلامیہ ممبئی)، راقم طارق (متعلم جامعہ اسلامیہ مدینہ) اور مولانا عامر مدنی (زیر تعلیم ایم اے جامعہ اسلامیہ، دہلی)۔ چار لڑکیاں: رقیہ، عاتکہ، رشیدہ اور عطیہ۔ ایک پوتا مساعد، پانچ پوتیاں: فرحت یاسمین، رفیعہ زینب، دردانہ، اروی اور نوال چھوڑی ہیں۔

آپ نے اپنے پیچھے بہت سی قیمتی تالیفات بھی چھوڑی ہیں۔ جو انشاء اللہ تا قیامِ قیامت مسلمانوں کی رہنمائی کرتی رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرف فرمائے۔ آمین

علم و تحقیق کی دنیا کا نیر تاباں

(از: مولانا عبداللہ مدنی جھنڈانگری، مدیر مسئول ماہنامہ نور توحید، نیپال)

عرب وعجم میں اپنی خداداد علمی صلاحیت کا سکہ بٹھانے والی معتبر و مستند علمی شخصیت، ممتاز عالم دین، نامور محقق و شارح حدیث، سیرۃ النبی کے موضوع پر عالم گیر شہرت کی حامل کتاب ''الرحیق المختوم'' کے شہرۂ آفاق مصنف حضرت علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری 64 برس کی عمر میں اپنے وطن حسین آباد (مبارکپور) میں انتقال فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کا تعلق اعظم گڑھ سے تھا، جس کی خاک سے اٹھنے والی عظیم ہستیوں نے شہرت دوام حاصل کی، حضرت علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ جامعہ فیض عام مئو میں سند فراغت سے سرفراز ہوئے اور مختلف اداروں میں مسند تدریس کو رونق بخشی، اور دعوت واصلاح کے میدان میں سرگرم عمل رہے، تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا، جامعہ سلفیہ بنارس میں تدریسی خدمات کی انجام دہی کے ساتھ ماہنامہ ''محدث'' کی ادارت بھی فرمائی، جامعہ سلفیہ میں دوران قیام حلقہ تعارف وسیع تر ہوتا گیا، جامعہ کے علمی ماحول میں بلند حوصلگی کے ساتھ اپنا قلم رواں دواں رکھا، اور وہ مبارک وقت بھی آیا جب استاذ الاساتذہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن رحمانی حفظہ اللہ کے مشورے اور احباب واخوان کے اصرار پر رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ کی جانب سے منعقدہ سیرۃ النبی کے عالمی مقابلے میں شرکت فرمائی، مقالہ نگاری کے اس عالمی مقابلے میں عربی زبان میں آپ کی تحریر کردہ کتاب ''الرحیق المختوم'' کو پہلا انعام حاصل ہوا، سیرت کی یہ وہ کتاب ہے جسے بیسویں صدی کی مقبول ترین کتاب قرار دیا جاسکتا ہے، دنیا کی متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے جسے لوگ بیش قیمت تحفہ کے طور پر اپنے عزیزوں کو پیش کرتے ہوئے افتخار وسعادت کا احساس کرتے ہیں۔

بلاشبہ علم وتحقیق کے اعلیٰ عالمی معیار کو برقرار رکھتے ہوئے حب رسول ﷺ کے ولولہ صادق اور اطاعت رسول ﷺ کے پرخلوص جذبے سے لکھی گئی یہ کتاب سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں کو موثر

طور پر اجاگر کر کے دل و دماغ کو پرنور بنا دیتی ہے۔

آپ کو قدرت کی جانب سے ذہانت وفطانت کا وافر حصہ عطا ہوا تھا جن کے اثرات ۵۰ سے زائد عربی اور اردو تصنیفات میں نمایاں نظر آتے ہیں، جس کا نتیجہ تھا کہ دانش کدۂ طیبہ، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے ''مرکز خدمت سنت وسیرت نبویہ'' نے آپ کی خدمات حاصل کیں، جہاں برسوں آپ کا علمی وتحقیقی فیض جاری رہا۔

ممتاز بین الاقوامی اشاعتی ادارہ دارالسلام ریاض نے بھی آپ کی علمی وفقہی بصیرت کو عام کرنے میں قابل ذکر کردار ادا کیا، عمر کے آخری برسوں میں اس ادارہ سے وابستہ ہو کر آپ نے متعدد کتابوں کی تصنیف کی اور کئی ایک کو نظر ثانی سے معتبر بنا دیا، آپ کے علمی فیوض کی ایک لائق ستائش مثال کتب ستہ (بخاری، مسلم، ابوداود، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ) کے صحیح ترین نسخوں پر مشتمل ''موسوعة الحديث الشريف'' ہے، جسے دارالسلام کی علمی وتحقیقی کمیٹی نے وزیر اسلامی امور سعودی عرب ''شیخ صالح بن عبدالعزیز آل الشیخ'' کی نگرانی میں تیار کیا ہے، موصوف اس کمیٹی کے صدر تھے، مدیر دارالسلام مولانا عبدالمالک مجاہد نے مقدمے میں اس عظیم انسائیکلوپیڈیا کی تکمیل میں مولانا رحمہ اللہ کی کاوش کا شکریہ ادا کیا ہے، جس میں 2772 صفحات ہیں اور جو صرف ایک جلد میں ہے، یہ موسوعہ دنیا کے سب سے عمدہ فرانسیسی کاغذ پہ اٹلی میں طبع ہوا ہے، اس بے نظیر مجموعہ کا ایک نسخہ برطانیہ کے سفر میں ''موسسة البر'' لندن نے راقم کو تحفتاً عطا کیا تھا، جو یقیناً ایک گراں قدر سوغات ہے، حدیث نبویہ کے اس عظیم الشان ذخیرے کی آب وتاب کو دوبالا کرنے میں حضرت مولانا رحمہ اللہ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

مولانا اب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، علمی دنیا کا یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی کے لیے حساس افراد ملت کو غور وفکر کی ہی نہیں تگ ودو بلکہ سعئ پیہم کی شدید ضرورت ہے، علم وتحقیق کی دنیا میں ان کی جانشینی کی ضرورت باقی ہے، کیا طالبان علوم شرعیہ کی ایک منتخب حوصلہ مند ٹیم اسلامی علوم وفنون کی ہمہ جہت خدمات کی خاطر تشکیل دی جا سکتی ہے؟

کسی بھی ممتاز شخصیت کی زندگی کے مختلف گوشوں سے واقفیت موجودہ اور آنے والی نسل کے

لیے ناگزیر ہوتی ہے، تاکہ اس کے ذوق وشوق کو جلا ملے، جذبہ عمل کو استحکام اور قوت کار کو مزید توانائی فراہم ہو سکے، اسی ضرورت کے پیش نظر ''نور توحید'' کی یہ اشاعت خاص قارئین کی نذر کی جا رہی ہے، یہ حضرت علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کی جلالت علمی کے لئے خراج تحسین ہے، اور ہمارے جذبہ احسان مندی ومنت گزاری کا اظہار بھی۔

ہم اپنے ان تمام اہل قلم بزرگوں اور دوستوں کے شکرگزار ہیں جنہوں نے اس اشاعت خاص کے لیے قلمی معاونت فرمائی اور ہماری ہمت افزائی کی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خصوصی اشاعت تاخیر کے بطن سے پیدا ہونے والی بعض قباحتوں سے بچنے کے لئے کچھ عجلت میں پیش کی گئی ہے، ہماری خواہش تھی کہ متعدد گوشہ ہائے حیات وخدمات پہ کما حقہ روشنی ڈالی جائے، مصنفات پہ مبسوط تبصرے اور دیار عرب میں دعوتی سرگرمیوں کے تذکرے کی ضرورت باقی ہے، یقین ہے معاصر مجلّات وجرائد اس جانب ضرور توجہ دیں گے(1)۔

(1) دیکھئے: مجلّہ نور توحید۔ جنوری، فروری، مارچ 2007۔

آبروئے جماعت

[مولانا کے استاذ محترم کے قلم سے]

(از: مولانا عبدالرحمٰن بن مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری)

مؤلف ''الرحیق المختوم'' مولانا صفی الرحمٰن صاحب حسین آبادی، مبارکپوری، اپنی بستی کے ایک دیندار، اہل علم اور متوسط خاندان کے فرد تھے، ان کے تایا مولانا عبدالصمد صاحب مبارکپوری رحمہ اللہ جو راقم السطور کے ماموں اور سسر تھے، صاحب تحفۃ الاحوذی حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری رحمہ اللہ کے معتمد علیہ ارشد تلامذہ میں تھے۔

مولانا صفی الرحمٰن رحمہ اللہ بچپن سے ہی ہونہار، مہم جو، اقدامی مزاج اور ذہین تھے، جامعہ اسلامیہ فیض عام مئو ناتھ بھنجن میں میرا زمانہ تدریس 1956ء سے 1960ء تک ہے، جماعت ثالثہ سے جماعت خامسہ تک کے کئی اسباق ان کے میرے ذمہ رہے، آخری کتاب جو ان کو میں نے پڑھائی ''دیوان الحماسہ'' ہے، اس کے علاوہ عربی وفارسی بورڈ اتر پردیش کے درجات مولوی وعالم کے کورس کی کئی کتب ان کو پڑھائی، نکتہ رسی اور ذہانت کے ساتھ ان کی مہم جو طبیعت رفقاء درس کے علاوہ دیگر طلبہ کو بھی اپنے گرد اکٹھا رکھتی تھی، ان کا یہی مزاج اور کیفیت ان کے تدریسی دور کے آخری ''مطاف'' جامعہ سلفیہ بنارس تک رہی، اس کے بعد میرا رابطہ باقی نہ رہ سکا، وہ اپنے مستقر سعودی عربیہ سے آتے اور جاتے رہے، آخری بار واپسی سے ایک روز قبل ان کا برین ہمبریج ہوگیا، اور علاج کے لیے بنارس منتقل کر دیے گئے۔ واپسی پر اہلیہ کے ساتھ عیادت ومزاج پرسی کی غرض سے حاضر ہوا تو اس وقت مولانا غفلت کی حالت میں تھے، نہ آنکھ ہی کھلتی تھی اور نہ ہی کسی طرح کی حس وحرکت محسوس ہوتی تھی، تصنیف وتالیف اور تحقیق وجستجو کے رسیا سنجیدہ ومدلل خطابت اور میدان مناظرہ کے اس شہسوار کی یہ کیفیت دیکھ کر ضبط نہ ہو سکا، اس کے بعد ہفتہ عشرہ کے وقفہ سے جاتا رہا، تھوڑے افاقہ کے بعد بھی ان کی عیادت کے لیے حاضری ہوئی، میری طرف ٹکٹکی

باندھے دیکھتے جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں، ان کا چھوٹا لڑکا عامر پوچھتا کہ کون ہیں؟ پہچانتے ہیں؟ آنکھ سے اشارہ کرتے کہ ہاں!

قلم وزبان اور تقریر وتحریر کے اس مرد میداں کی یہ کیفیت باعث رنج وافسوس تھی۔رحمہ اللہ واسعۃ وغفرلہ۔مولانا رحمہ اللہ عصر حاضر میں برصغیر کی جماعت اہلحدیث کی آبرو اور علمی شناخت تھے، اللہ تعالیٰ ان کی حسنات کو قبول فرمائے زلّات سے درگزر فرمائے، اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (آمین)

مولانا کا انتقال یکم دسمبر 2006ء بعد از صلاۃ جمعہ تقریباً 3 بجے ہوا اور تدفین دوسرے روز 2 دسمبر 2006ء ساڑھے چار بجے آبائی قبرستان میں عمل میں آئی، صلاۃ جنازہ ان کی وصیت کے مطابق ان کے لڑکوں میں سے دوسرے لڑکے یاسر سلمہ نے پڑھائی، اللہ ان کی مغفرت کرے اور درجات بلند فرمائے (1)۔

---

(1) دیکھئے: مجلّہ نور توحید۔جنوری، فروری، مارچ 2007ء۔

ایک درخشندہ شخصیت

(از: مولانا مختار احمد ندوی، سابق امیر جمعیت اہلحدیث ہند)

ہندستان کے مایہ ناز عالم، محدث اور ادیب علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کی وفات سے جو علمی خلا پیدا ہوا ہے اسے عالم اسلام ہمیشہ محسوس کرتا رہے گا۔ مولانا اپنی علمی، ادبی اور یگانہ روزگار شخصیت کی بنا پر عالم اسلام کے مایہ ناز علماء میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے، وہ ہر اعتبار سے عالم باعمل تھے اور علماء اہل حدیث ہندو پاک میں اس قحط الرجال کے دور میں بے مثال علمی شخصیت کے مالک تھے۔

علامہ موصوف صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ جس عنوان پر قلم اٹھاتے وہ خاص طور پر اپنے منفرد انداز واسلوب کی وجہ سے انہیں کا عنوان بن جاتا، وہ جس کتاب پر ہاتھ لگاتے وہ زندہ تابندہ ہو جاتی۔ جمعیت اہل حدیث ہند کے وہ ایک درخشندہ شخصیت تھے۔ وہ اپنی شخصیت کے اعتبار سے علماء کی محفلوں میں چمکتے ہوئے ایک ستارے کی طرح ممتاز و مایہ ناز فرد تھے۔

اپنے دور میں وہ تمام علماء ہندو پاک خواہ وہ کسی بھی مسلک اور جماعت کے ماننے والے ہوں ایک امتیازی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اپنی شخصیت میں بے مثال تھے، وہ اپنے ساتھیوں دوستوں اور ہم عصروں میں اپنی حیثیت کے اعتبار سے لفظ لفظ یاد کیے جاتے تھے، ان کا ہر حرف یگانہ روزگار ہوا کرتا تھا، وہ بڑے باکمال اور انتہائی نادر روزگار تھے۔

موصوف میرے دوست اور انتہائی یادگار زمانہ ساتھی تھے، لیکن جب تک ہم اس دنیا میں رہیں گے، انہیں یاد کرتے رہیں گے، وہ میرے سچے دوست اور بڑے ہی بے تکلف یار غار تھے، جب ہم بیٹھتے تو مجلس بڑی طویل ہوا کرتی اور بار بار اٹھنے کی کوشش کے باوجود پھر بیٹھ جاتے اور پھر باتیں شروع ہو جاتیں، ان کی یاد ذہن ودل سے کبھی محو نہیں ہو سکتی، حقیقت میں ہم ایسے دوست تھے جن کی دوستی دوستوں پر فدا تھی، وہ انتہائی مخلص، بڑے باوقار، بڑے دل نواز اور انتہائی جاذب نظر کے حامل تھے، اللہ تعالیٰ ان پر اپنی ہزاروں رحمتیں نازل فرمائے [1]۔ (آمین)

(1) دیکھئے: مجلہ نور توحید۔ جنوری، فروری، مارچ 2007۔

ذکر خیر

(از: مولانا عبدالسلام رحمانی، وکیل الجامعہ، سراج العلوم، بونڈیہار)

سورۂ شعراء میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا مذکور ہے: اے میرے رب پیچھے آنے والوں میں میرا ذکر خیر باقی رکھ۔ جو شخص بھی اس دنیا میں آیا ہے کسی کے لئے بھی دوام نہیں ہے، ایک نہ ایک دن اسے یہاں سے جانا ہی ہے، لیکن اگر کسی شخص کا ذکر خیر کسی بنا پر باقی رہ جائے تو اسے زندگی کا دوام مل جاتا ہے اور یہی بہترین بقا ہے، اسی کی دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی تھی۔

حضرت مولانا صفی الرحمن صاحب یکم دسمبر 2006ء کو طویل علالت کے بعد انتقال فرما گئے، وہ جمعہ کا دن تھا، جمعہ کے دن کی وفات کو علامہ البانی رحمہ اللہ نے حسن خاتمہ کی علامت میں سے قرار دیا ہے، جو خدا کرے مولانا کو بھی حاصل ہوا ہو اور اللہ تعالیٰ ہمیں بھی حسن خاتمہ سے نواز دے۔ مولانا نے دینی و علمی حسنات میں سے اس قدر حسنات و خدمات انجام دیے ہیں جن کے سبب میں اللہ کی ذات سے امید کرتا ہوں کہ وہ ان اعمال خیر کے سبب ان کے ذکر خیر کو دوام عطا فرمائے گا۔ وما ذلک علی الله بعزیز.

مولانا نے سیرت پر جو کتاب لکھ دی، متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو گیا اور بہت سے مدارس کے نصاب میں وہ داخل ہو گئی۔ جب تک وہ کتاب پڑھی پڑھائی جاتی رہے گی، مولانا کا ذکر خیر جاری رہے گا ان شاء اللہ، نیز اس کے علاوہ مولانا نے بلوغ المرام اور مسلم شریف کی جیسی شرح لکھ دی ہے، درس نظامیہ کے تمام مدارس میں اس سے استفادہ کا مستقل سلسلہ جاری رہے گا، اور لوگ مولانا کو یاد رکھیں گے اور ان کا ذکر خیر کرتے رہیں گے۔ علم کو اللہ کے رسول ﷺ نے صدقہ جاریہ ٹھہرایا، "أو علم ينتفع به" اس سے ہم توقع کرتے ہیں کہ ذکر خیر کے ساتھ مولانا کو ثواب کا سلسلہ بھی لامتناہی انداز میں جاری رہے گا ان شاء اللہ، ان علمی یادگاروں کے علاوہ بھی مولانا کی

بہت ہی اہم کتابیں ہیں جن کے استفادہ سے اہل علم مستغنی نہیں رہ سکتے۔

کاش مولانا کا قیام ہندوستان میں ہی زیادہ رہا ہوتا اور وہ تدریسی لائن میں ہوتے تو ان کے تلامذہ کا ایک طویل سلسلہ ہوتا، جنہوں نے ان کے علم اور ان کی بے پناہ صلاحیت سے فائدہ اٹھایا ہوتا اور ان چراغوں سے نہ جانے کتنے چراغ جلتے، اور وہ دنیا تسلسل کے ساتھ ان سے مستفید ہوتی۔ بہر حال اللہ کو جو منظور تھا ہوا، اور جو وقت مقرر تھا وہ پورا ہو گیا، سب کے ساتھ یہی ہونا ہے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

میں یہ سطور لکھ رہا ہوں، اور ابھی ابھی معلوم ہوا کہ دہلی میں مولانا عبدالرشید ازہری بھی آج 11 بجے اللہ کے حضور حاضر ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں بزرگوں کو اور دوسرے جو حضرات بھی فوت ہوئے ہیں اور ان پر اپنی بے شمار رحمتیں نازل فرمائے، انہیں اپنے عفو وکرم سے نواز دے، انہیں ابرار وصلحائے امت کے ساتھ اٹھائے، ان کی چھوٹی بڑی نیکیاں قبول فرمائے اور سب خطائیں معاف کر دے۔ آمین یارب العالمین (1)۔

---

(1) دیکھئے: مجلہ نور توحید۔ جنوری، فروری، مارچ 2007۔

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(از: مولانا عبدالحنان فیضی، شیخ الحدیث جامعہ سراج العلوم جھنڈا نگر)

حضرۃ العلام مولانا صفی الرحمٰن صاحب مبارکپوری کا سانحہ ارتحال پورے عالم اسلام کے لیے غیر معمولی حزن وملال کا باعث ہے کیونکہ ایسی باصلاحیت ہستیاں صدیوں کے بعد وجود میں آتی ہیں، موصوف گرامی گوناگوں خصوصیات وامتیازات کے حامل تھے، آپ کی شخصیت آفاقی اور ہمہ گیر تھی، مولانا ہر فن مولیٰ اور تمام علوم وفنون میں کامل دسترس رکھتے اور جس فن کو پڑھاتے اور ادب کا درس ایک ادیب کامل کی طرح دیتے تھے، خلاصہ کلام یہ کہ ہر فن کو پوری مہارت سے پڑھاتے اور اس کا پورا پورا حق ادا کر دیتے، کیونکہ آپ ایک کہنہ مشق مصنف تجربہ کار مناظر، کامیاب داعی ہر دلعزیز استاد ومربی، نامور صحافی اور باکمال ادیب تھے، تشنگان علوم دینیہ ان کے طرز نگارش اور انداز تدریس سے بے حد مطمئن ومسرور رہتے تھے، عام طور سے طلبہ کے ذہن میں جب کسی قسم کا کوئی علمی اشکال پیش آتا تو موصوف سے استفسار کرتے، آپ ان کے تمام سوالات کو نہایت ہی جامع ومانع، مدلل اور عقل ونقل کی روشنی میں انہیں اس طرح سمجھا دیتے تھے کہ ان کے تمام اشکالات ختم ہو جاتے، مرکزی دار العلوم الجامعۃ السلفیہ بنارس میں صلاۃ عصر کے بعد ذہین طلبہ حلقہ بنائے ہوئے آپ کے ارد گرد کھڑے رہتے اور ان کی بے پناہ علمی استعداد وصلاحیت سے بھرپور استفادہ کرتے، جس کی وجہ سے ان کے چہروں پر فرحت وانبساط کے آثار نمایاں رہتے، بعض طنز وتعریض کرنے والے حضرات اس قیام کو اسٹینڈنگ کانفرنس (Standing Conference) سے تعبیر کرتے تھے۔

آپ میدان صحافت کے بہترین شہسوار تھے، ہر موضوع پر عربی اردو دونوں زبانوں میں اظہار خیال کرنے پر پوری طرح قادر تھے، آپ کا رہوارِ قلم بہت ہی تیز اور سیال تھا، آپ کی تصانیف اس

پر شاہد عدل ہیں، آپ نے سب سے پہلے شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ پر قلم اٹھایا، اچھوتے اور عمدہ اسلوب وانداز میں امام صاحب رحمہ اللہ کی علمی، دعوتی، اصلاحی اور تبلیغی کارناموں کو اجاگر فرمایا، ان کے مشن اور دعوتی سرگرمیوں کو بسط وتفصیل سے ذکر کیا ہے، علماء سوء نے ان پر جو باطل اعتراضات کئے تھے ان کا دندان شکن جواب دیا، اس کے بعد علامہ زماں محدث دوراں حافظ وقت شارح بخاری حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی فن حدیث میں مشہور اور نصابی کتب ''بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام'' پر حاشیہ آرائی اور مفید تعلیق لگائی اور اس کا نام ''اتحاف الکرام حاشیہ بلوغ المرام'' رکھا جو مختصر ہونے کے ساتھ جامع ومانع ہے۔

''الرحیق المختوم'' مولانا نے جامعہ سلفیہ بنارس میں قیام کے دوران تصنیف فرمائی جو کچھ دن بھر لکھتے اسے مانوس اساتذہ کو سناتے تھے ہمارا کمرہ قریب ہونے کے سبب اور مجھ سے مدرسہ فیض عام مئو کے زمانہ طالب علمی ہی سے تعلق تھا اور پھر بحیثیت استاد چار سال جامعہ سلفیہ بنارس میں ساتھ رہا، اس لئے مجھے ضرور سناتے، میں اور دوسرے اساتذہ کرام جی بھر انہیں داد تحسین دیتے۔

مولانا نے اسلام اور مسلک حق کے دفاع میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، منکرین حدیث سے آپ نے مناظرہ کیا اور انہیں ہر طرح سے لاجواب کر دیا، اہل بدعت سے مناظرہ کیا اور انہیں شکست فاش دی، قادیانیت کے خلاف آپ نے کتاب لکھی۔ عرضیکہ اسلام کے خلاف ہر محاذ پر آپ نے زبان وقلم کے ذریعہ جہاد کیا اور باطل پرستوں کے منہ کو کالا کیا **فلله الشکر الجزیل**۔

آپ ایک بہترین محقق ومفکر تھے، آپ کا ذہن ودماغ بالکل تقلیدی نہیں تھا بلکہ آپ مجتہدانہ بصیرت اور سوجھ بوجھ کے حامل تھے، اجتہادی قوت آپ کے اندر بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ جامعہ اسلامیہ مدینہ طیبہ میں آپ نے کئی سال تک سیرت نگاری کے شعبہ میں کام کی اور قیمتی تحقیقات اور بیش قیمت علمی جواہرات ونوادرات کو اپنی بصیرت سے پیش فرما کر داد وتحسین حاصل کیا۔

آپ انتہائی متواضع، خلیق وملنسار تھے، ہر چھوٹے بڑے سے خندہ پیشانی کشادہ روئی اور محبت

سے ملتے تھے۔ان کی خوش اخلاقی کا ایک واقعہ سنیے:

میں ایک بار مرکزی جمعیت اہل حدیث دہلی میں موجود تھا ان کے انتظار میں ان کے فرزند ارجمند موجود تھے، جب مولانا تشریف لائے تو انتہائی گرم جوشی اور بے تکلفی سے ملے، موصوف اپنے گھر سے کھانا بنوا کر لائے تھے، مجھے کھانے میں شریک کیا اور مختلف کھانوں کی طرف اشارہ کر کے بار بار کہتے کہ یہ کھاؤ وہ کھاؤ، گھر کا بنا ہوا ہے، اپنے گھر سے ایک پختہ پپیتا لائے تھے، مجھ سے کہا کہ یہ میرے گھر کا ہے اسے بھی کھایئے۔

اللہ تعالیٰ مولانا کی علمی، تدریسی، دعوتی اور تحقیقی خدمات کو قبول فرماتے ہوئے آپ کو جنت الفردوس میں جگہ دے[1]۔(آمین)

(1) دیکھئے: مجلہ نور توحید۔جنوری، فروری، مارچ 2007۔

موتُ العالِم موتُ العالَم

(کچھ نابغۂ عصر مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کی یاد میں)

(از: مولانا قاری عبدالحلیم بلال، پاکستان)

الحمد للّٰه ربّ العالمين، والصّلاة والسّلام على أشرف الأنبياء وسيّد المرسلين، نبينا محمد وعلىٰ آله وصحبه أجمعين، ومن تبعهم بإحسان إلىٰ يوم الدين، أما بعد:

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری - رحمہ اللہ - بہترین، کامیاب اور دینی خدمات سے بھرپور زندگی جو 64 سال پر محیط تھی، گزار کر اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔ آپ اپنے وقت کے کامیاب مدرس، نامور مؤلف ومصنف، بہترین محقق، بلند پایہ ادیب اور گرامر (نحو وصرف) کے ماہر تھے، علومِ اسلامیہ کے جس علم (فن) کو شروع کیا اس میں مہارتِ تامہ حاصل کی۔ جہاں پڑھا، جہاں پڑھایا، جہاں علمی کام کیا، اور جس پروگرام میں شریک ہوئے، جس مجلس میں مشارکت کی، لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا، گویا آپ ہرفن مولا تھے، اگر آپ کے بارے میں یہ کہا جائے کہ آپ اپنے وقت کے نابغۂ عصر تھے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے، کیونکہ جس نے اللہ کی رضا کے لئے علم سیکھا اسے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل رہتی ہے، اور جو کسی دوسرے مقصد کے لئے علم حاصل کرتا ہے اس کے نصیب میں ماسوائے ذلت ورسوائی کے اور کچھ نہیں ہوتا(1)۔

چنانچہ عالم بڑا ہی ہوتا ہے خواہ عمر چھوٹی ہی کیوں نہ ہو، اور جاہل چھوٹا ہی ہوتا ہے خواہ بڑی عمر کا ہی کیوں نہ ہو، اس کی طرف ایک عربی شاعر نے اشارہ کیا ہے:

تَعَلَّمْ فليس المرء يُولد عالمًا ... وليس أخو علمٍ كمن هو جاهلُ

وإنّ كبيرَ القوم لا علم عنده ... صغيرٌ إذا التفتْ إليه المحافل

(1) المدخل لابن الحاج: 1/123 بتصرف۔

(علم سیکھو، اس لئے کہ آدمی عالم پیدا نہیں ہوتا، اور صاحب علم جاہل کی مانند نہیں ہوسکتا۔ قوم کا جاہل سردار اپنے پاس لگی محفلوں میں بھی چھوٹا ہی ہوتا ہے)(1)۔

علماء کو ہر حالت میں غیر علماء پر برتری حاصل رہتی ہے، علم سیکھنے کے لیے نکلتے ہیں تو ان کی دوسروں پر برتری اور فضیلت ہوتی ہے، علم کی مجلس میں بیٹھے ہیں تو سب سے بہتر، اور ایک دوسرے کے ساتھ علم کا مذاکرہ کریں تو سب سے اعلیٰ، جہاں علم سیکھتے اور سکھاتے ہیں، وہاں بھی بہتر اور افضل، گویا ہر طرف سے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے خیر کو جمع کر دیا ہے(2)۔

دین حنیف کے انہی متعلمین و معلمین کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

”مَنْ سَلَکَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ بِهِ طَرِيقًا إِلَى الجَنَّةِ، وَإِنَّ الْمَلاَئِكَةَ لَتَضَعُ أَجْنِحَتَهَا رِضًا لِطَالِبِ العِلْمِ، وَإِنَّ العَالِمَ يَسْتَغْفِرُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الأَرْضِ حَتَّى الحِيتَانُ فِي المَاءِ، وَفَضْلُ العَالِمِ عَلَى العَابِدِ كَفَضْلِ القَمَرِ عَلَى سَائِرِ الكَوَاكِبِ، إِنَّ العُلَمَاءَ وَرَثَةُ الأَنْبِيَاءِ، إِنَّ الأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَلَا دِرْهَمًا، إِنَّمَا وَرَّثُوا العِلْمَ، فَمَنْ أَخَذَ بِهِ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ“.

”جو علم حاصل کرنے کی غرض سے کسی راستہ میں نکلتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس کی بدولت جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے، اور فرشتے اہلِ علم سے راضی ہوکر ان کے لیے اپنے پر بچھاتے ہیں، اور عالم کے لیے آسمانوں اور زمینوں کی تمام مخلوقیں، حتی کے سمندروں اور پانیوں میں مچھلیاں بھی ان کے لئے استغفار کرتی ہیں، عالم کا مقام و مرتبہ عابد کے مقابلہ میں ایسے ہی ہے جیسے ستاروں کے مقابلہ میں چاند کا مقام ہوتا ہے، علماء انبیاء کے وارث ہیں، انبیاء دینار و درہم کا نہیں بلکہ علم کا ورثہ چھوڑ کر گئے ہیں، جس نے علم

---

(1) جامع بیان العلم وفضلہ لا بن عبدالبر: 2\123۔

(2) أخلاق العلماء للإمام أبی بکر الآجری، ص: 41۔

حاصل کیا وہ بڑے نصیب کا مالک بنا"(1)۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری -رحمہ اللہ- سمیت ہر اس عالم کے لئے جس کی زندگی دین کے سیکھنے، سکھانے اور اس کی دعوت اور نشر و اشاعت میں گزری ہو یا گزر رہی ہو، رسول کریم ﷺ کی طرف سے خوشخبری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ خیر و بھلائی کا ارادہ کیا ہے:

"مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ".

"جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے"(2)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"إِنَّمَا الدُّنْيَا لأَرْبَعَةِ نَفَرٍ: عَبْدٍ رَزَقَهُ اللّٰهُ مَالاً وَعِلْمًا، فَهُوَ يَتَّقِي فِيهِ رَبَّهُ، وَيَصِلُ فِيهِ رَحِمَهُ، وَيَعْلَمُ لِلّٰهِ فِيهِ حَقًّا، فَهٰذَا بِأَفْضَلِ الْمَنَازِلِ، وَعَبْدٍ رَزَقَهُ اللّٰهُ عِلْمًا وَلَمْ يَرْزُقْهُ مَالاً، فَهُوَ صَادِقُ النِّيَّةِ، يَقُولُ: لَوْ أَنَّ لِي مَالاً لَعَمِلْتُ بِعَمَلِ فُلَانٍ، فَهُوَ نِيَّتُهُ، فَأَجْرُهُمَا سَوَاءٌ ......" الحديث.

"دنیا صرف چار آدمیوں کے لیے ہے: ایک وہ بندہ جسے اللہ تعالیٰ نے علم و مال سے نوازا ہے، وہ اس میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا اور صلہ رحمی کرتا رہتا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کے حق کو پہچانتا ہے، یہ سب سے اعلیٰ و افضل مرتبہ والا ہے۔ دوسرا بندہ جسے اللہ تعالیٰ نے علم سے مالا مال کیا اور مال سے محروم رکھا ہے، وہ سچی نیت سے کہتا ہے: اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے مال عطا کیا ہوتا تو میں بھی فلاں آدمی کی طرح عمل کرتا، یہی اس کی نیت ہے، چنانچہ یہ دونوں اجر و فضل میں برابر ہیں......"(3)۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ علم مال سے بہتر ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک ساتھی سے کہا:

(1) الترمذی: 2682، واللفظ لہ، وأبو داود: 3641، وابن ماجہ: 223 وأحمد: 325، 352 وصححہ الألبانی۔

(2) البخاری: 71 واللفظ لہ، ومسلم: 1037۔

(3) الترمذی: 2325 وقال: ھذا حدیث حسن صحیح۔

(يَا كُمَيْلُ! الْعِلْمُ خَيْرٌ مِنَ الْمَالِ، الْعِلْمُ يَحْرُسُكَ وَأَنْتَ تَحْرُسُ الْمَالَ، وَالْعِلْمُ حَاكِمٌ وَالْمَالُ مَحْكُومٌ عَلَيْهِ، وَالْمَالُ تَنْقُصُهُ النَّفَقَةُ، وَالْعِلْمُ يَزْكُو بِالْإِنْفَاقِ).

(اے کمیل !علم مال سے بہتر ہے، علم تیری حفاظت کرتا ہے، جبکہ مال کی تو خود حفاظت کرتا ہے، علم حاکم اور مال محکوم علیہ ہے، مال خرچ کرنے سے کم ہوتا ہے جبکہ علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے)(1)۔

تاہم اللہ تعالیٰ نے مولانا صفی الرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ کو دونوں نعمتوں سے نوازا تھا۔

مولانا صفی الرحمن رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے ان کے اخلاص اور دین کے لیے شب ورز کی ان تھک محنت کی بدولت یہ مقام ومرتبہ عطا کیا ہے کہ آپ عصر حاضر کے مشاہیر علماء اور مؤلفین کی صف میں شامل ہو گئے، عرب وعجم میں ان کا چرچا ہونے لگا، بچہ بچہ ان کے نام اور ان کی خدمات سے آگاہ ہوا، لوگ ان سے ملاقات کو شرف سمجھنے لگے۔(ذلک فضل الله يؤتيه من يشاء)

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

دنیا بھر میں مولانا کو ارتقاء وعروج ملنا، شہرت پانا اور ان کی کتابوں کو قبول عام حاصل ہونا۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور احسان سے ہے، جو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی کتاب اور اپنے دین میں مہارت اور رسوخ حاصل کرنے اور اس کی خدمت کے لئے ان تھک محنت کرنے اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کے دفاع میں زندگی وقف کر دینے کی بدولت عطا کیا ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ﴾

''اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور ان لوگوں کے جو علم دیے گئے ہیں درجات بلند فرماتے ہیں''۔ (المجادلہ:الآیۃ:11)

(1) إحیاء علوم الدین للغزالی:17/1، 18۔

نافع بن عبدالحارث نے عُسفان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نافع کو مکہ مکرمہ پر گورنر مقرر کیا کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نافع سے پوچھا: وادی والوں پر کس کو گورنر مقرر کیا ہے؟ کہا: ابن ابزیٰ کو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ابن اَبزیٰ کون ہے؟ کہا: ہمارے غلاموں میں سے ایک غلام ہے، فرمایا: غلام کو گورنر مقرر کر دیا ہے؟! نافع نے عرض کیا: وہ قرآن کا قاری اور فرائض کا عالم ہے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (اگر یہ بات ہے تو) تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهِ آخَرِينَ".

"اللہ تعالیٰ اس کتاب پر عمل کرنے کی بدولت کئی قوموں کو عروج بخشتے ہیں اور اسی کتاب سے اعراض کی وجہ سے دوسری قوموں کو پستی اور انحطاط سے دوچار کرتے ہیں"(1)۔

دنیا میں قبول عام صرف اسی خوش نصیب کو حاصل ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کے یہاں پسندیدہ اور محبوب ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے:

"إِنَّ اللّٰـهَ إِذَا أَحَبَّ عَبْدًا دَعَا جِبْرِيلَ فَقَالَ: إِنِّي أُحِبُّ فُلَانًا فَأَحِبَّهُ فَيُحِبُّهُ جِبْرِيلُ، ثُمَّ يُنَادِي فِي السَّمَاءِ فَيَقُولُ: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَأَحِبُّوهُ، فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ، ثُمَّ يُوضَعُ لَهُ الْقُبُولُ فِي الْأَرْضِ".

"اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو حضرت جبریل علیہ السلام کو بلا کر فرماتا ہے: میں فلاں بندہ سے محبت کرتا ہوں، تو بھی اس سے محبت کر، چنانچہ جبریل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرتے ہیں، پھر جبریل علیہ السلام آسمان میں منادی کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ فلاں بندہ سے محبت کرتا ہے، (اے فرشتو!) تم بھی اس سے محبت کرو، چنانچہ تمام اہلِ آسمان اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر زمین میں اس کی مقبولیت عام ہو جاتی ہے"(2)۔

---

(1) مسلم: 817۔

(2) البخاری: 3209، ومسلم: 2637۔

ہمارے ممدوح مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری - رحمہ اللہ - اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس حدیث کے مصداق تھے، جس کی وجہ سے عرب وعجم سب ان سے والہانہ محبت کرتے اور چند منٹوں کے لئے ان کے ساتھ بیٹھنے کو سعادت شمار کرتے تھے۔ اور اب ہر بندہ ان کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کو سعادت سمجھ رہا ہے، جو کہ اہلِ زمین میں ان کی قبولیت کی دلیل ہے۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ پہلی مرتبہ جب سعودی عرب تشریف لائے تو مدینہ منورہ کے ایئرپورٹ پر سب سے پہلے راقم اپنے مخلص دوست اور ساتھی شیخ اصغر علی امام مہدی سلفی جنرل سکریٹری مرکزی جمعیت اہلِ حدیث ہند کی معیت میں مولانا سے ملاقات کی، اور پھر اپنی گاڑی میں ان کو ان کی رہائش پر لانے کا شرف حاصل کیا، اس پر مستزاد یہ ہے کہ مکتبہ دارالسلام ریاض میں کئی سال تک ان کے ساتھ اور ان کی نگرانی میں المصباح المنیر فی تہذیب تفسیر ابن کثیر اور تیسیر الکریم الرحمٰن فی تفسیر کلام المنان المعروف تفسیر السعدی از علامہ عبدالرحمٰن السعدی - رحمہ اللہ - اور دیگر کتب پر علمی کام کرنے کا شرف بھی راقم کو حاصل ہے۔ چنانچہ اس اثنا میں مولانا مرحوم کے حوالہ سے جو دیکھا جو پایا۔ افادۂ عامہ کی خاطر میں چند سطور ذیل میں تحریر کرنا پسند کرتا ہوں:

1- مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری - رحمہ اللہ - ایک عالم ربانی، راسخ العقیدہ، اور سلفی المنہج تھے۔

2- کتاب وسنت سے ثابت اہلِ حدیث کے امتیازی مسائل مثلاً: رفع الیدین، امام کے پیچھے سورۃ الفاتحہ، آمین بالجہر اور نماز تراویح کی تعداد وغیرہ میں کسی قسم کا نرم رویہ نہیں رکھتے تھے، اور نہ ہی مصلحت کا شکار ہو کر کسی قسم کی مداہنت اور مجاملت کا شکار ہوتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ حنابلہ فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں تخبت کا شکار ہیں، ایک طرف اس کو رکن قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف جب مقتدی رکوع کی حالت میں امام کے ساتھ نماز میں داخل ہوتا ہے تو اس (مدرک الرکوع) کی رکعت کو جائز اور درست قرار دیتے ہیں۔ جبکہ مدرک الرکوع کی رکعت کو جائز قرار دینے کے بارے میں شریعت کے اندر ایک بھی صحیح اور صریح حدیث موجود نہیں۔ جو صحیح ہے، وہ صریح نہیں اور جو صریح ہے وہ صحیح نہیں۔ جیسا کہ مولانا عبیداللہ رحمانی نے مرعاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح میں اس کی صراحت کی ہے۔ لہٰذا مدرک الرکوع کی رکعت شمار نہیں ہوگی۔

جماعت میں پاؤں کے ساتھ پاؤں ملانے کے حوالے سے حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی درج ذیل حدیث کے بارے میں فرمایا کرتے ہیں:

"أَلا تَصِفُّونَ كَمَا تَصِفُّ المَلائِكَةُ عِنْدَ رَبِّهَا". فَقُلْنَا : يَا رَسُولَ اللّٰهِ! وَكَيْفَ تَصِفُّ المَلائِكَةُ عِنْدَ رَبِّهَا؟ قَالَ: "يُتِمُّونَ الصُّفُوفَ الأُوَلَ وَيَتَرَاصُّونَ فِي الصَّفِّ".

''کیا تم لوگ ویسے ہی صف بندی نہیں کروگے جیسے فرشتے اپنے رب کے پاس کرتے ہیں؟''۔ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! فرشتے اپنے رب کے پاس کیسے صف لگاتے ہیں؟ ارشاد فرمایا: ''پہلے اگلی صفوں کو پوری کرتے ہیں اور صف میں مل کر کھڑے ہوتے ہیں''(1)۔

تراص پر عمل کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ نمازی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اپنے پاؤں کو نہ ملائیں۔ بلوغ المرام کے حاشیہ میں اور صحیح مسلم کی شرح منۃ المنعم میں بھی یہی بات لکھی ہے۔

3- ایک دفعہ میں شیخ عبدالرحمٰن بن سلطان بن علی السلطان (رئیس لجنۃ آسیا با دارۃ المساجد والمشاریع الخیریہ سابقًا) کو مولانا سے مکتبہ دارالسلام میں ملاقات کے لیے لایا۔ تبلیغی جماعت کی دعوت، طریقۂ دعوت اور منہج کے بارے میں شیخ سلطان کو کچھ اِشکال تھا، اثنائے گفتگو مولانا نے اس بات پر زور دیا کہ ان کی دعوت نہ کتاب وسنت کی دعوت ہے نہ ان کا منہج سلف صالحین کے منہج کے مطابق ہے، مثالوں کے ساتھ اس کی وضاحت فرمائی؛ چنانچہ شیخ سلطان نے مطمئن ہو کر مولانا کے موقف کو اختیار کیا اور اس کی دعوت دینے لگے۔

4- مولانا عربی قواعد (گرامر) میں بڑے پختہ اور راسخ تھے، چنانچہ عربی گرامر کے جس مشکل ترین مسئلہ میں راقم اور ہمارے دوسرے احباب نے مولانا سے گفتگو کی مولانا کو ماہر اور پختہ ہی پایا۔ تفسیر السعدی میں علامہ عبدالرحمٰن السعدی رحمہ اللہ کی قواعد سے متعلق جن جن عبارات پر ہم نے تعلیقات اور ملاحظات لکھے، ان سب میں مولانا نے ہماری تصویب فرمائی۔

(1) مسلم:430، أبوداؤد:661، والنسائی:815، وابن ماجہ:992۔

5-مولانا بہت مضبوط اور قوی حافظہ کے مالک تھے۔ جب بھی ہم نے مولانا سے کسی مسئلہ کے بارے میں گفتگو کی بحر ہی پایا۔ اس مسئلہ کے بارے میں جس کسی نے جو کچھ لکھا اس کو تفصیل سے بیان کرتے تھے، پاک و ہند کے ہمارے کبار علماء کے حافظہ اور ان کی علمی، تعلیمی، دعوتی اور ادبی خدمات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اس تناظر میں گفتگو کرتے ہوئے ایک مرتبہ فرمارہے تھے کہ مولانا محمد یوسف سورتی رحمہ اللہ کو ستر ہزار عربی اشعار یاد تھے۔ شاہ عبدالعزیز آل سعود رحمہ اللہ نے کتنے ساتھیوں کے ساتھ اور کیسے ریاض پر حملہ کر کے قبضہ کیا تھا؟ اور 1967ء میں اسرائیل نے فلسطین، شام، لبنان وغیرہ کے جن جن علاقوں پر قبضہ کیا؟ اور کیسے کیا؟ اور عربوں سے بالخصوص سوریا نے کیسے پسپائی اختیار کی تھی؟ اس قدر تفصیل اور روانگی کے ساتھ بیان کرتے تھے کہ گویا آپ کو یہ سارے واقعات سورۃ الفاتحہ کی طرح ازبر ہیں۔

6-سیرت نبویہ علی صاحبہا افضل الصلاۃ واتم التسلیم تو ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ سیرت سے متعلق ان کی شہرۂ آفاق کتاب ''الرحیق المختوم'' جو کہ رابطہ العالم الاسلامی کے بین الأقوامی مقابلہ میں اول انعام یافتہ ہے، اس کا منہ بولتا ثبوت ہے، اس کے علاوہ تاریخ اسلامی اور حالات حاضرہ پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے، فلسطین وغیرہ کے بارے میں جو کچھ فرمایا کرتے تھے، ان میں سے بعض باتیں بعینہ اسی طرح واقع ہو چکی ہیں جیسے مولانا بیان کیا کرتے تھے، یہ سب ان کی فراست کی دلیل ہے۔ مؤمن کی فراست ایک معروف چیز ہے۔ چنانچہ امام ابن القیم -رحمہ اللہ- نے مدارج السالکین، منزلۃ الفراسۃ: 552-540/3 میں صحابہ، تابعین، اتباع تابعین اور دیگر ائمہ بالخصوص اپنے استاذ شیخ الاسلام ابن تیمیہ- رحمہ اللہ- کی فراست کے مختلف واقعات بیان کیے ہیں۔ جنید -رحمہ اللہ- کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایک دن کچھ لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے تو ایک نوجوان عیسائی لڑکے نے انہیں پکار کر کہا: اے شیخ! رسول اللہ ﷺ کے فرمان ''اتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤمِنِ، فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللهِ''[1] کے معنی ہیں۔

جنید- رحمہ اللہ- نے کچھ دیر سر جھکایا اور پھر اٹھا کر کہا:

(1) ترمذی: 3127، شیخ البانی نے ضعیف قرار دیا ہے۔

"أَسْلِمْ، فَقَدْ حَانَ وَقْتُ إِسْلامِكَ".

"مسلمان ہوجا تیرے مسلمان ہونے کا وقت آگیا ہے"۔

چنانچہ وہ عیسائی نوجوان مسلمان ہوگیا۔

7- مولانا جب کبھی کسی کا رد فرماتے تو سلف صالحین کے منہج کے مطابق مہذب طریقہ اور مضبوط دلائل کے ساتھ رد فرماتے، مولانا کی کتاب (إبراز الحق والصواب فی مسألة السفور والحجاب) جو کہ مراکش کے علامہ دکتور محمد تقی الدین الہلالی رحمہ اللہ کے مقالہ (الإسفار عن الحق فی مسألة الحجاب والسفور) کا انتہائی علمی انداز میں رد ہے، جس میں مولانا نے دکتور کا مودبانہ اور شاندار انداز میں جواب دیا ہے، جو پڑھنے کے لائق ہے، اس میں مولانا کی عربی زبان میں فصاحت قابل داد ہے، اور یہ ایک ایسی کتاب ہے جو بہت سارے اہلِ علم کی نظر سے غائب اور اوجھل ہے، اس کے لکھنے کے بعد مدینہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور دکاترہ نے مولانا کو مبارکباد کا مستحق قرار دیا تھا، اور مولانا سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اس کتاب کو خوبصورت طباعت سے آراستہ کر کے لوگوں کے سامنے لائیں۔ اس کتاب کے کچھ نمونے قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا، تاہم طوالت کے خوف سے اس کو چھوڑ رہا ہوں، لہذا جو آدمی مولانا کی عربی زبان میں فصاحت وسلاست دیکھنا چاہتا وہ سابق الذکر کتاب کا مطالعہ کرے، نیز اگر کسی کو مولانا کے عربی زبان پر عبور اور پختگی کے بارے میں شک ہو تو ان کی کتاب (الرحیق المختوم) کا مطالعہ کرے، اس کا وہم زائل ہوجائے گا۔

8- مولانا خشک مزاج نہ تھے، بلکہ انتہائی خوش طبع اور صاحب خلق تھے، چنانچہ دار السلام میں ہمیں علمی کام کے دوران وقفہ وقفہ سے مختصر اور علمی لطائف سنایا کرتے تھے، گویا آپ کائنات کے امام محمد رسول اللہ ﷺ کے درج ذیل فرمان کا عملی نمونہ تھے:

"إِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ أَحْسَنَكُمْ أَخْلاقًا".

"تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے"(1)۔

9- اہلِ علم اور طلبہ کے ساتھ بڑی تواضع اور اخلاق سے پیش آتے تھے، اور جن علماء نے دین

(1) بخاری: 3559، مسلم: 2321۔

اسلام کے لیے کوئی کردار ادا کیا ہے، خواہ وہ تدریسی میدان میں ہو یا دعوتی، یا تالیف وتصنیف کے میدان میں ان کی خدمات کو سراہتے اور ان کا ذکر خیر فرماتے تھے۔

10- جو لوگ مسائل معلوم کرنے کے لیے آتے مولانا ان کا تسلی بخش جواب دینے کے بعد اپنے کام میں مصروف ہو جاتے تھے۔

11- بعض دفعہ امت کے درپیش مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے، امت مسلمہ کے زوال وانحطاط پر تفصیل سے روشنی ڈالتے، امت مسلمہ کو ان مصائب ومشاکل سے نکالنے کے لیے جس مضبوط پلاننگ، محنت اور اسباب واعمال اختیار کرنے کی ضرورت ہے تفصیل سے بیان کرتے، مسلمانوں کا اپنی صفوں کو متحد کرنا، معیشت کو مضبوط کرنا اور ہر میدان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد جہاد کے لیے پلاننگ کرنا، بطور خاص ذکر کیا کرتے تھے، جہاد کا تذکرہ کرتے ہوئے کسی کا خوف خاطر میں نہیں لاتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں جہاد اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جو جماعتیں دشمن سے برسر پیکار ہیں ان کی کھل کر تائید فرمایا کرتے تھے۔

12- جب کوئی مولانا سے کسی بھی مسئلہ کے بارے میں مشورہ کرتا اور خیر خواہی طلب کرتا تو آپ اسے درست مشورہ دیتے اور ٹھیک ٹھیک خیر خواہی کرتے گویا آپ رسول اللہ ﷺ کی درج ذیل حدیث کا عملی نمونہ تھے:

"إِذَا اسْتَنْصَحَ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ فَلْيَنْصَحْ لَهُ".

"جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی سے خیر خواہی طلب کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے خیر خواہی سے نوازے"(1)۔

13- مولانا مہمان نواز بھی تھے، بالخصوص علماء کا احترام کرتے اور خاطر تواضع کیے بغیر جانے کی اجازت نہ دیتے۔ ہمارے استاذ مکرم ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر- حفظہ اللہ- جو پاکستان میں اہلِ حدیث کے کبار علماء میں سے ایک ہیں۔ جب دو سال قبل سعودی عرب تشریف لائے تو مسجد نبوی کی زیارت کے لیے مدینہ منورہ تشریف لے گئے، مدینہ منورہ میں قیام کے دوران انہیں خبر ملی کہ

(1) بخاری: البیوع، 2157 سے قبل والی حدیث، معلقاً، أحمد: 4/259 موصولاً۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری آج کل مدینہ منورہ تشریف فرما ہیں، تو حضرت حافظ صاحب ان کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے، دوران ملاقات مختلف مسائل پر گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد حافظ صاحب نے جانے کی اجازت طلب کی تو مولانا رحمہ اللہ نے فرمایا: ناشتہ اور چائے وغیرہ تیار ہو رہی ہے، تناول کرنے کے بعد ہی آپ جاسکتے ہیں، آخر کار حافظ صاحب کو تناول کرنے کے بعد ہی وہاں سے جانے کی اجازت ملی۔

14- میرا پچیس سالہ مشاہدہ ہے کہ علوم شرعیہ کے مدرسین عموماً پختہ علماء ہونے کے ساتھ ساتھ عاملین بالشرع بھی ہوتے ہیں، اس لئے تاحیات ان کا حافظہ اور عقل سلامت رہتی اور کام کرتے رہتے ہیں، اس سلسلہ میں جن علمائے کرام کا میں مشاہدہ کر چکا ہوں، ان میں سے چند درج ذیل ہیں: علامہ محدث حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ، مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ، اور علامہ محدث عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ (جو موت سے چند منٹ قبل تک غیر مسلم ڈاکٹروں کو اسلام کی دعوت دیتے رہے ہیں) اور محدث عصر علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ وغیرہم۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری -رحمہ اللہ- سیرت طیبہ پر شاندار کتاب (الرحیق المختوم) لکھنے کے بعد خواب میں سردارِ دو جہاں، نبی الزماں محمد رسول اللہ ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل کر چکے ہیں۔ جو بہت بڑی کامیابی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی دلیل ہے۔

آپ چونکہ عالم باعمل اور متبع سنت تھے، اور سنت کے دفاع کے لئے بھرپور کردار ادا کرتے رہے، لہٰذا ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ممدوح مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری -رحمہ اللہ- کی لغزشوں سے درگزر فرمائے، ان کے درجات کو بلند کرے، ان کی کتابوں کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، اور اپنے حبیب محمد رسول اللہ ﷺ کے جوار میں ان کو جگہ عطا فرمائے اور ہمیں بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ اور آخرت میں جنت کے اندر اپنے نبی کریم ﷺ کی معیت نصیب فرمائے۔

إنّه ولي ذلك والقادر عليه، وصلى اللّه وسلّم على نبينا محمد وعلىٰ آله وصحبه أجمعين، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين.

ایک یادگار شخصیت

(از: مولانا عبدالمجید اصلاحیؔ، جیراجپور اعظم گڑھ یوپی)

شخصیتیں مختلف پہلوؤں سے یادگار ہوا کرتی ہیں، کوئی شخصیت قرآن عزیز کے فہم تدبر میں اس کے دور دراز گوشوں تک پہنچتی ہے، کوئی شخصیت علم حدیث میں باکمال اور اس کے تمام گوشوں پر نظر رکھتی ہے، کوئی شخصیت اسماء الرجال کے بحر بیکراں میں غوطہ زن ہو کر سرخرو ہوتی ہے، کوئی شخصیت تفقہ فی الدین کی نعمت سے مالا مال ہوتی ہے، کوئی شخصیت تاریخی واقعات کے صحت وسقم کے ادراک کا ملکہ رکھتی ہے، کوئی شخصیت فلسفہ وسائنس کے میدان میں عظمت وجلالت کی چوٹی پر اپنا علم گاڑ دیتی ہے، اسی طرح کوئی شخصیت ذہانت وطباعی اور فہم وادراک کے اندر درجہ کمال پر فائز ہوا کرتی ہے۔

ہمارے نزدیک مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ ذہانت وطباعی کے اندر یادگار شخصیت کے مالک تھے، ان کے چہرے سے فہم وادراک اور فکر رسا کے آثار اور علامات نمایاں تھے، گفتگو بصیرت افروز، تحریر پختہ، زبان وبیان کا معیار معتدل اور ممتاز، اختلافی مسائل کے اندر مجادلہ حسن کی شان رکھتے تھے، حاضر جوابی ان کی ذہانت کی سب سے بڑی علامت تھی۔

ہماری ملاقات سب سے پہلے مولانا علیہ الرحمہ سے جامعہ اثریہ دارالحدیث مئو میں ہوئی تھی، یہ غالباً 1960، 1961ء کا زمانہ تھا، اس وقت مولانا زیر تعلیم تھے یا معلم ہو چکے تھے، وہ ہم سے کوئی ۸،۹ سال چھوٹے تھے، پہلی ہی نظر میں ہم نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ مستقبل میں کوئی اہم شخصیت کا مقام حاصل کریں گے، ان کی گفتگو، ان کا رکھ رکھاؤ، ان کی سنجیدگی اور متانت شروع ہی سے آئندہ کسی اہمیت اور وزن کا پتہ دے رہی تھی۔

مشاہدہ ہے کہ ذہانت اور دانشوری کبھی حد سے تجاوز کر جاتی ہے، مولانا آزاد حد سے آگے بڑھ گئے، حافظ اسلم جیراجپوری بھی بے حد ذہین تھے مگر بے شمار فکری اور علمی لغزشوں میں مبتلا ہو گئے، سر

سید بھی بلا کے ذہین تھے مگر تفسیرات احمدیہ کے ذریعہ حدود سے تجاوز کر گئے، مولانا صفی الرحمٰن بھی ذہین تھے مگر الحمد للہ انہوں نے کبھی بھی حد سے تجاوز نہیں کیا، بلکہ حد کے اندر رہتے ہوئے کتاب وسنت کے مثبت فکر کو اجاگر اور اس کے خلاف حملوں کا کامیاب دفاع کیا۔

اپنی جماعت کے اندر بھی بعض نوجوان اہل حدیث بے حد ذہین ہیں، مگر وہ اپنی ذہانت سے کھیلنے لگے، دیکھیے ان کی ذہانت آئندہ کیا گل کھلاتی ہے۔ جماعت اہل حدیث کی ایک معروف شخصیت ہے جو کلام نبوت کی شیدا، شب وروز اس کے مطالعہ اور تحقیق میں غرق اور اپنے طرز فکر کا ایک ادارہ بھی قائم کیے ہوئے ہے، نیز اپنے فکر کا ایک ماہوار رسالہ بھی جاری کر رکھا ہے، اس کا بیان ہے کہ وہ ہندوستان میں صرف دو ہی علمی اور ادبی شخصیتوں سے متاثر ہو سکا، ان میں ایک یہی ہمارے مولانا صفی الرحمٰن رحمہ اللہ تھے، مذکورہ شخصیت کے تنقید واحتساب کی تیغ براں جس پر پڑی مشکل ہی سے وہ جانبر ہو سکا ہے۔

مولانا علیہ الرحمہ فیض عام مئو، جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ اور دیگر اداروں سے گذرتے ہوئے مرکزی دارالعلوم بنارس اور پھر مدینہ یونیورسٹی پہنچے، ہماری ملاقات ان سے زیادہ تر بنارس اور مدینہ میں ہوتی رہی۔

مرکزی دارالعلوم کے زمانہ قیام میں ایک دفعہ بطور جائزہ ہم نے موصوف سے پوچھا سورہ مریم کے اندر "فناداها من تحتها" میں مفسرین کے دو اقوال ہیں ایک قول یہ ہے کہ نادیٰ کا فاعل جبرئیل علیہ السلام ہیں اور ایک قول کے مطابق خود عیسیٰ علیہ السلام ہیں، ان دونوں اقوال میں آپ کے نزدیک صحیح قول کون سا ہے؟ انہوں نے برملا فرمایا کہ یہاں جبرئیل علیہ السلام کا کیا کام تھا، ہم نے بے اختیار جزاک اللہ کہا، یہ جواب ان کی ذہانت پر مبنی تھا، اگر سیاق وسباق اور نظم کلام پر بھی ان کی نگاہ ہوتی تو بھی یہی جواب ہوتا، اس وقت ہم نے اپنے دل میں کہا کہ اگر یہ شخص ہر طرف سے کٹ کر صرف قرآن عزیز کو اپنے غور وفکر کا مرکز بنائے، اور فکر وتدبر کے اس دروازہ سے داخل ہو جس سے داخل ہو کر آدمی قرآن کے شہرستان معانی میں پہنچ جاتا ہے تو آیات ومفردات کے وہ بہت سارے مفاہیم جو پردہ خفا میں ہیں اور مفسرین اور مترجمین کے یہاں الٹ گئے ہیں وہ سب

روشنی میں آجائیں۔

جس زمانہ میں مولانا کا قیام مرکزی دارالعلوم میں تھا، اسی زمانہ میں ناچیز مدرسۃ الاصلاح کے اندر عربی زبان وادب کی انتہائی کتابیں پڑھا رہا تھا، مولانا کسی وقت مرکزی دارالعلوم سے کچھ دل گرفتہ ہو گئے تھے، مدرسۃ الاصلاح کے ارباب نظم ونسق نے ہمیں اختیار دے رکھا تھا کہ اپنی صوابدید سے اچھے اساتذہ مدرسہ کے لیے حاصل کروں اور مشاہرہ جو بھی وہ طلب کریں اسے منظور کرلوں۔ چنانچہ ہم نے مولانا سے کہا ''مدرسۃ الاصلاح'' چلیں گے؟ انہوں نے ''ہاں'' کہا تو ہم نے مشاہرہ پوچھا انہوں نے تعیین فرمائی ہم نے کہا بوریا بستر سنبھالیں'' اور ابھی اسی مشاہرہ پر ہمارے ساتھ چلیں؟ فرمایا: ''ذرا شیخ الحدیث سے اجازت لے لوں''۔ میں نے کہا: ''پھر آپ نہیں جاسکیں گے کیونکہ شیخ محترم کبھی اجازت نہیں دیں گے''۔

یہ تھا ہماری جانب سے پہلی بار مولانا کی علمی اور ادبی شخصیت کا اعتراف، مدارس اور جمعیت ہائے اہلحدیث کے پروگراموں میں جب کبھی ساتھ ہوا دوران قیام اور دوران سفر مختلف علمی وادبی موضوعات پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا اور دونوں کے افکار اور اذہان میں حیرت انگیز حد تک توارد ہوتا رہا، ''أصح الكتب بعد كتاب الله البخاری'' کی جو بات ہمارے یہاں معروف ومشہور ہے اس کا مطلب تو یہی ہے کہ بخاری صحت کے اعتبار سے قرآن عزیز کے ہم پلہ نہیں ہے، اس کے اندر ضرور کچھ ضعف اور خامی ہوگی جس کے باعث اس کا درجہ قرآن حکیم کے بعد مگر حدیث کی دیگر کتب سے پہلے کا ہے۔ ایک دفعہ ہم نے مولانا سے پوچھا: ''کیا بخاری شریف کی جملہ احادیث صحت کے اعتبار سے اسی درجہ کی ہیں کہ کسی ایک پر بھی کلام کی گنجائش نہیں ہے؟'' فرمایا ''کیوں نہیں، بعض احادیث پر کلام کیا گیا ہے''۔

یہود کی ریشہ دوانیاں کہاں سے بڑھ کر کہاں تک پہنچی ہیں، ان کے منافقین نے ہماری صفوں کے اندر ہمارے دین کو بگاڑنے کی بھرپور کوشش کی ہیں اور برابر کر رہے ہیں، مگر اللہ کا فضل واحسان ہے کہ اس نے ہمارے دین کو محفوظ رکھا ہے اور یہ قیامت تک محفوظ رہے گا۔

رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی جانب سے سیرت نگاری کے عالمی مقابلہ کا اعلان ہوا تو ہم نے بھی

میدان میں اترنے کا فیصلہ کیا تھا، مگر معلوم ہوا کہ ہمارے مولانا میدان میں اتر چکے ہیں، لہٰذا اپنا ارادہ کینسل کر دیا، دوران تسوید ایک مقام پر انہوں نے توقف کر رکھا تھا، ملاقات ہونے پر تذکرہ کیا تو ہم نے کہا: اسے اس طرح لکھ دیں۔ چنانچہ موصوف نے ایسا ہی کیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ میں اور مولانا دونوں ہی معاشی اعتبار سے کسمپرسی کے عالم میں تھے۔ ''الرحیق المختوم'' پر جب پہلے انعام کا اعلان ہوا تو مولانا نے فرمایا انعامی رقم میں سے تھوڑا آپ کو بھی دوں گا۔ میں نے کہا ''جی نہیں اپنا گھر درست کر لیجئے اور بچوں کو دیکھئے۔''

سیرت اور تاریخی واقعات پر ان کی دوررس نگاہ تھی، ایسا لگتا تھا جیسے واقعات کا مشاہدہ سر کی آنکھوں سے کر رہے ہوں، میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ پر کوئی تاریخی الزام تھا مگر اس کا جواب انہوں نے اس طرح دیا جیسے وہ خود میاں صاحب کے ساتھ رہے ہوں اور الزام کی بے حقیقی ان کی نگاہوں میں ہو، اعداء کی بولتی بند ہو گئی۔

مدینہ منورہ کے اندر دوران قیام ایک دفعہ ہم مدینہ پہنچے تو مولانا کی قیام گاہ پر آئے جو مسجد نبوی سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع تھی، رمضان المبارک کا مہینہ تھا، افطار کے لیے تھوڑا وقت رہ گیا تھا، ہم نے جبل احد اور وہاں کے جنگی نقشہ کو دیکھنے کی درخواست کی، فوراً تیار ہو گئے اور سید الشہداء روڈ سے ہوتے ہوئے یہاں پہنچے، مولانا ہمیں لے کر جبل الرماۃ پر کھڑے ہو گئے اور جنگ کا نقشہ اس طرح سمجھایا جیسے وہ خود اونچے مقام پر رہے ہوں اور جنگ کا منظر ان کے سامنے ہو، یہ نقشہ آج تک ہمارے ذہن کے ایک گوشہ پر مرتسم ہے، یہاں سے قیام گاہ واپس آئے تو افطار کا وقت ہو چکا تھا، ایک پاؤڈر سے انہوں نے فوری طور پر فیرنی تیار کر لی، حیرت سے پوچھا: اتنی جلد یہ کیسے تیار ہو گئی؟ فرمایا: بس یہ اسی طرح تھوڑا پانی ڈالنے کے بعد تیار ہو جایا کرتی ہے۔

مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند کے منصۂ شہود پر بہت سارے حضرات آتے گئے اور اپنا اپنا ''کریڈٹ'' لیکر قصۂ پارینہ ہوتے گئے، جماعت اہل حدیث ایک تحریک تھی، طوفان تھی، بگولا تھی، جسے حرکت المجاہدین اور وہابی تحریک سے یاد کیا جاتا تھا، سلطان عبدالعزیز جب حجاز سمیت پورے جزیرۃ العرب کے حکمراں ہوئے تو جماعت کو ایک گوشۂ عافیت مل گئی، کاش اس نے اسی

گوشۂ عافیت کی بجائے گوشہ گیر ہو کر خود کو محفوظ کر لیا ہوتا۔

1950ء کے ادھر ادھر ہم نے میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کے شاگرد ارشد مولانا سلامت اللہ جیراج پوری کے فرزند اور وطن عزیز میں ہمارے خانوادہ سے تعلق رکھنے والے اور ''منکر حدیث'' کا ٹائٹل لگ جانے کے باوجود مسلک اہلحدیث پر شدت سے عامل اور مسلک ہی کے مطابق فتوے دینے والے حافظ اسلم جیراج پوری رحمہ اللہ کو لکھا:

''آپ کا چل چلاؤ ہے اور ہم زندگی کے دروازے پر کھڑے ہیں، فرمائیں ہم کس جماعت کے ساتھ رہ کر آخرت کی امید رکھ سکتے ہیں؟'' اس کا جواب حافظ صاحب نے دوسطری اس طرح دیا تھا: ''کل تک جماعت اہل حدیث راستہ پر تھی، اب وہ پٹری سے اتر گئی ہے، اس کی جگہ جماعت اسلامی نے لے لی ہے'' اور پھر ہم جماعت اسلامی کے ساتھ پندرہ سال تک رہے، رکنیت کے مقام تک پہنچے، مولانا مودودی کے ایماء سے ایک ماہ ان کے ساتھ بھی رہے، پھر دیکھا کہ یہ بھی پٹری سے اتر گئی ہے تو گھوم کر اپنی جماعت اہل حدیث کو زندہ کرنا چاہا اور اب تک اسی کوشش میں ہیں۔

اس تمہید طولانی کا مقصد یہ بتانا ہے کہ مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کے موجودہ ڈھانچہ سے پہلے اور مولانا مختار احمد صاحب ندوی کی امارت وصدارت کے بعد مولانا صفی الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ کو امیر/صدر بنایا گیا۔ یہ امیر کی اصطلاح مولانا مختار احمد صاحب نے قائم کی تھی، قائم کرنا ہی تھا اور صحیح بھی یہی تھا تو جمعیۃ کے اساسی دستور کو تبدیل اس طرح کر دیا جاتا کہ اماراتی نظام کی تشکیل ہو جاتی، مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری کو امیر بنایا گیا تو ہماری ملاقات ان سے دہلی میں مرکز کے دفتر میں ہوئی، اس وقت ہم نے ان سے کہا تھا ''یہ آپ اس وادی پرخار میں کہاں آ گئے'' ہم ان کا مزاج سمجھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر جو گہری دینی بصیرت رکھی تھی اور اپنے اسلاف اور بزرگان قدیم کا جو گہرا مطالعہ ان کا تھا اسی سے ان کا ضمیر اور ان کا کردار بھی بنا تھا، چنانچہ جمعیۃ کی موجودہ رفتار گفتار سے ان کا مزاج قطعاً میل نہیں کھاتا تھا۔

ابھی چند سال پہلے جب وہ بیمار ہو کر وطن آ گئے تو ضلعی جمعیۃ اعظم گڑھ کو زندہ کرنے کے لئے ہم

دورہ کرتے ہوئے حسین آباد بھی پہنچے، مولانا کو خبر ہوئی تو بمشکل باہر آئے، آواز مشکل سے نکل رہی تھی، پھر بھی تھوڑی دیر گفتگو کی دورے کی کامیابی کے لئے دعا بھی کی اور زرتعاون بھی پیش فرمایا، ان کی گرتی ہوئی صحت دیکھ کر ہمیں سخت تشویش ہوئی۔

تدریس، تقریر، تحریر، مجادلہ حسن کے میدان میں مولانا کی خدمات شاہکار ہیں، وہ علم وآگہی اور تحقیق وجستجو کی فضاؤں میں عظمت وجلالت کا وہ شہباز ہے جو پرواز کے بعد ایک ایسی بلند چوٹی پر بیٹھ گیا ہے جہاں اسے کسی حسین اور مکلل کلغی کی ضرورت نہیں ہے "الرحیق المختوم اور اتحاف الکرام جیسی تصانیف نے اسے یادگار شخصیت کا تمغہ امتیاز بخشا ہے۔ ہندستان ہی کیا سارے عالم اسلامی میں وہ محبوب اور ہر دل عزیز ہو چکا تھا۔

ابھی چند روز پیشتر عزیز مکرم انصار زبیر محمدی صاحب نے سعودیہ سے بذریعہ فون ہم سے رابطہ کر کے کہا کہ علاء الدین پٹی میں زیر تعمیر مسجد کے لئے شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری صاحب کی جانب سے تصدیق نامہ کی ضرورت ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا صفی الرحمٰن رحمہ اللہ عرب وعجم ہر جگہ معروف ہو چکے تھے، مولانا چلے گئے، یہ ہمیں عزیز تھے، ان کے کارنامے باقی رہیں گے، جو ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔

إذا مــا امــرؤ اثــنـىٰ بــآلاء ميت   فــلا يعبــد الــلــه الــوليد بن أدهما

لـعـمـرك مـا واریٰ الـتـراب فعاله   ولـكـنــه واریٰ ثـيابا وأعـظـما

مولانا علیہ الرحمہ کے باب میں بہت ساری باتوں میں سے یہ تھوڑی سی باتیں ہیں جو مولانا عبداللہ صاحب جھنڈانگری مدیر "نورتوحید" کی طلب پر بعجلت قلمبند کی گئی ہیں، اللہ تعالیٰ سے بصمیم قلب دعا ہے کہ مولانا کو کروٹ کروٹ راحت اور پسماندگان کو صبر وشکیب کی نعمت عطا فرمائے (1)۔

اللهم ارحمه واغفرله وعافه واعف عنه وأدخله فسيح جناتك.

(1) دیکھئے: مجلہ نورتوحید۔ جنوری، فروری، مارچ 2007۔

کچھ یادیں کچھ باتیں

جانے والا تجھے روئے گا زمانہ برسوں

(از: مولانا صلاح الدین مقبول احمد، کویت)

"إن العين تدمع والقلب يحزن ولا نقول إلا ما يرضى ربنا"

مادرِ علمی جامعہ سلفیہ بنارس کے ابتدائی سالوں میں زیرِ تعلیم تھا، تعطیل میں اپنے گاؤں اونر ہوا بلرام پور گیا، مولانا کے ایک پرانے شاگرد نے کہا: شیخ الحدیث صاحب (علامہ عبید اللہ رحمانی) کی صحت کی کمزوری اور پیرانہ سالی کے سبب شاید ان کی عظیم تصنیف "مرعاۃ الفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح"، مکمل نہ ہو سکے، کاش کہ شیخ صاحب کے تعاون کے لئے مولانا صفی الرحمٰن کی خدمات حاصل کی جائیں، اس طرح پہلی بار مولانا کا اسم گرامی گوش گذار ہوا، اندازہ ہوا کہ واقعی کوئی اہم علمی شخصیت ہے، یہ تقریباً 1972ء کی بات ہوگی۔

1974ء میں مولانا بحیثیت مدرس و محقق و باحث جامعہ سلفیہ تشریف لائے، فضیلت میں ان سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا کامیاب مدرس با صلاحیت محرر بہترین نقاد اور قابل تعریف مناظر تھے، علوم شرعیہ میں مہارت کے ساتھ تاریخی، جغرافیائی اور سیاسی بصیرت و تجربہ کا وافر حصہ آپ کو نصیب ہوا تھا، جس کی واضح دلیل درج ذیل پیشین گوئی ہے۔

کویت پر عراقی فوج کشی کے چند مہینوں کے بعد امریکہ کی مداخلت سے بہت پہلے جب مولانا سے مدینہ طیبہ میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا یہ حملہ عراق کو تین حصوں میں تقسیم کر دینے کا پیش خیمہ ہے۔

مولانا رحمہ اللہ کی یہ بات بار بار یاد آ رہی ہے، آج عراق اسی تقسیم کی طرف نہایت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ جامعہ فیض عام مئو سے 1961ء میں فراغت کے بعد تقریباً 13 سال تک ہندوستان کے مختلف اداروں میں تدریس و انتظامی خدمات انجام دیتے رہے، لیکن جب 1974ء میں جامعہ

سلفیہ تشریف لائے تو اس مرکزی پلیٹ فارم سے درس وتدریس تصنیف وتالیف دعوت وتبلیغ اور صحافت ومناظرہ کے میدانوں میں کامیاب کردار ادا کرنے کا سنہرا موقع ملا۔

اسی دور میں رابطہ اسلامی مکہ مکرمہ کی طرف سے سیرت کے عالمی مقابلے میں شریک ہونے کے لئے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''الرحیق المختوم'' کی تصنیف فرمائی، اور انعام حاصل کرنے کے موقع ۱۳۹۹ھ میں پہلی بار زیارت حرمین سے مشرف ہوئے، اس وقت ہم لوگ مدینہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے، فن حدیث کے ایک بزرگ استاد ڈاکٹر السید عبدالمنعم النجم سے مولانا کی ملاقات کالج میں کروائی گئی، تو انہوں نے کتاب میں سیرت کے واقعات کی حدیثی تحقیق سے متعلق سوال کیا، مولانا نے فرمایا ان شاء اللہ آئندہ یہ کمی بھی پوری کردی جائے گی۔

مولانا اس دنیا سے رخصت ہوگئے، لیکن ان کے ہم عصروں میں جماعت کی ممتاز شخصیات موجود ہیں، بطور خاص جناب مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری، ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری، ڈاکٹر عبدالعلی ازہری (لندن)، مولانا عبدالحمید رحمانی دہلی، مولانا عبد الحنان فیضی، مولانا عبد السلام رحمانی (بونڈیہار)، مولانا محمد مظہر احسن ازہری مئو وغیرہم حفظہم اللہ قابل ذکر ہیں، اللہ رب العالمین ان بزرگوں کا سایہ تادیر باقی رکھے۔

مولانا رحمہ اللہ کے تلامذہ عرب وعجم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مولانا کی تصانیف کی تعداد تقریبا 50 ہے، ان میں حدیثی اہمیت کے پیش نظر منۃ المنعم شرح صحیح مسلم ممتاز ہے، یہ مختصر شرح ہے، کام یک گونہ عجلت میں ہوا تھا، جس سے بعض مقامات پر تشنگی کا احساس ہوتا ہے، کاش ضرورت کے مطابق کافی وقت ملا ہوتا۔ اس اہم شرح کی بعض خصوصیات کا خلاصہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

۱۔ اس شرح میں دلائل کی روشنی میں مسلک محدثین کی ترجمانی کی گئی ہے۔

۲۔ جہاں جہاں حدیث کی فقہی تاویلیں کی گئی ہیں، ان کا خوبصورت انداز میں اختصار کے ساتھ جواب دیا گیا ہے۔

۳۔ غزوات وحوادث اور اماکن کی نئی معلومات کی روشنی میں تحقیق کی گئی ہے۔

۴۔ امام نووی رحمہ اللہ کی تبویب میں حسب ضرورت ترمیم کی گئی ہے۔

یہ ایک مفید اور مختصر شرح ہے جس کی کافی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے، اس میں حافظ ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ کی مشہور زمانہ کتاب ''فتح الباری، شرح بخاری'' سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ اس کتاب کو علماء اور طلبا کے لئے مفید عام بنائے اور مولانا رحمہ اللہ کے لئے اس کتاب اور جملہ تصنیفات کو ذخیرہ آخرت بنائے۔ آمین۔

ہے اسی قانون عالم گیر کا یہ سب اثر
بوئے گل کا باغ سے، گلچیں کا دنیا سے سفر

میں مولانا رحمہ اللہ کے جملہ پسماندگان کے غم میں شریک اور ان کے لئے دعا گو ہوں (1)۔

(1) دیکھئے: مجلہ نورتوحید۔ جنوری، فروری، مارچ 2007۔

ایک باکمال استاد اور مشفق مربی

(از: مولانا عبدالمنان سلفی، وکیل الجامعہ سراج العلوم جھنڈا نگر، نیپال)

مادر علمی جامعہ سلفیہ بنارس میں جن نامور اساتذہ کرام سے کسب فیض کی سعادت حاصل ہوئی ان میں ایک باکمال اور ہر دل عزیز شخصیت استاد محترم حضرت علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کی تھی، یہ حسن اتفاق ہی تھا کہ جس سال میں نے جامعہ رحمانیہ (جامعہ سلفیہ کا شعبہ متوسط وثانویہ) بنارس میں عربی کی جماعت ثالثہ (ثانویہ سال اول) میں داخلہ لیا تھا اسی سال مولانا بحیثیت مدرس وباحث جامعہ سلفیہ تشریف لائے تھے اور تدریسی فریضہ کی انجام دہی کے ساتھ شعبۂ تصنیف وتالیف سے وابستہ ہو کر قادیانیت کے موضوع پر اپنی تحقیقی کتاب تصنیف فرما رہے تھے، اس وقت جامعہ رحمانیہ کا شعبۂ عربی، جامعہ سلفیہ سے کچھ فاصلہ پر محلہ باگڑبلی میں چل رہا تھا، جب کہ اس کا دارالاقامہ مدنپورہ سے متصل محلہ پانڈے حویلی میں تھا، والد محترم مولانا عبدالحنان صاحب فیضی حفظہ اللہ ان دنوں جامعہ سلفیہ میں مدرس تھے، اس لئے جامعہ رحمانیہ کے ناظم مولانا عبدالقدوس نسیم بنارسی رحمہ اللہ اور جامعہ سلفیہ کے ناظم مولانا عبدالوحید سلفی رحمہ اللہ کی خصوصی اجازت سے میرا قیام والد محترم کے ساتھ جامعہ سلفیہ ہی میں تھا البتہ تعلیم اور کھانے کے لئے مجھے جامعہ رحمانیہ جانا پڑتا تھا۔

جامعہ سلفیہ میں استاد محترم علامہ صفی الرحمٰن کا رہائشی کمرہ والد صاحب کے کمرہ سے متصل تھا اور یہ دونوں حضرات مدرسہ فیض عام مئو کے رفیق مدرسہ تھے، اس لئے مولانا کا آنا جانا اکثر والد صاحب کے پاس ہوتا تھا، اس وقت میں ایک مبتدی طالب تھا، مولانا کے فضل وکمال کا مجھے اندازہ نہ تھا تاہم والد صاحب کو یہ کہتے اکثر سنتا کہ ’’مولانا بڑے ذہین اور قابل ہیں‘‘ اس طرح مولانا کی عظمت کا پہلا نقش میرے دل پر بیٹھا، کچھ دنوں بعد والد صاحب نے مولانا کی تصنیف ’’شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی‘‘ مجھے پڑھنے کو دی، اس سے مجھے احساس ہوا کہ یہ کوئی خاص کتاب ہے

جسے میرے شفیق باپ نے منتخب کر کے مطالعہ کے لئے دی ہے، اس لئے پورے اہتمام اور ذوق وشوق سے اس کا مطالعہ کیا، اس زمانہ میں الدار السّلفیہ ممبئی سے اسی نام سے ایک مترجم کتاب بھی شائع ہوئی تھی، میں نے اپنے طور پر دونوں میں موازنہ کیا تو مجھے پتہ نہیں کیوں مولانا کی کتاب اس مترجم کتاب سے اچھی لگی، وہ تاریخی کتاب آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔

دو سال بعد جامعہ سلفیہ میں حصول تعلیم کا موقع ملا تو مولانا سے بھی تلمذ کا شرف حاصل ہوا اور عالمیت وفضیلت کے چھ سالہ تعلیمی مرحلہ میں آپ سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھنے کی سعادت ملی، یہ ہماری خوش بختی ہی تھی کہ دیگر کتابوں کے ساتھ حدیث کی تین اہم کتابیں یعنی (جامع ترمذی، صحیح بخاری، ج۔۲) اور (صحیح مسلم ج۔۱) ہمیں مولانا نے پڑھائیں۔ حقیقت ہے کہ آپ حدیث کی ان کتابوں کو محدثانہ شان سے پڑھاتے تھے اور بڑے مرکز انداز میں سند و متن پر گفتگو فرماتے کہ ہم طلبہ عش عش کر اٹھتے اور آپ کے فضل وکمال کے گن گاتے نہ تھکتے تھے، خصوصاً وہ منظر دیدنی ہوتا تھا جب ساتھیوں میں سے کوئی کسی مسئلہ کی وضاحت کے لیے سوال کر دیتا تو آپ کے علم کا دریا موجزن ہو جاتا اور پورے جوش وخروش کے ساتھ اس کا مدلل جواب دیتے۔

استاذ محترم رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے گوناں گوں اوصاف وکمالات سے نوازا تھا، وہ متبحر عالم دین اور باکمال مدرس ہونے کے ساتھ میدان صحافت کے نامور شہسوار، بحر تحقیق وتصنیف کے غواص اور میدان دعوت وتبلیغ کے حوصلہ مند سپاہی تھے، مدلل اور سنجیدہ خطابت سے مجلسوں پر چھا جاتے تھے اور مناظرہ کے میدان میں اپنی خداداد ذہانت، حاضر جوابی اور استحضارِ نصوص کے سبب اپنے حریف کو شکست دینے پر پوری طرح قدرت رکھتے تھے۔

استاذ محترم علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ میں وہ ساری خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں جن کا کسی اچھے استاد اور باکمال مدرس میں ہونا ناگزیر ہے، یہی وجہ ہے وہ جہاں بھی رہے اپنے معاصر مدرسین میں ممتاز اور طلبہ کے مابین محبوب اور ہر دل عزیز رہے، آپ کے علم میں گیرائی اور گہرائی تو تھی ہی، اللہ نے آپ کو تدریس کا اچھا ملکہ دیا تھا۔ اور اپنے مافی الضمیر کو مختصر، جامع، دلچسپ اور مرتکز انداز

میں ادا کرنے پر انہیں خوب قدرت حاصل تھی، اس لئے تفسیر، حدیث، منطق، فلسفہ، عربی زبان وادب عروض وبلاغت اور علم ہیئت وغیرہ جس فن کی کتاب آپ نے پڑھائی اس کا حق ادا کر دیا، اور ہر لحاظ سے طلبہ کو نہ صرف مطمئن بلکہ انہیں متاثر بھی کیا، مولانا کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ منطق وفلسفہ اور ہیئت جیسے خشک مضامین کی تدریس کے وقت اپنی خداداد صلاحیت سے ان میں ایسی جان ڈال دیتے کہ ایک لمحہ کے لئے طلبہ نہ غافل ہوتے اور نہ ہی اکتاہٹ کا احساس کرتے۔

استاد محترم ہر چھوٹی بڑی کتاب کی تدریس کے لئے باقاعدہ مطالعہ کرتے، پوری تیاری کے ساتھ درس گاہ میں تشریف لاتے اور پورے وثوق واعتماد کے ساتھ درس دیتے، تحریر کی طرح آپ کی تقریر بھی شگفتہ اور دلنشین تھی، الفاظ وتعبیرات چن چن کر استعمال کرتے، ٹھہر ٹھہر کر بولتے مگر اس طرح کہ روانی ختم نہ ہونے پاتی، ایجاز مخل۔ ایسا اختصار جو سمجھ میں رکاوٹ بنے۔ اور اطناب ممل۔ ایسی تفصیل جو اکتا دے، سے مکمل اجتناب کرتے ہوئے درس کے وقت ایسی جامع گفتگو فرماتے کہ سارے مسائل طلبہ کے ذہن نشین ہو جاتے۔

مولانا مبارکپوری رحمہ اللہ اپنے علم بے کراں سے طلبہ کو ہمیشہ فیض پہنچانے کے حریص تھے، درس گاہ کے علاوہ مسجد میں، کمرہ کے اندر یا جامعہ کے صحن میں جب بھی کوئی مل جاتا اور کوئی مسئلہ چھیڑ دیتا تو مولانا کا دریائے علم بہہ پڑتا اور جب تک مکمل سیرابی نہ ہو جاتی وہ پورے جوش وخروش کے ساتھ جاری رہتا، اس دوران نہ مولانا تھکتے نہ اکتاتے اور نہ کسی مشغولیت کا عذر پیش کرتے، اکثر وبیشتر اس قسم کی گفتگو کھڑے کھڑے ہوتی اور قیام کی حالت میں گھنٹوں گزر جاتے اور مولانا کی پیشانی پر بل نہ آتا۔

علم وفضل کے بلند وبالا مقام پر فائز ہونے کے باوجود مولانا بے حد متواضع اور خاکسار تھے، غرور گھمنڈ، عجب، تعلّی، خودستائی اور خود پسندی جیسے اوصاف ذمیمہ کو آپ نے کبھی بھی اپنے قریب نہ آنے دیا، انتہائی درجہ کے خلیق اور شفیق تھے، حتی کہ اپنے اور اپنے تلامذہ کے درمیان ایک مخصوص فاصلہ رکھتے ہوئے طلبہ سے بے تکلف بھی تھے، جامعہ سلفیہ میں مولانا کا یہ معمول تھا کہ فجر کے بعد اور مغرب سے کچھ پہلے چہل قدمی کے لئے جامعہ سے باہر ہندو کالج کی جانب نکل جاتے اس وقت

آپ کے ساتھ طلبہ کی معتد بہ جماعت ہوتی، مولانا درمیان میں چلتے اور دائیں بائیں اور پیچھے آپ کے تلامذہ آپ کی علمی گفتگو سے مستفید اور بسا اوقات آپ کی ظریفانہ باتوں سے لطف اندوز ہوتے۔

باوقار اور سنجیدہ ہونے کے ساتھ مولانا بے حد ظریف اور بذلہ سنج بھی تھے، دوران سبق اکثر کوئی نہ کوئی لطیفہ ضرور سناتے یا ہنسنے ہنسانے کی کوئی بات ضرور لے آتے، بسا اوقات ہم طلبہ کی کسی حرکت یا بات پر ان کی رگ ظرافت پھڑک اٹھتی تو مخصوص انداز میں اس پر تبصرہ فرماتے کہ مجلس قہقہ زار بن جاتی، مگر انداز ایسا ہوتا کہ آپ کا وقار پوری طرح باقی رہتا، یہی سبب ہے کہ طلبہ ان کے درس میں کبھی بے چینی یا اکتاہٹ نہ محسوس کرتے اور آپ کے اسباق میں غیر حاضری کو اپنی محرومی تصور کرتے تھے۔

اس وقت مجھے مولانا کے تعلق سے زمانہ طالب علمی کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے: ہمارے ساتھیوں میں ایک بزرگ ساتھی مولوی عبدالرزاق تھے جو ضلع مالدہ مغربی بنگال سے تعلق رکھتے تھے، پڑھنے میں ذہین اور محنتی تھے مگر بولنے اور لکھنے میں علاقائی لب ولہجہ غالب تھا۔ ایک روز وہ اپنے کمرہ کے ساتھیوں کی شکایت لے کر مولانا مبارکپوری رحمہ اللہ کے پاس پہنچ گئے اور ان الفاظ میں عرض پرداز ہوئے: مولانا صاحب! کمرے والے مجھے بہت پریشان کرتے ہیں، میری جگہ بدل دیجئے۔ ''میرا اب اس کمرہ میں گزارہ نہیں'' شکایت کا آخری جملہ اردو زبان میں خاص موقع پر عورتیں استعمال کرتی ہیں۔ مگر بیچارے عبدالرزاق زبان وبیان کی اس نزاکت سے ناواقف تھے، بہر حال شکایت سن کر مولانا زیر لب مسکرائے اور انہیں تسلی دی کہ جایئے آپ کے معاملہ پر ہمدردانہ غور کیا جائے گا، اگلے روز جب مولانا ہمیں پڑھانے تشریف لائے تو بیٹھتے ہی سنجیدگی کے ساتھ ایک نظر طلبہ پر ڈالی، پھر عبدالرزاق کو مخاطب کر کے فرمایا: ہاں عبدالرزاق تم ذرا اپنی شکایت دہراؤ تاکہ تمہارے ساتھیوں کے خلاف کارروائی کی جا سکے، ادھر پریشان کرنے والے طلبہ کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں، ادھر مولوی عبدالرزاق نے لفظ بہ لفظ اپنی شکایت دہرا دی، اور جیسے ہی ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ ''اب اس گھر میں ہمارا گزرا نہیں''۔ نہ صرف سارے طلبہ ہنس پڑے بلکہ مولانا بھی ہنسی کے

مارے بے حال ہو گئے، پھر مولانا نے فرمایا کہ یہ حادثہ تو رات میں پیش آ چکا تھا مگر میں نے ضبط کیا اور فیصلہ کیا کہ درس گاہ ہی میں سب کے ساتھ اس تعبیر بلیغ سے لطف اندوز ہوں گے، بعد میں مولانا نے اس جملہ کی تشریح بھی کی اور ہم شریر طلبہ کی سرزنش بھی؛ البتہ عبدالرزاق کو اس گھر میں گزارا کرنے پر مجبور کیا۔

اللہ تعالیٰ مولانا کی خدمات جلیلہ کو شرف قبولیت عطا فرمائے، ان کے درجات بلند کرے اور ان کی بشری خطاؤں اور لغزشوں کو نیکیوں میں تبدیل فرما کر جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے (1)۔ (آمین)

(1) دیکھئے: مجلّہ نور توحید۔ جنوری، فروری، مارچ 2007ء۔

استاد محترم ''الرحیق المختوم'' کے آئینے میں

ترے قلم نے مذاقِ حیات بدلا ہے

(از: مولانا عبدالرزاق عبدالغفار سلفی، دبئی متحدہ عرب امارات)

یہ حسن اتفاق تھا کہ میں نے یکم دسمبر 2006ء کو تقریباً دو بجے بوقت متحدہ عرب امارات۔ ساڑھے تین بجے ہندستانی وقت۔ برادرم قاری محمد فضیل سلمہ کو بنارس فون کیا تاکہ ان کے حالات سے باخبر ہو سکوں، انہوں نے فوراً پوچھا کہ آپ کو خبر مل گئی ہے؟ میں نے کہا کس چیز کی؟ کہنے لگے: شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری کا انتقال ہو گیا ہے، ابھی ابھی خبر ملی ہے، میں نے ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' پڑھا: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾

اور پھر رسمی گفتگو کے بعد فون بند کر دیا، میں تقریباً پچیس سال پیچھے چلا گیا، اور ماضی کی حسین یادوں میں کھو گیا، 1978ء کے شب و روز یاد آنے لگے، شیخ سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں جامعہ سلفیہ بنارس میں داخلہ کے سلسلے میں بنارس پہنچا، اس کو بھی حسن اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے، کہ میرا انٹرویو (امتحان داخلہ) شیخ نے ہی لیا تھا، شیخ کا دماغ بڑا نکتہ رس اور دقیقہ سنج تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مجھ سے قرآن مجید کی چند آیات کا ترجمہ اور تفسیر پوچھا تھا، ایک طالب علم کی حیثیت سے جو مجھ سے بن پڑا تھا جواب دیا تھا، شیخ اس جواب سے خوش بھی تھے، اگرچہ ایک لفظ پر میں اٹک گیا تھا، مجھے یاد ہے کہ وہ لفظ سورۂ مریم کی آیت ۷۳ ﴿وأحسن نديا﴾ تھا، پھر شیخ نے خود ہی وضاحت فرمائی۔

میانہ قد، دہرا بدن، سرخی مائل گندمی رنگ، کشادہ پیشانی جس سے ذہانت و ذکاوت ہویدا، گھنی داڑھی کہیں کہیں سفیدی جھانکتی ہوئی، چمک دار آنکھیں اور ان پر لگی ہوئی عینک، سر پر بال کم اور اس پر مخملی ٹوپی، عام مشرقی لباس کرتا پاجامہ زیب تن، چلنے میں میانہ روی، گفتگو میں نرمی، وقار، متانت اور سنجیدگی، یہ تھے ہمارے استاذ محترم علامہ شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ۔

آپ ایک کامیاب مدرس، کامیاب مؤلف ومصنف ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب مناظر بھی تھے، جب میدان مناظرہ میں آئے، بڑے بڑوں کے چھکے چھوٹ گئے، باطل پرستوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اوران کے جملہ اعتراضات کا دنداں شکن جواب دیا، بجرڈیہہ بنارس کا مناظرہ جس کا واضح ثبوت ہے۔

23 تا26 اکتوبر1978ء کے ایام کبھی فراموش نہیں کیے جاسکتے ہیں، شیخ کا پراعتماد لب ولہجہ، مطالعہ کی وسعت، علم کی گہرائی، ٹھوس دلائل کے انبار، برجستہ گوئی، حاضر جوابی، بے باک وبے لاگ گفتگو جس نے مناظرہ میں جان ڈال دی تھی، اس مناظرہ میں جامعہ کے تمام طلبہ شریک تھے، راقم الحروف بھی ان طلبہ کے ساتھ تھا جو کتابیں اٹھاتے اور رکھتے تھے، اور سینئر طلبہ حوالے نکال نکال کر پیش کرتے تھے، اور شیخ مدمقابل کا جواب بڑے ہی آب وتاب سے دیتے تھے، جامعہ میں میرا پہلا سال تھا لیکن شیخ کی علمیت کا سکہ دل ودماغ پر بیٹھ چکا تھا، شیخ کا شماران اساتذہ میں تھا جنہیں طلبہ بہت چاہتے تھے۔

شیخ کو درس وتدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا بھی بڑا اچھا ذوق ملا تھا، مطالعہ میں وسعت اور گہرائی تھی، اس لئے جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے اس کا حق ادا کردیتے تھے، آپ نے اپنی زبان وبیان اور قلم وقرطاس سے قوم وملت کی خوب خدمت کی ہے۔

آپ کا لازوال اور لاثانی کارنامہ نبی آخرالزماں ﷺ کی سیرت مقدمہ پر تالیف کردہ معرکۃ الآراء کتاب ''الرحیق المختوم'' ہے، جس کا اب تک دنیا کی تیرہ زندہ زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے، جس نے آپ کو عالمی شہرت بخشی اور آپ کی لازوال مقبولیت کا سبب بن گئی، جو صدیوں پڑھی جائے گی، اور سیرت نبوی پر اتھارٹی تسلیم کی جائے گی، سیرت پاک پر لکھنے والوں کے لئے ایک اہم مرجع کی حیثیت رکھے گی، منارۂ نور کا کام دے گی اور جو آپ کے حق میں بروز محشر ان شاء اللہ العزیز نبی مکرم ﷺ کی شفاعت کا سبب بھی بنے گی، یہ کتاب آپ کی وسعت معلومات، ذہانت، طباعی، جودت فکر اور عمق نظر کا نتیجہ ہے، یہ کتاب قرآن وحدیث اور تاریخ کے اعلیٰ معیار پر رکھ کر انتہائی تحقیق، اخلاق، صدق دل، اور طہارت قلب وذہن کے ساتھ ساتھ، محبت رسول میں ڈوب کر لکھی

گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ کتاب میں ایجاز بھی ہے اور اعجاز بھی، گویا کتاب خود ہی کہتی ہے:

ہر ذرہ کوئے شوق کا صحرا فروش ہے

اب اور کیا تجھے دل دیوانہ چاہیے

☆ یہ کتاب لاجواب اختصار اور جامع انداز میں زمانہ جاہلیت کے سیاسی احوال، معاشی اور اقتصادی صورت حال، اجتماعی اور اخلاقی گراوٹ سے پردہ اٹھاتی ہے۔

☆ یہ کتاب محبت رسول سے معمور ہے اور اس کی ایک ایک سطر سے حب رسول کی کرنیں پھوٹتی ہیں، اور ہم سے اتباع رسول کا مطالبہ کرتی ہے۔

☆ یہ کتاب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کے انمٹ نقوش واحوال کو پیش کرتی ہے جن سے ہم اپنی زندگی سنوار سکتے ہیں۔

☆ یہ کتاب رسول اللہ ﷺ کو ایک عظیم داعی، عظیم مربی، عظیم سیاسی قائد اور عظیم مدبر و منتظم کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔

☆ یہ کتاب نہایت خوبصورت انداز اور اچھے اسلوب میں اس بات کا انکشاف کرتی ہے کہ شدائد اور مصائب پر کیسے صبر کیا جائے، اور اس سلسلے میں نبی ﷺ کا اسوہ کیا تھا۔

☆ یہ کتاب اللہ کے راستے میں فدائیت وشیدائیت کا سبق دیتی ہے۔

☆ یہ کتاب ''توحید'' کے بتدریج پروان چڑھنے پر بڑی اچھی روشنی ڈالتی ہے۔

☆ یہ کتاب بڑے پیارے انداز میں ہمیں بتاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی مقدس زندگی بحیثیت ایک شوہر کے کیسے گزاری۔

☆ یہ کتاب اس بات کا بھی انکشاف کرتی ہے کہ اولاد کے سلسلے میں باپ کا کردار کیسا ہونا چاہیے۔

☆ یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ دینی سیادت اور دنیاوی قیادت میں توازن کیسے برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

☆ یہ کتاب آپ ﷺ کے عملی نمونوں کو پیش کر کے رہبانیت کو للکارتی ہے، ملوکیت کو چیلنج کرتی

ہے، رہبانیت کی جگہ ربانیت کو پیش کرتی ہے، اور ملوکیت کی جگہ خلافت کا ڈنکا بجاتی ہے۔

☆ یہ کتاب جذبۂ جہاد کو مہمیز کرتی ہے اور ہمیں بتاتی ہے کہ امریکی قیصریت اور یورپین ''ڈرشین'' کسرویت کا زور کیسے توڑا جاسکتا ہے۔

☆ یہ کتاب ہمیں واشگاف الفاظ میں بتاتی ہے کہ آج سے پندرہ سو سال قبل مضطرب اور بے چین دنیا کا علاج اسی سیرت پاک میں تھا اور آج کی پریشان حال اور کراہتی دنیا کو اگر امن وسکون کی تلاش ہے تو وہ اسی سیرت مقدسہ میں مل سکتا ہے۔

☆ یہ کتاب رسول اللہ ﷺ کو فیلڈ مارشل، چیف کمانڈر اور قائد اعلیٰ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور اس کا بھرپور ثبوت بھی فراہم کرتی ہے۔

شیخ کی زندگی کا ایک خاص وصف ان کی کم گوئی تھی، مگر جب بولتے تھے تو بہت ناپ تول کر بولتے تھے، اور جب کوئی واقعہ بیان کرتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ خود ان کا گزر اس واقعہ کے ساتھ ہوا ہے اور وہ واقعہ ان کی آنکھوں کے سامنے پیش آیا ہے، جب کبھی اثنائے درس جہاد افغانستان کا تذکرہ آجاتا تو ایسا لگتا تھا کہ شیخ خود ہی میمنہ یا میسرہ کی قیادت فرمارہے ہیں، واقعات کو اس ترتیب سے بیان کرتے کہ ان کے سامنے کچھ وقوع پذیر ہوا ہے، اور وہ بیان کرتے جارہے ہیں، یہی خاص وصف ان کی معرکۃ الآراء کتاب الرحیق المختوم کا بھی ہے، تمام واقعات، حوادث، غزوات، اجتماعی نظام اور اعمال، اخلاق ومعاملات اس ترتیب اور اس انداز سے بیان کئے گئے ہیں گویا کہ ہم سارے لوگ ہی دور صحابہ سے گزر رہے ہیں اور رسول ﷺ کی مجلسوں سے لطف اندوز اور بہرہ مند ہورہے ہیں، ہم مدینہ کی گلیوں میں گھوم رہے ہیں، میدان بدر اور میدان احد میں تلواروں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں، صحابہ کرام خندقیں کھود رہے ہیں اور پھاوڑوں کی صدائیں سننے میں آرہی ہیں، رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس شریک ہیں، مہاجرین وانصار کی مشقت اور بھوک دیکھ کر انہیں تسلی دے رہے ہیں اور ان کا حوصلہ بڑھا رہے ہیں اور فرمارہے ہیں:

اَللّٰهُمَّ إِنَّ الْعَيْشَ عَيْشُ الآخِرَه

فَاغْفِرِ الأَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَه

کعب بن اشرف یہودی کے آخری انجام کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر گیا ہے اور عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین کی منافقت اور عداوت کھل کر سامنے آگئی ہے، رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام اس سے نبرد آزما ہیں، اس کے باوجود مرنے کے بعد اس کو اپنا مبارک کرتا عطا فرما رہے ہیں۔ صلح حدیبیہ، غزوہ حنین و تبوک اور فتح مکہ کے واقعات پیش آرہے ہیں اور رسول اللہ ﷺ ہر جگہ اور ہر مقام پر اپنے رحمت دو عالم ہونے کا اعلان فرما رہے ہیں۔

آئے دنیا میں بہت پاک مکرم بن کر
کوئی آیا نہ مگر رحمت عالم بن کر

''الرحیق المختوم'' کی عبارت میں اس قدر سلاست اور روانی ہے کہ پڑھتے چلے جائیے، طبیعت میں اکتاہٹ نہ آئے، یہ استاذ محترم شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کے قلم کا اعجاز تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی 63 سالہ حیات مبارکہ کا نقشہ اس قدر دل آویز اور دل کش انداز میں کھینچا کہ جس کسی نے بھی اس کتاب کو اٹھایا اور پڑھا وہ ہی اس کتاب کا ثنا خواں اور مدح سرا ہو گیا۔

شیخ رحمہ اللہ بجا طور پر کہنے کے حق دار تھے:

میرے قلم نے مذاق حیات بدلا ہے
بلندیوں پہ اڑا ہوں، سماسے کھیلا ہوں

استاذ محترم پندرہویں صدی کے ان عباقرہ اور نابغہ شخصیات میں سے ایک تھے جن پر جماعت اہل حدیث ہی نہیں پوری ملت بجا طور پر فخر کر سکتی ہے، یوں تو اس صدی میں ہندوستان کے اندر اور باہر بڑے بڑے علماء، ادباء اور افاضل روزگار گزرے ہیں جن کی شہرت مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک پھیلی ہوئی تھی اور جن کے ماننے والے اور حلقہ بگوش ان کی شہرت کو ان کی حقانیت کی دلیل گردانتے ہیں چاہے انکی تحریروں سے توحید میں خلل آئے، عقیدے پر ضرب پڑے، سنت پر غبار آئے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت و کردار کو داغدار کیا جائے اور حالی کی زبان میں۔

نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے   نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

مگر چونکہ وہ حضرات اپنی مشنریوں اور پروپیگنڈوں کے سبب شہرت کی ان بلندیوں تک پہنچ

گئے تھے، کہ اگر ان کی کسی غلطی اور لغزش پر نکیر کیا جاتا ہے تو ان کے ماننے والے اور حلقہ بگوش، حق کہنے والے اور حق پہنچانے والے کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے حسد وعداوت سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ اسلام میں حقانیت کی دلیل یہ نہیں ہے کہ کون کتنا شہرت پذیر ہے، کس کی دنیا میں کس قدر پذیرائی ہو رہی ہے، بلکہ اسلام میں حقانیت اور عدم حقانیت کی دلیل یہ ہے کہ وہ شخص کتاب وسنت سے کس قدر قریب ہے، یا کس قدر بعید۔

اسی طرح اللہ ہو اور احد احد کا رٹ لگانا، مالا جپنا، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی گردان کرنا، تصور شیخ کرنا، مکاشفہ اور مراقبہ میں بیٹھنا، حال اور وجد میں آنا، نہ تو سوز دروں ہے نہ نالہ نیم شب، اور نہ ہی آہ سحر گاہی، یہ جملہ اعمال اور تصوف کی کارستانیاں سچائی اور عقیدے کی پختگی کی دلیل نہیں بن سکتیں اگر کوئی ہوا میں اڑنے لگے اور پانی پر چلنے لگے تو یہ چیز اس کی بزرگی کی دلیل نہیں ہو سکتی ہے، جیسا کہ فضیل بن عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا؛

> ''اگر عمل خالص ہے لیکن درست نہیں تو اللہ کے نزدیک مقبول نہیں ہے، اور اگر عمل درست ہے لیکن خالص نہیں تو بھی اللہ کے نزدیک مقبول نہیں ہے، یہاں تک کہ وہ عمل خالص بھی ہو اور درست بھی، خالص کا مطلب یہ ہے کہ صرف اور صرف اللہ کے لئے ہو اور درست وہ چیز ہے جو سنت رسول ﷺ کے مطابق ہو اور یہی ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مطلب:
>
> ﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحًا وَلا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا﴾
>
> ''جسے بھی اپنے پروردگار سے ملنے کی آرزو ہو اسے چاہیے کہ نیک اعمال کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ کرے''۔ (الکھف:۱۱۰)

ہمارے استاذ محترم شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا خاص فضل وکرم تھا کہ انہوں نے توحید وسنت کے منبع صافی سے اکتساب کیا اور فیض اٹھایا، یہی وجہ ہے کہ ان کی سیرت پاک پر تالیف کردہ کتاب ''الرحیق المختوم'' کو جو مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی سیرت پر لکھی گئی کسی دوسری کتاب کو نصیب نہیں ہوئی، سیرت پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان حضرات نے لکھا جن کی علمیت اور ادبیت کا شہرہ مشرق سے مغرب تک رہا ہے، مگر ان کی کتابوں میں وہ بات نہ آسکی

اور نہ ہی وہ انداز آسکا جو پیارا اور نرالا انداز ''الرحیق المختوم'' میں نظر آتا ہے۔

أُولَئِکَ آبَائِي فَجِئْنِي بِمِثْلِهِمْ إِذَا جَمَعَتْنَا يَا جَرِيرُ الْمَجَامِعِ

اے اللہ! استاذ محترم کی لغزشوں اور خطاؤں کو معاف کر، ان کی دینی خدمات کو قبول فرما، ان کو انبیاء وصدیقین اور شہداء کی معیت نصیب فرما، اعلیٰ علیین اور جنت الفردوس میں جگہ دے، ان کے اخلاف کی اشک شوئی فرما اور ان کو صبر جمیل عطا کر، اور ہم سب کو اتباع رسول ﷺ اور حب رسول ﷺ کی توفیق دے۔ (آمین ثم آمین)۔

واقعہ ہے کہ استاذ محترم رحمہ اللہ اس دیار اور اس خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، جس کے متعلق بلا ریب کہا جاسکتا ہے کہ ''ایں خانہ تمام آفتاب است'' استاذ محترم رحمہ اللہ میں بے شمار خوبیاں تھیں، میں نے صرف ایک اور وہ بھی ان کے قلم کی روانی کی خوبی کے ایک گوشے کو اجاگر کرنے کی سعی ناتمام کی ہے، یہ کوشش بھی نتیجہ ہے میرے نہایت محترم بزرگ اور کرم فرما شیخ عبداللہ عبدالتواب مدنی حفظہ اللہ وتولاہ وبارك فی حیاته وجهوده وشفاه من كل مرض کی تشویق وتحریک کا، ورنہ:

کہاں ہم! اور کہاں نکہت گل نسیم صبح تیری مہربانی

میں ایک بار پھر کہوں گا کہ استاذ محترم شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ بلا شبہ اس صدی کے عظیم الشان انسانوں میں سے ایک تھے۔ اور میں اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتا ہوں (1):

نام اس کا ملت بیضا کے پروانوں میں تھا
وہ بہرصورت عظیم الشان انسانوں میں تھا

جادہ ومنزل کی ہر نصرت تھی اس کا ہم رکاب
کاروانِ قرآنِ اول کے حدی خوانوں میں تھا

رحمۃ للعالمین کی خوشہ چینی کے سبب
بادۂ توحید وسنت اس کے پیمانوں میں تھا

(1) دیکھئے: مجلہ نور توحید۔ جنوری، فروری، مارچ 2007۔

کچھ قابل ذکر باتیں

(از: مولانا عبداللہ مدنی جھنڈانگری)

حضرت علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ سے مجھے جامعہ سلفیہ بنارس میں شرف تلمذ اس وقت حاصل ہوا جب آپ ''الرحیق المختوم'' کے شہرۂ آفاق مصنف کی حیثیت سے نہیں جانے گئے تھے، مختلف مدارس کے جواں عزم، کہنہ مشق اور لائق و فائق استاذ کے اعتبار سے البتہ امتیازی مقام کا احساس دلا چکے تھے، آپ کی شان علمیت کا چرچا ہر اس جگہ ضرور ہوتا جہاں آپ کو تدریس، خطاب یا گفتگو کے مواقع میسر آئے، تحریر میں پختگی پہلے سے تھی، ماہنامہ ''محدث'' کی ادارت نے اس میں چار چاند لگا دیے۔

آنے والے ایام آپ کی زندگی میں بڑے سنہرے رہے، اللہ نے جو ذہانت اور مقبولیت و محبوبیت عرب و عجم میں عطا فرمائی انہیں خاص انعام الٰہی اور توفیق ربانی ہی کہا جائے گا، جس کا مشاہدہ میں نے خود کیا ہے:

آپ کی ذکاوت و فطانت کا اعتراف ہر اس شخص کو ہے جس نے آپ کی صحبت میں کچھ لمحات گزارے ہوں، مجھے ذاتی طور پر اس کا تجربہ ہوا، رابطہ عالم اسلامی سے عالمی ایوارڈ حاصل کر کے آپ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو تاریخی مقامات کی سیر کا پروگرام بنا، قبا پہنچنے پر ''کھجوروں کے شیرے میں ڈوبے ہوئے سہانے موسم'' میں سلیمانی چائے پی گئی، قہوہ خانے سے باہر نکلے، سامنے ہی مسجد قبا اپنی تابانیوں کے ساتھ تقدس ریز تھی، مولانا نے فرمایا: یہاں بنو قریظہ کا علاقہ کدھر ہے؟ پھر ہمیں روک کر خود ہی جواب کے لئے تیار ہو گئے، ایک نگاہ مسجد پر ڈالی، دائیں بائیں نظریں دوڑائیں، پھر ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ادھر ہونا چاہیے۔ اس خطۂ ارض کی یہ پہلی زیارت تھی، ہمیں حیرت ہوئی، اجنبی جگہ میں صرف سابقہ معلومات کی بنیاد پر درست سمت کی اطلاع کیا ذکاوت بے نہایت کی دلیل نہیں ہے؟

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ذات وحدہ لاشریک اپنے کسی بندے کے تئیں محبوبیت کے جذبات بندگان الٰہی کے دلوں میں کس طرح پیوست کرتا ہے، اس کا ایک نمونہ مجھے ریاض کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر دیکھنے کو ملا، میں حضرت مولانا رحمہ اللہ کے ساتھ مدینہ منورہ جانے والی فلائٹ کے انتظار میں تھا کہ ایک خوش شکل، متدین عربی نوجوان میری طرف بڑھا اور سرگوشی کے انداز میں دریافت کیا: ''کیا یہ بزرگ علامہ صفی الرحمٰن مبارک پوری ہیں؟'' میرا جواب ہاں میں پا کر فوراً ہی لوٹ گیا اور چند منٹ کے بعد اپنے دو احباب کے ساتھ واپس آ کر حضرت مولانا سے بغل گیر ہو گیا، پیشانی کا بوسہ دیا، فرداً فرداً تینوں نوجوانوں نے بصد احترام معانقہ کرتے ہوئے خیر و عافیت دریافت کی، والہانہ ملاقات کے اس عمل میں ان نوجوانوں کے چہرے پر شادمانی کے جو اثرات رونما ہوتے میری نگاہوں نے دیکھا وہ میرے لئے ناقابل فراموش ہے۔

☆ مدینہ منورہ کے مسافر اپنی سیٹوں پر بیٹھ چکے ہیں، جہاز روانگی کے لئے تیار ہے، مجھے فرسٹ کلاس میں سیٹ دستیاب ہوئی تھی، میری سیٹ سے ملحق کشادہ اور آرام وہ سیٹ خالی تھی، ایسے وقت میں مولانا کی رفاقت سے محروی الجھن میں ڈالے ہوئی تھی، میری نگاہ ایک متشرع عربی فضائی میزبان، ائرہوسٹ پر ٹک گئی۔ وہ میرے اشارے پہ قریب آئے، میں نے پوچھا کیا آپ ہندی عالم دین شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری سے واقف ہیں؟ انہوں نے کہا: صاحب الرحیق المختوم؟ میں نے ہاں میں جواب دیا، کہنے لگے: میں واقف ہوں۔ عرض کیا کہ یہ عظیم شخصیت جہاز میں موجود ہے، کیا آپ انہیں میرے بغل کی اس سیٹ پر لا سکتے ہیں، انہوں نے کہا: ضرور لاؤں گا، جہاز جب فضا میں ہموار ہو جائے وہ یہاں آ جائیں گے، کچھ ہی دیر بعد وہ میرے ساتھ مولانا رحمہ اللہ کی سیٹ تک گئے، ہزاروں فٹ کی بلندی پہ صاحب الرحیق کی درخشاں پیشانی پہ اپنی عقیدت کا نقش ثبت کیا، ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور نیازمندانہ انداز میں ساتھ چلتے ہوئے سیٹ پہ لا کر بٹھا دیا۔ سبحان اللہ! جہاز کا سفر خالص کاروباری طرز و اسلوب کا حامل ہوتا ہے، اس تاجرانہ ماحول میں عقیدت ومحبت کا ایسا مخلصانہ اظہار کب دیکھنے کو ملتا ہے؟ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

☆ اگست 2000ء میں برطانیہ کی جماعت اہل حدیث نے مجھے بھی شیخ الاسلام امام محمد بن

عبدالوہاب کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی تھی، جہاں میں نے شیخ اسلام کی حیات وخدمات سے متعلق عربی زبان میں مقالہ پیش کیا تھا، حضرت مولانا مبارکپوری دوسرے علمائے افاضل کے ہمراہ شریک اجلاس تھے، مولانا کے ساتھ متاع سفر کے نام پہ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس تھا جسے بریف کیس کہنا زیادہ مناسب ہے، جب میں نے اس مختصر زادراہ کی طرف اشارہ کیا تو فرمایا: معلوم ہوتا ہے لوگ یہاں دائمی قیام کی غرض سے وارد ہوئے ہیں، اسی لئے تو اتنے بڑے بڑے سوٹ کیس اور بیگ لے کر آئے ہیں۔

کانفرنس کے اختتام کے بعد جماعت نے برطانیہ کے مختلف شہروں کے جماعتی مراکز ومساجد میں دروس اور خطبات کا اہتمام کیا تھا، مجھے بھی ساتھ رہنے اور مختلف شہروں کے جماعتی اخوان سے خطاب کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔

میں نے اس دورے میں حضرت مولانا سے قلبی تعلق کا اظہار کرتے ہوئے الرحیق المختوم کی بابت بار ہا خوش کن تبصرے سنے، ہر جگہ احباب جماعت مصافحہ اور معانقہ کے لئے بیتاب نظر آتے، حیرت تو جب ہوتی جب کمسن اور نوعمر بچے آکر ملتے اور معصومیت کے ساتھ کہتے:

"I Read Al-Raheequl-Makhtoom"

"میں الرحیق المختوم پڑھ رہا ہوں"۔

☆ بلاد عرب کے ایک سفر میں عربی جریدے کا مطالعہ کر رہا تھا، ایک عنوان نے مجھے متوجہ کر لیا، خبر کا خلاصہ تھا کہ ایک خاتون اسپتال میں داخل تھیں، ان کے اعزاء واقرباء عیادت اور ملاقات کے لئے آتے رہتے تھے، انہیں میں سے ایک خاتون بھی تشریف لائیں جن کے ہاتھوں میں ایک پیکٹ تھا، جسے انہوں نے مریضہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: یہ گراں قدر تحفہ ہے قبول فرمائیں، خاتون کا یہ عطیہ واقعی مریضہ کے لئے انمول تھا، انہوں نے پیکٹ کھولا تو اس میں الرحیق المختوم کا ایک نسخہ نظر آیا، بستر پر پڑے ہوئے ایک مریض کے لئے اس سے مفید ونفیس اور یادگار سوغات اور کیا ہو سکتی تھی؟ کس قدر پاکیزہ ذوق کی حامل خاتون تھیں یہ جنہیں سوغات کے انتخاب کا ہنر آتا تھا، عیادت کے لئے تو ہر کوئی جا کر رسم ادا کر لیتا ہے مگر اس سلیقے سے کسی کی عیادت کی جائے کہ مریض بھی

شاداں وفرحاں اور تیمار دار بھی مطمئن۔

☆ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اردو دنیا کی ایک ممتاز شخصیت ہیں، اردو ادب سے لگاؤ رکھنے والا کہیں بھی ہو اس نام سے ضرور آگاہ ہوگا، دنیا کے مختلف بلاد وامصار کا سفر اردو کے حوالے سے کرتے رہے ہیں، ایک مشاعرے میں شرکت کی غرض سے ہندوستان سے ملحق سرحدی بستی کرشنا نگر میں تشریف لائے تھے، نیپال کے اس سفر میں مجھے ان سے گفتگو کا موقع ملا، بالخصوص ادب اسلامی کے تعلق سے میں ان کا نقطہ نظر جاننا چاہتا تھا، یہ نشست طویل تھی۔ مختلف موضوعات زیر بحث آئے، اس موقع پر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ انہیں الرحیق المختوم ہدیہ کیا جائے، میں نے اس کتاب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے انھیں پیش کی، کچھ دن گزرنے کے بعد موصوف نے سلام کے ساتھ یہ پیغام بھیجا کہ آپ کا عطا کردہ تحفہ میرے لئے یادگار ہے اور میں اس سے استفادہ کررہا ہوں۔

☆ ڈاکٹر انوار احمد خان نیپال کے معروف معالج ہیں، اللہ نے دست شفا عطا کیا ہے، کرشنا نگر میں ان کا مطب مریضوں سے بھرا ہوا رہتا ہے، اب تو سہولت کے پیش نظر مریض نمبر آنے پر ہی اندر داخل ہوسکتا ہے، صبح سے شام تک مستقل مزاجی کے ساتھ مریضوں میں گھرے رہتے ہیں، پھر بھی دنیا کی طبی ایجادات اور نئی میڈیکل تحقیقات سے واقفیت کے لئے سونے سے پہلے مطالعہ ضرور کرتے ہیں۔

جب الرحیق المختوم کا چرچا ہوا اور مرکز التوحید کو کچھ نسخے فراہم ہوئے، ایک نسخہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیا اور صاحب کتاب کا مختصر تعارف بھی کرادیا گیا، کچھ دنوں کے بعد ملاقات ہوئی کہنے لگے: واقعی یہ دل ودماغ کو اپیل کرنے والی عمدہ کتاب ہے، یہ غالباً پہلی غیر درسی کتاب ہے جسے میں نے پوری دلجمعی اور مکمل انہماک کے ساتھ پڑھا ہے۔

کائنات انسانی کی سب سے معتبر شخصیت کی سیرت پاک پہ مشتمل یہ کتاب کس کس انداز سے دامن دل کھینچنے کا اثر اپنے اندر رکھتی ہے اور کس کس طرح دل ودماغ پر اپنے نقوش چھوڑ جاتی ہے۔

اسلامی معاشرہ کے مختلف طبقات، بزرگ، نوجوان، طبیب، ادیب ودانشور خاتون اور بچوں کی جانب سے مصنف کے لئے عقیدت ومحبت کے اظہار اور کتاب کی تحسین کی یہ یادیں صفحہ دل پہ ثبت ہیں، جنہیں کاغذ پہ اتار دیا گیا ہے (1)۔

(1) دیکھئے: مجلہ نور توحید۔ جنوری، فروری، مارچ 2007۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوریؒ کی اردو نگارشات

ماہنامہ ''محدث'' بنارس کے آئینے میں

(از: مسعود عالم عبدالقیوم سلفی، جامعہ سلفیہ بنارس)

﴿کل نفس ذائقة الموت﴾ کے ضابطے کے مطابق موت ایک نا قابل انکار اٹل حقیقت ہے اور ہر شخص کو موت کا جام نوش کرنا ہے، لیکن کسی کی موت کا صدمہ زیادہ شدید اور جاں گسل ہوتا ہے، کسی کا کم، کسی کی وفات سے زبردست خلا محسوس ہوتا ہے اور کسی کی وفات سے ایسا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کی ذات جس قدر خوبیوں کی حامل ہوتی ہے اسی قدر ان کے انتقال پر افسوس ہوتا ہے، چونکہ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری کی ذات علم وعمل، تقوی وطہارت، زہد وورع، ذاتی محاسن وکمالات کی وجہ سے بھلائے نہیں بھولتی ہے اس لئے ان کی وفات سے ایک عجیب خلا محسوس ہو رہا ہے، آپ نے کوئی 63 برس کی عمر پائی۔ شیخوخت میں جو بعض عوارض وامراض عام طور پر لوگوں کو لاحق ہو جاتے ہیں آپ کو بھی لاحق ہوئے، آپ عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے اس لئے آپ کی رحلت اچانک پیش آنے والا حادثہ نہیں بلکہ امر متوقع تھا، پھر بھی جماعت نے ایک علوم وفنون کے ماہر، رمز شناس حدیث مصطفیٰ، ممتاز سیرت نگار اور اردو وعربی کے باکمال مصنف کو کھو دیا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات سے قوی امید ہے کہ آپ کی تحریروں کے بہتر ثمرات اور کثیر برکات آپ کے ساتھ آپ کی قبر اور آخرت میں شامل حال ہونگے۔ اللهم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه ووسع مدخله......

یوں تو آپ نے اپنے سیال قلم سے تحریر کے اکثر وبیشتر شعبوں کی آبیاری کی، ترجمہ وتعریب اور تصنیف وتالیف کے علاوہ مقالہ نگاری اور مضمون نویسی جیسی سرگرمیوں کے ذریعہ آپ نے تحریر کے بیشتر مجالات کا احاطہ کیا ہے اور عربی واردو میں کئی وقیع کتابیں یادگار چھوڑیں ہیں مگر آپ کے وہ بکھرے ہوئے مضامین جو آپ نے مختلف موضوعات پر لکھے ہیں، بڑے فکر انگیز اور معلوماتی ہیں

اوران کوایک علمی ورثہ کی حیثیت حاصل ہے، آپ کا سب سے اہم علمی کارنامہ نبی کریم ﷺ کی سیرت پر ممتاز ومنفرد کتاب ''الرحیق المختوم'' ہے جسے رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے منعقد کردہ بین الاقوامی انعامی مقابلے میں پہلا انعام حاصل ہوا۔

آپ نے تقریباً سات سال تک جماعت کے علمی ودینی مجلّہ ''محدث'' بنارس کے گل وگلزار کی لالہ کاری کی ہےاور مختلف مسائل پر محققانہ مضامین کے ذریعے اس کے وقار کواونچا کیا ہے ''تاریک بدعت، اسلام اور عدم تشدد، راستہ اور منزل، ترتیب الٹی یا سیدھی، جب کسی قوم کا مزاج بگڑتا ہے، عید قومی مزاج کا پیمانہ دامن اور بندقبا، سنگین خسارہ، انسانیت کے یہ اجارہ دار، فیصلے کا وقت، رخصت اے بزم چمن'' وغیرہ اس طرح کے جتنے بھی مضامین ''محدث'' میں شائع ہوئے ہیں ان سب کو بغور پڑھنے کے بعد آپ کے عمیق علم وتحقیق، قلم کی سلاست، بیان کی سادگی وپاکیزگی اور محاورات واشعار کے برمحل استعمال کی بھرپور قدرت کا پتہ چلتا ہے کہ قاری پڑھتا ہےاوراس کی حلاوت سے محظوظ ہوتا رہتا ہے جولفظوں کے انتخاب واستعمال اور زبان پر قدرت کاملہ کی دلیل ہے، چنانچہ آپ کا آخری اداریہ جو آپ نے جامعہ سلفیہ چھوڑنے اور مدینہ منورہ جانے سے قبل لکھا تھااس کوپڑھنے سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے،''اسلام اور عدم تشدد'' محدث میں شائع ہونے والی ایسی تحریر ہے جس نے ان تمام غلط فہمیوں کا جسے اسلام کی طرف منسوب کیا گیا تھا، قلع قمع کردیا۔

جامعہ سلفیہ سے شائع ہونے والے اردو زبان کے اہم دینی وعلمی مجلّہ ''محدث'' میں تحریری عمل کا آغاز آپ نے فروری 1982ء سے کیااور مسلسل ستمبر 1988ء تک آپ کی تحریریں اس مجلّے کی زینت بنتی رہیں۔اس عرصہ میں ان کی شائع ہونے والی تحریروں کی کل تعداد 64 ہے،ان میں سب سے طویل ''اسلام اور عدم تشدد'' ہے جو 4 قسطوں میں شائع ہوا ہے، یہ مضمون کتابی شکل میں بھی شائع ہوچکا ہے،''پاک سرزمین پر'' 3 قسطوں میں اور ''بصیرت افروز'' دوقسطوں میں شائع ہوئے ہیں، باقی مضامین ایک قسط میں شائع ہوئے ہیں، زیرنظر مضمون کے آخر میں مجلّہ ''محدث'' میں شائع ہونے والے آپ کے مقالات ومضامین کی مکمل فہرست مندرج ہے جو آپ کی سات سالہ صحافتی کاوشوں اور قلمی خدمات کی منہ بولتی تصویر ہے۔

اس فہرست پر سرسری نظر ڈالنے سے کئی باتوں کا پتہ چلتا ہے، سب سے پہلی چیز موضوعات کا تنوع ہے۔آپ کی تحریروں میں ایمان وعقائد، اسلامیات، سیاست، حالات حاضرہ، غیر مسلموں کے باطل افکار ونظریات کی تردید اور سفرنامہ جیسے موضوعات کی رنگارنگی موجود ہے۔

آپ کی تحریروں میں تنوع کے ساتھ اس حقیقت سے بھی اغماض نہیں کیا جاسکتا ہے کہ آپ نے اسلامیات اور بدعات کے موضوع پر مضامین زیادہ لکھے ہیں۔آپ کے مقالات کی فہرست میں ایک بات یہ بھی دیکھنے کو ملتی ہے کہ آپ کے بیشتر مقالات مختصر اور جامع ہیں جو دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔

آپ عنوان قائم کرتے وقت دقت نظری سے کام لیتے اور ایسا عنوان قائم کرتے ہیں کہ قاری کا ذہن دیکھتے ہی اس طرف مائل ہو جاتا ہے اور پڑھنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، جیسے ''ترتیب الٹی یا سیدھی'' یہ سیاہی وغیرہ اور یہی عصر حاضر کا تقاضا بھی ہے۔ذیل میں محدث میں شائع شدہ آپ کی اردو تحریروں کی اجمالی فہرست پیش کی جارہی ہے۔

☆ اداریے

	مقالات	شمارہ	صفحات
۱۔	نشان راہ	فروری ۱۹۸۲ء	۳-۹
۲۔	ترتیب الٹی یا سیدھی	مارچ ۱۹۸۲ء	۳-۸
۳۔	اپنی خودی پہچان	اپریل ۱۹۸۲ء	۳-۵
۴۔	می خواست رستخیز نہ علام برآورد	مئی ۱۹۸۲ء	۳-۶
۵۔	حفاظت دین کے تین ذرائع	جون ۱۹۸۲ء	۳-۷
۶۔	لعلکم تتقون	جولائی ۱۹۸۲ء	۳-۴
۷۔	عید قومی مزاج کا پیمانہ	اگست ۱۹۸۲ء	۳-۵
۸۔	دامن اور بندقبا	ستمبر ۱۹۸۲ء	۳-۶
۹۔	نہیں مصلحت سے خالی......	اکتوبر ۱۹۸۲ء	۳-۶

۱۰۔	کمی کیا ہے	دسمبر ۱۹۸۲ء	۴-۳
۱۱۔	عزائم کو سینوں میں بیدار کردے	جنوری ۱۹۸۳ء	۴-۳
۱۲۔	اتحاد اسلام کی بنیاد	فروری ۱۹۸۳ء	۹-۳
۱۳۔	بحر ظلمات کے اس پار	مارچ ۱۹۸۳ء	۱۲-۳
۱۴۔	سیرت نبوی کے چند جلوے	اپریل ۱۹۸۳ء	۱۵-۳
۱۵۔	راستہ اور منزل	مئی ۱۹۸۳ء	۱۰-۳
۱۶۔	جب کسی قسم کا مزاج بگڑتا ہے	جون، جولائی ۱۹۸۳ء	۹-۳
۱۷۔	کچھ علاج اس کا بھی اے..	اگست ۱۹۸۳ء	۶-۳
۱۸۔	ہندستانی حاجیوں کی میقات	ستمبر ۱۹۸۳ء	۸-۳
۱۹۔	قرآن تحریف کی زد میں	اکتوبر ۱۹۸۳ء	۶-۳
۲۰۔	سنگین خسارہ	دسمبر ۱۹۸۳ء	۹-۳
۲۱۔	نقش راہ	جنوری ۱۹۸۴ء	۵-۳
۲۲۔	تنظیمات کا المیہ	فروری ۱۹۸۴ء	۵-۳
۲۳۔	ایمان کی ایک علامت	مارچ ۱۹۸۴ء	۴-۳
۲۴۔	اسلامی نظام حکومت میں متعدد پارٹیاں	اپریل ۱۹۸۴ء	۸-۳
۲۵۔	زہر خرمنے خوشئے یافتم	مئی ۱۹۸۴ء	۷-۳
۲۶۔	عبادت یا کھلواڑ	جون، جولائی ۱۹۸۴ء	۷-۳
۲۷۔	ثم قست قلوبکم	اگست ۱۹۸۴ء	۵-۳
۲۸۔	اسلام اور عدم تشدد (۱)	ستمبر ۱۹۸۴ء	۱۱-۳
۲۹۔	اسلام اور عدم تشدد (۲)	اکتوبر ۱۹۸۴ء	۱۰-۳
۳۰۔	اسلام اور عدم تشدد (۳)	نومبر ۱۹۸۴ء	۱۰-۳
۳۱۔	اسلام اور عدم تشدد (۴)	دسمبر ۱۹۸۴ء	۷-۳

۳۲۔	فلاح کا راستہ	جنوری ۱۹۸۵ء	۳-۵
۳۳۔	کنزالایمان غیر مقلدین کی نظر میں	فروری ۱۹۸۵ء	۳-۸
۳۴۔	بصیرت افروز (۱)	مارچ ۱۹۸۵ء	۳-۸
۳۵۔	بصیرت افروز (۲)	اپریل ۱۹۸۵ء	۳-۱۰
۳۶۔	زکاۃ کے چند مسئلے	مئی، جون ۱۹۸۵ء	۳-۱۰
۳۷۔	بنگلور کانفرنس	جولائی ۱۹۸۵ء	۳-۱۰
۳۸۔	عشرہ ذی الحجہ میں بال وناخن	اگست ۱۹۸۵ء	۳-۵
۳۹۔	تنگ نظر تنگ دل	ستمبر ۱۹۸۵ء	۳-۷
۴۰۔	اس شمارے کا موضوع	اکتوبر ۱۹۸۵ء	۳-۴
۴۱۔	اقلیتی کمیشنوں کے سوالنامہ کا جواب	نومبر ۱۹۸۵ء	۳-۱۶
۴۲۔	انسانیت کے یہ اجارہ دار	دسمبر ۱۹۸۵ء	۳-۶
۴۳۔	ہماری منزل	جنوری ۱۹۸۶ء	۳-۵
۴۴۔	پاک سرزمین پر (۱)	فروری ۱۹۸۶ء	۲-۱۲
۴۵۔	پاک سرزمین پر (۲)	مارچ ۱۹۸۶ء	۳-۸
۴۶۔	پاک سرزمین پر (۳)	اپریل ۱۹۸۶ء	۳-۱۳
۴۷۔	جلسہ عام اور تقسیم اسناد	مئی جون ۱۹۸۶ء	۳-۷
۴۸۔	فیصلے کا وقت	جولائی ۱۹۸۶ء	۳-۴
۴۹۔	سوز وساز زندگی	اگست ۱۹۸۷ء	۳-۶
۵۰۔	افغانستان کا درس	فروری ۱۹۸۸ء	۳-۴
۵۱۔	پیام صیام	اپریل مئی ۱۹۸۸ء	۳-۴
۵۲۔	فلسطین جہاں اسلامی......	جون ۱۹۸۸ء	۲-۴
۵۳۔	آزمائش اور اس کا نتیجہ	جولائی ۱۹۸۸ء	۳-۴

۵۴۔	بعداز خرابی بسیار	اگست ۱۹۸۸ء	۳-۵
۵۵۔	رخصت اے بزم چمن	ستمبر ۱۹۸۸ء	۳-۴

☆ دیگر مضامین

۱۔	قرآن مجید کس لئے اتارا گیا	فروری ۱۹۸۲ء	۱۰-۱۵
۲۔	یکم شوال کی تاریخی اہمیت	اگست ۱۹۸۲ء	۱۰-۱۵
۳۔	حد رجم شکوک کی زد میں	فروری ۱۹۸۳ء	۴۴-۴۸
۴۔	امریکہ میں چند دن	فروری ۱۹۸۳ء	۵۳-۵۶
۵۔	طلاق چند نازک حدود کے درمیان	اکتوبر ۱۹۸۳ء	۷-۱۱
۶۔	تاریک بدعت	جنوری ۱۹۸۴ء	۴۰-۴۴
۷۔	مناظرہ جو نہ ہوسکا	فروری ۱۹۸۴ء	۴۸-۵۳
۸۔	فجر کی جماعت ہوتے ہوئے سنت کا حکم	نومبر ۱۹۸۵ء	۵۰-۵۲
۹۔	حرمات حج	فروری ۱۹۸۸ء	۲۹-۳۳

(دیکھئے: مجلّہ نور توحید۔جنوری،فروری،مارچ 2007)

نوٹ ! مضمون نگار نے کافی محنت سے شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری کے زمانۂ ادارت میں شائع ہونے والے ان کے اداریوں اور مضامین کی یہاں نشاندہی کی ہے۔البتہ بعض اشاریوں سے ان کی نگاہیں چوک گئی ہیں۔مثلاً ان اشاریوں میں مارچ ۱۹۸۲ء کے محدث (ص ۱۶، ۲۰) میں شیخ مرحوم کا مضمون بعنوان ''سوکھے پتے اور آگ'' اور فروری ۱۹۸۸ء کے اداریہ بعنوان ''حرمت حرمین شریفین'' کا تذکرہ ان کے مضمون میں نہیں ہے۔میں ۱۸ر اپریل ۲۰۰۷ء کو جامعہ سلفیہ بنارس گیا تھا تو وہاں محدث کے فائلوں کی تلاش میں مجھے یہ کچھ نظر آیا۔(مرتب)

فولاد ہے مومن

(از: حامد سراجی)

علامہ اقبال رحمہ اللہ نے اپنے ایک شعر میں مومن کی صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ مجلس احباب میں مرد مومن کی حریری صفت کا اظہار ہوتا ہے جبکہ مخالفین کے سامنے وہ فولاد کی طرح سخت اور ناقابل تسخیر بن کر نمایاں ہوتا ہے:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

ہمارے مخدوم وممدوح حضرت مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ ان صفات سے مکمل طور پر متصف تھے۔ ان کے تلامذہ اور معتقدین واقف ہیں کہ احباب ومتعارفین کی محفل میں دلآویز گفتگو فرماتے، خوش کلامی ان کا شیوہ تھی، اور تبسم زیر لب ان کا انداز خاص، مولانا کی شخصیت مجلسی تھی۔ وہ ہر جگہ میر مجلس تسلیم کیے جاتے، شرکاء مجلس خاموش رہ کر بیان کی لطافت سے حظ اندوز ہوتے رہتے، اس طرح گل افشانی گفتار کا سلسلہ جاری رہتا، یہاں اکتاہٹ کا گزر ہی نہیں تھا۔

اس کے برخلاف معاملہ جب حق و باطل کا ہوتو "فولاد ہے مومن" کا پیکر بن کر زور بیان اور قوت استدلال سے فریق مخالف پہ چھا جاتے اور نکل بھاگنے، موضوع سے ہٹنے اور گنجائش نکالنے کی راہ کچھ اس طرح مسدود کرتے کہ وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہو کر ہوش وحواس کھو بیٹھتا۔

مولانا رحمہ اللہ کی اس صفت خاص کا مظاہرہ بجر ڈیہہ، بنارس کے مناظرہ منعقدہ 1978ء میں خوب خوب ہوا۔ جس میں آپ نے فریق مخالف کے دلائل کی دھجیاں بکھیر دیں اور کتاب وسنت اور سلفی فکر ومنہج کی تعبیر وتشریح ایسے حکیمانہ اسلوب میں فرمائی کہ 49 افراد مسلک حق کے دامن میں پناہ گزیں ہو گئے۔ کتنے ایسے بھی رہے ہوں گے جن کے دل کی دنیا تہہ وبالا ہوئی ہوگی، اور قبول حق کے لئے بے قرار رہے ہوں گے۔

یہ تحریری مناظرہ تھا، شرائط فریقین کی جانب سے مقرر کردہ نمائندوں نے طے کی تھی، موضوع وسیلہ مرجبہ تھا، وسیلہ مرجبہ کا مطلب بتایا گیا: اہل قبور (انبیاء واولیاء، پیروں اور شہیدوں وغیرہ) کو مشکل کشائی وحاجت روائی کے لئے پکارنا ان سے مدد چاہنا، مرادیں مانگنا۔ مثلاً اولاد اور شفا وغیرہ مانگنا، اپنی فتح ودشمن کی شکست کی التجا کرنا، اپنی بگڑی بنانے کی گزارش کرنا، ان کی نذر ماننا، ان کے نام پر جانور ذبح کرنا، ان کے جلال سے ڈر کر اور ان کو راضی وخوش کرنے کے لئے ان کی قبروں کے سامنے نہایت ہی تعظیم کے ساتھ کھڑا ہونا، جھکنا، سجدہ کرنا، قبروں پر چڑھاوے چڑھانا (مثلاً حلوے، بتاشہ، چادر پیسے وغیرہ) چراغ جلانا، اگربتی اور خوشبو جلانا وغیرہ اور ان افعال کے ساتھ یہ تصور کرنا کہ ان انبیاء واولیاء اور پیروں وغیرہ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی غیبی اور اسباب سے بالاتر روحانی قوت دے رکھی تھی کہ یہ لوگ اس وقت کے ذریعے ہماری مرادیں خود پوری کر دیتے ہیں یا اللہ سے منوا کر پوری کروا دیتے ہیں۔''

وسیلہ مرجبہ کی اس تشریح کا ہر لفظ اعلان کر رہا ہے کہ تشریح کرنے والا وسیلہ مرجبہ کے کمزور پہلوؤں سے آگاہ ہے اور اس کی نفی کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے، وسیلہ مرجبہ کے اس مفہوم پہ حضرت مولانا صفی الرحمٰن الاعظمی کا یہ نوٹ درج ہے: ''اہل حدیث کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ مذکورہ بالا وسیلہ مجموعی طور پر شرک ہے، مذکورہ بالا عقیدے کے تحت اوپر جتنے افعال ذکر کئے گئے ہیں سب شرک ہیں اور اس کا مرتکب مشرک ہے۔

فریق مخالف نے اس مختصر سے نوٹ کے ساتھ دستخط کئے ہیں ''ہم فریق اہل سنت وجماعت مذکورہ بالا موضوع پر مناظرہ کے لئے تیار ہیں'' ضیاء الاعظمی قادری۔ یہاں اہل سنت وجماعت کے مفروضہ لقب پہ یہ تبصرہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اہل سنت میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی وغیرہ شامل ہیں، یہ اہل سنت کی کون سی قسم ہیں؟ ظاہر ہے حنفی اہل سنت ہیں، پھر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حنفیت کی دو معروف قسموں میں سے دیوبندی اور بریلوی ہیں یہ کیا ہیں؟ یقیناً بریلوی ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ یہ صرف اہل سنت نہیں ہیں بلکہ ''بریولی حنفی اہل سنت ہیں'' دراصل اس لقب کی خلعت فاخرہ ان پر پھبتی بھی خوب ہے۔

اس مقام پہ ہمیں حیرت ہو رہی ہے کہ دیو بندی علمائے احناف مسلمانوں کے درمیان اپنی تعداد 99 فیصد بتاتے ہیں، جب کہ بریلوی حنفی اہل سنت و جماعت انہیں کوئی حیثیت ہی دینے کے لئے تیار نہیں بلکہ گمراہ اور بددین مانتے ہیں۔ پھر علمائے دیو بند اپنی اکثریت ثابت کرنے اور سواد اعظم کا شرف حاصل کرنے کے لئے انہیں اپنے آپ میں شامل رکھنے کی خاطر کیوں بے قرار رہتے ہیں؟ اس تنازعہ کا تازہ فتنہ لکھنؤ کے حج ہاؤس موسوم بہ ''علی میاں حج ہاؤس'' کے حوالے سے بریلوی حنفی اہل سنت نے اٹھایا ہے، میں سمجھتا ہوں ان حالات میں علمائے دیو بند کو اکثریت کے زعم میں مبتلا ہونے کی بجائے اپنی برأت کا اظہار کر دینا چاہیے، خواہ اس کے لئے اقلیت کی سبکی ہی کیوں نہ برداشت کرنی پڑے، کم از کم عقیدہ تو سلامت رہے گا۔ اگر اپنے ساتھ بریلوی مسلک کے معتقدین کو ملانے کا یہ سلسلہ جاری رہا تو صرف وسیلہ مروجہ کی اس تشریح کی روشنی میں ہی علمائے دیو بند کو اپنے عقیدے کی خیر منانی چاہیے۔

بات کچھ دور نکل گئی، ذکر کرنا چاہتا تھا مولانا مبارک پوری کی وسعت علم، استحضار ادلہ و استنباط مسائل کی بھر پور قدرت اور فقہی نکتہ آرائیوں کا، جس کے سامنے قادری حریف لاچار و بے بس نظر آتا ہے۔

مولانا رحمہ اللہ کی ایک تحریر کے جواب میں فریق مخالف کے مناظر قادری صاحب نے فن مناظرہ کی معروف کتاب رشیدیہ کے حوالے سے اپنا یہ حق ثابت کیا کہ ہم دعوی کے ہر لفظ کی تشریح تام مع احکام آپ سے پوچھیں، اور آپ بتانے پر مجبور ہیں۔

مولانا مبارک پوری نے رشیدیہ کے بیان کی تکمیل کرتے ہوئے جواباً عرض کیا کہ آپ ہمارے دعویٰ کے بارے میں کہ ''وسیلہ مروجہ شرک ہے'' صرف اتنا پوچھ سکتے ہیں کہ وسیلہ مروجہ کیا ہے اور شرک کیا ہے؟ بشرطیکہ آپ اسے نہ جانتے ہوں، لیکن معلوم ہوتے ہوئے ایسے سوالات کرنے کو مجادلہ اور مکابرہ کہتے ہیں یعنی ہٹ دھرمی اور کٹھ حجتی۔ آگے آپ نے رشیدیہ کی عبارت اپنے دعوی کی دلیل کے طور پر پیش کی ہے۔

مولانا آگے لکھتے ہیں: اگر آپ ان مسلم قوم کی آرزوؤں کو پامال کرنا اور ان کے وقت اور پیسے کا

خون کر کے صرف الجہاد کی باتیں کرنا چاہتے ہیں تو تشریف لائیے! پہلے آپ اپنے سوال میں استعمال کیے ہوئے الفاظ کو واضح کیجیے: تشریح، دعوی، منطق، جامع ومانع، تعریف، دلائل، نسب اربعہ مناظرہ، اصول، مبادی لازم، ابواب، ایمان، افراد، نہایت، شریعت، موضوع، شرائط پہلے ان الفاظ کا صحیح اردو میں ترجمہ کیجیے اس کے بعد ہر ایک کی پوری وضاحت کیجیے، تشریح عبارت اور تشریح جسم میں کیا فرق ہے، دلائل کے اقسام مع دلیل حصر لکھیے، اصول کے لغوی اور عرفی معنی بتایئے، شریعت اور دین کا فرق لکھیے، دین کی وحدت اور شریعت کے اختلاف کی حکمت لکھیے، ایمان کا لغوی وشرعی معنی لکھ کر اس کے بسیط اور مرکب ہونے کے دلائل دیجیے۔ ابواب کا لغوی اور اصطلاحی معنی لکھیے، ابواب وفصول کا فرق بتلایئے، لازم کا اصطلاحی معنی لکھتے ہوئے اس کے اقسام مع دلیل حصر بیان کیجیے، شرائط کے لغوی اور اصطلاحی معنی لکھیے۔

جب تک آپ ان باتوں کی وضاحت نہیں کریں گے، جواب کے ہرگز مستحق نہیں ہوں گے۔ پوری عبارت فولادی اسلوب کی آئینہ دار ہے۔ کٹھ حجت مناظر کی سرکوبی کے لئے قائم کئے گئے یہ سوالات اپنے منہ میاں مٹھو بننے والے فریق کو زچ کرنے کے لئے کافی ہیں، تاکہ آئندہ محتاط رہ کر قلم اٹھانے کا سلیقہ آجائے اور اس کا بھی شعور ہو جائے کہ مخاطب مرد میدان ہے، پکڑ بہت سخت ہوگی، چوٹ برابر کی نہیں بلکہ سیر کا سوا سیر یعنی اینٹ کا جواب پتھر سے ملے گا۔

حضرت مولانا نے زیر بحث موضوع وسیلہ مروجہ پر بحث کرتے ہوئے اپنی چوتھی تحریر کو کتاب وسنت اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ اور مولوی نعیم الدین صاحب کے حاشیہ سے مبرہن فرمایا ہے، بحث کا نتیجہ بیان کرتے ہیں:

> ”مشرکین اللہ کو خالق ورازق او رساری چیزوں اور سارے اختیارات کا مالک سمجھتے تھے، پھر وہ فرشتوں پیغمبروں اور بزرگوں وغیرہ کے سلسلے میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ انہیں اللہ کی طرف سے فوق الفطری قوت واختیار ملا ہوا ہے، اس لئے وہ انہیں پکارتے اور التجائیں کرتے تھے۔ ان کی نذریں مانتے تھے، ان پر چڑھاوے چڑھاتے تھے، ان کے نام اور ان کے استھان پر جانور ذبح کرتے تھے، مجاور بن کر بیٹھتے تھے، انہیں سجدہ کرتے

تھے وغیرہ یہی سب ان کا شرک تھا''۔

چونکہ وسیلہ مروجہ جو موضوع بحث ہے عقیدہ سے لے کر عمل تک اس سے مطابقت کرتا ہے، اس لئے وہ بھی شرک ہے، اور اس کا مرتکب بھی مشرک ہے۔'' اتنی واضح حقیقت کے اظہار کے بعد بھی وسیلہ مروجہ کا عقیدہ نہ ترک کیا جا سکے تو اسے بدتوفیقی کے سوا اور کیا کہا جائے۔

وسیلہ مروجہ کی حیثیت بتاتے ہوئے ایک اور چوٹ اس طرح لگائی ہے، لکھتے ہیں:

''اذان کے بعد جو دعا پڑھی جاتی ہے اس میں یہ لفظ ہے ''آت محمد الوسیلة'' صاحب روح المعانی نے (ج:۴ص:۱۱۲) پر مسلم کی ایک روایت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ''جو وسیلہ حضور ﷺ کے لئے مانگا جاتا ہے وہ جنت کا ایک بلند مقام ہے'' سنی حضرات وسیلہ کا جو مطلب لیتے ہیں وہ ہرگز یہاں صحیح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حضور ﷺ کا درجہ اور مقام خدا کے بعد ہے۔ اگر یہاں وسیلہ سے مراد مردہ بزرگ ہوں اور دعاء کا مطلب یہ ہو کہ مردہ بزرگوں کا سہارا حضور ﷺ کو مل جائے تو اس سے بڑھ کر اہانت رسول کیا ہوگی۔ ہم اہل حدیث حضور ﷺ کی شان میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے''۔

حب رسول کا زبانی دعویٰ کرنے والے اس آئینے میں اپنا سراپا دیکھ سکتے ہیں۔ شرائط مناظرہ کے خلاف ورزی کرتے ہوئے فریق مخالف نے شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کا قول اہل حدیث کے خلاف بطور حجت پیش کیا، مولانا رحمہ اللہ جواباً لکھتے ہیں کہ ہم جس طرح اماموں کے مقلد نہیں اسی طرح اسماعیل شہید کے بھی مقلد نہیں ہیں۔ اس لئے ہم پر حسب شرائط مناظرہ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ سے حجت قائم کرنے کی کوشش کیجئے، آپ کے جو اعتراضات اسماعیل شہید پر ہیں ان کا جواب حاصل کرنے کا آسان طریقہ ہے اور آپ کے پاس آپ کے عقیدے کے مطابق نہایت آسان راستہ ہے۔

''آپ کا عقیدہ ہے کہ شہید، ولی سنتے بھی ہیں اور دوسروں کی مدد بھی کرتے ہیں۔ اسماعیل شہید کے شہید ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں اس لئے وہ آپ کے عقیدے کے مطابق آپ کی ضرور سنیں گے اور اس موقع پر آپ کی نہ سہی اپنی مدد ضرور کریں گے اگر کر سکیں گے،

آپ ان کو پکاریئے"۔

"اے اسماعیل شہید! ہم نے تمہاری عبارتوں کا جواب وہابیوں سے مانگا انہوں نے ہم کو ٹکا سا جواب دے دیا اور تمہارے مزار پر بھیج دیا۔ ہم ریوڑی بتاشہ، چادر، اگربتی سب لائے ہیں کیونکہ ان چیزوں کو چڑھانے کا حکم ہم کو ہمارے پیر احمد رضا نے دیدیا ہے پس تم ہمارے نذرانے قبول کرو اور جواب دو۔ اگر ان کا جواب پسند آئے تو واہ واہ، ورنہ وہاں کے ڈپٹی کلکٹر سے اجازت لے کر اور پولس کی موجودگی میں ان سے شرائط مناظرہ طے کر کے مناظرہ کرلو"۔

"آئندہ ہندستان میں اہلحدیثوں کے سامنے اس قسم کی تحریر پیش کرنے کی جرأت نہ کرو، ورنہ اگر پورا پردہ اٹھا دیا گیا تو تمہاری حالت ہندستان میں وہی ہوگی جو عیسائی دنیا میں پادریوں کی ہو چکی ہے، باتیں بہت ہیں اور وقت کم، سب کا پیش کرنا مشکل ہے۔

عقلمنداں را اشارہ کافی است"

کتاب وسنت کی اہمیت، مسلک کی حقانیت، فریق مخالف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چیلنج کرنے کی جرأت انہیں بے نقاب کرنے کی ہمت اور انجام بد سے بچنے کی ہدایت کیا کچھ نہیں ہے اس اقتباس میں، اسی لئے ہم نے "رزم حق وباطل ہو تو فولاد ہے مومن" کا عنوان قائم کرکے مرد آہن ضیغم اسلام مناظر اہل حدیث حضرت مولانا صفی الرحمٰن صاحب اعظمی مبارکپوری کی زندگی کا فولادی پہلو نمایاں کرنے کے لئے معرکۃ الآراء کتاب "رزم حق وباطل" کی روشنی میں مندرجہ بالا سطور تحریر کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ مناظرہ کی مکمل روداد سے واقفیت کے لئے اس کتاب کا مطالعہ سودمند ہوگا(1)۔

---

(1) دیکھئے: مجلّہ نور توحید۔ جنوری، فروری، مارچ 2007۔

آہ صد آہ! موت العالِم موت العالَم
قضا تیری نہیں آئی ایک عالم کی قضا آئی

(از: مولانا محمد حنیف مدنی، استاذ جامعہ سلفیہ بنارس)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ضابطۂ الٰہی ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ اپنی جگہ اٹل ہے۔ لہٰذا اس ضابطہ کے تحت ایک نہ ایک دن ہر انسان کو موت سے ہمکنار ہونا ہے۔

دیکھ ٹک تو اس سرائے فانیہ کے حال کو
جو یہاں آیا اسے ناچار اِک دن موت ہے

ویسے تو اموات کا سلسلہ لگا رہتا ہے۔ لیکن اشخاص کے اختلاف سے نتائج بھی مختلف رونما ہوتے ہیں۔ یعنی کسی کی موت از حد باعثِ رنج و ملال ہوتی ہے، کسی کی کم۔ کسی کی موت زبردست خلا کا سبب بنتی ہے، کسی کی نہیں۔ کسی کی موت ایک عالم کی موت کا نتیجہ ظاہر کرتی ہے، کسی کی نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ انسان کی ذات جس قدر اوصافِ حمیدہ اور کمالاتِ نادرہ کی جامع ہے، اسی قدر اس کی وفات پر ثمرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔ چونکہ استاذ گرامی علامہ صفی الرحمٰن صاحب مبارکپوری رحمہ اللہ کی ذات گرامی متنوع فضائل اور گوناگوں کمالات کی جامع تھی۔ اس لیے ان کی وفات سے بے حد رنج و ملال اور ناقابلِ تلافی خلا محسوس کیا جارہا ہے؛ بلکہ ان کی موت ایک عالَم کی موت معلوم ہورہی ہے۔ آہ! جماعت اہلحدیث خصوصاً اور عالمِ اسلام عموماً ایک عبقری ہستی، مثالی شخصیت اور سیرت نگاری کے عالمی مقابلہ میں اول انعام پانے والی ذاتِ گرامی سے محروم ہوگیا۔ آہ! علم وفن کا یہ ماہر نیّر تاباں ابدی طور پر روپوش ہوگیا۔ آہ! علمِ نبوت کا یہ رواں دواں اور چمکتا دمکتا

آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ تغمده الله برحمته وأسكنه فسيح جنته

شخصیت تیری تھی اپنے وقت کی اک بے مثال — اب کہاں پائیں گے ایسا صاحبِ فضل وکمال

سیرتِ نبوی میں جب شامل ہوئے سب باکمال — گوئے سبقت لے گیا لا ریب تا حدِ کمال

عزم کا تھا پختہ تر تو اور ہمت کا پہاڑ — گردشِ دوراں میں پل کر تو نے پایا تھا کمال

کیسا کیسا انقلابِ دھر آیا تیرے سر — لیک تو مثلِ چٹاں ثابت رہا بے قیل وقال

ہوگیا رخصت جہاں سے کر کے اپنا نیک نام — جسطرح رخصت ہوئے سب نامورِ اہلِ کمال

ہوگیا دل شاد اپنے رب سے مل کر تو مگر — دے گیا سب کو جدائی اور پھر رنج وملال

موت تیری بن گئی ہے ایک عالَم کی وفات — مغفرت تیری کرے ہم سب کا رب ذوالجلال

(محمد حنیف مدنی)

علامہ مبارکپوری کی کامرانی کے اسباب:

انسان کی کامیابی کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے:

۱۔ اخلاص۔

۲۔ ذہانت وفطانت اور نمایاں قابلیت۔

۳۔ صلاحیت اجاگر کرنے کے لیے مجال۔

ان کے لیے یہ تینوں چیزیں فراہم ہوگئی تھیں۔ اس لیے وہ بہت زیادہ کامیاب رہے۔

چونکہ علمی کام کرنے کا جذبۂ صادق رکھتے تھے اس لیے اپنی ذمہ داری کو بڑی مستعدی، دلجمی اور لگن سے انجام دیتے تھے۔ ان کے ذوق وانہماک کا یہ حال تھا کہ جب تک بدن میں طاقت رہی، تمام کمزوریوں کے باوجود کام میں لگے رہے، بے کار بیٹھنے کا نام ونشان نہیں تھا۔ ساتھ ساتھ کام کرنے کا عمدہ سلیقہ اور اس کے طور طریق سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے؛ بلکہ کبھی کبھی اپنی فہم وفراست کی روشنی میں طریقۂ کار خود متعین کر لیتے۔

جامعہ سلفیہ بنارس میں انھوں نے جب قدم رکھا تو ان کی ذہانت وفطانت اور فہم وفراست کو

پھلنے پھولنے کا موقع مل گیا اور ساری صلاحیتوں کو جلا مل گئی۔ لہٰذا انھوں نے درس وتدریس، تالیف وتصنیف، دعوت وتبلیغ، دراسہ وتحقیق، صحافت اور افتا وغیرہ گوناگوں خدمات انجام دیں اور اپنی جولانیٔ قلم کے خوب سے خوب تر جوہر دکھلائے۔ جامعہ میں قیام کے دوران ماہنامہ ''محدث'' کی ادارت کی ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی جس کو انھوں نے بحسن وخوبی انجام دیا اور اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''الرحیق المختوم'' لکھ ڈالی جو رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی طرف سے منعقدہ سیرت نبوی کے بین الاقوامی مقابلہ میں اول انعام کی مستحق قرار پائی۔

علامہ مبارکپوری کی ذہانت وفطانت اور نمایاں قابلیت:

وہ بڑے ذہین وفطین تھے۔ اللہ نے انھیں ذہانت وفطانت سے خوب خوب نوازا تھا۔ ان کا یہ وصف ہمیشہ اور ہر چیز میں نمایاں رہتا۔ چنانچہ ان کا دورِ طالبعلمی اسی بنیاد پر ممتاز رہا۔ اسی طرح اس کے بعد کی ان کی علمی زندگی بھی اسی بنا پر ممتاز رہی۔ پڑھنے لکھنے، درس وتدریس، تالیف وتصنیف، تقریر وتحریر، مناظرہ وافتا اور معاملات وغیرہ ہر ہر چیز میں ان کی ذہانت وفطانت نمایاں نظر آتی تھی۔ چنانچہ مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی رقمطراز ہیں:

> ''۱۹۷۱ء کی ہندوپاک کی جنگ کے زمانے میں وہ جامعہ الرشاد سے وابستہ تھے (یہ صحیح نہیں ہے؛ بلکہ ۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۶ء اس سے وابستہ رہے۔ محمد حنیف مدنی)۔ اس زمانے میں وہ دارالمصنفین اکثر آتے اور اس کے کتب خانہ سے استفادہ کرتے۔ مجھ سے اور مولوی ابوعلی عبدالباری صاحب مرحوم سے بہت بے تکلف ہو گئے تھے اور مختلف علمی، دینی اور قومی وسیاسی مسائل پر گفتگو کرتے۔ اس سے ان کی ذہانت، قوت گویائی، اچھی صلاحیت اور مسائلِ حاضرہ سے باخبری کا اندازہ ہوتا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات''۔ (معارف، جنوری ۲۰۰۷ء)

بلاشبہ علامہ مبارکپوری میں ذہانت وفطانت اور نمایاں قابلیت کے اوصاف خوب سے خوب تر موجود تھے۔

ذہانت وفطانت اور نمایاں قابلیت کے بعض گوشے:

۱۔ دورِ طالبعلمی میں ایک ممتاز طالبعلم کی حیثیت سے نمایاں رہے۔

۲۔ دورانِ تعلیم وہ تمام امتحانات میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوتے رہے۔ نیز دورانِ تعلیم ہی انھوں نے الہ آباد بورڈ کے امتحانات میں بھی شرکت کی۔ فروری ۱۹۵۹ء میں مولوی اور فروری ۱۹۶۰ء میں عالم کے امتحانات دیے اور دونوں میں فرسٹ ڈویژن سے کامیاب ہوئے۔ پھر ایک طویل عرصے کے بعد مدرسین سے متعلق جدید حالات کے پیش نظر فروری ۱۹۷۶ء میں فاضل ادب اور فروری ۱۹۷۸ء میں فاضل دینیات کا امتحان دیا اور ان دونوں میں بھی فرسٹ ڈویژن سے کامیاب ہوئے۔

۳۔ درس وتدریس کا انداز نرالا تھا۔ مناقشہ کا دروازہ مفتوح رہتا؛ خواہ اثنائے درس ہو یا خارج از درس۔ اسی درس وتدریس کی عمدگی کی بنا پر طلبہ کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔

۴۔ مشکل عبارتوں کی تسلی بخش توضیح کرتے۔ اس سلسلے میں میرا اپنا بار بار کا تجربہ ہے۔

۵۔ اگر کوئی طالب علم یا غیر طالب علم صحافت کے میدان میں قدم رکھتا تو اردو یا عربی جیسا بھی مضمون ہوتا، فوراً اس کی اصلاح فرما دیتے؛ بلکہ مضمون کو جاندار بھی بنا دیتے اور مفید مشوروں سے نوازا کرتے۔ اگر کوئی تحقیقی نکتہ ہوتا تو اس کی ہمت افزائی پُر زور طور سے کرتے۔

۶۔ ان کی عربی تعلیم جو کچھ بھی ہوئی وہ چند سالوں میں اور وہ بھی ہندستانی مدارس میں ہوئی۔ فراغت کے بعد وہ درس وتدریس اور دعوت وتبلیغ میں مشغول ہو گئے اور گھر کی معاشی حالت نے اجازت نہیں دی کہ تعلیم کو مزید آگے بڑھا سکیں۔ لہٰذا نہ تو اندرونِ ملک کسی یونیورسٹی میں جا سکے اور نہ ہی بیرونِ ملک کا رخ کر سکے اور نہ ہی عربی ماحول میں زندگی گزارنے کا موقع مل سکا۔ بلکہ صرف سات سال عربی درس نظامی تعلیم کا کل زمانہ ملا لیکن اس کے باوجود ایسی صلاحیت کے حامل ہوئے کہ علم وفن کے ہر میدان میں نمایاں جوہر دکھاتے گئے؛ حتی کہ سیرت نگاری کے عالمی مقابلہ میں اول انعام کے مستحق قرار پائے۔ اس طرح وہ ایک بہترین مدرس، مصنف، مورخ، مناظر،

محدث، سیرت نگار اور صحافی بن کر منظر عام پر نمایاں ہوئے۔ سچ فرمایا کرتے تھے جامع فیض عام مئو کے ناظمِ اعلیٰ مولانا محمد احمد صاحب:

"درس نظامی کا پڑھا ہوا 'ہیولی' ہوتا ہے یعنی بظاہر تو کچھ نہیں معلوم ہوتا لیکن درحقیقت اس میں ایسی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے جس کی بنیاد پر وہ ہر میدان کا اچھا شہسوار بن سکتا ہے"۔

پس یہ مقولہ ان پر اچھی طرح صادق آرہا ہے کہ انھوں نے چند سالہ درسِ نظامی کو دلجمعی اور لگن سے حاصل کیا پھر ایسا باصلاحیت فاضل اور باکمال اسکالر بن کر منظر عام پر چمکے کہ ان کے جیسا باکمال مشکل ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ سچ ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

۷۔ ان کے اندر استنباطی صلاحیت اور اجتہادی بصیرت عمدہ طریقے پر پائی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں ان کی بعض تصانیف مثلاً: اتحاف الکرام اور الرحیق المختوم وغیرہ بحسن وخوبی اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔

۸۔ الرحیق المختوم جیسی شہرۂ آفاق کتاب زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین سے چار ماہ تک میں مکمل کر لیا جواُن کی نمایاں قابلیت کی زبردست دلیل ہے۔ (الرحیق المختوم، دیباچہ بعنوان: یہ کتاب، ص:۲)

۹۔ ان کی متعدد علمی کمالات اور خوبیوں نے طلبہ کو ان کا بہت گرویدہ بنا دیا تھا۔ مثلاً: تدریس کی عمدگی، مشکل عبارتوں کی تسلی بخش توضیح اور مضمون نگاری میں طلبہ کی اصلاح وتشجیع وغیرہ نے طلبہ کو ان کی طرف زیادہ مائل اور راغب کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ طلبہ چاہتے تھے کہ ہمارا درس ان کے پاس رہے اور زیادہ سے زیادہ ہم ان سے مستفید ہوں۔ یہ چیز میں نے جامعہ فیض عام مئو میں دیکھی تھی اور جامعہ سلفیہ میں بھی اس طرح کی چیز معتبر طور پر معلوم ہوئی ہے۔ اس سلسلے کا اپنا ایک چشم دید واقعہ بیان کر دینا مناسب ہے، وہ یہ کہ جب وہ جامعہ فیض عام مئو میں دو سال گزار کر وہاں سے رخصت ہو کر اپنے گھر جانے لگے تو سوائے چند لڑکوں کے باقی تمام چھوٹے بڑے طلبہ ان کو رخصت کرنے کے لیے ساتھ ساتھ اسٹیشن گئے اور ٹرین روانہ ہونے کے بعد واپس ہوئے۔ گرویدگی کا یہ ایک

عجیب منظر تھا جس نے جامعہ فیض عام کے ناظم صاحب کو سخت تعجب میں مبتلا کر دیا تھا۔

۱۰۔ تحریر کی عمدگی اور قلم کی تیز رفتاری ان کی نمایاں خوبی تھی۔ وہ دوسرے مؤلفین و مصنفین کے بہ نسبت کہیں تیز کام کرتے تھے۔ اور اس بات کی شہادت وہ لوگ بھی دیتے ہیں جن کے پاس رہ کر مولانا نے تصنیفی خدمات انجام دی ہیں۔

عقیدہ وعمل:

آپ عقیدۃً وعملاً سلفی المسلک تھے؛ بلکہ اس مسلک کے زبردست داعی تھے۔

مرنجا مرنج شخصیت:

آپ نہایت ظریف، زندہ دل اور خوش طبع انسان تھے۔ جب کسی مجلس میں موجود ہوتے تو آپ مجلس کی جان ہوتے۔ آپ کی طلاقتِ لسانی، خوش گفتاری اور لطیف حکایات سے لوگ بے حد محظوظ ہوتے۔

اخلاق وعادات:

آپ نہایت خوش خلق اور وسیع الظرف انسان تھے۔ لوگوں سے خندہ پیشانی سے ملتے اور دل سے ملتے۔ ہر آدمی آپ سے بے تکلفی سے ملتا اور وسعت قلبی سے بات چیت کرتا۔ آپ سے ملنے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ جو جس وقت چاہتا بلا تأمل ملاقات کرتا۔ عموماً ان پر متانت وسنجیدگی طاری رہتی۔ ان کے ماتھے پر شکن نہیں دیکھا جاتا۔ صاف دل تھے۔ دل حسد، کینہ، بغض سے پاک وصاف رہتا۔ قول وفعل میں تضاد کا نام ونشان نہ تھا۔ متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ شریف اور متحمل مزاج تھے۔ صبر واستقلال کے پہاڑ تھے۔ مصائب وآلام کو خندہ پیشانی سے انگیز کرتے تھے اور اُف تک نہ کرتے۔ حرص وطمع سے الگ تھلگ رہتے۔ کفایت شعار تھے۔ مزاج سادہ تھا۔ کھانے پینے، رہنے سہنے اور لباس دپوشاک میں سادگی پسند کرتے۔ تکلف وآرائش سے نفرت تھی۔ ٹیپ ٹاپ سے کنارہ کش رہتے۔ اپنی ذمہ داریوں کو حسن وخوبی سے انجام دیتے۔ بہت نشیط تھے۔ سستی وکاہلی کا نام ونشان نہ تھا۔ اجتماعی اور انفرادی دونوں اعتبار سے آپ کی زندگی لائق تعریف تھی۔

علامہ مبارکپوری سے راقم الحروف کے روابط:

راقم الحروف کو درسی حیثیت سے ان سے استفادہ کا بہت کم موقع ملا۔لیکن جب ان کا تقرر جامعہ سلفیہ میں ہو گیا اور وہ اکتوبر ۱۹۷۴ء میں یہاں تشریف لے آئے تو اس کے بعد میرا خاصا تعلق ان سے وابستہ ہو گیا؛ بایں طور کہ میرا میلان مضمون نگاری کی طرف ہوا۔لہٰذا میں نے ۱۹۷۵ء میں ایک لمبا مضمون بعنوان ''امام حاکم صاحب المستدرک'' قلمبند کیا۔اس کے بعد ان سے ملاقات کر کے اصلاح کے لیے گفتگو کی اور منظوری کے بعد مسودہ ان کو بھیج دیا۔انھوں نے اصلاح کے بعد اس وقت کے جامعہ سلفیہ بنارس کے اردو ترجمان ''صوت الجامعہ'' میں مسلسل تین قسطوں میں شائع کرایا۔پھر کسی وجہ سے اس پرچہ کا نکلنا موقوف ہو گیا۔اس لیے پورا مضمون اس وقت شائع نہیں ہو سکا (اور خاصا وقت گزرنے کے بعد 'محدث' میں میں نے باقی حصے کو شائع کرایا)۔اس طرح یہ تعلق مزید بڑھتا گیا اور وقتاً فوقتاً میں اپنا کوئی نہ کوئی مضمون ان کے پاس بھیجتا رہا اور ان سے لقاء کا شرف بھی حاصل کرتا رہا اور علمی امور میں مشورہ بھی کرتا رہا، اور وہ جب بنارس سے گھر براہِ مئو جاتے تو کبھی فیض عام پہنچ جاتے اور مجھے لقاء کا شرف بخشتے۔کبھی میرے پاس خبر بھیجتے کہ میں فلاں جگہ ٹھہرا ہوں تو میں جا کر ان سے ملاقات کر لیتا۔

یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا؛ یہاں تک کہ ۱۶ر دسمبر ۱۹۸۱ء کو میں بغرض تحصیلِ علم مدینہ یونیورسٹی چلا گیا اور چار سال جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں اور دو سال معہد الائمۃ والدعاۃ مکہ مکرمہ میں تعلیم حاصل کر کے فروری ۱۹۸۸ء میں بحیثیت مدرس وداعی جامعہ سلفیہ بنارس میں آیا۔اس اثنا میں برابر طرفین سے مراسلت کا سلسلہ جاری رہا۔لیکن جب میں جامعہ سلفیہ میں آ گیا تو خوشی ہوئی کہ پھر استفادہ کا موقع فراہم ہوگا۔لیکن جلد ہی وہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے مرکز خدمۃ السنۃ والسیرۃ النبویۃ میں بحیثیت باحث ومحقق چلے گئے اور تقریباً دس سال وہاں رہ کر اگریمنٹ ختم ہو جانے کے بعد مکتبہ دارالسلام ریاض کی دعوت پر اس کی علمی کمیٹی کے چیرمین کی حیثیت سے وہاں منتقل ہو گئے اور مدۃ العمر اس مکتبہ سے وابستہ رہے۔اس دوران مدینہ منورہ یا ریاض سے جب گھر آتے

رہے تو میں ان سے لقاء کا شرف حاصل کرتا رہا۔ کبھی جامعہ سلفیہ میں کبھی ان کے گھر پر آتا؛ تا آنکہ اللہ کے پیارے ہو گئے۔

علامہ مبارکپوری کے ساتھ میرا ارتباط بہت مفید رہا کیونکہ وقتاً فوقتاً مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ چنانچہ ان ہی کے مشورے کی روشنی میں میں نے جامعہ اسلامیہ میں اپنے داخلے کی درخواست دی۔ صورت یہ ہوئی کہ جامعہ فیض عام کا الحاق جب جامعہ اسلامیہ سے ہو گیا تو میں نے ان سے اس کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ بھی اپنی درخواست بھیج دیجیے۔ اس پر میں نے تعجب سے کہا کہ کیا میرا داخلہ بھی ہو جائے گا؟! اس پر انھوں نے فرمایا کہ کوشش کرنی چاہیے، شاید کامیابی ہو ہی جائے، کیا فرق پڑتا ہے، درخواست بھیج دیجیے اور اپنے کام سے لگے رہیے۔ ان کی اس تشجیع پر میں نے داخلے سے متعلق کاغذات تیار کر کے درخواست کے ساتھ بھیج دیا۔ پہلے سال تو نہیں لیکن دوسرے سال منظوری آ گئی۔ پھر اللہ نے اس مقدس سرزمین میں پہنچا دیا۔ اسی طرح مضمون نگاری کے طور وطریق کی معرفت میں بھی ان کی رہنمائی کارآمد ثابت ہوئی اور بھی متعدد فوائد ان سے ارتباط کے نتیجے میں حاصل ہوئے۔ بہر حال میں نے انھیں ایک مخلص استاذ پایا۔ اللہ تعالیٰ انھیں غریقِ رحمت کرے، آمین۔

دورِ روابط کے خطوط تو بہت سے محفوظ ہیں لیکن بطورِ نمونہ چند ہی خطوط نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:

پہلا خط:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صفی الرحمٰن ۲۲/ جون ۱۹۷۵ء

مرکزی دار العلوم، بنارس ۱۱/ رجب ۱۳۹۵ھ

عزیز گرامی مولوی محمد حنیف صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ بخیریت ہوں، آپ بھی غالباً بخیر ہوں گے!

توقع ہے آپ کو مسودہ واپس مل گیا ہوگا، میں مئو آیا تھا اور اپنی آمد کے سلسلے میں ممتاز سے کہہ دیا تھا کہ وہ پہلے ہی آپ کو بتلا دے۔ آپ سے کچھ ضروری گفتگو کرنی تھی، مگر افسوس! آپ سے ملاقات نہ ہوسکی۔ دارالعلوم گیا تھا، مولوی ظفر الحسن سے ملاقات ہوئی تھی۔ آپ کو تفصیلاً معلوم ہو چکا ہوگا۔ آپ کے مضمون کا آخری حصہ پڑھ کر معلوم ہوا کہ یہ معاملہ متفق علیہ ہے کہ "مستدرک" امام حاکم کی آخری عمر کی تصنیف ہے۔ لہٰذا آپ پورے اطمینان کے ساتھ امام دارقطنی کی طرف منسوب اس روایت کی تکذیب کر سکتے ہیں جس میں مستدرک کے اندر "حدیث طیر" کے اندراج پر امام دارقطنی کا اعتراض نقل کیا گیا ہے۔ ہاں اگر مستدرک کے اندر اندراج پر نہیں؛ بلکہ محض "حدیث طیر" روایت کرنے پر اعتراض منقول ہو تو پھر تردید کا دوسرا پہلو اختیار کرنا ہوگا۔

ایک کام آپ یہ کریں کہ پورے یا جہاں تک دیکھا جا چکا ہے اتنے مضمون کی ایک نقل یہاں حتی الامکان جلد بھیج دیں۔ انشاء اللہ 'صوت الجامعہ' میں اس کی اشاعت ہو جائے گی۔ اشاعت کے علاوہ اس سے ایک اور اہم کام لینا بھی مقصود ہے، جو انشاء اللہ آپ کے لیے مفید ہی ہوگا۔ غالباً آپ اس طرف فوری توجہ فرمائیں گے، مجھے شدت سے انتظار رہے گا۔ والسلام

صفی الرحمن

دوسرا خط:

۲۹/رجب ۱۳۹۵ھ

۶/اگست ۱۹۷۵ء

عزیز گرامی مولوی محمد حنیف صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ بخیریت ہوں، آپ کا گرامی نامہ اور مسودہ دونوں دستیاب ہو چکے ہیں۔ مسودہ پہنچنے سے قبل ہی 'صوت الجامعہ' کے تازہ ایڈیشن کے مضامین کاتب کے حوالے ہو چکے تھے، جو اب تک کتابت ہو چکے ہوں گے۔ کاتب صاحب بھدوہی رہتے ہیں، امروز فردا میں وہ آئیں گے اور

اگلے ایڈیشن کے لیے جو مضامین ان کے حوالے کیے جائیں گے ان میں آپ کا مضمون بھی شامل ہوگا۔ آپ کا مضمون دو یا تین قسطوں میں شائع ہوگا۔ چونکہ آپ کے مضمون کی آمد سے قبل ہی یہ شمارہ مرتب ہو چکا تھا، اس لیے آپ کے مضمون کی پہلی قسط رمضان کے بعد شائع ہو سکے گی۔ رسالہ سہ ماہی ہے۔ آپ چاہیں تو برہان میں بھی شائع کرا سکتے ہیں۔ مضمون ماشاء اللہ نہایت شاندار ہے اور اپنے دامن میں وسیع تحقیقات اور نہایت گرانقدر معلومات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ میری قطعی رائے ہے کہ اگر انتظام ہو سکے اور کوئی صاحب اخراجات برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں تو اسے رسالے کی شکل میں نہایت آب و تاب سے شائع کیا جائے۔ مئو میں کتابت وطباعت کے سارے مراحل طے ہو سکتے ہیں۔ انشاء اللہ یہ مضمون اپنی حیثیت میں منفرد ہوگا، آپ آئندہ بھی ہمت سے کام لے کر کچھ نہ کچھ لکھنے کی کوشش کریں۔ انشاء اللہ لوگ قدر کرنے پر مجبور ہوں گے اور آپ کے لیے بہت سے امکانات کے دروازے کھل جائیں گے۔ میں اتوار کو صبح مئو پہنچ رہا ہوں، ملاقات ہوگی، انشاء اللہ۔ والسلام

صفی الرحمن

نوٹ! مذکورہ دونوں خطوط اس زمانے کے ہیں جب میں جامعہ فیض عام مئوناتھ بھنجن میں تدریسی خدمات انجام دے رہا تھا۔ اور ذیل کا خط اس وقت کا ہے جب میں جامعہ فیض عام میں گیارہ سال تدریسی خدمات انجام دے کر بغرض تحصیل علم جامعہ اسلامیہ مدینہ میں فوراً داخل ہوا تھا۔

تیسرا خط:

جناب عزیز محترم مولوی محمد حنیف صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خیریت نامہ موصول ہوا۔ بہ سلامت منزل مقصود تک پہنچنے پر خوشی ہوئی۔ خدا کرے کہ اگلے مراحل بھی کامرانی کے ساتھ طے ہوتے رہیں۔ ابھی تو آپ سکون سے بیٹھے بھی نہیں ہوں گے کہ ششماہی امتحان نے آپ کا استقبال کیا ہوگا، توقع ہے کہ نتیجہ اطمینان بخش ہوگا۔

آپ کے التحاق کی داستان بڑی مسرت خیز ہے اور آپ کے لیے سبق آموز بھی۔ ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ ۔اس لیے مختلف دامنوں سے چپکنے کے بجائے اعتصام بحبل اللہ ہی کامیابی اور اعزاز کا ضامن ہے۔ رقعہ مولانا شمس الحق صاحب تک پہنچا دیا گیا ہے، محدث کے دوشمارے نکل چکے ہیں۔ آپ اطمینان سے مضمون مکمل کیجیے، تیاری کے بعد مناسب شکل میں اس کی اشاعت بھی انشاء اللہ ہو جائے گی۔ میرے لیے دعائیں کرتے رہیں۔ والسلام

صفی الرحمن

یکم دسمبر 2006ء کو بعد نمازِ جمعہ تقریباً تین بجے بعمر 64 سال ہمارے شیخ رحمہ اللہ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون

اس طرح نہ صرف جماعت اہلحدیث بلکہ پورا عالم اسلام ایک مثالی اور جامع کمالات شخصیت سے محروم ہو گیا۔ رب العزت ان کا نعم البدل پیدا فرمائے اور مرحوم کی لغزشوں کو درگزر فرما کر ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے، آمین (1)۔

(1) مولانا محمد حنیف مدنی صاحب کا یہ مضمون ماہنامہ محدث فروری، مارچ، اپریل ۲۰۰۷ء کے شمارے میں قسط وار شائع ہوا ہے۔ میں ۱۸ اپریل ۲۰۰۷ء کو جامعہ سلفیہ بنارس گیا ہوا تھا۔ مجھے مولانا کے اس مضمون کا علم ہوا تھا تو باوجودیکہ میری کتاب فائنل ہو چکی تھی، اسے شاملِ کتاب کر لیا۔ کیونکہ اس میں مولانا مرحوم کی زندگی کے کئی ایک گوشے قارئین کے سامنے آتے ہیں۔ البتہ میں نے اس مضمون میں اتنا تصرف کیا ہے کہ جو عام باتیں تھیں، انھیں حذف کر دیا۔ (مرتب)

مولانا صفی الرحمٰنؒ کی رحلت......علم اٹھتا جارہا ہے

(از: مولانا ابورضوان محمدی، مدیر ثانویہ واستاذ جامعہ محمدیہ منصورہ مالیگاؤں)

''میں خود کو نصیحت کرنے کے مقام پر نہیں پاتا، اس لئے کہ ناصح کو مخاطب سے بہتر ہونا چاہیے، میں خود کو ایسا نہیں پاتا، پھر بھی آپ کے مطالبے پر چند باتیں عرض کرتا ہوں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ زندگی کے کسی بھی شعبے میں جائیں، کہیں بھی رہیں، اپنی حقیقت اور شناخت کو کبھی فراموش نہ کریں، فراغت کے بعد آپ کی خواہ کوئی بھی مصروفیت ہو، آپ نہ بھولیں کہ آپ کس دین اور کس منہج کے علمبردار ہیں...... ہمارا عقیدہ اور منہج ہمارا سب سے قیمتی سرمایہ ہے، اس کی حفاظت کرتے رہیے...... میں کبھی سوچتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں میں سے صرف اس ایک نعمت کا کہ اس نے ہمیں مسلمان بنایا شکر ادا کرنا چاہیں تو ہم اس کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ سوچیۓ کہ اگر ہم کسی مشرک وکافر کے گھر میں پیدا ہوتے اور بلا سوچے سمجھے غیر اللہ کی پوجا پاٹ کرتے ہوتے اور ہمیں احساس بھی نہ ہوتا کہ ہم کتنا سنگین گناہ اور عظیم ظلم کر رہے ہیں۔ پھر یہی نہیں اللہ، کی مزید نعمت کہ اس نے ہمیں ایسا مسلمان بنایا جو کتاب سنت کو اپنی بنیاد بناتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے منہج فکر وعمل کو اختیار کرتے ہیں۔ آپ تنہائی میں غور کریں تو معلوم ہوگا اللہ کی صرف اس ایک نعمت کا شکر ادا نہیں کر سکتے، ہم ایسے مسلمان بھی ہو سکتے تھے جو اپنے کسی پیر اور بزرگ یا امام کی عقیدت میں ان کی بات اور قول کو دین سمجھتے، ان کے سامنے اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث اور سنت کو ٹھکرا دیتے، مسترد کر دیتے اور ہمیں احساس بھی نہ ہوتا کہ ہم نے کتنا بڑا گناہ اور کتنی جسارت کی ہے، لہٰذا ہر حال میں اپنی حقیقت کو یاد رکھیں، اپنے تشخص کو مجروح نہ ہونے دیں...... کہ یہ دنیا کی مشکلات کو آسان بنانے والی اور آخرت میں نجات وسعادت سے ہمکنار کرنے والی چیز ہے......''۔

مذکورہ اقتباس استاذ محترم حضرت العلام صفی الرحمٰن مبارکپوری کے درس کا ایک حصہ ہے۔ 1978ء میں جب میں جامعہ سلفیہ فضیلت اول کی جماعت میں تھا، فضیلت ثانی (آخر سال) کے طلبہ نے اپنے طور پر صحیح بخاری کے اختتامی درس کے لیے خصوصی مجلس اور الوداعی تقریب میں شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری سے اپنی خواہش کا اظہار کیا، جو قبول کر لی گئی۔ میں نے طلبائے فضیلت ثانی سے گزارش کی کہ مجھے اپنے پروگرام میں شریک کر لیں...... پوری جماعت نے خندہ پیشانی سے کہا کہ آپ ہمارے مہمان ہوں گے۔ آخری حدیث کا آخری درس نہایت علمی، سیر حاصل گفتگو پر مشتمل رہا۔ بعد ازاں طلبہ نے فراغت اور جامعہ سے رخصت ہونے کی مناسبت سے درخواست کی کہ کچھ نصیحت فرما دیں...... جواباً موصوف نے اول الذکر باتوں سے آغازِ کلام کیا اور زریں نصیحتوں سے نوازا۔

صحیح بخاری کی آخری حدیث کا درس میرے لئے مولانا کا پہلا درس تھا، پھر اگلے تعلیمی سال میں پوری جلد ثانی پڑھنے کی سعادت ملی، آپ سے استفادے کا تعلق بے شمار لوگوں کو رہا۔ خطابات کے ذریعے، عربی اور اردو تحریروں اور تصنیفات کے ذریعے، مناظروں کے توسط سے، گفتگو اور سوال وجواب کی مجلسوں کے ذریعے اور درس وتدریس کے واسطے سے۔ الحمدللہ مجھے ان میں سے ہر ذریعہ سے استفادے کا موقع ملا اور ان میں سے کسی ایک ذریعے سے بھی مستفید ہونے والا شخص قائل رہا کہ موصوف کو مبدءِ فیاض سے علم وفقہ، فہم وبصیرت کا حظِ وافر ملا تھا۔ علمی تبحر کے ساتھ نرم گفتاری، شائستہ مزاجی اس پر برجستگی وحاضر جوابی آپ کا نمایاں اور امتیازی وصف تھا۔ ایک مناظر کے لیے صرف علم ومعرفت کافی نہیں ہوتی؛ بلکہ موضوع بحث پر گہری علمی بصیرت کے ساتھ استحضار اور برمحل وبرجستہ جواب دینے کی صلاحیت بھی ضروری ہوتی ہے۔ موصوف کی یہ خوبی بتوفیق الٰہی بجز دیہہ میں جہاں عقیدۂ صحیحہ کے کلمۂ الٰہی کی بلندی کی شکل میں دنیا کے سامنے ہے، وہیں آپ کے شاگردان ومستفیدین دروس اور مجالس میں ہر روز اس کا مشاہدہ کرتے، مختلف اعتراضات وانحرافات کے متعلق معقول، مدلل، چست اور درست جوابات حاصل کرتے اور "**لیطمئن قلبی**" کے تحت ایسے سوال وجواب کے حریص رہا کرتے۔ موصوف صرف علمی اور مسکت جواب ہی نہیں دیتے بلکہ

اپنے جوابات میں لطف ومزاح کے پہلو پیدا کر کے خشک موضوعات ومباحث کو بھی انتہائی دلچسپ بنا دیتے۔اس ضمن میں وہبی اور کسبی دونوں طور پر مہارت نامہ حاصل تھی۔وذلک فضل اللہ

موصوف کی تحریر وتقریر اور گفتگو کی ایک خاص شان وہ ہوتی جو ہر عالمِ ربانی اور منہج سلف کے پیروکار عالم اور مسلمان کی ہونی چاہیے کہ پوری نرمی کے ساتھ، مدلل انداز میں ، بے لاگ اور دوٹوک سچ بولتے۔صحیح علم وعقیدہ کے مطابق واضح ،صاف اور صحیح موقف پیش کرنا بجائے خود سب سے بڑی مصلحت ہے۔مولانا صفی الرحمٰن رحمہ اللہ نے قادیانیت کے موضوع پر قلم اٹھایا تو در نفیس، مفید کتابیں لکھ کر مرزا غلام احمد کے دعوؤں (بشمول برطانوی نبوت) اور حقیقتوں کو بے نقاب کیا، منکرین حدیث کی طرف روئے سخن کیا تو قرآن کے ساتھ حدیث کے اٹوٹ رشتے کو نہ صرف آشکار کیا بلکہ اس ضمن میں کیے جانے والے اعتراضات کا علمی وعقلی کسوٹی پر جائزہ لی اور پرخچے اڑادیے، کاشی ودیاپیٹھ بنارس میں مدعو ہوئے تو اسلام اور اہنسا کے عنوان کا حق ادا کرتے ہوئے اسلام کی جامعیت اور فطرت کے مطابق ہونے اور ہر حال میں اہنسا اور عدم تشدد اختیار کرنے کے دلکش نعرے کا غیر فطری ہونا دوٹوک واضح اور مدلل انداز میں پیش فرمایا، (اس تناظر میں بھی آپ نمونہ سلف نظر آتے اور بہت سارے ان نام نہاد مفکرین ودانشوران اور ''عباقرہ'' کہلانے والے افراد سے بلند ہیں جو مخاطبین اور سامعین کی رعایت کرتے ہوئے اپنے موقف اور زبان میں تبدیلی کرتے رہتے ہیں)۔شیخ صفی الرحمٰن رحمہ اللہ نے اکابر پرستی ،روایت پرستی ،تقلید پرستی کی بنیادوں پر ضرب لگانے میں بھی کبھی فروگزاشت نہ کی ،اسے امت کے کم سواد لوگ خواہ مسلکی عصبیت کا نام دیں لیکن یہ ایک رحم دل طبیب اور اللہ کے جناب میں احساس جواب دہی سے سرشار عالم وداعی کا کردار ہے جسے انتہائی شفیق ورحم دل طبیب کے عملِ جراحی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جو اپنی جراحی سے امت کے جسم کے ناسور کاٹ پھینکنا اور اسے صحت مند بنانے کا جذبۂ خیر لئے ہوتا ہے۔

پردے اور اسلامی حجاب کے ضمن میں جب عرب دنیا میں یہ بحث چلی کہ عورت کا اجنبی مردوں کے سامنے چہرہ اور ہتھیلی کھولنا جائز ہے یا نہیں؟ بعض اپنے ہم فکر اور بڑے علماء نے رائے ظاہر کی کہ افضل نہیں ہے مگر جائز ہے اور اس موقف کی تائید میں کٹر سلفی عالم شیخ تقی الدین ہلالی رحمہ اللہ کا

مضمون شائع ہوا۔ علامہ البانی رحمہ اللہ کی کتاب حجاب المرأۃ المسلمۃ شائع ہو چکی تھی۔ تب موصوف کی ایک مدلل تحریر منظر عام پر آئی جس میں ثابت کیا گیا کہ چہرہ اجنبی کے سامنے بے نقاب کرنا جائز نہیں یعنی ہنگامی حالات اور مجبوری کے مخصوص حالات جیسے حج اور جنگ کے موقعوں کی دلیلوں سے عمومی جواز کی بات کہنا فہم واجتہاد کی صریح غلطی ہے۔ موصوف کی تحریر نے عرب دنیا کے علمی وعوامی حلقوں میں شہرت وقبولیت حاصل کی۔ الرحیق المختوم کے بعد عالم عرب بلکہ عالم اسلام میں آپ کی شناخت وشہرت کا یہ دوسرا سبب بنا۔ پھر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے مرکز السنہ میں شعبۂ بحث وتحقیق کے ذمہ دار کی حیثیت سے تقرری، مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کی امارت، مکتبہ دارالسلام ریاض کا علمی اشراف موصوف کے علمی فیض کے فروغ اور معتبریت کے اسباب بنتے گئے۔ ابتداءً ناگپور کے قریب سیونی پانڈرنا کے چھوٹے سے مدرسے میں درس وتدریس کا آغاز پھر جامعہ سلفیہ بنارس، جامعہ اسلامیہ ومسجد نبوی کے حلقہ درس واستفادہ مدینہ تک پہنچا، جامعہ سلفیہ بنارس کے ماہنامہ محدث کی ادارت سے مکتبہ دارالسلام کے تصنیفی کاموں تک سلسلہ دراز ہوا۔ آپ کے قلم نے مضامین، اداریوں، کتابچوں، روداد اور تحقیقی مواد پر مشتمل کتابوں سے عالمگیر شہرت یافتہ کتاب الرحیق المختوم اور پھر تجلیات نبوت تک سفر کیا، کتب حدیث، تفسیر ابن کثیر کی تلخیص کا اشراف، احسن البیان کی نظر ثانی اور ایسے دیگر متعدد علمی کارہائے نمایاں انجام دیے...... اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کے شاگردان ومستفیدین، آپ کی تصنیفات وتالیفات اور تراجم کو "علم ينتفع به" کے تحت قبولیت بخشے اور تاقیامت انہیں موصوف کے نامۂ اعمال میں حسنات کے اضافے کا باعث بنائے۔ آپ کی مفارقت سے جمعیت اہلحدیث ہی نہیں پوری ملت اسلامیہ ایک متبحر عالم اور بیباک داعی سے محروم ہوگئی جن کی رخصت پر فرمان رسول ﷺ:

"إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ يُرْفَعَ الْعِلْمُ......"

"قیامت کی نشانیوں میں سے ہے کہ علم اٹھالیا جائے گا"۔

یاد آتا ہے کہ علم اٹھتا جارہا ہے۔ آپ نے خود اس کی وضاحت فرمائی کہ علم کیسے اٹھے گا۔ فرمایا:

"إِنَّ اللّٰهَ لا يَقْبِضُ العِلْمَ اِنْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ العِبَادِ، وَلٰكِنْ يَقْبِضُ العِلْمَ بِقَبْضِ

الْعُلَمَاءِ حَتَّى إِذَا لَمْ يَبْقَ عَالِمًا يَتَّخِذَ النَّاسُ رُؤُوسًا جُهَّالاً، فَسُئِلُوا فَأَفْتَوا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا".

''اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح نہیں اٹھالے گا کہ اس کو بندوں سے چھین لے۔ بلکہ وہ (پختہ کار) علماء کو موت دے کر علم کو اٹھالے گا۔ حتیٰ کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے، ان سے سوالات کیے جائیں گے اور وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے۔ چنانچہ وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے''۔

(بخاری:100، مسلم: 2673)

اللہ تعالیٰ علم، علماء کو قبض کر کے اٹھاتا ہے۔ موجودہ دور میں شیخ صفی الرحمٰن جیسے عالم باعمل کی رحلت پر بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ علم اٹھتا جارہا ہے (1)۔

اللهم ارحمه واغفرله ووسع قبره واجعله روضة من رياض الجنة، وأعذه من عذاب في القبر وعذاب في النار وارفع درجته وأدخله في جنة الفردوس۔"

(1) ماخوذ از مجلہ صوت الحق، جنوری وفروری ۲۰۰۷ء ممبئی۔

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

(از: ایمن المدنی)

سرزمین ہند پہ بسنے والی مذہبی شخصیات میں عالم وفاضل بہت ہیں، مفسر ومقرر بے شمار ہیں، معلم ومدرس بے حساب ہیں، مصنف ومؤلف لا تعداد ہیں، شاعر وادیب لا محدود ہیں، واعظ وخطیب بے انتہا ہیں، عابد وزاہد اَن گنت ہیں، محدث وفقیہ کی کمی نہیں اور ایسی ہستیاں بھی تلاش بسیار کے بعد ضرور مل جائیں گی جن میں یہ تمام اوصافِ جمیلہ موجود ہوں، لیکن حقیقی معنوں میں عالم ربانی جو مذکور بالا صفات کے حامل ہوتے ہوئے بھی دنیاوی مناصب ومراتب کی اعلیٰ کرسی پر جلوہ افروز ہونے وشہرت طلبی سے پرہیز کرتے ہوئے خدا مست بھی ہوں، تو ایسی فہرست میں علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری کا نام نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

مبارکپور کی سرزمین فخر کرسکتی ہے کہ اس نے محدث کبیر علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی، محدث عظیم علامہ عبیداللہ مبارکپوری صاحب مرعاۃ المفاتیح اور علامۂ زماں محقق دوراں شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری صاحب الرحیق المختوم وغیرہ ہم جیسی نابغۂ روزگار شخصیات کو پیدا کیا۔ آپ کی پہلو دار عبقری شخصیت ایسا جگمگاتا ہوا تابناک ہیرا ہے جس میں متعدد اتقیاء وصلحاء کی شاندار پرچھائیاں جگمگ جگمگ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری نے خود کو قرآن وحدیث کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ آپ کی پوری زندگی اسی سے عبارت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کلام اللہ وسنت رسول اللہ کا احیاء آپ کا مقصدِ حیات تھا، آپ نے سب کچھ اسی کے لئے تج دیا تھا، یہ خدمت یہ سعادت اور یہ مشقت ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

تدریسی خدمات:

حلقۂ دروس میں ہم جیسے تلامذہ کے استفسارات وسوالات کے جوابات بہت ہی احسن طریق سے شاگردوں کے حواشی دماغ بٹھاتے تھے، اگر کہیں اشتباہ کی صورت پیدا ہوتی اور واضح دلیل دکھائی نہیں دیتی تو اس وقت اپنے حواسِ معنوی سے مدد لے کر یقین کی روشنی میں کتابِ دل کے اوراق الٹتے اور پھر خداداد صلاحیت کی بدولت علم لدنی کے خزانے ایسے لٹاتے جیسے چشمے سے پانی ابلتا ہو۔

آپ کا حلقۂ دروس ایک علمی مکتب ہوتا، مذہبی درس گاہ ہوتا، ایک دانش کدہ ہوتا، جہاں علم وفضل کی بارش ہوتی، عقل ودانش کا مینہ برستا، جنہوں نے آپ کی ساحرانہ خطابت کے زمزموں سے آب زلال پیا ہے وہ پھر اور کسی چشمے کی طرف رخ نہیں کرتے تھے۔ آپ کے چشمۂ فیض سے جاری ہونے والے آبِ مصطفیٰ کے چھینٹوں سے دلوں کو تازگی اور روح کو بالیدگی حاصل ہوتی تھی۔ آپ کی سحر البیان شخصیت کا نکھار اس وقت دیکھنے کے قابل ہوتا جب آپ قرآن کی تفسیر بیان کرتے تھے۔ آپ معارفِ قرآن کچھ اس طرح سمجھاتے کہ بسا اوقات ایک سطر کی تفسیر میں کئی گھنٹے صرف ہو جاتے، مجھے تو یوں محسوس ہوتا کہ دورانِ تفسیر آپ پر شرحِ صدر کی کیفیت پیدا ہو جاتی اور آپ کی زبان کی بجائے آپ کا دل بولنے لگتا:

علم کے میکدہ کا پیرِ مغاں
ماہرینِ ادب کا تھا وہ امام

تصنیفی خدمات:

اللہ تعالیٰ نے علامہ کو جہاں پیکرِ حسن وجمال اور مجسمۂ اخلاق بنایا تھا وہیں لیاقت وصلاحیت، تفکر وتدبر اور معلومات کا مخزن بنایا تھا اور علم وفنون میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ مرحوم کے اندر علم وفن کا جو بحر بیکراں موجزن تھا، اس کی واقفیت کے لئے سیرت نویسی کے عالمی مقابلہ میں فرسٹ آنے والی کتاب ''الرحیق المختوم'' کی شکل میں ہمارے درمیان موجود ہے۔ جو پوری امت مسلمہ کو

سیرت رسول ﷺ کے سمجھنے کے لئے نہایت مستند و معتبر کتاب ہے، اور تشریح و تحقیق کا ایسا نادر تحفہ ہے جو دیگر کتبِ سیر کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتی ہے، آپ کی اشہب خامہ سے تقریباً پچیس معیاری کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں، جو بے حد مقبول ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان قلمی خدمات کو قبول فرمائے۔ آمین۔

مناظرانہ خدمات:

17-8 جون 1978ء کو موضع بجر ڈیہہ بنارس میں اعیانِ مدرسہ احیاء السنہ نے دو روزہ اجلاس عام کا اہتمام کیا۔ دوسرے دن کے پروگرام میں ہندستان کے منجھے ہوئے کہنہ مشق سحر البیان خطیب شہیر شاعر بے نظیر مولانا حکیم عبدالسلام صاحب اسلم کانپوری نے اہل قبور سے استمداد و وسیلہ کی شرعی حیثیت پر سنجیدگی سے مدلل و مفصل روشنی ڈالی۔ یہ مسئلہ چونکہ بریلوی علماء کی شکم پروری کے سلسلہ میں کلیدی درجہ رکھتا ہے۔ اس لئے انہوں نے 25-26 جون 1978ء کو جوابی جلسہ کیا جس میں اپنی کج فہمی، ناسمجھی، بدکلامی، بیہودگی اور عاقبت نا اندیشی کا واضح ثبوت دیا اور اہل حدیثوں کو جواب کے لئے للکارا۔

29 جون 1978ء کو جماعت اہل حدیث نے پھر ایک جلسہ کیا جس میں علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری وغیرہ کو مدعو کیا۔ علامہ نے خالص قرآن وحدیث کی روشنی میں سیر حاصل بحث کرتے ہوئے بریلوی تلبیسات و تحریفات کا پردہ اس طرح چاک کیا کہ ایوان ضلالت و بدعت میں زلزلہ برپا ہو گیا اور آپ کی تقریر دلپذیر سے 9-10 بریلوی حضرات پختہ اہلحدیث ہو گئے۔

30 جون کو پورے غم وغصہ میں بریلوی علماء نے مناظرہ کا چیلنج دے دیا۔ جس کو اہلحدیث علماء نے برضا و رغبت قبول کر لیا اور 14 جولائی 1978ء بروز جمعہ فریقین کے سربرآوردہ حضرات نے شرائط مناظرہ طے کر لیا، اہلحدیث مناظر علامہ صفی الرحمٰن منتخب ہوئے اور بریلوی مناظر مولانا ضیاء المصطفیٰ مقرر ہوئے۔

۲۰-۲۳ ذی قعدہ ۱۳۹۸ھ مطابق 23-26 اکتوبر 1978ء کو دور حاضر کا عظیم الشان مناظرہ

ہوا، قدرت نے آپ کو نہایت ذہین وفطین بنایا تھا، اور حاضر جوابی کا وہ ملکہ عطا کیا تھا کہ عوام وخواص رشک کرتے تھے۔ آپ نے چار روزہ مناظرہ میں اسلام کی حقانیت اور بدعت کا پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے بریلوی عالم ضیاء المصطفیٰ کی ایسی مضبوط گرفت کی کہ چاروں شانے چت ہوگیا، اپنے عالم کی بوکھلاہٹ دیکھ کر اسی وقت پچاس بریلوی حضرات اہلحدیث ہوگئے۔ **فللہ الحمد و لہ الشکر**

مدینہ یونیورسٹی میں قیام:

علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری کی مایہ ناز کتاب ''الرحیق المختوم'' ایک خوشگوار کوشش اور قابل قدر ولافانی کارنامہ ہے، جس کو موصوف نے رابطہ عالم اسلامی کے منعقدہ مقابلہ سیرت نویسی ۱۳۹۶ھ کی دعوت عام پر لبیک کہتے ہوئے تحریر کیا تھا اور جو انعام اول سے سرفراز ہوئی تھی۔

اس کتاب نے عرب وعجم کے علماء ومشائخ کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا اور پوری دنیا نے علامہ کی ذہانت وفطانت کا لوہا مان لیا۔ ۱۳ ربیع الآخر ۱۳۹۹ھ کو مکہ مکرمہ سے گرانقدر انعام لے کر جب صنم کدہ ہند واپس ہوئے تو اس کے چند برسوں کے بعد آپ سعودی عرب کی دعوت پر مدینہ یونیورسٹی تشریف لے گئے اور وہاں رہ کر دین متین کی ٹھوس خدمت انجام دی۔

مولانا عبدالمالک مجاہد کے مکتبہ سے وابستگی:

مدینہ یونیورسٹی کی خدمات سے علیحدگی کے بعد مولانا عبدالمالک مجاہد صاحب مینیجنگ ڈائریکٹر مکتبہ دارالسلام کی شدید خواہش پر ان کے ادارہ سے منسلک ہوگئے اور ناقابل فراموش دینی خدمات انجام دینے کے ساتھ ایک بہت ہی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔ وہ ہے حافظ صلاح الدین کی تفسیر احسن البیان کی مراجعت ونظر ثانی۔ چنانچہ حافظ صاحب رقمطراز ہیں:

> ''حضرت مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری حفظہ اللہ مصنف الرحیق المختوم بھی مستحق شکریہ ہیں، جنھوں نے مجاہد صاحب کی خواہش اور درخواست پر پوری تفسیر پر نہایت محنت اور توجہ سے نظر ثانی فرمائی۔ اس میں حسب ضرورت اصلاح وترمیم فرمائی اور اس پر اپنے اعتماد کا اظہار فرمایا۔ حضرت مولانا موصوف مبارکپوری خاندان کے علم وعمل کی درخشندہ روایات

کے حامل وامین اور عالم اسلام کی نہایت ممتاز شخصیت ہیں،ان کی نظر ثانی ، اصلاح اور اظہارِ اعتماد نے اس تفسیر کے حسن کو دو چند اوراس کے پایۂ اعتبار کو بلند کر دیا ہے۔ فجزاء الله احسن الجزاء وبارك فی عمره (تفسیر احسن البیان ص۱۴)"۔

علامہ سے ناچیز کی عقیدت ومراسلت:

1966ء میں ناچیز راقم السطور نے جامعہ دارالحدیث اثریہ مئو میں اکتسابِ علم وفن کے لیے داخلہ لیا۔اس وقت جامعہ میں بہت لائق وفائق علماء تدریسی فرائض انجام دے رہے تھے جیسے حضرت العلام عبداللہ صاحب شائق مئوی (بانیٔ جامعہ)، علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری ، مولانا عبدالعلی صاحب اور مولانا منظور احمد صاحب وغیرہم ۔لیکن مجھ پر سب سے زیادہ جن کی چھاپ پڑی وہ علامہ شائق وعلامہ مبارکپوری رحمہما اللہ ہیں۔علامہ مبارکپوری سے آخری وقت تک انتہائی محبت تھی۔ چنانچہ میں 1970 تا 1975ء جامع مسجد اہل حدیث سمی ضلع مہسانہ (گجرات) میں امام وخطیب تھا تو علامہ جب بھی کوئی کتاب تالیف فرماتے تو ناچیز کواس کی طباعت کے سلسلہ میں ضرور لکھتے کہ میرے عزیز! میں نے فلاں کتاب لکھی ہے لہٰذا اس کی طباعت واشاعت کے لئے کچھ کرو،اس طرح علامہ سے مسلسل مراسلت رہتی تھی۔

آخری ملاقات:

آج سے تقریباً 3-4 سالوں قبل آپ سے ملنے کے لئے آپ کے وطن مالوف حسین آباد (مبارکپور) حاضر ہوا، بوقت نمازِ عصر مسجد میں وارد ہوا،ایک نورانی چہرہ والے بزرگ جن کی داڑھی وکپڑے دودھ جیسے سفید وزرق برق تھے، دیکھنے میں بہت بھلے معلوم ہورہے تھے،انتہائی خضوع کے ساتھ نماز پڑھا رہے تھے۔راقم آخری رکعت میں شامل ہوا۔ بعد سلام تمام نمازی تو چلے گئے تھے مگر علامہ مصلیٰ پر تشریف فرما تھے۔میں نے سلام پھیرنے کے بعد جو علامہ کی طرف دیکھا تو آپ کے حسین وجمیل لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔مصافحہ کے بعد مسجد میں علیک سلیک ہوا پھر فرمایا: آؤ گھر چلتے ہیں۔گھر پہنچ کر مہمان خانہ میں رونق افروز ہو گئے اور عصر تا مغرب مختلف موضوعات پر محو

گفتگو تھے۔ دورانِ گفتگو بار بار آپ پر نظر ڈالتا تھا تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ نور کی بارش ہو رہی ہے۔ یہ آپ کی کمال تقویٰ کی واضح دلیل ہے۔

این سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

وفات حسرت آیات:

﴿کل نفس ذائقة الموت﴾ کے اٹل قانون سے کون مستثنیٰ ہے؟ غیر مرئی جرثومہ سے لے کر قوی الجثہ ہاتھی تک سب اسی آئینِ ایزدی کے تحت ہیں۔ اسی ازلی وابدی قانون کے تحت جماعت اہل حدیث کو خصوصاً اور عامۃ المسلمین کو عموماً حادثۂ عظیم پیش آیا کہ دو تین سال صاحب فراموش رہ کر یکم دسمبر 2006ء مطابق 9 ذی قعدہ ۱۴۲۷ھ بروز جمعہ علم وعمل کا یہ نہایت تابناک و درخشندہ ستارہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون (1)۔

قوم کا ایک چراغ تھا نہ رہا

ایک عالی دماغ تھا نہ رہا

---

(1) ماخوذ از ماہنامہ البلاغ ممبئی، مارچ ۲۰۰۷ء۔

عالم اسلام کو عظیم صدمہ

(از: مولانا ابوالعاص وحیدی، ناظم ریاستی جمعیت اہلحدیث مشرقی یوپی)

یکم دسمبر 2006ء بروز جمعہ عظیم محقق و مصنف علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ طویل علالت کے بعد اس عالم فانی سے کوچ کر گئے۔

"سقی اللہ ثراہ وجعل الجنة مثواہ".

موجودہ صدی میں علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ ایک مستند مدرس، معتبر مصنف، بیباک صحافی، جرأت مند مناظر اور اول درجہ کے سیرت نگار تھے۔ یقیناً ان کی وفات سے جماعت اہل حدیث، ملت اسلامیہ ہند بلکہ پورے عالم اسلام کو عظیم صدمہ پہنچا ہے۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کا تعلق مختلف علمی و دینی میدانوں سے تھا، جمعیت و جماعت سے بھی ان کا تنظیمی تعلق تھا۔ وہ اپنی زندگی کی ایک مدت میں ریاستی جمعیت اہل حدیث مشرقی یوپی کے امیر رہے ہیں۔ اسی طرح بیسویں صدی کی آخری دہائی میں مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے بھی امیر رہے ہیں۔ بنابریں ان کی وفات سے ریاستی جمعیت مشرقی یوپی اور مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند دونوں سوگوار ہیں اور ان کے لیے دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں رحمت ومغفرت سے نوازے، ان کی علمی و دینی خدمات قبول فرمائے اور ان کی لغزشیں معاف کرے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (آمین)

مولانا مبارکپوری رحمہ اللہ کی بہت بڑی خصوصیت ان کی حاضر دماغی وحاضر جوابی تھی۔ ہم لوگوں کو یاد ہے کہ ایک بار سیدنا ابوبکر صدیق ہال سنی انٹر کالج لکھنؤ میں ریاستی جمعیت اہل حدیث مشرقی یوپی کی کانفرنس تھی۔ اس میں سوال وجواب کی بھی ایک نشست تھی، لکھنؤ ومضافات کے اصحاب علم ودانش ان سے تحریری سوالات کرتے اور وہ برجستہ انتہائی تشفی بخش جوابات دیتے۔ اب تک لکھنؤ

کے لوگ ان کی حاضر جوابی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ان کے حادثۂ وفات نے لکھنؤ والوں کو حد درجہ متاثر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ علامہ مبارکپوریؒ کے تمام سوگواروں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ریاستی جمعیت مشرقی یوپی اور تمام ضلعی جمعیات ان کے پسماندگان کے درد وغم میں شریک ہیں۔اللہ تعالیٰ ان سب کو صبر وضبط کی توفیق بخشے (1)۔(آمین)

(1) دیکھئے: پندرہ روزہ ترجمان، دہلی۔ 15-1 جنوری 2007ء۔

'الرحیق المختوم' پر ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف حفظہ اللہ کا مقدمہ

الحمد لله الذی بنعمته تتم الصالحات ، وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريک له، وأشهد أن محمدًا عبده ورسوله وصفيه وخليله ، أدى الرسالة وبلغ الأمانة، ونصح الأمة، وتركها على المحجة البيضاء ليلها كنهارها، صلى الله عليه وعلى آلهِ وصحبه أجمعين، ورضى عن كل من تبع سنته عمل بها إلى يوم الدين ، وعنا معهم ورضاک يا أرحم الراحمين . أما بعد:

سنت نبویہ مطہرہ جو ایک تجدد پذیر عطیہ اور تا قیامت باقی رہنے والا توشہ ہے۔ اور جس کو بیان کرنے اور جس کے مختلف عنوانات پر کتابیں اور صحیفے لکھنے کے لیے لوگوں میں نبی ﷺ کی بعثت کے وقت سے مقابلہ اور تنافس جاری اور قیامت تک جاری رہے گا۔ یہ سنت مطہرہ مسلمانوں کے سامنے وہ عملی نمونہ اور واقعاتی پروگرام رکھتی ہے جس کے سانچے میں ڈھل کر مسلمانوں کی رفتار وگفتار اور کردار واطوار کو نکلنا چاہیے۔ اور اپنے پروردگار سے ان کا تعلق اور اپنے کنبہ وقبیلہ، برادران واخوان اور افرادِ اُمت سے ان کا ربط اس کے عین مطابق ہونا چاہیے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے۔

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا﴾

''یقیناً تمہارے ہر اس شخص کے لیے اللہ کے رسول ﷺ میں بہترین اسوہ ہے جو اللہ اور روز آخرت کی امید رکھتا ہو اور اللہ کو بکثرت یاد کرتا ہو''۔ (الاحزاب:۲۱)

اور جب حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کیسے تھے؟ انہوں نے فرمایا: كان خلقه القرآن. ''بس قرآن ہی آپ کا اخلاق تھا''۔

لہٰذا جو شخص اپنی دنیا اور آخرت کے جملہ معاملات میں ربانی شاہراہ پر چل کر اس دنیا سے نجات چاہتا ہو اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ رسول اعظم ﷺ کے اسوہ کی پیروی کرے

اور خوب اچھی طرح سمجھ بوجھ کر اس یقین کے ساتھ نبی ﷺ کی سیرت کو اپنائے کہ یہی پروردگار کا سیدھا راستہ ہے جس میں ہمارے آقا اور پیشوا رسول اللہ عملاً اور واقعۃً تمام شعبہائے زندگی میں گامزن تھے۔ لہٰذا اسی میں قائدین و متبعین، حکام و محکومین، رہبران و مرشدین اور مجاہدین کی رشد وہدایت ہے۔ اور اسی میں سیاست و حکومت، دولت و اقتصاد، معاشرتی معاملات، انسانی تعلقات، اخلاق فاضلہ اور بین الاقوامی روابط کے جملہ میدانوں کے لیے اسوہ ونمونہ ہے۔

آج جبکہ مسلمان اس ربانی منہج سے دور ہٹ کر جہل و پسماندگی کے کھڈ میں جا گرے ہیں، ان کے لیے کیا ہی بہتر ہوگا کہ وہ ہوش کے ناخن لیں اور اپنے تعلیمی نصابوں اور مختلف اجتماعات ومجالس میں اس بنا پر سیرت نبوی کو سرفہرست رکھیں کہ یہ محض ایک فکری متاع ہی نہیں ہے؛ بلکہ یہی اللہ کی طرف واپسی کی راہ ہے اور اسی میں لوگوں کی اصلاح و فلاح ہے۔ کیونکہ یہی اخلاق وعمل کے میدان میں اللہ عزوجل کی کتاب قرآن مجید کی ترجمانی کا اسلوب ہے، جس کے نتیجہ میں مومن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی شریعت کا تابع فرماں بن جاتا ہے۔ اور اسے انسانی زندگی کے جملہ معاملات میں حکم بنالیتا ہے۔

یہ کتاب ''الرحیق المختوم'' اپنے فاضل مؤلف شیخ صفی الرحمن مبارکپوری کی ایک خوشگوار کوشش اور قابلِ قدر کارنامہ ہے جسے موصوف نے رابطہ عالم اسلامی کے منعقد کردہ مقابلہ سیرت نویسی ۱۳۹۶ھ کی دعوت عام پر لبیک کہتے ہوئے انجام دیا اور پہلے انعام سے سرفراز ہوئے۔ جن کی تفصیل رابطہ عالم اسلامی کے سابق سکریٹری جنرل مرحوم فضیلۃ الشیخ محمد علی الحرکان تغمدہ اللہ برحمتہ وجزاہ عنا خیر الجزاء کے مقدمہ طبع اول میں مذکور ہے۔

اس کتاب کو لوگوں میں زبردست پذیرائی حاصل ہوئی اور یہ ان کی مدح وستائش کا مرکز بن گئی۔ چنانچہ پہلے ایڈیشن کے کل کے کل (دس ہزار) نسخے ہاتھوں ہاتھ نکل گئے اور اس کے بعد جناب محترم ح، ح (حسان حمودی حفظہ اللہ) نے ازراہ کرم مزید پانچ ہزار نئے نسخوں کی طباعت کا بیڑہ اٹھایا۔ فجزاء اللہ خیر الجزاء

اس موقع پر محترم موصوف ح، ح نے مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں اس تیسرے

ایڈیشن کا دیباچہ لکھ دوں۔ چنانچہ ان کی خواہش کے احترام میں میں نے یہ مختصر سا دیباچہ قلم بند کر دیا۔ مولیٰ عزوجل سے دعا ہے کہ وہ اس عمل کو اپنے رُخ کریم کے لیے خالص بنائے اور اس سے مسلمانوں کو ایسا نفع پہنچائے کہ ان کی موجودہ خستہ حالی بہتری میں تبدیل ہو جائے۔ اُمتِ محمدیہ کو اس کا گم گشتہ مجد وشرف اور اقوامِ عالم کی قیادت کا مقام بلند واپس مل جائے اور وہ اللہ عزوجل کے اس ارشاد کی عملی تصویر بن جائے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾

''تم خیر امت ہو جسے لوگوں کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔ (آل عمران:۱۱۰)

وصلى الله على المبعوث رحمة للعالمين، رسولِ الهدى ومرشد الإنسانية إلى طريق النجاة والفلاح، وعلىٰ آله وصحبه وسلم والحمد لله رب العالمين.

ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف

سیکرٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ (سابقاً)

'الرحیق المختوم' پر معالی الشیخ محمد علی الحرکان رحمۃ اللہ علیہ کا مقدمہ

الحمد لله رب العالمين، خالق السماوات والأرض وجاعل الظلمات والنور، وصلى الله على سيدنا محمد خاتم الأنبياء والرسل أجمعين، بشر وأنذر، ووعدَ وأوعد، أنقذ الله به البشر من الضلالة، وهدى الناس إلى الصراط المستقيم، صراط الله الذى له ما فى السماوت وما فى الأرض، ألا إلى الله تصير الأمور وبعد:

چونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مقام شفاعت اور بلند درجہ عطا فرمایا ہے اور آپ سے ہم مسلمانوں کو محبت کرنے کی ہدایت دی ہے اور آپ کی پیروی کو اپنی محبت کی نشانی قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ﴾

''اے پیغمبر کہہ دو! اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو۔ اللہ تمہیں محبوب رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو تمہارے لیے بخش دے گا''۔ (آل عمران:۳۱)

اس لیے یہ بھی ایک سبب ہے جو دلوں کو آپ کا گرویدہ ووارفتہ بنا کر ان اسباب وذرائع کی جستجو میں ڈال دیتا ہے جو آپ کے ساتھ تعلّقِ خاطر کو پختہ تر کردیں۔ چنانچہ طلوعِ اسلام ہی سے مسلمان آپ کے محاسن کے اظہار اور آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کی نشرو اشاعت میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ آپ ﷺ کی سیرت طیبہ نام ہے آپ ﷺ کے اقوال وافعال اور اخلاقِ کریمانہ کا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں:'' كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ '' ''یعنی قرآن کریم ہی آپ ﷺ کا اخلاق تھا۔'' اور معلوم ہے کہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے کلماتِ تامّہ کا نام ہے۔ لہٰذا جس ذاتِ گرامی کا یہ وصف ہے وہ یقیناً سارے انسانوں سے بہتر اور کامل ہے، اور ساری خلقِ خدا کی محبت کی سب سے زیادہ حقدار ہے۔

یہ گراں مایہ محبت ہمیشہ مسلمانوں کا سرمایہ دل وجان رہی اور اسی کے افق سے سیرت نبویہ شریفہ کی پہلی کانفرنس کا نور پھوٹا۔ یہ کانفرنس ۱۳۹۶ھ میں پاکستان کی سرزمین پر منعقد ہوئی اور رابطہ نے اس کانفرنس میں اعلان کیا کہ ذیل کی شرائط پر پورے اترنے والے سیرت کے پانچ سب سے عمدہ مقالات پر ڈیڑھ لاکھ سعودی ریال کے مالی انعامات دیے جائیں گے۔ شرائط یہ ہیں:

(۱) مقالہ مکمل ہو اور اس میں تاریخی واقعات زمانۂ وقوع کے لحاظ سے ترتیب وار بیان کیے گئے ہوں۔

(۲) مقالہ عمدہ ہو اور اس سے پہلے شائع نہ کیا گیا ہو۔

(۳) مقالے کی تیاری میں جن مخطوطات اور علمی مآخذ پر اعتماد کیا گیا ہو ان سب کے حوالے مکمل دیے گئے ہوں۔

(۴) مقالہ نگار اپنی زندگی کے مکمل اور مفصل حالات قلم بند کرے اور اپنی علمی اسناد اور اپنی تالیفات کا...... اگر ہوں تو...... ذکر کرے۔

(۵) مقالے کا خط صاف اور واضح ہو؛ بلکہ بہتر ہوگا کہ ٹائپ کیا ہوا ہو۔

(۶) مقالے عربی اور دوسری زندہ زبانوں میں قبول کیے جائیں گے۔

(۷) یکم ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ سے مقالات کی وصولی شروع کی جائے گی اور یکم محرم ۱۳۹۷ھ کو ختم کر دی جائے گی۔

(۸) مقالات رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے سکریٹریٹ کو مہر بند لفافے کے اندر پیش کیے جائیں۔ رابطہ ان پر اپنا ایک خاص نمبر شمار ڈالے گا۔

(۹) اکابر علماء کی ایک اعلیٰ کمیٹی تمام مقالات کی چھان بین اور جانچ پڑتال کرے گی۔

رابطہ کا یہ اعلان محبت نبوی ﷺ سے سرشار اہل علم کے لیے مہمیز ثابت ہوا اور انہوں نے اس مقابلے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ادھر رابطہ عالم اسلامی بھی عربی، انگریزی، اردو اور دیگر زبانوں میں مقالات کی وصولی اور استقبال کے لیے تیار تھا۔

پھر ہمارے محترم بھائیوں نے مختلف زبانوں میں مقالات بھیجنے شروع کیے۔ جن کی تعداد

۱۷۱ تک جا پہنچی۔ ان میں ۸۴ مقالے عربی زبان میں تھے ۶۴ اردو میں، ۲۱ انگریزی میں، ایک فرانسیسی میں اور ایک ہوسا زبان میں۔

رابطہ نے ان مقالات کو جانچنے اور استحقاق انعام کے لحاظ سے ان کی ترتیب قائم کرنے کے لیے کبار علماء کی ایک کمیٹی تشکیل دی اور انعام پانے والوں کی ترتیب یہ رہی۔

۱۔ پہلا انعام۔ شیخ صفی الرحمٰن مبا کپوری، جامعہ سلفیہ، ہند۔ پچاس ہزار سعودی ریال۔

۲۔ دوسرا انعام۔ ڈاکٹر ماجد علی خاں، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ہند، چالیس ہزار سعودی ریال۔

۳۔ تیسرا انعام۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، صدر جامعہ اسلامیہ، بہاولپور پاکستان۔ تیس ہزار سعودی ریال۔

۴۔ چوتھا انعام۔ استاد حامد محمود، محمد منصور لیمود مصر۔ بیس ہزار سعودی ریال۔

۵۔ پانچواں انعام۔ استاد عبدالسلام ہاشم حافظ، مدینہ منورہ مملکت سعودیہ عربیہ۔ دس ہزار سعودی ریال۔

رابطہ نے ان کامیاب افراد کے ناموں کا اعلان ماہ شعبان ۱۳۹۸ھ میں کراچی (پاکستان) کے اندر منعقد پہلی ایشیائی اسلامی کانفرنس میں کیا۔ اور اشاعت کے لیے تمام اخبارات کو اس کی اطلاع بھیج دی۔

پھر تقسیم انعامات کے لیے رابطہ نے مکہ مکرمہ میں اپنے مستقر پر امیر سعود بن عبدالمحسن بن عبدالعزیز کی سرپرستی میں سنیچر ربیع الآخر ۱۳۹۹ھ کی صبح ایک بڑی تقریب منعقد کی۔ امیر سعود مکہ مکرمہ کے گورنر امیر فواز بن عبدالعزیز کے سکریٹری ہیں۔ اور اس تقریب میں ان کے نائب کی حیثیت سے موصوف نے انعامات تقسیم کیے۔

اس موقع پر رابطہ کے سکریٹریٹ کی طرف سے یہ اعلان بھی کیا گیا کہ ان کامیاب مقالات کو مختلف زبانوں میں طبع کرا کر تقسیم کیا جائے گا۔ چنانچہ اس کو روبہ عمل لاتے ہوئے شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری جامعہ سلفیہ ہند کا (عربی) مقالہ سب سے پہلے طبع کرا کر قارئین کی خدمت میں پیش کیا

گیا۔ کیونکہ موصوف ہی نے پہلا انعام حاصل کیا ہے۔ اس کے بعد بقیہ مقالے بھی ترتیب وار طبع کیے جائیں گے۔

اللہ سبحانہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے اعمال اپنے لیے خالص بنائے اور انہیں شرفِ قبولیت سے نوازے۔ یقیناً وہ بہترین مولیٰ اور بہترین مددگار ہے۔ وصلی اللہ علیٰ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم۔

محمد علی الحرکان

سکریٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ (سابقاً)

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری کے دورۂ پاکستان کی مختصر روداد

(بحوالہ ہفت روزہ الاعتصام لاہور، 20 دسمبر 1985ء)

ہندستان کے نامور سلفی عالم، جامعہ سلفیہ بنارس کے شیخ الحدیث، کتب کثیرہ کے مصنف اور نامور اہل علم مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری مدظلہ العالی 29 نومبر 1985ء کو واردِ لاہور ہوئے۔ اور اپنے رفیق مولانا محمد مستقیم صاحب کی معیت میں ہمارے ادارہ دارالدعوۃ السّلفیہ میں قیام پذیر رہے۔ مولانا موصوف کو حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف حفظہ اللہ سے بے پناہ محبت وعقیدت ہے ۔اوران کی پاکستان میں آمد کے مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ حضرت کی زیارت کرسکیں اور چندروز ان کی صحبت میں گزاریں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ موقع عنایت فرمایا۔ اسی دن بعد نماز عشاء مسجد قدس لاہور میں منعقد ہونے والی حرمین شریفین کانفرنس میں آپ نے شرکت فرمائی، جیسے جیسے یہاں کے اہل حدیث حلقوں میں آپ کی آمد کی اطلاع پہنچتی گئی۔ آپ کے اعزاز میں استقبالیہ تقاریب کے تقاضے بڑھتے گئے اور پروگرام مرتب ہوتے چلے گئے۔ لاہور شہر کی مختلف سلفی تنظیموں کو آپ کی صحبت سے مستفیض ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ لاہور سے باہر فیصل آباد (1) میں بھی تشریف لے گئے جہاں سلفی مدارس جامعہ سلفیہ اور ادارہ علوم اثریہ اور جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن کا معائنہ فرمایا۔ اور احباب سے خطاب فرمایا۔ فیصل آباد میں مولانا عبدالغفار حسن حفظہ اللہ سے بھی شرف ملاقات حاصل کیا۔

تحریک جہاد اور شہدائے بالاکوٹ سے آپ کی عقیدت اور وابستگی کے پیش نظر لاہور سے بالاکوٹ کے سفر کا پروگرام بنا تو ہمارے مدیر اعلیٰ حافظ صلاح الدین یوسف اور راقم الحروف کے لیے بھی اس سعادت کے حصول کا ذریعہ پیدا ہوگیا۔ ادارہ انصار السنۃ المحمدیۃ لاہور کے رئیس مولانا عطاء اللہ ثاقب اس قافلے کے امیر اور قائد بنے۔ اور مولانا مبارک پوری کی رفاقت میں ہم مولانا

(1) مولانا کے رفیق مولانا محمد مستقیم صاحب بھی اس دورے میں ان کے ساتھ تھے۔

ثاقب کی ویگن میں جمعہ 6 دسمبر 1985ء کی رات ساڑھے گیارہ بجے لاہور سے بالاکوٹ کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ اس پروگرام کی تیاری میں حافظ احمد شاکر صاحب اور ضیاء اللہ کھوکھر صاحب (گوجرانوالہ) نے مرکزی کردار ادا کیا۔ گو دونوں حضرات اپنی دیگر مصروفیات کی وجہ سے شریک سفر نہ بن سکے (1)۔

مولانا ثاقب نے ویگن کے لیے متبادل ڈرائیور محمود ابن مولانا خالد گھرجاکھی کو بھی ساتھ لیا۔ جو نہایت زیرک ڈرائیور اور خوش اخلاق سلفی نوجوان ہیں۔ راتوں رات جی ٹی روڈ کا سفر ٹیکسلا تک تمام ہوا۔ اور ہم نے آٹھ دسمبر کی فجر کی نماز جامع مسجد اہل حدیث ٹیکسلا میں ادا کی۔ نماز کے بعد مولانا عبداللہ صاحب خطیب مسجد مذکور نے ناشتے سے تواضع فرمائی اور ہم وہاں سے اگلی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹیکسلا سے کوٹ نجیب اللہ، ہری پور، حویلیاں، ایبٹ آباد اور مانسہرہ سے گزرتے ہوئے پہاڑی نشیب وفراز اور بل کھاتی ہوئی سڑک پر سفر نہایت پر لطف رہا۔ مانسہرہ سے بالاکوٹ کا راستہ پر پیچ پہاڑی اتار چڑھاؤ کا راستہ ہے۔ مولانا عطاء اللہ ثاقب اور عزیزی محمود کی محتاط اور ماہرانہ ڈرائیونگ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم شامل حال رہا اور ہم بالاکوٹ کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ بالاکوٹ سے تقریباً سولہ کلومیٹر ادھر مظفر آباد کی سڑک الگ ہوتی ہے جو گڑھی حبیب اللہ سے ہو کر گزرتی ہے۔ وہیں سے دریائے کنہار کا مغربی ساحل شروع ہو جاتا ہے جو بالاکوٹ تک چلا گیا ہے اور اس کے تقریباً ساتھ ساتھ سڑک چلی جاتی ہے۔ جس پر فراٹے بھرتی ہوئی ویگن بالاکوٹ میں جامع مسجد اہل حدیث کے پاس جا کر رکی۔ اس وقت دن کے کوئی گیارہ بجے ہوں گے کہ ہم اپنی منزل مقصود پر پہنچے۔ مسجد کے خطیب مولانا محمد صدیق صاحب کو گھر سے بلوایا گیا۔ جنہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا۔ انہوں نے چائے وغیرہ سے ہماری تواضع فرمائی اور پھر جنگ بالاکوٹ کے مقامات اور شہدائے کرام کے مقابر کی طرف راہنمائی کے لیے ساتھ ہو لیے۔ ہم ویگن پر ہی پہلے مجاہد کبیر امیر المومنین سید احمد شہید رحمہ اللہ سے منسوب قبر پر پہنچے۔ قبر پر باقاعدہ کتبہ نصب ہے۔ جس پر تاریخ شہادت 6 مئی کے بجائے 7 مئی 1831ء درج

(1) اسی طرح مولانا محمد مستقیم صاحب اپنی علالت کے باعث ساتھ جانے سے معذور رہے۔

ہے، ساتھ ہی یہ قطعہ بھی کندہ کیا ہوا ہے جو سید صاحب اکثر پڑھا کرتے تھے:

اے آنکہ زنی دم از محبت   از ہستی خویشتن بہ پرہیز

برخیز و بہ تیغ تیز بنشین   یا از سرِ راہِ دوست برخیز

اس قطعے میں بعض الفاظ کی غلطیاں نمایاں ہیں، اس قبر کے ساتھ بہت سی دوسری قبریں بھی اسی احاطے میں موجود ہیں ۔ جن میں امیر المجاہدین مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی کی قبر بھی ہے، جو 1951ء میں فوت ہوئے ۔ اور وصیت کے مطابق وہاں دفن کیے گئے ۔ سید صاحبؒ سے منسوب اس قبر میں ان کی میت بغیر سر کے دفن کی گئی تھی ۔ کیونکہ ان کا سر سکھوں نے کاٹ کر دریائے کنہار میں پھینک دیا تھا جو بہتا ہوا گڑھی حبیب اللہ کے پاس کنارے لگا ۔ وہاں اس سر کا مدفن بیان کیا جاتا ہے ۔ مگر اکثر روایات کے مطابق اس قبر میں سید صاحبؒ کی میت نہیں ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

یہاں سے ویگن گھما کر بالاکوٹ کے گاؤں کی طرف روانہ ہوئے ۔ بالاکوٹ جس پہاڑی پر واقع ہے اس کے مغرب میں ست بنے کا نالہ ہے جو جنوب مغربی بلند و بالا پہاڑ سے اتر کر دریائے کنہار میں جا گرتا ہے ۔ بالاکوٹ کے دامن میں اس کے کنارے ویگن کھڑی کر دی گئی ۔ اور نالے کے شمالی کنارے پر اسلام کے بطلِ جلیل مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ کے مدفن پر پہنچے جو یہاں سے کافی بلندی پر واقع ہے ۔ یہ بھی ایک احاطہ ہے جس میں دوسری قبریں بھی موجود ہیں ۔ مولانا شہیدؒ کی قبر کے سرہانے بھی ایک کتبہ ہے جو اسد علی انوری فرید آبادی نے محرم ۱۳۷۲ھ (1952ء) میں نصب کروایا ۔ اس کتبے پر تاریخ ولادت وشہادت اور مندرجہ ذیل اشعار درج ذیل ہیں:

اے ذبیح اللہ اسماعیل ما   شد ندایت صورِ اسرافیل ما

خونِ خود را در کہ و کہسار ریخت   لیک بیخ حریت در ہند بیخت

قطعے میں بیخ حریت کی جگہ ''تخم حریت'' ہونا چاہیے جو قافیے ''بیخت'' کے لحاظ سے زیادہ موزوں ہے مگر ''تحفۃ الابرار'' کے مصنف نے بھی ''بیخ حریت'' ہی استعمال کیا ہے ۔ اس لیے یہاں بھی وہی درج ہے ۔ کچھ دیر مولانا کے مدفن پر رہے، وہاں سے شمالی جانب کھیتوں میں ایک بہت بڑا چٹان نما سیاہ پتھر پڑا ہے جس کے متعلق مولانا محمد صدیق نے بتایا کہ اس پتھر پر کھڑے ہو کر مولانا شہیدؒ اپنے

جیش کو خطاب فرماتے تھے۔ مدفن شہیدؒ سے ہو کر ست بنے نالے کے جنوبی پاٹ سے ہوتے ہوئے ہم ویگن کے پاس آئے۔ چند احباب وہیں ٹھہر گئے۔ جب کہ مولانا مبارکپوری اور راقم الحروف ایک دو اور احباب کے ساتھ مولانا محمد صدیق صاحب کی راہنمائی میں بالا کوٹ گاؤں کو روانہ ہوئے۔ پہاڑی پر چڑھ کر گاؤں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے ہم مسجد بالا میں پہنچے۔ جس کے پاس حضرت سید احمد شہیدؒ واصل خاں کی حویلی میں فروکش ہوئے تھے۔ اس حویلی کا نقشہ تو بالکل بدل چکا ہے۔ اب وہاں نئے مکان وغیرہ بن گئے ہیں۔ مسجد میں بھی خاصی تبدیلی ہوگئی ہے۔ مسجد کا پرانا کمرہ اب صحن بن گیا ہے۔ اور صحن کی جگہ مسجد کا پختہ ہال تعمیر ہو چکا ہے۔ ہم نے مسجد میں کھڑے ہو کر سامنے مٹی کوٹ کے اس ٹیلے کا نظارہ کیا جہاں سے سکھ فوج اتر کر بالا کوٹ پر حملہ آور ہوئی تھی۔ مٹی کوٹ اور بالا کوٹ کے مابین نشیبی علاقہ ہے جہاں کھیت، مکان اور دیگر تعمیرات کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے۔ دراصل یہی میدان جنگ ہے جہاں کفر و ایمان کا وہ عظیم معرکہ بپا ہوا جس نے مسلم ہندستان کی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری مدظلہ نے اس میدان اور پہاڑی مواضعات پر نظر دوڑاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ میں نے کتابوں میں جو تفصیلات پڑھی تھیں اور ان کا جغرافیائی نقشہ جو میں نے مرتب کیا تھا وہ اب سمجھ میں آیا ہے۔ مسجد بالا میں کھڑے ہوئے بالا کوٹ کے دائیں بائیں بازو اور سامنے کا منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ اور ان نشیب و فراز کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ ان مجاہدین راہِ حق نے کن مشکل حالات اور کن معمولی وسائل کے ساتھ سکھوں کے بیس ہزار کے لشکر کا بے جگری سے مقابلہ کیا۔ اللہ اکبر!!

مسجد بالا کے ساتھ واصل خاں صاحب مرحوم کے پوتے اس وقت موجود ہیں۔ ان کا نام بھی واصل خاں ہے اور وہ حاجی ہیں۔ ان سے ملاقات ہوئی تو وہ نہایت خندہ پیشانی اور احترام سے پیش آئے۔ انہوں نے چائے وغیرہ کی پیش کش کی مگر ہمارے پاس وقت بہت کم تھا اس لئے ان سے معذرت کر کے ہم بالا کوٹ سے نیچے اتر آئے۔ اور ویگن لے کر لب دریا جامع مسجد اہل حدیث میں واپس پہنچ گئے اور نمازِ ظہر اور عصر ادا کی۔ بعد میں ''کوہ طور ہوٹل'' میں کھانا کھا کر اور مولانا محمد

صدیق صاحب کوالوداع کہہ کر تقریباً تین بجے شام شہداء کی اس سرزمین سے رخصت ہوئے۔

"شاہنامہ بالاکوٹ" کے مصنف کی حیثیت سے راقم الحروف نے اپنے تصورات کو اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ اس لئے دل میں سوز وساز اور جوش واضطراب کی نئی کیفیات پیدا ہوئیں جن کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جاسکتا۔ البتہ یہ اطمینان ضرور ہوا کہ جب معرکہ بالاکوٹ نظم کرنے کا وقت آئے گا تو مختلف مقامات کی جائے وقوع نظر کے سامنے ہوگی۔ اور واقعات کے بیان میں راست روی قائم ہو جائے گی۔ انشاء اللہ العزیز!

آٹھ دسمبر کو بالاکوٹ سے واپسی میں شام ہوگئی۔ ایبٹ آباد سے بارش بھی شروع ہوگئی تھی۔ اس لیے گاڑی کی رفتار بھی قدرے نرم رکھی گئی۔ ہم راولپنڈی پہنچے تو عشاء کی نماز پڑھی جا چکی تھی اور آٹھ بج رہے تھے۔ محترم مولانا حبیب الرحمٰن شاہ پہلے ہی منتظر تھے۔ کیونکہ جاتے وقت ان سے ملتے ہوئے گئے تھے اور ان سے وعدہ کر گئے تھے کہ رات آپ کے ہاں پنڈی میں گزاریں گے۔ چنانچہ شاہ صاحب موصوف ہمیں لے کر مولانا محمد اسماعیل ذبیح مرحوم والی جامع مسجد اہل حدیث میں پہنچے جہاں شاہ صاحب کی زیر نگرانی مدرسہ تدریس القرآن والحدیث جاری ہے۔ یہاں قیام وطعام کا نہایت عمدہ انتظام تھا۔ شاہ صاحب کافی رات گئے تک ہمارے ساتھ رہے۔ اور مولانا مبارکپوری کی صحبت میں علمی اور تنظیمی مسائل پر طویل گفتگو رہی۔ نمازِ فجر کے بعد مولانا مبارکپوری کا درس قرآن ہوا۔ جس میں نمازیوں کی خاصی بڑی تعداد موجود رہی۔ صبح ناشتے کے بعد اسلام آباد میں قائم کیا جانے والا دارالعلوم جامعہ سلفیہ دیکھنے کا پروگرام تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن شاہ صاحب بخاری، مولانا حافظ عبدالعزیز صاحب شیخ الحدیث، مولانا عبدالحمید صاحب ازہر، پروفیسر حافظ عبدالستار صاحب اور دیگر اساتذہ وطلباء مختلف سواریوں پر وہاں پہنچے۔ ادھر سے چوہدری محمد یعقوب صاحب امیر جمعیت راولپنڈی تشریف لے آئے۔ جامعہ سلفیہ کے قیام اور تعمیر میں چوہدری صاحب نے اپنی جماعت کی خدمات کا ذکر فرمایا۔ اور جامعہ کی عمارت کے مختلف نقشے بھی دکھائے۔ اس وقت تک جامعہ کا ایک بلاک تیار ہوا ہے جس کی تزئین وتکمیل کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کے بعد دوسرے بلاک اور دیگر مجوزہ تعمیرات کی تفصیل چوہدری صاحب موصوف کی زبانی معلوم ہوئی۔

جامعہ سفلیہ کا محل وقوع نہایت موزوں جگہ پر ہے جہاں تین اطراف سے سڑکیں گزرتی ہیں۔ اور اسلام آباد شہر، سکرٹریٹ، جامع فیصل اور دیگر مقامات وہاں سے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ جامعہ کا یہ پلاٹ مرکزی حکومت نے معمولی لیز پر (تقریباً مفت) دیا ہے، جس کا رقبہ تقریباً آٹھ ایکڑ ہے۔ جامعہ دیکھ چکنے کے بعد مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری مدظلہ نے کتاب مہماناں (Visitors Book) میں اپنے تاثرات قلم بند فرمائے اور پھر چوہدری محمد یعقوب صاحب، مولانا بخاری اور دیگر احباب سے الوداع ہو کر ہم اسلام آباد میں فیصل مسجد دیکھنے روانہ ہو گئے یہ مسجد عالم اسلام میں ایک عظیم مسجد کی حیثیت رکھتی ہے جس کا تمام انتظام جامعہ الاسلامیہ العالمیہ کے زیر تحویل ہے۔ مولانا مبارکپوری اس جامعہ کے ایک پروفیسر سہیل حسن صاحب (مولانا عبدالغفار حسن کے صاحبزادے) سے ملنا چاہتے تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی تو وہ ہمیں وائس چانسلر صاحب کے پاس لے گئے۔ وہ ایک عرب نژاد، متواضع قسم کی شخصیت کے مالک تھے۔ جنہوں نے نہایت تپاک سے ہمارا استقبال کیا اور چائے سے تواضع فرمائی۔ ان سے مل کر ہم جامع فیصل میں گئے۔ جہاں تعمیرات اور تزئین و آرائش کا کام مسلسل جاری ہے۔ اس مسجد کو دیکھ کر دل نہایت مسرور ہوا۔ اس کی تعمیر اگر چہ روایتی مغل فن تعمیر کی بجائے جدید ڈیزائن پر مبنی ہے۔ جس کا نقشہ ایک ترک ماہر تعمیرات نے بنایا ہے مگر اس کے باوجود یہ عمارت اپنا مخصوص جلال و جمال لئے ہوئے ہے جو ہر زائر کو متاثر کرتا ہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر مولانا ثاقبؔ نے شہر اسلام آباد کا رخ کیا اور آب پارہ میں مولانا محمد بشیر سیالکوٹی کے پاس چند منٹ رک کر ویگن کو شاہراہ لاہور پر ڈال دیا۔ فراٹے بھرتی ہوئی یہ سبک رو ویگن اسلام آباد سے روات، گجر خاں، دینہ، جہلم، سرائے عالم گیر اور کھاریاں سے گزر کر سر راہ ایک ہوٹل ''رائل ہوٹل'' پر آ کر رکی۔ شام کے ساڑھے تین بجے کا وقت تھا۔ ہوٹل میں کھانا کھایا اور پھر ویگن اپنے سفر پر چل نکلی۔ عشاء کے قریب گوجرانوالہ پہنچے۔ وہاں گھر جاکھ میں مولانا خالد گھر جاکھی سے ملاقات کی اور عشاء کی نماز وہیں ادا کی۔ پھر محلہ اسلام آباد میں ضیاء اللہ صاحب کھوکھر کے گھر گئے اور ان کی لائبریری پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ وہاں سے اہل حدیث چوک (چوک نیائیں) آئے اور مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم کی عظیم الشان مسجد اور مدرسہ دیکھا، اس کے بعد ہم پھر عازم

لاہور ہو گئے۔ مولانا عطاء اللہ ثاقب دام لطفہم نے مہمان محترم مولانا مبارکپوری کو دارالدعوۃ السّلفیہ لاہور (جہاں وہ رہائش پذیر تھے) میں پہنچادیا۔ اور پھر کمال محبت سے راقم الحروف اور حافظ صلاح الدین یوسف صاحب ہم دونوں کو اپنے اپنے گھروں میں چھوڑ کر اپنی رہائش گاہ کو تشریف لے گئے۔ جزاھم اللہ احسن الجزاء۔

اگلے دن 9 دسمبر کو دارالدعوۃ السّلفیہ لاہور کی طرف سے مولانا مبارکپوری کے اعزاز میں دارالدعوۃ کے سامنے ہائی اسکول میں استقبالیے کا انتظام تھا۔ دو اڑھائی سو احباب کو دعوت نامے جاری کئے گئے تھے۔ 4 بجے شام کو ایک شامیانے میں یہ پروقار تقریب منعقد ہوئی۔ لاہور شہر کے علاوہ باہر سے بھی احباب مدعو تھے جو خاصی تعداد میں تشریف لائے تھے۔ حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف حفظہ اللہ تعالیٰ اپنی علالت اور ضعف ونقاہت کے باوجود اس تقریب میں شریک ہوئے، جس سے یہ محفل اور زیادہ بابرکت ہو گئی۔

پروگرام کے مطابق تلاوت کلام مجید حافظ قاری محمد ادریس عاصمؔ صاحب نے فرمائی۔ جس کے بعد راقم الحروف نے ایک نظم میں مولانا صفی الرحمٰن مدظلہ کو ارمغانِ محبت پیش کیا۔ اس کے بعد ہمارے الاعتصام کے مدیر اعلیٰ حافظ صلاح الدین یوسف صاحب نے ایک تعارف نامہ پڑھا۔ جس میں مولانا مبارکپوری کی شخصیت، علم وفضل، تدریسی اور تصنیفی خدمات کو نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کیا۔ راقم کی نظم اور حافظ صاحب کا یہ مضمون اسی شمارے میں شامل اشاعت ہے۔ پھر مولانا مبارکپوری نے خطاب فرمایا۔ اپنے یہاں تشریف لانے کی غرض وغایت بیان کی اور ہندستان میں جمعیت اہل حدیث کی دینی اور علمی خدمات کا ذکر فرمایا۔

مولانا کی تقریر کے اجمال میں تفصیل کا خوب رنگ تھا۔ جس میں ہندستان میں سلفی مدارس کی کارکردگی، دیگر اسلامی ممالک فکر سے رواداری، ہندستان کی سیکولر حکومت کے زیر سایہ مسلمانوں کی اسلامی اقدار کے تحفظ کے عملی اقدامات وغیرہ کا عمدہ تجزیہ اور پاکستانی احباب کی مہمان نوازی کا شکریہ شامل تھا۔ آخر میں دارالدعوۃ السلفیۃ کے صدر مولانا فضل الرحمٰن صاحب ایم اے نے میزبانوں کی طرف سے مولانا کو سپاس محبت پیش کیا اور حضرت باباجی (مولانا محمد عطاء اللہ حنیف

حفظہ اللہ) کی دعا پر محفل اختتام پذیر ہوئی۔ پھر آخری لمحات میں مولانا عطاء اللہ ثاقب (رئیس انصار السنۃ المحمدیۃ) نے اپنے مکتبے کی نہایت خوبصورت اور وقیع کتب کا ایک سیٹ مولانا صفی الرحمٰن صاحب کی خدمت میں ہدیۃ پیش کیا۔ اتنے میں مغرب کی اذان ہوئی۔ دارالدعوۃ السلفیۃ کی مسجد میں نماز ادا کی گئی، جس کے بعد مہمانوں کو کھانا کھلایا گیا۔ تقریب کا اہتمام نہایت سلیقہ شعاری سے کیا گیا۔ جس کا اعتراف ہر شخص کی زبان پر تھا۔ فللہ الحمد والمنۃ۔

10 دسمبر 1985ء (بروز منگل) کو صبح مولانا صفی الرحمٰن مدظلہ عازمِ وطن ہوئے۔ مولانا محمد سلیمان انصاری اور حافظ احمد شاکر صاحب کی ان مشایعت میں واہگہ بارڈر تک گئے۔ اور معزز مہمان کو الوداع کہہ کر واپس آئے۔ مولانا کے رفیق مولانا محمد مستقیم صاحب ان کے ساتھ وطن واپس نہیں گئے بلکہ وہ یہاں تصانیف علمائے اہلحدیث کی فہرست تیار کرنے میں مصروف ہیں اور مزید کچھ دن پاکستان میں رہیں گے۔ مولانا مستقیم صاحب نہایت نحیف الجثہ ہیں مگر پختہ عزم کے مالک ہونے کے باعث نہایت تندہی سے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو تکمیل کار کی توفیق عطا فرمائے۔

پاکستان سے جانے کے بعد مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری کا مکتوب گرامی

مکرمی ومحترمی جناب حافظ احمد شاکر صاحب حفظہ اللہ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ بحمد اللہ پورا سفر خیریت سے گزار کر 11 دسمبر کو عشاء کے وقت اپنے مستقر پر آپہنچا۔ آپ حضرات نے اس خاکسار کی جس قدر عزت افزائی کی وہ لوحِ قلب پر انشاء اللہ ہمیشہ نقش رہے گی۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ جن کے ذریعہ شکریے کا حق ادا کرسکوں۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو اس محبت اور خلوص کی بہترین جزا دے۔

یہاں پہنچنے پر بزرگوں نے یاد دلایا کہ کچھ ضروریات رہ گئیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا داؤد غزنوی اور ان جیسے بزرگوں کی تقریروں کے ٹیپ سننے کے لوگ شائق ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا کی ضرورت بھی بڑی شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔ اگر مولوی مستقیم صاحب کی روانگی سے پہلے

میرا یہ خط پہنچ جائے تو اتنی زحمت مزید گوارہ فرمائیں گے کہ یہ چیزیں انہیں جامعہ کے لیے فراہم کر دیں گے، خواہ قیمتاً ہی کیوں نہ ملے۔

میری طرف سے جملہ بزرگوں اور احباب کو سلام عرض کریں۔ خصوصاً مولانا محترم مدظلہ کو، اللہ انہیں صحت بخشے اور تشنگانِ علم کے استفادے کا ذریعہ بنائے۔ مولانا محمد سلیمان انصاری کا بھی بے حد شکر گزار اور اپنی کم مائیگی اور موصوف کی عنایات پر شرمسار ہوں۔ موصوف کو خصوصاً میرا سلام اور شکریہ پہنچا دیں۔ جناب علیم ناصری صاحب کی مصاحبت، رفاقت اور سرپرستانہ محبت کے ایک ایک نقش میرے سامنے ہیں۔ اور ان کا سرمایہ خلوص منظوم یادگار سفر اور پھر حافظ صلاح الدین یوسف صاحب تو گویا ابتدا سے اپنے ہم سفر رہے ہوں۔ موصوف سے جو انس غائبانہ تھا ملاقات نے اسے دو چند بلکہ ''کئی چند'' کر دیا۔ ان سب بزرگوں اور رفیقوں سے بہت بہت سلام عرض ہے اور ان کی عنایات کا بے حد شکریہ بھی۔ شاید مولانا عطاء اللہ ثاقب سے ملاقات مشکل ہو۔ فون پر میرا سلام اور شکریہ پہنچا دیں۔ عزیزانِ گرامی قدر حماد، عباد، خلاد وغیرہم سلمہم اللہ کو بھی سلام و دعا۔ اللہ ان سب کو آپ کے لیے راحتِ جان اور قرۃ العین بنائے اور مولانا کا خلف صدق بنائے۔ دیگر حالات بحمد اللہ اچھے ہیں۔ کل سے تعلیم شروع ہو جائے گی۔ بچے سب خیریت سے ہیں۔

والسلام

صفی الرحمن مبارکپوری

13 دسمبر 1985ء یوم الجمعہ

الجامعہ السّلفیہ بنارس ہند

شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری پر سیمینار

(بحوالہ روزنامہ اردو نیوز، 11 دسمبر 2006ء جدہ، سعودی عرب)

مورخہ 3 دسمبر بروز اتوار بوقت 8 تا 9 بجے شب سعودی ٹی، وی چینل 2 پر عالم اسلام کی نامور شخصیت مفسر، محدث، مؤلف اور محقق مولانا صفی الرحمٰن صاحب کی وفات کے تعلق سے ایک سیمینار منعقد ہوا جس میں اندرون سعودی عرب سے جناب عبدالمالک مجاہد، رفیق لاکھانی، حافظ محمد طاہر، اور شیخ کے داماد جناب مولانا انعام الحق رحمانی نے شرکت کی جب کہ بیرون سعودی عرب امریکا سے معروف امریکی اسلامی اسکالر اور بہت سی کتب کے مترجم اور محقق ابوخلیل تونی، پاکستان سے مرکزی جمعیت اہل حدیث کے امیر سینیٹر پروفیسر ساجد میر اور ہندستان سے مولانا عبدالمعید عبدالجلیل صاحب نے شرکت کی۔ کنویز کے فرائض جناب ڈاکٹر عبداللہ الحسن نے انجام دیے۔

پروگرام ٹھیک آٹھ بجے شروع ہوا۔ اور سب سے پہلے جناب ڈاکٹر عبداللہ الحسن نے مشارکین کا تعارف کروایا۔ سعودی نشریاتی ادارے کی جانب سے سب کا شکریہ ادا کیا اور عالم اسلام کی اس معروف علمی شخصیت کی وفات پر تعزیت کا اظہار کیا۔ پھر انھوں نے فرمایا کہ آج اس وقت کا پروگرام ایک علمی مجلس کے لیے وقف تھا مگر مولانا کی وفات کی وجہ سے انہوں نے اس علمی مجلس کو مولانا کی حیات و خدمات کے موضوع سے بدل دیا ہے اور اس پروگرام کی تیاری کے لیے جن لوگوں نے آج دن بھر تگ و دو کی ہے ہم اس کے لیے ان سب کے شکر گزار ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری صاحب کی ذات گرامی نہ صرف برصغیر اور عالم عرب بلکہ دنیا کی تمام علمی شخصیتوں اور عامۃ الناس کے مابین ایک باوقار علمی شخصیت تھی۔ ان کی کتاب ''الرحیق المختوم'' تمام دنیا میں جانی اور پہچانی جاتی ہے۔ اور پڑھی جاتی ہے۔ اور عالم عرب میں سیرت کے موضوع پر وہ ایک مستند کتاب کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔

پھر انہوں نے حافظ محمد طاہر سے درخواست کی جو مولانا کے خصوصی شاگرد رہے اور جن کا تعلق

مولانا کے ساتھ 1973ء سے اب تک مسلسل رہا ہے کہ وہ مولانا کی ابتدائی زندگی، مقام پیدائش، تعلیمی سلسلہ اور علمی مشاغل کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

حافظ محمد طاہر نے بتایا کہ مولانا صفی الرحمن مبارکپوریؒ ہندستان کے صوبہ اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک صنعتی قصبہ مبارکپور کے محلّہ حسین آباد میں 1942ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے اپنے دادا محمد اکبر اور چچا مولانا عبدالصمد سے حاصل کی، پھر مدرسہ دارالتعلیم میں داخل ہوئے۔ وہاں پرائمری درجات کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں عربی درجات میں داخل ہوئے۔ وہاں دو سال تعلیم حاصل کی۔ اور وہاں سے مدرسہ فیض عام مئو ناتھ بھنجن میں جو جماعت اہل حدیث کا ایک قدیم اور بنیادی تعلیمی ادارہ ہے تشریف لے گئے۔ درس نظامی کی پوری تعلیم مکمل کی۔ 1961ء میں فراغت حاصل کرنے کے بعد وہیں مدرس کی حیثیت سے متعین کیے گئے۔ دو تین سال وہاں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ بعد ازاں دوسرے مدرسہ جامعہ اثریہ دارالحدیث میں منتقل ہو گئے، 1966ء تک وہیں رہے پھر مدرسہ فیض العلوم سیونی مدھیہ پردیش میں استاد اور پرنسپل کی حیثیت سے ان کی تقرری ہوئی۔ اور 1972ء تک وہاں رہے۔ 1972ء میں ان کے اہل وطن نے گزارش کی کہ وہ اپنے مادر علمی مدرسہ دارالتعلیم مبارکپور میں تشریف لائیں۔ چنانچہ وہ صدر مدرس اور پرنسپل کے عہدہ پر متعین کیے گئے۔ پھر 1974ء میں جامعہ سلفیہ بنارس سے جو جماعت اہل حدیث کی ایک مرکزی درسگاہ ہے دعوت ملی کہ اپنی خدمات جامعہ کو منتقل کر دیں۔ چنانچہ اکتوبر 1974ء میں وہ جامعہ سلفیہ میں منتقل ہو گئے اور 1988ء تک وہاں کے مختلف شعبہ ہائے تعلیم میں بطور استاد، ایڈیٹر اور محقق خدمات انجام دیں۔ اس دوران یعنی 1976ء میں انہوں نے بین الاقوامی مقابلہ سیرت نگاری میں جسے رابطہ عالم اسلامی نے منعقد کیا تھا حصہ لیا اور اپنا شہرہ آفاق عربی مقالہ ''الرحیق المختوم'' کے نام سے پیش کیا جو اس بین الاقوامی مقابلہ میں اول نمبر پر آیا۔ اور مولانا پچاس ہزار ریال کے پہلے انعام کے حقدار ٹھہرے۔

1988ء میں وہ مرکز السنة جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں منتقل ہو گئے اور 1997ء میں وہاں

سے سبکدوش ہونے کے بعد مکتبہ دارالسلام ریاض سے منسلک ہو گئے اور تادم زیست اس ادارہ کے ساتھ منسلک رہے۔

ان کلمات کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے ابوخلیل تونی نے مولانا کے بارے میں گفتگو کی۔ شیخ ابوخلیل نے بتلایا کہ تفسیر ابن کثیر کے اختصار اور ترتیب و تدوین میں مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری کا کلیدی کردار تھا جس کا انگریزی ترجمہ میں نے (ابوخلیل) نے کیا اور دیگر بہت سی دینی کتب کے پروجیکٹس کی تیاری کے دوران احادیث کے درجہ' رواۃِ حدیث کے احوال اور لغت عربی کے اشکالات کے سلسلہ میں مولانا ہمہ وقت رہنمائی فراہم کرتے رہے۔

پھر جناب عبدالمالک مجاہد نے اپنے کلمات پیش کیے۔ اور بتلایا کہ ادارہ دارالسلام کی بہت خوش نصیبی تھی کہ مولانا جب مرکز السنۃ النبویہ مدینہ منورہ سے فارغ ہوئے تو انہوں نے ہماری اس درخواست کو شرف قبولیت بخشا کہ وہ دارالسلام کی مجلس علمی کے رئیس کے طور پر ہم سے منسلک ہو جائیں۔ چنانچہ مولانا نے میری فرمائش پر میٹرک تک کے طلبا کے لیے ایک متوسط درجہ کی سیرت نبوی پر کتاب تصنیف کی اور اس کا نام ''روضة الأنوار في سيرة النبي المختار'' رکھا۔ کتاب شائع ہوئی تو سعودی عرب کے متعدد تعلیمی اداروں نے اسے زبردست پذیرائی بخشی اور بہت سے عربی اسکولوں نے اسے اپنے نصاب میں شامل کر لیا۔ بعدازاں مولانا نے کمال شفقت فرماتے ہوئے خود ہی اس کا اردو ترجمہ بھی کر دیا جسے دارالسلام نے ''تجلیات نبوت'' کے نام سے شائع کیا۔

مجاہد صاحب نے بتایا کہ مولانا کی کتاب ''الرحیق المختوم'' کو دنیا کی متعدد زبانوں میں ترجمہ کروا کے شائع کرنے کا اعزاز بھی دارالسلام کو حاصل ہے۔ مولانا نے دارالسلام کے ایک بہت اہم پراجیکٹ ''موسوعة الحديث النبوي الشريف'' یعنی کتب ستہ جن کو ایک جلد میں شائع کیا گیا ہے، پر بے حد شاندار کام کیا، اس عظیم الشان کتاب کا اشراف شیخ صالح بن عبدالعزیز آل الشیخ وزیر مذہبی امور سعودی عرب کے پاس تھا جب کہ مولانا نے اس کتاب کا مراجعہ اور تصحیح فرمائی۔

مجاہد صاحب نے کہا کہ مولانا بیک وقت ایک محدث' مفسر' محقق' محشی اور مناظر بھی تھے اور آپ

نے بہت سے مشکل مسائل پر لوگوں کو فتویٰ بھی دیا۔ ان کا علم بے حد پختہ اور حافظہ بہت تیز تھا۔

پھر پروفیسر ساجد میر نے اتصال خارجی کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور مولانا مرحوم کو ان کی دینی اور ملی خدمات پر بھرپور خراج عقیدت پیش کیا۔ ان کے بعد رفیق لاکھانی نے ''الرحیق المختوم'' کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اسے سیرت نبوی پر ایک مستند اور قابل اعتماد کتاب قرار دیا۔

اس کے بعد مولانا عبدالمعید سے ٹیلیفونک رابطہ ہوا مگر برقرار نہ رہ سکا۔ آخر میں جناب انعام الحق رحمانی نے عربی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کیا جس کا ترجمہ کنویز نے انگلش میں پیش کیا۔ 9 بجے پروگرام اپنے اختتام کو پہنچا(1)۔

(1) یہ انٹرویو مورخہ 3 دسمبر بروز اتوار بوقت 8 تا 9 بجے شب سعودی ٹی، وی چینل 2 پر شائع ہوا۔ اس کے بعد یہ مختلف میگزین اور اخبارات میں بھی شائع ہوا۔ جیسے پندرہ روزہ ترجمان دہلی، 16-31 دسمبر 2006ء اور سعودی عرب کے شہر جدہ سے شائع ہونے والے معروف اردو اخبار 'اردو نیوز' 11 دسمبر 2006ء میں۔

مولانا مرحوم کے رشحاتِ قلم سے

پچھلے صفحات میں جو کچھ مواد مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کے متعلق پیش کیا گیا ہے، اس سے قارئین کو بخوبی اندازہ ہو چکا ہوگا کہ مولانا مرحوم کی شخصیت کس قدر متنوع خوبیوں کی حامل تھی۔ دراصل مولانا مرحوم ایک انقلابی شخص تھے جنھوں نے اپنی زندگی کے سارے ایام، جب سے ہوش سنبھالا، دین اسلام کی خدمت میں گزار دیے۔ ان کی تحریر میں بھی وہی انقلاب تھا جو ان کے عزم وارادے میں پنہاں تھا۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مولانا مرحوم کی کتابوں کے بارے میں بھی خاطر خواہ مواد میری اس کتاب میں شامل کیا جائے مگر چونکہ کتاب کے بہت ضخیم ہونے کا خدشہ ہے اور مولانا کے عقیدتمندوں کی طرف سے ان کی سوانح پر مشتمل کتاب کا بڑی شدت سے تقاضا ہو رہا ہے اس لیے میں نے مولانا کی بعض تحریروں کو ہی یہاں شامل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ میری شامل کردہ تحریروں میں خاص طور سے مولانا کی اپنی سرگزشت اور داستانِ الرحیق المختوم کے علاوہ ان کی کتابوں کے وہ مقدمے ہیں جنہیں انھوں نے اپنی کتابوں کے آغاز میں لکھا تھا۔ نیز اس میں مولانا کی بعض وہ تحریریں بھی شامل ہیں جنھیں انھوں نے بطورِ تاثراتی کلمات، یا خطوط کی شکل میں قلمبند کیا تھا یا فتویٰ دیا تھا۔

مولانا مرحوم کی ان تحریروں میں ہر طبقہ کے لوگوں کے لیے عظیم پیغام ہے جس کی وجہ سے میں نے انھیں اپنی اس کتاب میں جگہ دی ہے۔ امید ہے قارئین اس اقدام کو پسند فرمائیں گے۔ لہٰذا اس سلسلے میں اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں اور مولانا مرحوم کی نوکِ زبان سے نکلی ہوئی تحریروں سے محظوظ ہوں:

اپنی سرگزشت

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والأولين والآخرين محمد خاتم النبيين وعلى آله وصحبه أجمعين، أما بعد:

چونکہ رابطہ عالم اسلامی نے سیرت نویسی کے مقابلے میں حصہ لینے والوں کو پابند کیا ہے کہ وہ اپنے حالاتِ زندگی بھی قلمبند کریں۔ اس لیے ذیل کی سطور میں اپنی سادہ زندگی کے چند خاکے پیش کر رہا ہوں:

سلسلۂ نسب:

صفی الرحمٰن بن عبداللہ بن محمد اکبر بن محمد علی بن عبدالمؤمن بن فقیر اللہ مبارکپوری اعظمی۔

پیدائش:

سند میں میری تاریخ پیدائش ۶ / جون ۱۹۴۳ء درج ہے۔ مگر یہ تخمینی اندراج ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ پیدائش ۱۹۴۲ء کے وسط کی ہے۔ مقامِ پیدائش موضع حسین آباد ہے جو مبارکپور کے شمال میں ایک میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ مبارکپور ضلع اعظم گڑھ کا ایک معروف علمی اور صنعتی قصبہ ہے۔

تعلیم و تعلم:

میں نے بچپن میں قرآن مجید کا کچھ حصہ اپنے دادا اور چچا سے پڑھا اور گاؤں ہی کے مدرسے میں تھوڑی سی تعلیم حاصل کی۔ پھر ۱۹۴۸ء میں مدرسہ عربیہ دار التعلیم مبارکپور میں داخل ہوا۔ وہاں چند برسوں میں پرائمری درجات کے علاوہ قدرے فارسی وغیرہ کی تعلیم حاصل کر کے عربی زبان وقواعد اور نحو وصرف وغیرہ کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے جون ۱۹۵۴ء میں مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں داخل ہوگیا۔ دو سال بعد مدرسہ فیض عام مئو جا پہنچا۔ اس مدرسہ کو اس علاقہ میں ایک

اہم دینی درسگاہ کی حیثیت حاصل ہے اور مئو ناتھ بھنجن، مبارکپور سے ۳۵ کیلومیٹر کے فاصلے پر بجانب مشرق واقع ہے۔

فیض عام میں میرا داخلہ مئی ۱۹۵۶ء میں ہوا۔ میں نے وہاں پانچ سال گزارے اور عربی زبان وقواعد اور شرعی علوم وفنون یعنی تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ جنوری ۱۹۶۱ء میں میری تعلیم مکمل ہوگئی اور مجھے باقاعدہ شہادۃ التخرج (یعنی سند تکمیل) دے دی گئی۔ یہ سند فضیلت فی الشریعہ اور فضیلت فی العلوم کی سند ہے اور تدریس وافتا کی اجازت پر مشتمل ہے۔

میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے تمام امتحانات میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل ہوتی رہی۔

دورانِ تعلیم میں نے الہٰ آباد بورڈ کے امتحانات میں بھی شرکت کی۔ فروری ۱۹۵۹ء میں مولوی اور فروری ۱۹۶۰ء میں عالم کے امتحانات دیے۔ اور دونوں میں فرسٹ ڈویژن سے کامیاب رہا۔ پھر ایک طویل عرصے کے بعد مدرسین سے متعلق جدید حالات کے پیش نظر میں نے فروری ۱۹۷۶ء میں فاضلِ ادب اور فروری ۱۹۷۸ء میں فاضلِ دینیات کا امتحان دیا اور بحمد للہ دونوں میں فرسٹ ڈویژن سے کامیاب ہوا۔

کارگاہِ علم وحیات میں:

۱۹۶۱ء میں مدرسہ فیض عام سے فارغ ہوکر میں نے ضلع الہٰ آباد پھر شہر ناگپور میں درس وتدریس اور تقریر وخطابت کا شغل اختیار کیا۔ دو سال بعد مارچ ۱۹۶۳ء میں مادرِ علمی مدرسہ فیض عام کے ناظمِ اعلیٰ نے مجھے تدریس کے کام پر مدعو کرلیا۔ لیکن میں نے وہاں بمشکل دو سال گزارے تھے کہ حالات نے علیحدگی پر مجبور کر دیا۔ اگلا سال جامعہ الرشاد اعظم گڑھ کی نذر رہا۔ اور فروری ۱۹۶۶ء سے مدرسہ دار الحدیث مئو کی دعوت پر وہاں مدرس ہوگیا۔ تین سال یہاں گزارے اور تدریس کے علاوہ بحیثیت نائب صدر مدرس تعلیمی امور اور داخلی انتظامات کی نگہداشت میں بھی شریک رہا۔

آخری ایام میں مدرسہ کی انتظامیہ کے درمیان اتنے سخت اختلافات برپا ہوئے کہ معلوم ہوتا تھا مدرسہ بند ہو جائے گا۔ ان اختلافات سے بددل ہوکر میں نے عین عید کے روز استعفیٰ دے دیا۔ اور

چند دن بعد مدرسہ دار الحدیث سے مستعفی ہو کر مدرسہ فیض العلوم سیونی کی خدمت پر جا مامور ہوا۔ جو مئوناتھ بھنجن سے کوئی سات سو کیلو میٹر دور مدھیہ پردیش میں واقع ہے۔

سیونی میں میری تقرری جنوری ۱۹۶۹ء میں ہوئی۔ میں نے وہاں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے کے علاوہ صدر مدرس کی حیثیت سے مدرسہ کے تمام داخلی و خارجی انتظامات کی ذمہ داری بھی سنبھالی اور جمعہ کا خطبہ دینا اور گرد و پیش کے دیہاتوں میں جا جا کر دعوت و تبلیغ کا کام کرنا بھی اپنے معمولات میں شامل کیا۔

میں نے سیونی میں چار سال درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ پھر ۱۹۷۲ء کے اخیر میں سالانہ تعطیل پر وطن واپس آیا تو مدرسہ دار التعلیم مبارکپور کے اراکین نے یہاں کے تعلیمی انتظامات سنبھالنے اور تدریس کے فرائض انجام دینے کے لیے حد درجہ اصرار کیا اور مجھے یہ پیشکش قبول کرنی پڑی۔ اب میں نے اپنی اولین مادر علمی کے اندر نئی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ دو سال بعد جامعہ سلفیہ کے ناظم اعلیٰ نے مدرسہ دار التعلیم کے سرپرست سے گفتگو کی کہ مجھے جامعہ سلفیہ منتقل کر دیں۔ جامعہ کی خیر خواہی اور دیرینہ روابط کے پیش نظر بات طے ہوگئی اور میں اکتوبر ۱۹۷۴ء میں جامعہ سلفیہ آ گیا۔ جب سے یہیں کام کر رہا ہوں۔

(شیخ صاحب نومبر ۱۹۸۸ء تک جامعہ سلفیہ بنارس میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد اگست ۱۹۸۸ء مطابق ۱۴۰۹ھ میں مرکز خدمۃ السنۃ مدینہ چلے آئے۔ دسمبر ۱۹۹۷ء کے خاتمے کے ساتھ مرکز السنۃ مدینہ سے آپ کا اگریمنٹ ختم ہو گیا تو اس کے دو ڈھائی ماہ بعد مکتبہ دار السلام ریاض آ گئے اور عمر کے آخری حصے تک اس سے جڑے رہے۔ از مرتب)

تالیفات:

تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں نے اس طویل عرصے میں درس و تدریس کے پہلو بہ پہلو تالیف و تصنیف کا بھی کچھ نہ کچھ شغل جاری رکھا۔ چنانچہ مختلف مضامین و مقالات کے علاوہ اب تک آٹھ عدد (بلکہ اب کوئی بیس عدد) کتابوں اور رسائل کی تالیف یا ترجمے کا کام بھی ہو چکا ہے، جو یہ ہیں:

(۱) شرح أزھار العرب (عربی) أزھار العرب۔ علامہ محمد سورتی کا جمع کردہ نفیس عربی اشعار پر مشتمل ایک منتخب اور ممتاز مجموعہ ہے۔ یہ شرح 1963ء میں لکھی گئی مگر قدرے ناقص رہی اور طبع نہیں کرائی جاسکی۔

(۲) المصابیح فی مسئلۃ التراویح للسیوطی۔ کا اردو ترجمہ 1963ء

(۳) ترجمہ الکلم الطیب لابن تیمیۃ 1966ء

(۳) ترجمہ کتاب الأربعین للنووی 1969ء مع مختصر تعلیق۔

(۵) صحفِ یہود و نصاریٰ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارتیں (اردو) 1970ء

(۶) تذکرۃ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب 1972ء۔ یہ اصلاً محکمہ شرعیہ قطر کے قاضی شیخ احمد بن حجر کی عربی تالیف کا ترجمہ ہے۔ لیکن اس میں کسی قدر ترمیم واضافہ کیا گیا ہے۔

(۷) تاریخ آل سعود (اردو) 1972ء۔ یہ کتاب تذکرۃ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کے پہلے ایڈیشن کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

(۸) اتحاف الکرام حاشیہ بلوغ المرام لابن حجر عسقلانی (عربی) 1974ء

(۹) قادیانیت اپنے آئینہ میں (اردو) 1976ء۔

(۱۰) فتنۂ قادیانیت اور مولانا ثناء اللہ امرتسری (اردو) 1976ء۔

(۱۱) 'الرحیق المختوم' عربی اور اسی نام سے اردو ترجمہ۔

(۱۲) انکارِ حدیث کیوں؟ (اردو) 1976ء

(۱۳) انکارِ حدیث حق یا باطل؟ (اردو) 1977ء

(۱۴) رزمِ حق و باطل (مناظرہ بجرڈیہہ) کی روداد 1978ء

(۱۵) إبراز الحق والصواب فی مسئلۃ السفور والحجاب (عربی) 1978ء

اس کتاب میں ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی رحمہ اللہ کی رائے پر علمی محاکمہ کیا گیا ہے۔

(۱۶) تطور الشعوب والدیانات فی الھند ومجال الدعوۃ الاسلامیۃ فیھا (عربی)

(۱۷) الفرقۃ الناجیۃ والفرق الاسلامیۃ الأخری (عربی 1982ء)

(۱۸) اسلام اور عدم تشدد 1984ء

(۱۹) بہجۃ النظر فی مصطلح اہل الأثر (عربی) مطبوع

(۲۰) اہل تصوف کی کارستانیاں (اردو 1986ء) مطبوع

(۲۱) الاحزاب السیاسیۃ فی الاسلام (عربی 1986ء) مطبوع

(۲۲) مختصر اظہار الحق (ترجمہ)

(۲۳) ائمہ اربعہ کا عقیدہ (ترجمہ)

(۲۴) مختصر سیرۃ الرسول (ترجمہ) از شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی

(۱۹ سے ۲۴ تک کا عدد میں نے اضافہ کیا ہے۔ مرتب)

علاوہ ازیں ماہنامہ محدث بنارس کی (اس کے پورے زمانۂ اشاعت میں یعنی ساڑھے چار برس تک) ایڈیٹری کے فرائض بھی انجام دیے[1]۔

واللہ الموفق وأزمة الأمور كلها بيده، ربنا تقبله منا بقبول حسن وأنبته نباتاً حسناً.

(1) دیکھیے: الرحیق المختوم کا اردو نسخہ، لاہور پاکستان

انعامی مقابلے کی کہانی، مولانا مرحوم کی زبانی

(الرحیق المختوم میں مولانا مرحوم کا لکھا ہوا: عرضِ مؤلف)

الحمد للہ والصلاۃ علی رسول اللہ وصحبہ ومن ولاہ. امابعد:

یہ ربیع الاول ۱۳۹۶ھ (مارچ 1976ء) کی بات ہے کہ کراچی میں عالم اسلام کی پہلی سیرت کانفرنس ہوئی۔ جس میں رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس کانفرنس کے اختتام پر ساری دنیا کے اہل قلم کو دعوت دی کہ وہ سیرت نبوی ﷺ کے موضوع پر دنیا کی کسی بھی زندہ زبان میں مقالے لکھیں۔ پہلی، دوسری تیسری، چوتھی اور پانچویں پوزیشن حاصل کرنے والوں کو علی الترتیب پچاس، چالیس، تیس، بیس اور دس ہزار ریال کے انعامات دیے جائیں گے۔ یہ اعلان رابطہ کے سرکاری ترجمان اخبار العالم الاسلامی کی کئی اشاعتوں میں شائع ہوا۔ لیکن مجھے اس تجویز اور اعلان کا بروقت علم نہ ہوسکا۔

کچھ دنوں بعد جب میں بنارس سے اپنے وطن مبارک پور گیا تو میرے پھوپھازاد بھائی اور محترم استاد مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری حفظہ اللہ (ابن شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی حفظہ اللہ) نے مجھ سے اس کا ذکر کیا اور زور دیا کہ میں بھی اس مقابلے میں حصہ لوں۔ میں نے اپنی علمی کم مائیگی اور ناتجربہ کاری کا عذر کیا۔ مگر مولانا مصر رہے اور بار بار معذرت پر فرمایا کہ میرا مقصود یہ نہیں ہے کہ انعام حاصل ہو بلکہ میں چاہتا ہوں کہ اسی بہانے ایک کام ہو جائے۔ میں نے ان کے اصرار مسلسل پر خاموشی تو اختیار کرلی۔ لیکن نیت یہی تھی کہ اس مقابلے میں حصہ نہیں لوں گا۔

چند دن بعد جمعیت اہل حدیث ہند کے آرگن اور نقیب پندرہ روزہ ترجمان دہلی میں رابطہ کی اس تجویز اور اعلان کا اردو ترجمہ شائع ہوا تو میرے لیے ایک عجیب صورت حال پیدا ہوگئی۔ جامعہ سلفیہ کے متوسط اور منتہی طلبہ میں سے عموماً جس کسی سے سامنا ہوتا وہ مجھے اس مقابلے میں شرکت کا مشورہ

دیتا۔ خیال ہوا کہ شاید خلق کی یہ زبان ''خدا کا نقارہ'' ہے۔ تاہم مقابلے میں حصہ نہ لینے کے اپنے قلبی فیصلے پر میں قریب قریب اٹل رہا۔ کچھ دنوں بعد طلبہ کے مشورے اور تقاضے بھی تقریباً ختم ہو گئے۔ مگر چند ایک طالب علم اپنے تقاضے پر قائم رہے۔ بعض نے مقالے کے تصنیفی خاکے کو موضوع گفتگو بنا رکھا تھا۔ اور بعض بعض کی ترغیب اصرار کی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ بالآخر میں خاصی ہچکچاہٹ کے ساتھ آمادہ ہو گیا۔ کام شروع ہو گیا لیکن تھوڑا تھوڑا کبھی کبھی اور آہستہ خرامی کے ساتھ۔ چنانچہ ابھی بالکل ابتدائی مرحلے ہی میں تھا کہ رمضان کی تعطیلِ کلاں کا وقت آ گیا۔ ادھر رابطہ نے آنے والے محرم الحرام کی پہلی تاریخ کو مقالات کی وصولی کی آخری تاریخ قرار دیا تھا۔ اس طرح مہلت کار کے کوئی ساڑھے پانچ ماہ گزر چکے تھے۔ اور اب زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین ماہ میں مقالہ مکمل کر کے حوالۂ ڈاک کر دینا ضروری تھا؛ تاکہ وقت پر پہنچ جائے۔ اور ادھر ابھی سارا کام باقی تھا۔

مجھے یقین نہیں تھا کہ اس مختصر عرصے میں ترتیب و تسوید، نظر ثانی اور نقل و صفائی کا کام ہو سکے گا۔ مگر اصرار کرنے والوں نے چلتے چلتے تاکید کی کہ کسی طرح کی غفلت یا تذبذب کے بغیر کام میں جُت جاؤں، رمضان بعد ''سہارا'' دیا جائے گا۔ میں نے بھی فرصت کے ایام غنیمت سمجھے۔ اشہبِ قلم کو مہمیز لگائی اور کدو کاوش کے بحرِ بیکراں میں کود پڑا۔ پوری تعطیل سُہانے خواب کے چند لمحوں کی طرح گزر گئی۔ اور جب یہ حضرات واپس پلٹے تو مقالے کا دو تہائی حصہ مرتب ہو چکا تھا۔ چونکہ نظر ثانی اور تبییض کا موقع نہ تھا اس لیے اصل مسودہ ہی ان حضرات کے حوالے کر دیا کہ نقل و صفائی اور تقابل کا کام کر ڈالیں۔ باقی ماندہ حصے کے کچھ دیگر لوازمات کی فراہمی و تیاری میں بھی ان سے کسی قدر تعاون لیا۔

جامعہ کی ڈیوٹی اور ہماہمی شروع ہو چکی تھی۔ اس لیے زمانہ تعطیل کی رفتار برقرار رکھنی ممکن نہ تھی۔ تاہم ڈیڑھ ماہ بعد جب عید الاضحی کی تعطیل کا وقت آیا تو ''شب بیداری'' کی ''برکت'' سے

مقالہ تیاری کے آخری مرحلے میں تھا۔ جسے سرگرمی کی ایک جست نے تمام وکمال کو پہنچا دیا۔ اور میں نے آغاز محرم سے بارہ، تیرہ دن پہلے یہ مقالہ حوالۂ ڈاک کر دیا۔

مہینوں بعد مجھے رابطہ کے دو رجسٹرڈ مکتوب ہفتہ عشرہ آگے پیچھے موصول ہوئے۔ خلاصہ یہ تھا کہ میرا مقالہ، رابطہ کے مقررہ شرائط کے مطابق ہے۔ اس لیے شریکِ مقابلہ کر لیا گیا ہے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد دن پر دن گزرتے گئے۔ حتیٰ کہ ڈیڑھ سال کا عرصہ بیت گیا۔ مگر رابطہ مُہر بلب۔ میں نے دوبارہ خط لکھ کر معلوم کرنا بھی چاہا کہ اس سلسلے میں کیا ہو رہا ہے تو مُہر سکوتِ نہ ٹوٹی۔ پھر میں خود بھی اپنے مشاغل اور مسائل میں اُلجھ کر یہ بات تقریباً فراموش کر گیا کہ میں نے کسی ''مقابلہ'' میں حصہ لیا ہے۔

اوائل شعبان ۱۳۹۸ھ (8/7/6 جولائی 1978ء کو) کراچی (پاکستان) میں پہلی ایشیائی اسلامی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ مجھے اس کی کارروائیوں سے دلچسپی تھی۔ اس لیے اس سے متعلق اخبار کے گوشوں میں دبی ہوئی خبریں بھی ڈھونڈ کر پڑھتا تھا۔ ایک روز بھدوہی اسٹیشن پر ٹرین کے انتظار میں، جو لیٹ تھی، اخبار دیکھنے بیٹھ گیا۔ اچانک ایک چھوٹی سی خبر پر نظر پڑی کہ اس کانفرنس کے کسی اجلاس کے اندر رابطہ نے سیرت نگاری کے مقابلے میں کامیاب ہونے والے پانچ ناموں کا اعلان کر دیا ہے اور ان میں ایک مقالہ نگار ہندستانی بھی ہے۔ یہ خبر پڑھ کر اندر ہی اندر طلب وجستجو کا ایک ہنگامۂ محشر بپا ہو گیا۔ بنارس واپس آ کر تفصیل معلوم کرنے کی کوشش کی مگر لاحاصل۔

10 جولائی 1978ء کو چاشت کے وقت پوری رات مناظرہ بجرڈیہہ کے شرائط طے کرنے کے بعد بے خبر سو رہا تھا کہ اچانک حجرے سے متصل سیڑھیوں پر طلبہ کا شور و ہنگامہ سُنائی پڑا اور آنکھ کھل گئی۔ اتنے میں طلبہ کا ریلا حجرے کے اندر تھا۔ ان کے چہروں پر بے پناہ مسرت کے آثار اور زبانوں پر مبارکبادی کے کلمات تھے۔

''کیا ہوا؟ کیا مخالف مناظر نے مناظرہ کرنے سے انکار کر دیا؟''۔

میں نے لیٹے ہی لیٹے سوال کیا۔

''نہیں؛ بلکہ آپ سیرت نگاری کے مقابلے میں اول آگئے ہیں''۔

''اللہ! تیرا شکر ہے۔'' ''آپ حضرات کو اس کا علم کیسے ہوا؟'' میں اُٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔

''مولوی عُزیر شمس یہ خبر لائے ہیں''۔

''مولوی عزیر یہاں آچکے ہیں''۔

''جی ہاں''۔

اور چند لمحوں بعد مولوی عزیر مجھے تفصیلات سُنا رہے تھے۔

پھر ۲۲ شعبان ۱۳۹۸ھ (29 جولائی 1978ء) کو رابطہ کا رجسٹرڈ مکتوب وارد ہوا جس میں کامیابی کی اطلاع کے ساتھ یہ مُژدہ بھی رقم تھا کہ ماہ محرم ۱۳۹۹ھ میں مکہ مکرمہ کے اندر رابطہ کے مستقر پر تقسیم انعامات کے لیے ایک تقریب منعقد کی جائے گی اور اس میں مجھے شرکت کرنی ہے۔ یہ تقریب محرم کی بجائے ۱۲ ربیع الآخر ۱۳۹۹ھ کو منعقد ہوئی۔

اس تقریب کی بدولت مجھے پہلی بار حرمین شریفین کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی۔ ۱۰ ربیع الآخر یوم جمعرات کو عصر سے کچھ پہلے مکہ مکرمہ کی پُر نور فضاؤں میں داخل ہوا۔ تیسرے دن ساڑھے آٹھ بجے رابطہ کے مستقر پر حاضری کا حکم تھا۔ یہاں ضروری کارروائیوں کے بعد تقریباً دس بجے تلاوت قرآن پاک سے تقریب کا آغاز ہوا۔ سعودی عدلیہ کے چیف جسٹس شیخ عبداللہ بن حمید رحمہ اللہ صدر مجلس تھے۔ مکہ کے نائب گورنر امیر سعود بن عبدالمحسن، جو مرحوم ملک عبدالعزیز کے پوتے ہیں، تقسیم انعامات کے لیے تشریف فرما تھے۔ انہوں نے مختصر سی تقریر کی۔ ان کے بعد رابطہ کے نائب سیکرٹری جنرل شیخ علی المختار نے خطاب فرمایا۔ انہوں نے قدرے تفصیل سے بتایا کہ یہ انعامی مقابلہ کیوں منعقد کرایا گیا اور فیصلے کے لیے کیا طریق کار اپنایا گیا۔ انہوں نے وضاحت فرمائی کہ رابطہ کو اعلان مقابلہ کے بعد ایک ہزار سے زائد (یعنی 1182) مقالات موصول ہوئے جن کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد ابتدائی کمیٹی نے ایک سو تراسی (183) مقالات کو مقابلے

کے لیے منتخب کیا۔ اور آخری فیصلے کے لیے انہیں وزیر تعلیم شیخ حسن بن عبداللہ آل الشیخ کی سرکردگی میں قائم ماہرین کی ایک آٹھ رکنی کمیٹی کے حوالے کر دیا۔ کمیٹی کے یہ آٹھوں ارکان ملک عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ کی شاخ کلیۃ الشریعہ (اور اب جامعہ ام القریٰ) مکہ مکرمہ کے استاد اور سیرت نبوی ﷺ اور تاریخ اسلام کے ماہر اور متخصص ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

ڈاکٹر ابراہیم علی شعوط	ڈاکٹر احمد سید دراج
ڈاکٹر عبدالرحمٰن فہمی محمد	ڈاکٹر فائق بکر صواف
ڈاکٹر محمد سعید صدیقی	ڈاکٹر شاکر محمود عبدالمنعم
ڈاکٹر فکری احمد عکاز	ڈاکٹر عبدالفتاح منصور

ان اساتذہ نے مسلسل چھان بین کے بعد متفقہ طور پر پانچ مقالات کو ذیل کی ترتیب کے ساتھ انعام کا مستحق قرار دیا۔

۱۔ الرحیق المختوم (عربی) تالیف صفی الرحمٰن مبارکپوری جامعہ سلفیہ، بنارس، ہند (اوّل)

۲۔ خاتم النبیین ﷺ (انگریزی) تالیف ڈاکٹر ماجد علی خاں جامعہ سلفیہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، ہند (دوم)

۳۔ پیغمبر اعظم و آخر (اردو) تالیف ڈاکٹر نصیر احمد ناصر وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ، بہاولپور، پاکستان (سوم)

۴۔ منتقی النقول فی سیرۃ اعظم رسول (عربی) تالیف شیخ حامد محمود بن محمد منصور لیمود، جیزہ مصر (چہارم)

۵۔ سیرۃ نبی الہدیٰ والرحمۃ (عربی) استاد عبدالسلام ہاشم حافظ، مدینہ منورہ، مملکت سعودیہ عربیہ (پنجم)

نائب سکریٹری جنرل محترم شیخ علی المختار نے ان توضیحات کے بعد حوصلہ افزائی، مبارکباد، اور دعائیہ کلمات پر اپنی تقریر ختم کر دی۔ اس کے بعد مجھے اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی۔ میں نے اپنی

مختصر سی تقریر میں رابطہ کو ہندستان کے اندر دعوت و تبلیغ کے بعض ضروری اور متروک گوشوں کی طرف توجہ دلائی اور اس کے متوقع اثرات و نتائج پر روشنی ڈالی۔ رابطہ کی طرف سے اس کا حوصلہ افزا جواب دیا گیا۔

اس کے بعد امیر محترم سعود بن عبدالمحسن نے ترتیب وار انعامات تقسیم فرمائے اور تلاوتِ قرآن مجید پر تقریب کا اختتام ہو گیا۔

۷ار ربیع الآخر یوم جمعرات کو ہمارے قافلے کا رخ مدینہ منورہ کی طرف تھا۔ راستے میں بدر کی تاریخی رزمگاہ کا مختصراً مشاہدہ کر کے آگے بڑھے تو عصر سے کچھ پہلے حرم نبویؐ کے درو بام کا جلال و جمال نگاہوں کے سامنے تھے۔ چند دن بعد ایک صبح خیبر بھی گئے اور وہاں کا تاریخی قلعہ اندر و باہر سے دیکھا پھر کچھ تفریح کر کے سرِ شام مدینہ منورہ کو واپس ہوئے اور پیغمبر آخر الزماں ﷺ کی اس جلوہ گاہ، جبریل امین کے اس مَہبَط، قدوسیوں کی اس فرودگاہ اور اسلام کے اس مرکزِ انقلاب میں دو ہفتے گزار کر طائرِ شوق نے پھر حرمِ کعبہ کی راہ لی۔ یہاں طواف و سعی کے ہنگامے میں مزید ایک ہفتہ گزارنے کا شرف حاصل ہوا۔

عزیزوں، دوستوں، بزرگوں اور علماء و مشائخ نے؛ کیا مکہ کیا مدینہ، ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یوں میرے خوابوں اور آرزوؤں کی سرزمین حجاز مقدس کے اندر ایک ماہ کا عرصہ چشم زدن میں گزر گیا۔ اور میں پھر صنم کدۂ ہند میں واپس آ گیا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شُد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شُد

حجاز سے واپس ہوا تو ہندستان و پاکستان کے اردو خواں طبقے کی طرف سے کتاب کو اردو جامہ پہنانے کا تقاضا شروع ہو گیا۔ جو کئی برس گزر جانے کے باوجود برابر قائم رہا۔ ادھر نئی نئی مصروفیات اس قدر دامنگیر ہوتی گئیں کہ ترجمہ کے لیے فرصت کے لمحات میسر ہوتے نظر نہ آئے۔ بالآخر مشاغل کے اسی ہجوم میں اردو ترجمہ شروع کر دیا گیا اور اللہ کا بے پایاں شکر ہے کہ چند ماہ کی جزوی کوشش سے پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ **وللہ الامر من قبل ومن بعد**

اخیر میں ان تمام بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے اس کام میں کسی بھی طرح مجھ سے تعاون کیا۔ خصوصاً استادِ محترم مولانا عبدالرحمٰن صاحب رحمانی، اور عزیزانِ گرامی شیخ عزیر صاحب اور حافظ محمد الیاس صاحب فاضلانِ مدینہ یونیورسٹی کا کہ ان کے مشورے اور ہمت افزائی نے مجھے وقتِ مقررہ پر اس مقالے کی تیاری میں بڑی مدد پہنچائی۔ اللہ ان سب کو جزائے خیر دے۔ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ کتاب کو شرفِ قبول بخشے اور مؤلف و معاونین اور مستفیدین کے لیے فلاح و نجاح کا ذریعہ بنائے [1]۔ آمین۔

صفی الرحمٰن مبارکپوری

۱۸ رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ

(1) دیکھیے: الرحیق المختوم کا اردو نسخہ، لاہور پاکستان

الرحیق المختوم کا تعارف، مولانا مرحوم کی زبان میں

(الرحیق المختوم پر 'زیرِ نظر کتاب کے بارے میں' کے عنوان سے لکھی ہوئی تحریر)

الحمد لله الذي أرسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله فجعله شاهدًا ومبشرًا ونذيرًا، وداعيًا إلى الله بإذنه وسراجًا منيرًا، وجعل فيه أسوة حسنة لمن كان يرجو الله واليوم الآخر وذكر الله كثيرًا، اللهم صل وسلم وبارك عليه وعلى آله وصحبه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين وفجر لهم ينابيع الرحمة والرضوان تفجيرًا، أما بعد:

یہ بڑی مسرت اور شادمانی کی بات ہے کہ ربیع الاول ۱۳۹۶ء میں پاکستان کے اندر منعقدہ سیرت کانفرنس کے اختتام پر رابطہ عالم اسلامی نے سیرت کے موضوع پر مقالہ نویسی کا ایک عالمی مقابلہ منعقد کرنے کا اعلان کیا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ اہلِ قلم میں ایک طرح کی امنگ اور ان کی فکری کاوشوں میں ایک طرح کی ہم آہنگی پیدا ہو۔ میرے خیال میں یہ بڑا مبارک قدم ہے۔ کیونکہ اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت سیرتِ نبوی اور اسوۂ محمدی ہی وہ واحد منبع ہے جس سے عالم اسلام کی زندگی اور انسانی معاشرے کی سعادت کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ آپ ﷺ کی ذات بابرکات پر بے شمار درود وسلام ہو۔

پھر یہ میری سعادت وخوش بختی ہوگی کہ میں بھی اس مبارک مقابلے میں شرکت کروں۔ لیکن میری بساط ہی کیا ہے کہ میں سید الاولین والآخرین ﷺ کی حیات مبارکہ پر روشنی ڈال سکوں۔ میں تو اپنی ساری خوش بختی وکامرانی اسی میں سمجھتا ہوں کہ مجھے آپ ﷺ کے انوار کا کچھ حصہ نصیب ہو جائے؛ تاکہ میں تاریکیوں میں بھٹک کر ہلاک ہونے کے بجائے آپ ﷺ کے ایک امتی کی حیثیت سے آپ کی روشن شاہراہ پر چلتا ہوا زندگی گزاروں اور اسی راہ میں میری موت بھی آئے اور

پھر آپ ﷺ کی شفاعت کی برکت سے اللہ تعالیٰ میرے گناہوں پر قلمِ عفو پھیر دے۔

ایک چھوٹی سی بات اپنی اس کتاب کے اندازِ تحریر کے متعلق بھی عرض کرنے کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میں نے کتاب لکھنے سے پہلے ہی یہ بات طے کر لی تھی کہ اسے بارِ خاطر بن جانے والے طول اور ادائیگیِ مقصود سے قاصر رہ جانے والے اختصار دونوں سے بچتے ہوئے متوسط درجے کی ضخامت میں مرتب کروں گا۔ لیکن جب کتبِ سیرت پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ واقعات کی ترتیب اور جزئیات کی تفصیل میں بڑا اختلاف ہے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ جہاں جہاں ایسی صورت پیش آئے وہاں بحث کے ہر پہلو پر نظر دوڑا کر اور بھرپور تحقیق کر کے جو نتیجہ اخذ کروں اسے اصل کتاب میں درج کر دوں اور دلائل و شواہد کی تفصیلات اور ترجیح کے اسباب کا ذکر نہ کروں؛ ورنہ کتاب غیر مطلوب حد تک طویل ہو جائے گی۔ البتہ جہاں یہ اندیشہ ہو کہ میری تحقیق قارئین کے لیے حیرت و استعجاب کا باعث بنے گی، یا جن واقعات کے سلسلے میں عام اہلِ قلم نے کوئی ایسی تصویر پیش کی ہو جو میرے نقطۂ نظر سے صحیح نہ ہو وہاں دلائل کی طرف بھی اشارہ کر دوں۔

یا اللہ! میرے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی مقدر فرما۔ تو یقیناً عفوو وَدود ہے۔ عرش کا مالک ہے اور بزرگ و برتر ہے[1]۔

صفی الرحمٰن مبارکپوری

جامعہ سلفیہ بنارس، ہند

جمعۃ المبارک ۲۴/ رجب ۱۳۹۶ھ، مطابق ۲۳/ جولائی ۱۹۷۶ء

(1) دیکھیے: الرحیق المختوم کا اردو نسخہ، لاہور پاکستان

انکارِ حدیث ...... حق یا باطل؟

[ایک منکرِ حدیث کے شبہات کے جوابات]

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری

کیا قرآن میں سب کچھ ہے اور حدیث کی ضرورت نہیں؟:

انکارِ حدیث کے لئے سب سے اہم اور بنیادی نکتہ یہ تلاش کیا گیا ہے کہ قرآنِ مجید میں ہر مسئلہ کی تفصیل بیان کردی گئی ہے، اس لئے حدیث کی ضرورت نہیں۔ اس کے ثبوت میں قرآن مجید کے متعلق تبیانا لکل شيء اور تفصیلا لکل شيء والی آیات پیش کی جاتی ہیں۔ جن کا مطلب توڑ مروڑ کر اور غلط سلط بیان کر کے یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ قرآن میں ہر مسئلہ کی تفصیل موجود ہے۔

① منکرین حدیث اب ہمارا سوال سنیں؛ قرآن میں مردہ، خون، سؤر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور حرام قرار دیا گیا ہے اور **بهيمة الأنعام** حلال کیا گیا ہے۔ **بهيمة الأنعام** کی تفسیر قرآن میں ان جانوروں سے کی گئی ہے: اونٹنی، اونٹ، گائے، بیل، بکری، بکرا، بھیڑ اور مینڈھا۔ لغت میں بھی **بهيمة الأنعام** کی فہرست میں یہی جانور بتائے گئے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان کے علاوہ دنیا کے بقیہ جانور حلال ہیں یا حرام؟ مثلاً کتا، بلی، گیدڑ، بھیڑیا، چیتا، شیر، تیندوا، بندر، ریچھ، ہرن، چیتل، سانبھر، بارہ سنگھا، بھینسا، خرگوش، کوا، چیل، باز، شکرہ، کبوتر، مینا، فاختہ وغیرہ وغیرہ؛ یہ سارے جانور حلال ہیں یا حرام؟ یا ان میں سے کچھ حلال ہیں اور کچھ حرام؟ آپ جو جواب بھی دیں، اس کا ثبوت قرآن سے پیش کریں۔ آپ کی عقلی تک بندیاں نہیں مانی جائیں گی، یعنی آپ چونکہ دعویدار ہیں کہ ہر مسئلہ قرآن میں موجود ہے اس لئے ان جانوروں میں سے جس کو حلال مانیں، اس کے حلال ہونے کا ثبوت قرآن سے دیں اور جس کو حرام

مانیں، اس کے حرام ہونے کا ثبوت قرآن سے دیں اور اگر آپ قرآن سے نہ دے سکیں (اور یقیناً نہیں دے سکیں گے) تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن میں ہر مسئلہ بیان نہیں کیا گیا ہے اور حدیث کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ان جانوروں کے حلال وحرام ہونے کا قاعدہ حدیث میں بیان کر دیا گیا ہے جس سے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سا جانور حلال ہے اور کون سا حرام......!

② دوسرا سوال یہ ہے کہ قرآن میں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نماز کی حالت میں کھڑے ہونے، رکوع کرنے اور سجدہ کرنے کا ذکر بھی قرآن میں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ نماز میں پہلے کھڑے ہوں یا پہلے رکوع کریں یا پہلے سجدہ کریں؟ پھر کھڑے ہوں تو ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں یا لٹکا کر؟ ایک پاؤں پر کھڑے ہوں یا دونوں پر؟

لغت میں 'رکوع' کا معنی ہے جھکنا، سوال یہ ہے کہ آگے جھکیں، یا دائیں جھکیں یا بائیں جھکیں؟ پھر جھکنے کی مقدار کیا ہو؟ ذرا سا سر نیچا کریں یا کمر کے برابر نیچا کریں یا اس سے بھی زیادہ نیچا کریں؟ پھر رکوع کی حالت میں ہاتھ کہاں ہوں؟ گھٹنوں پر ٹیکیں؟ یا دونوں رانوں کے بیچ میں رکھ کر بازوؤں کو ران پر ٹیکیں؟ یا ڈنڈے کی طرح لٹکنے دیں؟

اسی طرح سجدہ کیسے کریں؟ یعنی زمین پر سر کا کون سا حصہ ٹیکیں، پیشانی کا ٹھیک پچھلا حصہ یا دایاں کنارہ یا بایاں کنارہ؟ سجدہ کی حالت میں ہاتھ کہاں رکھیں؟ رانوں میں گھسا لیں؟ یا زمین پر ٹیکیں؟ اور اگر زمین پر ٹیکیں تو صرف ہتھیلی زمین پر ٹیکیں یا پوری کہنی زمین پر ٹیکیں؟ سجدہ ایک کریں یا دو کریں؟ ان سوالات کا آپ جو بھی جواب دیں، اس کا ثبوت قرآن سے دیں۔ ان مسائل کے بارے میں آپ کی عقلی تک بندیاں نہیں مانی جائیں گی اور اگر قرآن سے ان سوالات کا جواب نہ دے سکیں (اور یقیناً نہیں دے سکتے) تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حدیث کے بغیر قرآن کے حکم پر بھی عمل نہیں ہو سکتا۔

③ تیسرا سوال یہ ہے کہ قرآن میں زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نہ دینے والوں کو سخت عذاب کی دھمکی بھی دی گئی ہے۔ جس جس قسم کے لوگوں پر زکوٰۃ خرچ کرنی ہے، انہیں بھی بتا دیا گیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ زکوٰۃ کب کب وصول کی جائے؟ یعنی زکوٰۃ روز روز دی جائے؟ یا

سال بھر میں ایک مرتبہ دی جائے؟ یا پانچ سال یا دس سال یا بیس سال میں ایک مرتبہ دی جائے؟ یا عمر بھر میں ایک مرتبہ دی جائے؟ پھر یہ زکوٰۃ کس حساب سے دی جائے اور کتنی کتنی دی جائے؟ یعنی غلہ کتنا ہو تو اس میں زکوٰۃ دی جائے؟ اور کتنے غلہ پر کتنی زکوٰۃ دی جائے؟ سونا چاندی کتنی ہو تو زکوٰۃ دی جائے؟ اور کس حساب سے دی جائے؟

یہ سارے مسئلے قرآن سے ثابت کیجئے۔ اگر آپ قرآن میں یہ مسائل نہ دکھلا سکیں (اور ہرگز نہیں دکھلا سکتے) تو ثابت ہوگا کہ حدیث کو مانے بغیر قرآن کے حکم پر بھی عمل ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ان سارے مسائل کا بیان حدیث ہی میں آیا ہے۔

④ چوتھا سوال: قرآن میں حکم ہے کہ مسلمان جنگ میں کفار کا جو مالِ غنیمت حاصل کریں، اس کے پانچ حصے کر کے ایک حصہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام پر الگ نکال دیا جائے جو یتیموں، مسکینوں اور حاجت مندوں وغیرہ میں بانٹ دیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ باقی چار حصے کیا کیے جائیں؟ تمام مجاہدین پر برابر برابر بانٹ دیے جائیں یا فرق کیا جائے؟ کیونکہ بعض لوگ اپنا ہتھیار، گھوڑا، تیر، کمان، نیزہ، بھالا، زرہ، خود، سواری کا جانور اور کھانے کا سامان خود لے کر جاتے تھے اور بعض کو اسلامی حکومت کی طرف سے یہ سامان فراہم کیا جاتا تھا۔

اسی طرح بعض لوگ بڑی بہادری اور بے جگری سے لڑتے تھے، بعض دبکے رہتے تھے، کچھ اگلی صف میں رہتے تھے، جن پر براہِ راست دشمن کا وار ہوتا تھا۔ کچھ پیچھے رہتے تھے جو خطرہ سے دور رہتے تھے۔ اب اگر ان سب کو برابر دیں تو کیوں دیں؟ اور اس کا ثبوت قرآن میں کہاں ہے؟ اور اگر فرق کریں تو کس حساب سے فرق کریں؟ قرآن سے اس کا حساب بتائیے۔ اور اگر کمانڈر کی رائے پر چھوڑ دیں تو قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ کمانڈر کی رائے پر چھوڑ دیں؟ اس کی دلیل دیجئے۔ اگر قرآن میں ان مسئلوں کا کوئی حل نہیں ہے تو کیسے کہا جاتا ہے کہ قرآن میں سارے مسئلے بیان کر دیے گئے ہیں......!!

⑤ پانچواں سوال: قرآن میں حکم ہے کہ چوری کرنے والے مرد اور عورت کے ہاتھوں کو کاٹ دو۔ اب سوال یہ ہے کہ دونوں ہاتھ کاٹیں یا ایک ہاتھ؟ اور اگر ایک ہاتھ کاٹیں تو داہنا کاٹیں

یا بایاں؟ پھر اسے کاٹیں تو کہاں سے کاٹیں؟ بغل سے یا کہنی سے یا کلائی سے؟ یا ان کے بیچ میں کسی جگہ سے؟ آپ جو جواب بھی دیں، اس کا ثبوت قرآن سے دیں اور اگر قرآن سے اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتے تو کیسے کہتے ہیں کہ قرآن میں ہر مسئلہ بیان کر دیا گیا ہے۔

⑥ چھٹا سوال: قرآن میں یہ ارشاد ہے کہ جب جمعہ کی نماز کے لئے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ سوال یہ ہے کہ جمعہ کے دن کب پکارا جائے؟ کس نماز کے لئے پکارا جائے؟ کن الفاظ کے ساتھ پکارا جائے؟ جس نماز کے لئے پکارا جائے، وہ نماز کیسے پڑھی جائے؟ ان ساری باتوں کا ثبوت قرآن سے دیجئے۔ ورنہ تسلیم کیجئے کہ قرآن میں ہر مسئلہ بیان نہیں کیا گیا ہے۔

صاف بات یہ ہے کہ قرآن میں رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور جو باتیں ہم نے پوچھی ہیں، ان باتوں میں اور اسی طرح زندگی کے بہت سارے مسئلے میں تنہا قرآن سے کسی طرح بھی معلوم نہیں ہوسکتا کہ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ کیا تھا۔ یہ طریقہ صرف حدیث سے معلوم ہوسکتا ہے۔ اس لئے جب تک حدیث کو نہ مانیں، خود قرآن پر بھی عمل نہیں کر سکتے۔ فی الحال یہی سوال پیش کر کے ہم آگے بڑھتے ہیں۔

انکارِ حدیث کے اُصولی دلائل:

اس ایک اصولی دلیل کا حال جان لینے کے بعد آیئے اب مدھو پوری محقق صاحب کی زبانی چند اور اُصولی دلیلیں سنئے۔ اس کے بعد ہمارا جواب ملاحظہ فرمایئے۔ موصوف نے خود ہی سوال قائم کیا ہے اور خود ہی جواب بھی دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"سوال: دین میں مصطلح 'حدیث' کا کیا مقام ہے؟

جواب: کچھ نہیں، کیونکہ......

(۱) دین حق ہے اور اس کی بنا علم و یقین پر ہے۔ جس کی شہادت خود اللہ اور اس کے سچے فرشتے دیتے ہیں:

﴿لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهٖ وَالْمَلَائِكَةُ يَشْهَدُوْنَ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا﴾ (النساء:۱۶۶)

(ب) دین عملاً محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہ کے ذریعہ بطریق احسن مکمل ہو چکا:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدۃ:۳)

(ج) دین لوحِ قرآن پر لفظاً لفظاً اور حرفاً حرفاً بدرجہ اکمل محفوظ ہو گیا ہے:

﴿بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾ (البروج:۲۱،۲۲)

برعکس اس کے ہماری حدیثیں سب کی سب یکسر ظنی، غیر یقینی اور روایت بالمعنی ہیں۔ دین سے اس کا کیا تعلق؟: ﴿وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا﴾ (النجم:۲۸) یعنی حق کے مقابلے میں 'ظن' کا کوئی مقام نہیں ہے: ﴿اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى﴾ (النجم:۲۳) یعنی ''یہ لوگ محض 'ظن' کے پیچھے دوڑتے ہیں، دراصل وہ اپنی من مانی کرتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے ان کو ہدایت پہنچ چکی ہے''۔ اور ایک مقام پر تو خاص کر مومنوں کو خطاب کر کے زیادہ ظن و گمان سے کوسوں دور رہنے کا حکم صادر کر دیا گیا ہے۔ بلکہ یہاں تک متنبہ کر دیا گیا ہے کہ بعض قیاس آرائیاں 'صریح' گناہ کے درجہ تک پہنچ جاتی ہیں۔ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ (الحجرات:۱۲)

وفاتِ نبویؐ کے سینکڑوں سال بعد بعض ایرانیوں نے ادھر ادھر کی محض سنی سنائی اٹکل پچو باتوں (جنہیں اقوالِ رسولؐ واصحابِ رسول سے منسوب کیا جاتا تھا) کا ذخیرہ جمع کر کے انہیں متفرق ومتضاد روایتوں کو 'صحیح حدیث' کا نام دے دیا اور بعد والوں نے بعض دینی اور سیاسی مصالح کی بنا پر اس کو (بزعم خویش) جزوِ دین سمجھ لیا، اور اس طرح تفقہ فی الدین اور تدبر فی القرآن کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لیا۔ اس سے قبل یہی روایتیں جب تک زید، عمرو وبکر کی زبانوں پر بے روک ٹوک گشت کرتی رہیں، ان کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی، لیکن

قیدِ کتابت میں آنے اوران پر 'صحیح' کا لیبل چپکانے کے بعد انہیں 'فلاں نے فلاں سے کہا' اور 'فلاں نے فلاں سے سنا'......

روایتوں کو بدقسمتی سے دین کی اصل واساس سمجھ لیا گیا، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ مجموعہ ہائے روایات زیادہ سے زیادہ ایک طرح کے نیم تاریخی مواد کی حیثیت رکھتے ہیں اور بس۔ نیم تاریخی ہم نے اس لئے کہا کہ اولاً یہ فن تاریخ کے معیار پر پورے نہیں اُترتے، اور دوسرے یہ کہ ان کتب احادیث کی اکثر روایات قصہ گویوں، واعظوں اور داستان سراؤں کی خود ساختہ روایات اور من گھڑت کہانیاں ہیں۔ نیز ان جھوٹی روایات اور فرضی واقعات کا عوام میں خوب خوب پرچار کرنے کے ذمہ دار بھی یہی وعاظ وقصاص کا گروہ رہا ہے۔

ہماری 'حدیث' کا ایک دوسرا تاریک پہلو بھی ہے جو پہلے سے زیادہ افسوس ناک ہے۔ اور جسے 'اسلامی تاریخ' کا 'المیہ' کہنا چاہیے۔ مثلاً حدیث کے مجموعوں میں ایسی روایتیں بھی بکثرت ملتی ہیں جو الزام تراشی، دروغ بافی اور فحش نگاری کا مرقع ہیں۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ ان مخرب اخلاق اور حیا سوز 'حدیثوں' کو منسوب کیا جاتا ہے قرآن کی برگزیدہ شخصیتوں کی طرف (جیسے خود آنحضرت ﷺ، آپ کی ازواجِ مطہرات، خصوصاً حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت حفصہؓ اور اصحابِ رسول علی الخصوص حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ)۔ یا پھر سب وشتم کے تیر چلائے جاتے ہیں تو اگلی آسمانی کتابوں کی مثالی ہستیوں پر جیسے حضرت ابراہیمؑ، یوسفؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، اور مریمؑ وغیرہم۔ غرض صحفِ اولیٰ کی منتخب شخصیتیں ہوں یا صحیفہ آخر کی پسندیدہ ہستیاں، کسی کی بھی عزت وآبرو راویانِ حدیث کی مشق ستم کا نشانہ بننے سے نہ بچ سکی: ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ﴾ (المرسلات:١٩)

واضح رہے کہ یہ روایتیں مسیلمہ کذاب یا ملا معین واعظ کاشفی جیسے مشہور دروغ گویوں کی نہیں ہیں بلکہ عام مسلمانوں کے 'مایہ ناز' اور 'فخر روزگار' اماموں کے 'ثقہ' راویوں کی ہیں جو آج تقریباً ہزار سال سے ان کتابوں کی زینت بنی ہوئی ہیں جو 'اصح الکتب بعد کتاب اللہ' اور 'مثلہ معہ' سمجھی جاتی رہی ہیں...... وائے گر درپس امروز بود فردائے!''

ان 'تحقیقاتِ عالیہ' اور 'فرمودات طیبہ' کے بعد مدھوپوری 'محقق' صاحب ایک 'ٹھوس حقیقت' کا عنوان لگا کر مزید ارشاد فرماتے ہیں:

''ہم مکلّف ہیں ایمان لانے کے اللہ اور اس کے رسولؐ پر۔ اور اللہ و رسولؐ پر ایمان لانے کے معنی ہیں اللہ کو حق جاننا اور محمدؐ (رسول اللہ) پر نازل شدہ کتاب (قرآن) کو ماننا۔ بخلاف اس کے محض سنی سنائی باتیں جو صدہا سال تک ہر کہ ومہ کی زبان پر بے روک ٹوک گشت کرتی رہی ہوں اور بالآخر انہیں محدثین نے بالکل غیر ذمہ دارانہ ذرائع سے معلوم کر کے اپنے بیاض میں نقل کیا ہو، ایسی غیر مستند اور غیر یقینی روایتوں کو اس صادق ومصدوق کی طرف منسوب کر کے انہیں 'سنت' کا نام دینا اور ان پر ایمان لانے کے لئے مسلمانوں کو مجبور کرنا سراسر بے انصافی اور انتہائی زیادتی ہے۔

مروّجہ انجیل کا نسخہ جسے خود حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے قلم بند کیا تھا (جو سفر وحضر ہر حال میں آپؑ کے رفیق وہم جلیس رہ چکے تھے) اگر محض اس لئے قابل اعتنا نہیں سمجھا جاسکتا کہ یہ کام حضرت مسیح کی موجودگی میں نہیں بلکہ واقعہ رفع کے چالیس سال بعد انجام پایا تھا تو یہ روایتیں جنہیں نہ خود حضورؐ نے قلمبند کروایا نہ ہی آپ کے اصحاب میں سے کسی نے اس کی ضرورت سمجھی۔ بلکہ حضور کے سینکڑوں سال بعد بعض عجمیوں نے زید، عمرو وبکر سے پوچھ پوچھ کر لکھ لیا ہو، انہیں منزل من اللہ ماننے اور جزوِ دین قرار دینے کے لئے وجہ جواز کیا ہوسکتی ہے؟ اور یہ تدوین وترتیب کے دوران تقویٰ وطہارت کا اہتمام یعنی ایک ایک روایت کو قلم بند کرنے سے پہلے تازہ غسل و وضو اور دو رکعت نفل ادا کرنے کا شاخسانہ نفسیاتی اعتبار سے ذہنوں میں روایتوں کی تقدیس وتکریم کا جذبہ خواہ کتنا ہی پیدا کرے لیکن نفس روایات کا جہاں تک تعلق ہے، یہ حقیقت ہے کہ اگر انہیں آبِ زمزم سے بھی غسل ووضو کر کے لکھا گیا ہوتا تو بھی اس عمل سے ان کی صحت وسقم میں کوئی فرق نہیں آتا''۔

قرآن اللہ کا کلام ہے، اس کا یقین کرنے کے لئے ہمیں رسولؐ کی رسالت پر ایمان لانا ہوگا، بغیر آپ پر ایمان لائے قرآن کے کلام اللہ ہونے پر ہمارا ایمان لانا کسی درجہ میں

معتبر نہ ہوگا۔ بعینہ اسی طرح روایتوں کو حدیثِ رسولؐ ماننے کے لئے ایک ایک روایت کے راوی پر ایمان لانا ہمارے لئے ناگزیر ہوگا بلکہ ہر روایت کے ہر سلسلہ اسناد میں جتنے راوی ہوں گے ہر ایک پر بلا استثنا ایمان لانا ہوگا۔ کیا ہمیں اللہ و رسولؐ کی طرف سے اِن اَن گنت اصحابِ اسماء الرجال پر ایمان لانے کی تکلیف دی گئی ہے۔ انا اللہ......''

جواب:

مدھو پوری 'محقق' صاحب کا 'سرمایۂ تحقیقات' ختم ہوا۔ اب آیئے اس پر ہمارا تبصرہ اور جائزہ ملاحظہ فرمایئے۔ ہم نے اس کے جواب میں انہیں لکھا تھا کہ آپ کا دعویٰ ہے کہ دین میں حدیث کا کوئی مقام نہیں اور اس دعویٰ کی آپ نے اپنے خیال میں دو دلیلیں لکھی ہیں۔ دوسری دلیل پر تو ہم آگے گفتگو کریں گے۔ پہلی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ دین کی بنا علم و یقین پر ہے، احادیث ظنی ہیں۔ اس ضمن میں آپ نے وہ آیات نقل کی ہیں جن میں ظن کی مذمت کی گئی ہے۔ اور ظن سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ آپ کی یہ حرکت دیکھ کر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ حضرات نہ تو قرآن کو مانتے ہیں اور نہ اس کو سمجھنے کا سلیقہ ہی رکھتے ہیں!!

شریعت میں ظنّ اور ظنّیات کی حیثیت:

جنابِ عالی! قرآنِ مجید میں صرف ظن کی مذمت ہی نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کی تعریف بھی کی گئی ہے۔ اسے اختیار کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے اور اسے مدارِ نجات بھی قرار دیا گیا ہے۔ سنئے، فرمایا گیا ہے:

﴿لَوْلَاۤ إِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّقَالُوْا هٰذَاۤ إِفْكٌ مُّبِيْنٌ﴾ (النور:١٢)

''جب تم لوگوں نے حضرت عائشہؓ پر الزام کے واقعہ کو سنا تو مؤمن مردوں اور مؤمنہ عورتوں نے اپنے نفسوں کے ساتھ اچھا ظن کیوں نہ قائم کیا؟ اور کیوں نہ کہا کہ یہ کھلی ہوئی جھوٹی تہمت ہے۔''

غور فرمایئے! اس میں صرف 'ظن' کو اختیار ہی کرنے کا مطالبہ نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد پر ایک

معاملہ کے بارے میں فیصلہ کن رائے قائم کرنے کا بھی مطالبہ ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا:

﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾

''صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو اور بے شک یہ بھاری ہے مگر ان ڈرنے والوں پر جو یہ 'ظن' رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے ربّ سے ملنا ہے اور یہ کہ وہ اسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے''۔ (البقرۃ:۴۵،۴۶)

گویا قیامت کے وقوع اور اللہ سے ملاقات کا 'ظن' رکھنا ایمان کی علامت ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ، لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ﴾ (المطففین:۴،۵)

''کیا وہ لوگ ظن نہیں رکھتے کہ وہ ایک بڑے دن کے لئے اٹھائے جائیں گے؟''

گویا بعث کا ظن نہ رکھنا عدمِ ایمان کی علامت ہے اور ڈنڈی مارنے جیسی برائیوں کا سبب ہے۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ، فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ﴾

''قیامت کے دن جس شخص کی کتاب اس کے دائیں ہاتھ میں دی جائے گی، وہ کہے گا: آؤ میری کتاب پڑھو۔ میں ظن رکھتا تھا کہ میں اپنے حساب سے ملوں گا۔ پھر وہ پسندیدہ زندگی یعنی بلند وبالا جنت میں ہوگا''۔ (الحاقۃ:۱۹تا۲۲)

لیجئے جناب! یہاں ایک 'ظنی' عقیدے پر جنت مل رہی ہے اور آپ ظن اور ظنیات کو جہنم میں دھکیلنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ حضرت داود علیہ السلام نے ظن کی بنیاد پر توبہ واستغفار کیا تو ان کے اس عمل کو مدح وتعریف کے سیاق میں ذکر کیا گیا ہے، ارشاد ہے:

﴿وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ﴾

''داؤد نے یہ ظن کیا کہ ہم نے اسے آزمائش میں ڈال دیا ہے پس انہوں نے اپنے ربّ

سے مغفرت مانگی اور رکوع کرتے ہوئے گر پڑے اور اللہ کی طرف جھک گئے"۔ (ص:۲۴)
آپ ظنی چیز کا دین سے کوئی تعلق ہی نہیں سمجھتے اور قرآن ظن پر دین کے ایک حکم کا دارومدار رکھتا ہے، ارشاد ہے:

﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ﴾
یعنی "مطلقہ ثلاثہ کا دوسرا شوہر اگر طلاق دے دے تو (پہلے شوہر اور اس کی مطلقہ) ان دونوں پر کوئی حرج نہیں کہ آپس میں تراجع کرلیں (یعنی پھر بذریعہ نکاح اکٹھے ہو جائیں) اگر یہ ظن کریں کہ وہ دونوں اللہ کے حدود قائم کرسکیں گے"۔ (البقرۃ:۲۳۰)

غزوۂ تبوک میں جو تین مؤمنین خالصین بلا عذر شریک نہ ہوئے تھے، ان کی توبہ بھی جس مرحلے کے بعد قبول کی گئی، اس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے:

﴿وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا حَتَّى إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَنْ لَا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾
"اور اللہ نے ان تین افراد کی توبہ بھی قبول کی جنہیں پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا یہاں تک کہ جب ان پر زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی اور ان کی جان پر بن آئی اور انہوں نے یہ ظن قائم کرلیا کہ اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں۔ پھر اللہ نے ان پر رجوع کیا تاکہ وہ توبہ کریں۔ بیشک اللہ توبہ قبول کرنے والا رحیم ہے"۔ (التوبہ:۱۱۸)

لیجئے جناب! کتنی صاف بات ہے کہ جب ان پیچھے رہ جانے والوں نے حالات کی سختی کا مزا چکھ لیا اور یہ 'ظن' قائم کرلیا کہ اللہ کے علاوہ کوئی جائے پناہ نہیں تو اللہ نے ان کی توجہ قبول کرلی۔ یعنی انہیں اللہ کی رحمت و مغفرت ان کے اسی ظن کے نتیجہ میں حاصل ہوئی۔

یہ تو یہ؛ اسلام نے اسلامی عدالت کے تمام فیصلوں کی بنیاد صرف دو عادل گواہوں پر رکھی ہے، اس سے صرف زنا کا کیس مستثنیٰ ہے۔ لیکن ان دو عادل گواہوں کی عدالت وثقاہت کس درجہ کی ہوگی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر وہ نماز کے بعد اللہ کی قسم اور اپنے اخلاص کا واسطہ

دے کر گواہی دے رہے ہوں، تب بھی قرآن نے ان کے بارے میں اس احتمال کو قبول کیا ہے کہ وہ جان بوجھ کر غلط بیانی سے کام لے سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو سورۂ مائدہ: ۱۰۶ تا ۱۰۸

بلکہ گواہی کے سلسلے میں مزید ایک قانونی شق یہ رکھی ہے کہ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کافی ہوگی (البقرۃ: ۲۸۳)......اور خود ہی یہ بھی بتلا دیا ہے کہ عورتوں کی تعداد ایک کے بجائے دو اس لئے رکھی جا رہی ہے کہ ﴿ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ ﴾ (البقرۃ: ۲۸۲) ''اگر ایک عورت معاملہ کو بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے''۔ یعنی ایسی گواہی بھی قبول کی جائے گی جو خود گواہی دینے والے کو یاد نہیں ہے۔ بلکہ گواہی دینے والا انسان دوسرے کی یاد دہانی کی بنیاد پر گواہی دے رہا ہے۔

کہئے جنابِ عالی! اس قسم کی گواہی 'یقینیات' کے کس درجہ سے تعلق رکھتی ہے؟ اور یہ ڈھیل تو رہی نظامِ عدالت کے سلسلے میں، باقی رہیں خبریں تو ان کے سلسلے میں اس سے بھی زیادہ وسعت اور گنجائش رکھی گئی ہے۔ حکم دیا گیا: ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا ﴾ (الحجرات: ٦) ''اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق آدمی کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لو......الخ'' اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی صاحب تقویٰ اور صالح آدمی خبر لائے تو تحقیق بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔

جنابِ محترم! جب قرآن میں نہ صرف ظن کی تعریف کی گئی ہو بلکہ اس پر دین کے بعض احکامات کا دارومدار رکھا گیا ہو، اسی پر پورے نظامِ عدالت کی بنیاد رکھی گئی ہو، اسی ظن کی بنیاد پر فیصلہ کن رائے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہو، اسی ظن کے تحت توبہ واستغفار کرنے والوں کی بخشش کی گئی ہو حتیٰ کہ اسے آخرت میں نجات کا سبب قرار دیا گیا ہو تو آپ کو یہ بات کہاں تک زیب دیتی ہے کہ آپ احادیث پر 'ظنی' ہونے کی پھبتی چست کریں۔ آپ دوسروں کو تفقہ فی الدین اور تدبر فی القرآن سے محروم قرار دیتے ہیں، دراں حالے کہ اس محرومی کے شکار درحقیقت آپ خود ہیں۔ محترم کہنا پڑتا ہے کہ ؎ ایاز قدر خود بشناش

شاید آپ اس موقع پر لغت کھول کر بیٹھ جائیں اور چیخنا چلانا شروع کر دیں کہ دیکھو یہ شخص 'ظن'

کے مختلف معانی کو ایک دوسرے کے ساتھ گڈ مڈ کر رہا ہے۔ اس لئے میں آپ کی اس چیخ پکار سے پہلے ہی یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ کارِ خیر میں نہیں، آپ انجام دے رہے ہیں۔ آخر اس سے بڑھ کر دھاندلی اور زبردستی کیا ہو سکتی ہے کہ آپ قرآن کی ان تمام آیات اور اسلام کے اس سارے نظام کو پس پشت ڈال دیں جن میں 'ظن' کو دین اسلام کا جزوِلا ینفک قرار دیا گیا ہے اور قرآن کی دو تین آیتوں کو پیش کر کے لفظ 'ظن' کے مفہوم کو غلط رنگ دیتے ہوئے یہ فیصلہ ٹھونک دیں کہ 'ظن' کے لئے دین میں کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے ذخیرۂ احادیث جو یکسر ظنی اور غیر یقینی ہے، اس کا دین میں کوئی مقام نہیں۔ بتایئے! ہم نے جو آیات پیش کی ہیں، ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ کے اس فیصلے پر اس کے سوا کیا کہا جائے کہ ؎

آں کس کہ نداند و بداند کہ بداند — در جہل مرکب ابد الدہر بماند

دین کے مکمل ہونے کا مطلب:

حدیث کے بے حیثیت اور بے مقام ہونے کے سلسلے میں آپ کی دوسری دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ دین عملاً محمد رسول اللہ والذین معہ کے ذریعہ مکمل ہو چکا ہے۔ اور قولاً لوحِ قرآن میں محفوظ ہو گیا ہے۔

غالباً آپ کے اس 'فنکارانہ' استدلال کا منشا یہ ہے کہ اگر آپ سے یہ سوال کر دیا جائے کہ محمد رسول اللہ والذین معہ کے ذریعہ عملاً جو دین مکمل ہو چکا ہے، اس کی تفصیلات کہاں دستیاب ہوں گی تو آپ جھٹ کہہ دیں گے کہ قرآن میں۔ ممکن ہے آپ نہ کہیں لیکن آپ کے دوسرے ہم خیال حضرات یہی کہتے ہیں۔ اس لئے میں آپ کی توجہ اپنے ان سوالات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو اسی مضمون کے شروع میں درج ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ

☆ قرآن میں جن جانوروں کو حرام اور جن کو حلال قرار دیا گیا ہے، انکے علاوہ بقیہ جانور حلال ہیں یا حرام؟

☆ نماز کے متعلق قرآن میں جو چند چیزیں مذکور ہیں، ان کے علاوہ نماز کے بقیہ حصوں کی

ترکیب کیا ہے؟

☆ زکوٰۃ کم از کم کتنے مال پر فرض ہے؟ کتنے فیصد فرض ہے؟ اور کب کب فرض ہے؟

☆ مالِ غنیمت کی تقسیم مجاہدین پر کس تناسب سے کی جائے؟

☆ چور کے دونوں ہاتھ کاٹے جائیں یا ایک؟

☆ جمعہ کی نماز کے لئے کب اور کن الفاظ میں پکارا جائے؟ اور وہ نماز کیسے پڑھی جائے؟

ان سوالات کو ایک بار غور سے پڑھ لیجئے اور بتایئے کہ اس سلسلے میں 'رسول اللہ ﷺ والذین معہ' کا عمل کیا تھا؟ اور اس عمل کی تفصیلات کہاں سے ملیں گی؟ اگر قرآن میں ملیں گی تو کس سورہ، کس پارے، کس رکوع اور کن آیات میں؟ اور اگر قرآن میں یہ تفصیلات نہیں ہیں۔ اور یقیناً نہیں ہیں تو قرآن کے بعد وہ کون سی کتابیں ہیں جو آپ کے 'معیار' پر صحیح ہیں اور ان میں یہ تفصیلات بھی درج ہیں؟

قرآن تو بڑے زور شور سے کہتا ہے کہ جو اللہ سے اُمید رکھتا ہے اور آخرت میں کامیاب ہونا چاہتا ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کے نمونے پر چلے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ﴾ (الاحزاب:۲۱) اور یہاں یہ حال ہے کہ جو مسائل پیش آتے ہیں، ان میں رسول اللہ ﷺ کا اُسوہ ملتا ہی نہیں۔ اور اگر کہیں ملتا بھی ہے تو آپ اسے 'ایرانی سازش' کے تحت گھڑا گھڑایا افسانہ قرار دیتے ہیں جن پر تقدس کا خول چڑھا کر لوگوں کو بیوقوف بنایا گیا ہے، ورنہ دین میں ان کی کوئی حیثیت اور کوئی مقام نہیں۔ اب آپ ہی بتایئے کہ اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی چاہنے والے بے چارے کریں تو کیا کریں؟ ؎

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں......؟

اس سلسلے میں سوالات اس کثرت سے ہیں کہ انہیں درج کرتے ہوئے آپ کے ملولِ خاطر کا اندیشہ ہے، اس لئے اتنے پر اکتفا کرتا ہوں ؎

اندکے باتو بگفتم و بدل ترسیدم   کہ آزردہ دل نہ شوی ورنہ سخن بسیار است

میری ان گزارشات سے یہ حقیقت دوٹوک طور پر واشگاف ہو جاتی ہے کہ یہ ساری دشواریاں

اور پیچیدگیاں اس لئے پیش آ رہی ہیں کہ سورۂ مائدہ کی آیت ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ...... الخ﴾ اور سورۂ بروج کی آیت ﴿بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيْدٌ...... الخ﴾ کا مفہوم سمجھنے میں آپ کے تدبر فی القرآن اور تفقہ فی الدین کا طائر پندار حقائق کی دنیا سے بہت دور پرواز کر گیا ہے۔

روایت بالمعنی:

اب آیئے! آپ کے چند اور 'فرمودات عالیہ' پر گفتگو ہو جائے، آپ نے حدیثوں کی بابت لکھا ہے کہ "یہ سب کی سب یکسر ظنی، غیر یقینی اور روایت بالمعنی ہیں"۔ یہ معلوم ہی ہے کہ 'غیر یقینی' کا لفظ 'ظنی' کی تفسیر ہے اور ظن کے سلسلے میں میں اپنی گزارشات پیش کر چکا ہوں۔ رہا 'روایت بالمعنی' کا معاملہ تو سن لیجئے کہ روایت بالمعنی اگر کوئی جرم ہے تو اس جرم کا سب سے بڑا مجرم (نعوذ باللہ) خود قرآن ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا مکالمہ، ہودؑ اور ان کی قوم کا مکالمہ، صالح ؑ اور قوم ثمودؑ کا مکالمہ، ابراہیم اور لوط علیہما السلام اور ان کی قوم کا مکالمہ، حضرت شعیبؑ اور اہل مدین و اصحاب الایکہ کا مکالمہ، حضرت موسیٰ کا فرعون سے، بلکہ جادوگروں سے اور بنی اسرائیل سے مکالمہ، اور حضرت عیسیٰ کے مواعظ و مکالمے، کیا یہ سب انہی الفاظ اور عبارتوں میں تھے، جن الفاظ اور عبارتوں کے ساتھ قرآن میں درج ہیں؟ کیا آپ اس تاریخی حقیقت کا انکار کر سکتے ہیں کہ ان پیغمبروں اور ان کی قوموں کی زبان عربی نہیں تھی......!!؟

قرآن میں ایک ہی بات کہیں کچھ الفاظ و عبارت میں ادا کی گئی ہے تو کہیں دوسرے الفاظ و عبارت میں۔ کہیں مختصر ہے کہیں مطول، بلکہ کہیں ایک جز مذکور ہے تو کہیں دوسرا جز۔ پس اگر ایک بات کے بیان کرنے میں الفاظ و عبارت، اجمال و تفصیل اور اجزاءِ گفتگو کے ذکر و عدمِ ذکر کا اختلاف اور روایت بالمعنی کوئی عیب ہے تو سب سے پہلے قرآن مجید کو اس عیب سے (نعوذ باللہ) پاک کیجئے۔ اور اگر نہیں تو پھر حدیث کے روایت بالمعنی ہونے پر آپ کو اعتراض کیا ہے؟ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ قرآن تو روایت بالمعنی سے بھرا ہوا ہے، پھر بھی یقینی کا یقینی اور احادیث کے متعلق جوں ہی آپ کے کان میں یہ آواز پہنچے کہ اس میں کچھ احادیث روایت بالمعنی بھی ہیں، بس

آپ شور مچانے لگیں کہ ہٹاؤ ان احادیث کو، یہ روایت بالمعنی کی گئی ہیں۔ ان کا کیا اعتبار، اور دین سے ان کا کیا تعلق......؟

ایرانی سازش کا بدبودار افسانہ:

قرآنی آیات کو آپ نے اپنی مزعومہ خرافات کے گرد طواف کرنے کے بعد اس بڑے بول کا اظہار کیا جسے منکرین حدیث کے گرگانِ باراں دیدہ اپنے سرد وگرم چشیدہ یہودی صلیبی مستشرق اساتذہ کی تقلید میں بولتے آئے ہیں اور جس کے متعلق ہر صاحبِ بصیرت بے کھٹک کہہ سکتا ہے کہ ﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا﴾ (الکھف:۵) ''بڑا بول ہے جو ان کے منہ سے نکل رہا ہے، وہ سراپا جھوٹ بک رہے ہیں''۔ اِن کے اِس بول کا خلاصہ یہ ہے کہ احادیث کا ذخیرہ درحقیقت ایرانیوں کی سازش اور قصہ گویوں، واعظوں اور داستان سراؤں کی من گھڑت حکایات کا مجموعہ ہے۔

آپ کے اس دعویٰ کا پردہ فاش کرنے سے پہلے میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ اس عجمی سازش اور داستان سراؤں کی گھڑنت کا پتہ آپ نے کس طرح لگایا؟ آپ کے ذرائع معلومات کیا ہیں؟ اور آپ کے پاس اس پرشور دعویٰ کی کیا دلیل ہے؟ کیونکہ دعویٰ بلا دلیل قبول خرد نہیں!

آپ لوگوں پر حیرت ہوتی ہے کہ دعویٰ تو کرتے ہیں اس قدر زور و شور سے، اور ایسے اونچے آہنگ کے ساتھ اور دلیل کے نام پر ایک حرف نہیں۔ کیا اسی کا نام تدبر فی القرآن ہے؟ اور اسی کو تفقہ فی الدین کہتے ہیں......؟

آپ فرماتے ہیں کہ ''وفاتِ نبوی کے سیکڑوں برس بعد بعض ایرانیوں نے ادھر ادھر کی سنی سنائی انٹکل پچو باتوں کو جمع کر کے انہیں صحیح حدیث کا نام دے دیا''۔ ملخصاً

میں کہتا ہوں کہ آیئے، سب سے پہلے یہی دیکھ لیں کہ ان مجموعہ ہائے احادیث کو جمع کرنے والے ایرانی ہیں بھی یا نہیں؟ سن وار ترتیب کے لحاظ سے دورِ اول کے رواۃِ حدیث میں سرفہرست ابن شہاب زہری، سعید بن مسیب، عروہ بن زبیر اور عمر بن عبدالعزیز رحمھم اللہ کے نام نامی آتے

ہیں۔ یہ سب کے سب، سب سے معزز عربی خاندان قریش سے تعلق رکھتے ہیں اور آخر الذکر تو اسلامی تاریخ کے پانچویں خلیفہ راشد کی حیثیت سے معلوم ومعروف ہیں۔

اسی طرح دورِ اوّل کے مدوّنینِ حدیث میں سرفہرست امام مالکؒ ہیں۔ پھر امام شافعیؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ، ان تینوں ائمہ کے مجموعہ ہائے احادیث پوری اُمت میں متداول اور مقبول ہیں۔ یہ تینوں خالص عربی النسل ہیں۔ امام مالکؒ قبیلہ ذی اُصبح سے، امام شافعیؒ قریش کی سب سے معزز شاخ بنو ہاشم سے، اور امام احمدؒ قبیلہ شیبان سے۔

یہ بنو شیبان وہی ہیں جن کی شمشیر خارا شگاف نے خورشیدِ اسلام کے طلوع ہونے سے پہلے ہی خسرو پرویز کی ایرانی فوج کو ذی قار کی جنگ میں عبرتناک شکست دی تھی۔ اور جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ کے دور میں ایرانی سازش کے تحت برپا کیے گئے ہنگامہ ارتداد کے دوران نہ صرف ثابت قدمی کا ثبوت دیا تھا بلکہ مشرقی عرب سے اس فتنے کو کچلنے میں فیصلہ کن رول ادا کر کے عربی اسلامی خلافت کو نمایاں استحکام عطا کیا تھا۔ اور پھر جس کے شہ پر وشہباز مثنیٰ بن حارثہ شیبانی کی شمشیر خارا شگاف نے کاروانِ حجاز کے لئے فتح ایران کا دروازہ کھول دیا تھا۔

آخر آپ بتلا سکتے ہیں کہ یہ کیسی ایرانی سازش تھی جس کی باگ دوڑ عربوں کے ہاتھ میں تھی؟ جس کا سرپرست عربی خلیفہ تھا اور جس کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے ایسی ایسی نمایاں ترین عربی شخصیتوں نے اپنی زندگیاں کھپا دیں۔ جن میں سے بعض بعض افراد کے قبیلوں کی ایران دشمنی چار دانگ عالم میں معروف تھی؟ کیا کوئی انسان جس کا دماغی توازن صحیح ہو، ایک لمحہ کے لئے بھی ایسے بدبودار افسانہ کو ماننے کے لئے تیار ہوسکتا ہے؟

دورِ اوّل کے بعد آیئے دورِ ثانی کے جامعینِ حدیث پر نگاہ ڈالیں۔ ان میں سرفہرست امام بخاری ہیں جن کا مسکن 'بخارا' تھا۔ بخارا ایران میں نہیں بلکہ ماوراء النہر (ترکستان) میں واقع ہے۔ دوسرے اور تیسرے بزرگ امام مسلم اور امام نسائی ہیں۔ ان دونوں حضرات کا تعلق نیشاپور کے علاقے سے تھا اور نیشاپور ایران کا نہیں بلکہ خراسان کا جز تھا۔ اگر اس پر ایران کا اقتدار رہا بھی ہے تو اجنبی اقتدار کی حیثیت سے۔ چوتھے اور پانچویں بزرگ امام ابوداؤد اور امام ترمذی تھے۔ اول

الذکر کا تعلق سجستان (خراسان) سے، ثانی الذکر کا تعلق ترمذ (ماوراء النہر، ترکستان) سے رہا ہے۔ چھٹے بزرگ کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک طبقہ ابن ماجہ کی سنن کو صحاحِ ستہ میں شمار کر کے انہیں استناد کا یہ مقام دیتا ہے، دوسرا طبقہ سنن دارمی یا مؤطا امام مالک کو صحاحِ ستہ میں شمار کرتا ہے۔ امام ابن ماجہ یقیناً ایرانی ہیں لیکن ان کی تصنیف سب سے نیچے درجے کی ہیں۔ حتیٰ کہ اکثر محدثین اسے لائق استناد ماننے کو تیار نہیں۔ آخر الذکر دونوں حضرات عربی ہیں۔ امام مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی بھی عربی ہیں۔

کیا محدثین عجمی تھے؟:

یہ حقیقت اچھی طرح یاد رہے کہ جن محدثین نے احادیث کو کتابی شکل میں جمع کیا ہے، ان سب کو یا ان کی اکثریت کو عجمی قرار دینا محض فریب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج حدیث کی جو کتابیں اُمت میں رائج، مقبول اور متداول ہیں، چند ایک کے سوا، سب کے مصنّفین [مؤلفین] عرب تھے۔ ہم ذیل میں اس طرح کے عرب محدثین کی فہرست دے رہے ہیں تا کہ واقعی حقیقت دوٹوک طور پر واشگاف ہو جائے:

عرب محدثین		قبیلہ
۱۔ امام مالکؒ	۱۷۹ھ	ذی اصبح
۲۔ امام شافعیؒ	۲۰۴ھ	قریش
۳۔ امام حمیدیؒ	۲۱۹ھ	قریش
۴۔ امام اسحٰق بن راہویہؒ	۲۳۸ھ	بنو تمیم
۵۔ امام احمد بن حنبلؒ	۲۴۱ھ	بنو شیبان
۶۔ امام دارمیؒ	۲۵۵ھ	بنو تمیم
۷۔ امام مسلمؒ	۲۶۱ھ	بنو قشیر
۸۔ امام ابوداودؒ	۲۷۵ھ	بنو ازد

۹۔امام ترمذیؒ	۲۷۹ھ	بنو سلیم
۱۰۔حارث بن ابی اسامہؒ	۲۸۲ھ	بنو تمیم
۱۱۔امام ابوبکر بزارؒ	۲۹۲ھ	بنو اَزد
۱۲۔امام نسائیؒ	۳۰۳ھ	......
۱۳۔امام ابویعلیٰؒ	۳۰۷ھ	بنو تمیم
۱۴۔امام ابوجعفر طحاویؒ	۳۲۱ھ	بنو اَزد
۱۵۔امام ابن حبانؒ	۳۵۴ھ	بنو تمیم
۱۶۔امام طبرانیؒ	۳۶۰ھ	لخم
۱۷۔امام دار قطنیؒ	۳۸۵ھ	......
۱۸۔امام حاکمؒ	۴۰۵ھ	بنو ضبہ

عجمی محدثین

۱۔امام ابن ابی شیبہ	۲۳۵ھ
۲۔امام بخاری	۲۵۶ھ
۳۔امام ابن ماجہ	۲۷۳ھ
۴۔امام ابن خزیمہ	۳۱۱ھ

اس فہرست سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جن محدثین کی کتابیں رائج اور مقبول ہیں ان میں ۱۸ عرب اور صرف ۴ عجمی ہیں۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین، اعظم گڑھ نے پہلی صدی ہجری میں پیدا ہونے والے محدثین سے لے کر آٹھویں صدی کے آخر تک وفات پانے والے مشہور اور صاحبِ تصنیف محدثین کا تفصیلی ذکر 'تذکرۃ المحدثین' نامی کتاب کی دو جلدوں میں کیا ہے۔ ان محدثین کی کل تعداد ستر ہوتی ہے۔ جن میں سے صرف ۱۲ محدثین کے متعلق یہ صراحت ملتی ہے کہ وہ عجمی تھے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حدیث کو عجمی یا ایرانی سازش قرار دینے میں کتنا وزن ہے اور یہ نعرہ کس قدر پرفریب ہے۔

اسی کے ساتھ اگر یہ بات بھی مدنظر رہے کہ کتبِ احادیث کے لکھنے والوں میں پیشرو اور سرفہرست عرب محدثین ہیں۔ عجمی محدثین ان کے بعد ہیں۔ پھر ان عجمی محدثین نے اپنی کتابوں میں جو حدیثیں جمع کی ہیں، وہ وہی حدیثیں ہیں جنہیں ان کے پیشرو اور ہم عصر عربوں نے اپنی کتابوں میں جمع کیا ہے تو مذکورہ بالا حقیقت مزید اچھی طرح بے نقاب ہو جاتی ہے۔

اب آپ بتایئے کہ آخر عربوں کے خلاف یہ کیسی سازش تھی جس کے دورِ اول کے تمام بڑے بڑے لیڈر عربی تھے اور عربوں کے بعد ترکستانی اور خراسانی تھے جو نسلاً عربی تھے۔ اور اگر عربی نہ بھی تسلیم کریں تو پھر ایرانیوں سے کدورت و رقابت رکھتے تھے اور انہوں نے سازش کا سارا مواد اپنے پیشرو عرب لیڈروں سے حاصل کیا تھا۔ اگر بدقسمتی سے اس دور کے 'سازشی ٹولے' میں ایک آدھ ایرانی نے شریک ہو کر ان کی کفش برداری اور خوشہ چینی کی بھی تو اس کو کوئی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ یا تو اس کی تصنیف کو درجہ استناد ہی نہیں دیا گیا۔ یا دیا بھی گیا تو سب سے نچلے درجہ کا......؟

یہ بھی بتلا دیجئے کہ آخر یہ کیسی 'ایرانی سازش' تھی کہ 'سازشی ٹولے' اور ان کے سیاسی آقاؤں کے درمیان برابر ٹھنی رہتی تھی؟ کسی کو شہر بدر کیا جا رہا ہے، کسی پر شہر کے دروازے بند کئے جا رہے ہیں، کسی کو حوالہ زنداں کیا جا رہا ہے، کسی پر کوڑے برس رہے ہیں، کسی کی زخمی پیٹھ پر زہریلے پھائے لگائے جا رہے ہیں، کسی کے پاؤں میں بیڑیاں پہنائی جا رہی ہیں، کسی کے کندھے اُکھڑوا کر گدھے پر بٹھایا جا رہا ہے اور شہر میں گشت کرایا جا رہا ہے اور کسی کے ساتھ کچھ اور ہو رہا ہے!!

پھر 'سازشی ٹولہ' بھی کیسا ہے کہ اپنے آقاؤں سے ذرا دبتا نہیں؟ ان کے مقابل میں اکڑا ہوا ہے۔ ان کے بچوں کے لئے سپیشل کلاس لگانے پر آمادہ نہیں۔ عام درس میں نمایاں اور مخصوص جگہ دینے کو تیار نہیں۔ ان کے ہدایا اور تحائف کو پوری بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہے اور ان کے دربار میں بھول کر بھی حاضر نہیں ہوتا۔ اگر کبھی حاضری کے لئے مجبور بھی کیا جاتا ہے تو وہ کھری کھری سناتا ہے کہ بلائیں ٹوٹ پڑتی ہیں۔ کیا یہی 'لچھن' ہوتے ہیں سازشیوں کے......؟

آخر یہ کیسا نادان 'سازشی ٹولہ' تھا کہ جن سیاسی مصالح کے حصول کے لئے اس نے اتنی خطرناک سازش رَچائی تھی، انہی سیاسی مصالح کے خلاف برسرپیکار رہا اور اس رستے میں جو جو مصیبتیں جھیلنی

پڑیں نہایت ہی استقلال کے ساتھ جھیلتا رہا۔

اس 'ایرانی سازش' کا ایک اور پہلو بھی خاصا دلچسپ ہے۔ اس سازشی ٹولے کی جمع کی ہوئی کتب احادیث میں ایسی احادیث بھی ہیں جن میں قبیلوں، قوموں اور ملکوں کے فضائل ومناقب یا خرابیاں اور کمزوریاں بھی بیان کی گئیں ہیں۔ اس قسم کی احادیث میں حجاز کو 'دین کی پناہ گاہ' کہا گیا ہے۔ (بخاری ومسلم وغیرہ)۔ یمن کو 'ایمان وحکمت کا مرکز' قرار دیا گیا ہے (ایضاً)......شام کو اسلام کی چوٹی کی 'شخصیتوں کا مرکز'، 'اللہ کی منتخب کی ہوئی زمین' اور 'اسلام کا مستحکم قلعہ' کہا گیا ہے اور اس کے لئے دعائیں کی گئی ہیں۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، مسند احمد)

آپ کو معلوم ہے کہ مشرق کو عموماً اور ایرانیوں کے مرکزِ اقتدار (عراق) کو خصوصاً، احادیث میں کیا مقام عطا ہوا ہے؟ اسے فتنہ وفساد کا مرکز اور اُجڈوں اور اَکھڑوں کا مسکن قرار دیا گیا ہے۔ اس پر قدرتی آفات اور تباہیوں کی آمد کی پیشین گوئی کی گئی ہے اور اسے ابلیس کی قضائے حاجت کا مقام بتلایا گیا ہے۔ (بخاری، طبرانی وغیرہ)۔ اگر ایک آدھ حدیث میں اہل ایران سے متعلق کوئی فضیلت آ بھی گئی ہے تو صرف چند افراد کے لئے رجال من ھولاء

بتایئے! آخر یہ کیسے 'بدھو' قسم کے 'سازشی' لوگ تھے کہ سارے فضائل وکمالات تو عطا کردیے اپنے عرب دشمنوں کو؟ اور ساری پستی اور خرابی منتخب کرلی، اپنے لئے اور اپنے آقاؤں کے لئے؟ کیا سازش اسی طرح کی جاتی ہے؟ اور کیا ایسی ہی اُلٹی سیدھی تدبیروں سے سیاسی بالادستی حاصل ہوتی ہے؟

بریں عقل ودانش بباید گریست

آیئے آپ کو ایک اور حقیقت کی طرف متوجہ کروں۔ جسے مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم، گوجرانوالہ نے لکھا ہے، لکھتے ہیں:

''پھر آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ اسلامی حکومت سرزمین حجاز سے شروع ہوکر اقطارِ عالم تک لاکھوں مربع میل زمین پر پھیلی ہوئی تھی۔ آپ یہ سوچیں آپ کو صلح سے کوئی ملک ملا۔ خود سرزمین حجاز میں قدم قدم پر لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ مکہ پر فوج کشی کی ضرورت

ہوئی۔ نجد لڑائی سے ملا۔ شام، عراق، حبش، یمن کے بعض علاقوں پر لڑنا پڑا۔ سمندر کے ساحلی علاقوں پر جنگیں ہوئیں۔

آنحضرت ﷺ کو اپنی زندگی میں کم وبیش بیاسی جنگیں لڑنا پڑیں۔ پھر یہ جنگوں کا سلسلہ خلیفہ ثالث کی حکومت کے درمیانی ایام تک جاری رہا۔ پھر خلیفہ ثالث کے آخری دور سے شروع ہو کر حضرت علیؓ کا پورا زمانہ قریب قریب باہمی آویزش کی نذر رہا۔ ۴۱ھ کے بعد جوں ہی ملک میں امن قائم ہوا، خلفاے بنی اُمیہ نے شخصی کمزوریوں کے باوجود جہاد فی سبیل اللہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہندوستان، اندلس، بربر، الجزائر، تمام علاقے جنگ ہی سے اسلامی قلمرو میں شامل ہوئے۔

پھر آپ کے قلم اور دماغ نے سازش کا نزلہ صرف 'فارس' پر کیوں گرایا؟ محض ملک گیری اور فتوحات کی بنا پر بغاوتیں، سازشیں تصنیف کی جا سکتی ہیں تو حجازی سازش، ہندوستانی سازش، بربری اور اندلسی سازش کیوں نہیں بنائی گئی؟ کیا شام کے یہودی معصوم، عراق اور روم کے مشرک اور عیسائی فارسیوں سے زیادہ پاک باز تھے؟ ان کی حکومتیں مسلمانوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ نہیں اُتریں؟ مصر میں اسلامی فتوحات سے قبطی اور مصری قوموں کا وقار پامال نہیں ہوا۔ پھر آپ مصری سازش کے متعلق کیوں نہیں سوچتے؟

اگر عقل کا دیوالیہ نہیں دے دیا گیا تو اپنی فتوحات کی پوری تاریخ پر غور فرمائیے۔ چین کے سوا شاید ہی کوئی ملک ہے جہاں مسلمانوں کے خون نے زمین کو لالہ زار نہ کیا ہو۔ مغربی سمندر کے سواحل پر آپ کی فوجیں برسوں لنگر انداز رہیں۔ ان لوگوں پر آپ کو سازش کا شبہ کیوں نہیں؟ آپ اُلٹا خود ہی ان کی سازش کا شکار ہو گئے......!!

غزالی، ابن مکرم، ابن عربی، ابن العربی، شاطبی، ابن حزم، یحییٰ بن یحییٰ مصمودی وغیرہم، قرطبہ اور اندلس کے علما کو سازشی نہیں کہا جاتا۔ اگر خراسان، بخارا، قزوین، ترمذ، نساء کے علما پر حدیث سازی کی تہمت اس لئے لگائی گئی ہے کہ ان بزرگوں نے سنت کے پرانے تذکروں، صحابہ اور تابعین کی بیاضوں اور سلف اُمت کے مسودات سے تدوین حدیث

کے لئے راہیں ہموار کیں تو علمائے اندلس نے بھی سنت کی کچھ کم خدمت نہیں کی کہ شروحِ حدیث، فقہ الحدیث اور علومِ سنت کی خدمت میں ان بزرگوں نے لاکھوں صفحات لکھ ڈالے۔ان خدمات کو کیوں سازش نہیں کہا گیا۔منکرین سنت کے پورے خاندان میں کوئی عقلمند نہیں جو ان حقائق پر سنجیدگی سے غور کرے، کیا علومِ دین اور فنونِ نبوت کی ساری داستان میں آپ کو صرف علمائے فارس ہی مجرم نظر آئے!!

من كان هذا القدر مبلغ علمه فليستتر بالصمت والكتمان"

(حدیث کی تشریعی اہمیت از مولانا محمد اسمٰعیل سلفیؒ ص ۶۹ تا ۷۱)

آیئے اس 'ایرانی سازش' کے متعلق مولانا موصوف کے بعض اور تبصرے ملاحظہ فرماتے چلئے۔ مولانا موصوف لکھتے ہیں:

"آج سے تقریباً ایک صدی پہلے حکومت نہ انتخابی تھی؛ نہ جمہوری نمائندگی کی سند ان کو حاصل تھی۔ نہ وہ حکومتیں عوام کے سامنے جواب دہ ہوتی تھیں بلکہ اس وقت کی حکومتیں شخصی ہوتی تھیں یا زیادہ سے زیادہ کوئی قوم حاکم ہو جاتی، باقی لوگ محکوم ہوتے تھے۔اقتدار میں عوام کی جوابدہی قطعاً ملحوظ نہیں رکھی جاتی تھی۔ نہ حکومت کسی آئین کی پابند ہوتی تھی۔ بادشاہ کی رائے اور بادشاہ کا قلم پورا آئین ہوتا تھا۔یا وہ لوگ جو بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملا کر حکومت کے منظورِ نظر ہو جائیں۔

ایسی حکومتوں کے ساتھ ہمدردی ذاتی ضرورتوں کی وجہ سے ہوتی تھی۔ یا بادشاہ کے ذاتی اخلاق اور کریکٹر کی وجہ سے۔اگر کوئی انقلاب ہو جائے تو انقلاب سے ملک متاثر تو ہوتا تھا لیکن اس کی وجہ سے بادشاہ یا اس کے خاندان کے ساتھ ہمدردی نہیں ہوتی تھی، بلکہ یہ تاثر آنے جانے والی حکومتوں کے مقاصد کی وجہ سے ہوتا۔

فارسی حکومت شخصی تھی۔ یزدگرد کی موت پر اس کا خاتمہ ہوگیا۔ یزدگرد کا خاندان یقیناً اس انقلاب میں پامال ہوا ہوگا۔لیکن تاریخ اس وقت کسی ایسی سازش کا پتہ نہیں دیتی جو اس خاندان کے ساتھ ہمدردی کے طور پر کی گئی ہو۔نوشیرواں کے بعد ویسے بھی کسریٰ کی

حکومت رو بہ انحطاط تھی، ان کے کردار میں عدل وانصاف کے بجائے استبداد روز بروز بڑھ رہا تھا۔ عوام کو حکومت کے ساتھ کوئی دلچسپی اور محبت نہیں تھی۔ پھر سازش کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

مذہباً فارسی حکومت آتش پرست تھی۔ اسلام نے توحید کے عقیدہ کی سادگی سے یہودیت اور عیسائیت تک کو متاثر کیا۔ بت پرستی ان کے سامنے نہ ٹھہر سکی، آتش پرستی کی وہاں کیا مجال تھی۔ اسلام کی تعلیمات اس مسئلہ میں نہایت مدلل اور واضح تھیں، ان میں کوئی چیز ڈھکی چھپی نہ تھی۔ اسلام کا موقف عقیدۂ توحید کے معاملے میں کھلی کتاب تھا۔ وہ دوسروں کے شبہات اور اعتراضات بڑی کشادہ دلی سے سنتا تھا۔ مخالفین کے شبہات کی تردید اور اصلاح میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا تھا۔ نہ ہی اپنے نظریہ کو کسی پر جبراً ٹھونستا تھا، پھر اس کے خلاف کیوں سازش کی جائے.....کون کرے؟ اور کس طرح کرے؟

فارسی حکومت کا چراغ خلیفہ ثانی کی حکومت میں گل ہوا۔ یزدگرد کو خود اس کی رعایا نے قتل کیا اور اس کے خاتمہ میں مسلم عساکر کی مدد کی۔ پھر سازش کی ضرورت کیسے ہوئی؟ فارس کی فتح کے بعد ہزاروں فارسی اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے۔ جزیہ دیتے رہے، انہیں کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔ ان کے معبد (آتش کدے) مدتوں قائم رہے۔ جو لوگ ان سے اسلام کی طرف راغب ہوئے انہیں اسلام نے پوری ہمدردی کے ساتھ اپنی آغوش میں عزت کی جگہ دی۔

جہاں مذہب یوں آزاد ہو اور سیاست اس طرح بے اثر، ملک کے عوام مسلمانوں کی فتوحات پر خوشیاں مناتے ہوں، جب وہ جنگی مصالح کی بنا پر کسی مقام سے پیچھے ہٹنا پسند کریں تو اس علاقہ میں صف ماتم بچھ جائے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ادارۂ طلوع اسلام اور جناب اسلم جیراجپوری نے سازش کے جراثیم کو کون سی عینک سے دیکھ لیا!!

تاریخ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی عدل گستری اور انصاف پسندی کی وجہ سے فارسی بالکل مطمئن ہو گئے تھے۔ فاتحین کی علم دوستی کے اثرات سے فارس کے تمام ذہین

لوگ سیاست چھوڑ کر فوراً علم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس راہ میں انہوں نے آخرت کی سربلندیوں کے علاوہ علمی دنیا میں بہت بڑا نام پیدا کیا، اور حکومت کے خلاف سازش کا ان کی زبان پر کبھی نام تک نہیں آیا۔ یہ سازش کا پورا کیس مولانا جیراجپوری کے کاشانہ اور ادارہ طلوع اسلام کے دفتر میں تیار ہوا ہے۔ واقعات کی روشنی میں اسے ثابت کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

سازش کی یہ عجیب قسم ہے کہ سازشیوں نے فاتحین کا مذہب قبول کیا۔ پھر ان کے علوم کی اس قدر خدمت کی کہ فاتحین اپنے علوم کی حفاظت سے بے فکر اور کلی طور پر مطمئن ہو گئے۔ پھر فاتحین نے ان میں سے اکثر علوم اور علما کی سرپرستی کی۔ (مقدمہ ابن خلدون:۵۸)

معلوم ہے کہ اُموی خلفاء کے وقت شاہی درباروں میں عجمیوں کو وہ اقتدار حاصل نہ تھا جو عباسی درباروں میں برامکہ کو حاصل ہوا۔ لیکن اُن کا دامن دین کی خدمات سے بالکل خالی تھا۔ قرآن وسنت اور دینی علوم تو بڑی بات ہے، برامکہ سے تو عربی زبان کی بھی کوئی خدمت نہ ہو سکی۔

ہارون الرشید نے امام مالکؒ اور ان کے درس کی سرپرستی کی کوشش کی، لیکن امام مالک نے اسے بے اعتنائی سے مسترد کر دیا، روپیہ دینے کی کوشش کی تو پورے استغنا سے واپس کر دیا۔ سازش کا آخر یہ مقصد ہو سکتا تھا کہ شاہی دربار تک رسائی ہو، مال و دولت اور حکومت میں حصہ ملے، اب دربار خود در دولت پر حاضر ہوتا ہے، اپنی ساری بلندیاں چھوڑ کر پورے انکسار، انتہائی احترام سے خزانوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ تھیلیاں باادب پیش ہوتی ہیں، اور 'سازشی' ہیں کہ نظر اُٹھا کر نہیں دیکھتے۔

بادشاہ عرض کرتے ہیں تشریف لے چلیے، آنکھیں فرشِ راہ ہوں گی، فارسی سازش کے سرغنہ یا فنِ حدیث کے سالارِ قافلہ فرماتے ہیں: ”**والمدينة خير لهم لو كانوا يعلمون**“ مطلب یہ کہ اس بڑے دربار سے علیحدگی میرے لئے ناممکن ہے۔

پھر سازشیوں کا یہ پورا گروہ مختلف عجمی ممالک سے ہزاروں میل سفر طے کر کے مدینہ منورہ

پہنچ کر امام کی خدمت میں تحصیل علم کے لئے پیش ہوتا ہے اور کوئی سوچتا نہیں کہ شیخ عرب ہے، یہ عجمی النسل کہیں پوری سازش کا راز فاش نہ کر دے۔

عرب استاد کے عجمی شاگرد مدتوں استفادہ کرتے ہیں اور انہیں علوم کا درس ہوتا ہے۔ ساتھی ساتھی پر جرح کرتا ہے۔ ایک دوسرے کی کمزوریوں کے کھلے بندوں تذکرے ہوتے ہیں۔ عرب محدثین عجمی علما پر تنقید کرتے ہیں، عجمی اہل عرب کے نقائص کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لیکن اس سازش کا سراغ جس کے اختراع کا سہرا 'طلوع اسلام' کے دفتر پر ہے، نہ کسی عرب کو لگا، نہ کسی عجمی کو۔ نہ استاد نے اسے محسوس کیا نہ شاگرد نے نہ ساتھی نے!!

پھر تعجب یہ ہے کہ فارس کی فتح پہلی صدی کے اوائل میں ہوئی اور اس سازش کا منصوبہ تیسری صدی میں بنایا گیا۔ تقریباً پورے دو سو سال فارسی بے وقوف آرام کی نیند سوتے رہے۔ یعنی جب شکست کا درد اور کوفت تازہ تھی، اس وقت تو فارسیوں کو کوئی احساس نہ ہوا۔ لیکن تین سو سال کے بعد درد کی بے قراریاں انگڑائیاں لینے لگیں اور فارسی سازشیوں نے بخاری ومسلم اور کتب صحاح کی صورت اختیار کر لی۔ فيا للعقول وأربابها

پھر اتنی بڑی سازش جس نے اسلامی اور تعلیمی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، دنیا کے مسلم اور غیر مسلم مؤرخوں کی آنکھیں بے کار ہو گئیں، قلم ٹوٹ گئے اور زبانیں گنگ؟...... ان کی ضخیم کتابیں اس عظیم الشان سازش کے تذکرے سے یکسر خالی ہیں۔ یہ راز سب سے پہلے یورپ کے ملحد مستشرقین پر کھلا اور اس کے بعد دفتر طلوع اسلام کے دریوزہ گروں نے کچھ ہڈیاں مستعار لے لیں۔ ﴿فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ﴾"

(حدیث کی تشریعی اہمیت: ص ۴۲ تا ۴۹)

ہماری ان گزارشات سے واضح ہو گیا کہ ایرانی سازش کا جو شاخسانہ آپ کے رہنماؤں نے چھوڑا ہے وہ کوئی 'ٹھوس حقیقت' نہیں بلکہ ایک 'بدبودار افسانہ' ہے۔ جس نے اسلام کے دانا دشمن یہودی مستشرق گولڈ زیہر اور اس کے رفقا کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور حافظ اسلم، مسٹر پرویز اور

پاکستان کے کچھ بے علم یا محدود العلم کلرکوں کی گود میں پل کر جوان ہوا ہے۔ اور اب آپ جیسے 'محقق' حضرات اسے عام مسلمانوں کے حلق میں ٹھونسنے کے لئے اپنے 'سرمایہ تحقیقات' کی حیثیت سے اس کی نمائش کرتے پھر رہے ہیں۔

خیر جناب! 'سازشی ٹولے' نے پہلی صدی میں اپنی 'سازش' کا آغاز کیا اور تیسری صدی کے اخیر تک مکمل کر لیا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اب ہزار برس بعد یعنی اب سے کوئی اسی برس پہلے آپ حضرات کے ہوش وحواس نے انگڑائی لی اور یہودی وصلیبی مستشرقین کی خردبین لگا کر آپ حضرات نے یہ انکشاف کیا کہ یہ اُمت تو اپنے آغاز سے اب تک 'ایرانی سازش' کا شکار ہے۔ یہ انکشاف بڑی دیر سے ہوسکا۔ اب یہ آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہے۔ اس کی حیثیت مشت بعد از جنگ کی ہے۔ اس لئے اسے شیخ سعدیؒ کے مشورہ کے مطابق آپ اپنے ہی کلے پر مار لیجئے۔ اتنی دیر کے بعد ایسے فوجداری مقدمات کی تفتیش نہیں ہوسکتی اور نہ کوئی دانشمند اس موضوع پر سوچنے کی کوشش کرسکتا ہے!!

روایتوں کے متفرق اور متضاد ہونے کی حقیقت:

آپ نے روایتوں کو متفرق اور متضاد لکھا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی غیر مسلم آپ سے یہ سوال کر بیٹھے کہ آپ کا قرآن ابتداءً متفرق تھا یا مجتمع؟ اور اگر مجتمع تھا تو کس لوح پر، وہ لوح کہاں ہے؟ اسے کس نے دیکھا ہے؟ اور اس بات کی شہادت کیا ہے کہ انہوں نے دیکھا ہے؟ پھر یہ شاہدین قابل اعتبار تھے بھی یا نہیں؟ انہوں نے اپنی شہادت کن کن لوگوں کے سامنے اُدا کی؟ پھر ان لوگوں کی حیثیت کیا تھی؟ وھلم جرا، اگر آپ کے سامنے ایسے سوالات پیش کردیے جائیں تو آپ کیا جواب دیں گے؟ حدیث تو خیر 'فلاں نے فلاں سے اور فلاں نے فلاں سے، کے واسطے سے حضور ﷺ تک پہنچ بھی جاتی ہے۔ مگر آپ لوحِ قرآن کے لئے تو اتنا بھی ثبوت فراہم نہیں کرسکتے۔

باقی رہا تضاد کا معاملہ تو یہ محض ایک 'ہوا' ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں۔ صحیح احادیث میں کوئی

تضاد نہیں۔ ظاہر بینی کے لحاظ سے اگر آپ حضرات نے کچھ مثالیں فراہم کر لی ہیں تو ایسی مثالیں قرآن کے نہ ماننے والوں نے خود قرآن سے فراہم کی ہیں تو کیا آپ تسلیم کر لیں گے کہ (نعوذ باللہ) قرآن میں بھی تضاد ہے؟ پھر آپ حضرات اپنی 'تدبر فی القرآن' کی مخصوص صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے قرآنی آیات کا جیسا کچھ مفہوم سمجھتے ہیں، ان کے لحاظ سے تو قرآن مجید تضاد سے بھرا نظر آئے گا۔ مثال دیکھنی ہو تو پچھلے اوراق پلٹ لیجئے (اور اگلے صفحات میں بھی ملاحظہ فرمائیے گا) ظن کی بحث میں آپ کی پیش کردہ جن قرآنی آیات پر ہم نے بحث کی ہے، وہ سب کی سب آپ کے بتلائے ہوئے مفہوم کے اعتبار سے خود قرآن ہی کی دوسری آیات سے ٹکرا رہی ہیں۔

روایات کی کتابت میں تاخیر:

آپ کو اس کا بھی اِدعا ہے کہ روایتیں کتابت میں آنے سے پہلے زید، عمرو، بکر کی زبانوں پر بے روک ٹوک گشت کر رہی تھیں، اور قیدِ کتابت میں آنے کے بعد اس پر 'صحیح' کا لیبل چسپاں کر دیا گیا۔ ان کی حیثیت نیم تاریخی مواد کی ہے...... وغیرہ

مجھے آپ لوگوں کی جرأت پر حیرت ہے۔ جن حوالوں کی بنیاد پر آپ قیدِ کتابت کی تاریخ متعین کرتے یا کر سکتے ہیں، انہی حوالوں کی رو سے یہ بات بالکل صاف اور قطعی طور پر عیاں ہے کہ احادیث کے قیدِ کتابت میں آنے سے پہلے صرف دو طبقے پائے جاتے ہیں: ایک صحابہ کرام کا طبقہ اور دوسرا تابعین عظام کا۔ پہلا طبقہ وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے 'والذین معہٗ' سے تعبیر کیا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جن کی عملی معیت کو شامل کر کے آپ دین کو مکمل مان رہے ہیں اور دوسرا طبقہ ان کے تربیت یافتگان کا ہے جسے قرآن نے ﴿وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ﴾ (التوبہ:۱۰۰) سے تعبیر کیا ہے۔ کیا قرآن کے یہ دونوں مقدس طبقے آپ کی نگاہ میں ایسے ہی ایرے غیرے، نتھو خیرے قسم کے ہیں کہ آپ انہیں زید عمرو بکر جیسی اہانت آمیز تعبیر کا نشانہ بنائیں، اور اقوال و افعالِ رسولؐ کے متعلق ان کی روایت اور بیان کو ایک کافر کی بے سند تاریخی روایت کے برابر بھی نہ سمجھیں؟

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو!

یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ جن کتابوں اور حوالوں کی بنیاد پر آپ حضرات نے یہ شگوفہ چھوڑا ہے کہ جن حدیثوں پر 'صحیح' کا لیبل چسپاں کیا گیا ہے، وہ حدیثیں قیدِ کتابت میں آنے سے پہلے زید، عمرو، بکر کی زبانوں پر بے روک ٹوک گشت کرتی تھیں اور قصہ گویوں، داستان سراؤں اور واعظوں کی گھڑی ہوئی ہیں ان کتابوں اور حوالوں سے آپ حضرات اپنا دعویٰ قطعاً ثابت نہیں کر سکتے۔

﴿ولو كان بعضهم لبعض ظهيرًا﴾

ان کتابوں اور حوالوں سے جو کچھ سمجھا جا سکتا ہے، وہ یہی ہے کہ اُسوۂ رسولؐ، صحابہ کرامؓ کے درمیان عملاً بھی محفوظ تھا اور قولاً بھی۔ اور اس کے بعد والے طبقوں تک منتقل ہوا۔ پھر تدوین حدیث کے زمانے میں کچھ لوگوں نے اپنے مختلف النوع اغراض کے لئے حدیثیں گھڑیں اور کوشش کی کہ اپنی گھڑی ہوئی احادیث کو اُسوۂ رسولؐ یعنی صحیح احادیث کے ساتھ گڈمڈ کر کے اپنے دیرینہ مقاصد کو حاصل کر لیں۔ مگر وہ اس میں بری طرح ناکام ہوئے۔ شیعوں نے اہل بیت کے سیاسی تفوق کے لئے حدیثیں گھڑیں۔ اباحیت پسندوں نے اپنی راہ ہموار کرنے کے لئے اور عقلیت پسندوں نے اپنی عقلیت کو وجہ جواز فراہم کرنے کے لئے۔ گھڑنے والوں نے اپنی جعلی احادیث کی ترویج کا طریقہ یہ سوچا کہ کچھ مشہور اصحاب حدیث کی صحیح اور قوی سندوں سے ان جعلی احادیث کو روایت کریں تاکہ کسی کو ان کی صحت میں شک نہ ہو۔ لیکن جوں ہی یہ روایتیں اہل علم کے سامنے آئیں، گھڑنے والے پکڑے گئے۔ کیونکہ کسی بھی بڑے محدث کے ہزاروں شاگرد ہوا کرتے تھے۔ اب ممکن نہ تھا کہ کوئی شخص اس محدث سے ایسی حدیث روایت کرے جو ان ہزاروں شاگردوں میں سے کسی کو بھی معلوم نہ ہو اور وہ اس پر بھی اس کا اعتبار کر لیں۔ ایسے راوی پر فوراً جرح شروع ہوتی تھی۔ پچیسیوں تنقیحات ایسی تھیں کہ کسی جعلساز کے لئے نکل بھاگنے کی کوئی راہ باقی نہ بچتی۔ تھوڑی سی زدوخورد کے بعد اسے ہتھیار ڈال دینے پڑتے اور اپنی جعلسازی کا اقرار کر لینا پڑتا۔

محدثین نے حدیث کی صحت پرکھنے کے لئے ایسے سخت اصول وضوابط بنائے اور ایسا کڑا معیار مقرر کیا کہ دنیا آج تک اس کی نظیر نہ لا سکی۔ کوئی دس لاکھ افراد کی زندگیاں کھنگال کر رکھ دیں۔ پھر جملہ افراد کو اس کسوٹی پر پرکھ کر کھرا کھوٹا الگ کر دکھایا۔

تدوینِ حدیث کے تیسرے اور چوتھے دور میں ان جعلی احادیث کا ذخیرہ بھی تالیفی شکل میں باقاعدہ علیحدہ کردیا گیا، تاکہ راہِ حق کے راہرو کے لئے کسی بھی مرحلہ میں مشکل پیش نہ آسکے!!

یہ ہے کہ واقعہ کی اصل صورت جو ان کتابوں اور حوالوں سے مستفاد ہوتی ہے، جن کی بنیاد پر آپ حضرات نے 'ایرانی سازش' کا بدبودار افسانہ تیار کیا ہے۔ اگر آپ کا ایمان بالقرآن آپ کو صدق و دیانت کی اجازت دیتا ہے تو واقعہ کو اس کی حقیقی صورت میں پیش کیجئے اور قبول کیجئے، ورنہ اپنے دعویٰ کی دلیل لایئے......!!

آپ کے استدلال کی نوعیت بالکل وہی ہے کہ کسی گھر میں چور گھس جائے تو آپ گھر والے ہی کو چور کہنے لگیں اور جب آپ سے ثبوت مانگا جائے تو آپ فرمائیں کہ ثبوت یہ ہے کہ اس کے گھر میں چور گھسے تھے، یا کوئی پولیس پارٹی ڈاکوؤں کو گرفتار کرلائے تو آپ پولیس پارٹی ہی کو ڈاکو کہیں اور ثبوت یہ پیش کریں کہ انہوں نے ڈاکوؤں کو گرفتار کیا ہے۔

جنابِ والا! محدثین نے جعل سازوں سے کوئی حدیث روایت نہیں کی ہے اور نہ اپنے ذخیرے میں ان کی روایات کو دَر آنے دیا ہے؛ بلکہ ان کی جعل سازی پکڑ کر لوگوں کو بتلایا ہے کہ فلاں نے فلاں سے روایتیں گھڑی ہیں۔ اس فرض شناسی پر خود محدثین اور ان کی روایتیں آخر موردِ الزام کیسے ٹھہر گئیں۔ بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

آپ نے ذرا آگے چل کر اسی سلسلے میں اناجیل اربعہ کی استنادی حیثیت کی کمزوری بھی بطورِ شہادت پیش کی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ذہن پر یہ ضابطہ کابوس بن کر مسلط ہوچکا ہے کہ کوئی بھی واقعہ اسی وقت قابل قبول ہوسکتا ہے جب کہ وہ علی الفور قیدِ کتابت میں آچکا ہو۔ صرف چند برسوں کی تاخیر بھی اسے مشکوک بلکہ ناقابل قبول بنا دینے کے لئے کافی ہے، اگرچہ درمیان کے ناقلین اور رواۃ کتنے ہی زیادہ مستند اور قابل اعتماد کیوں نہ ہوں، بلکہ خود واقعہ کے عینی شاہد ہی نے اسے کیوں نہ قلم بند کیا ہو۔

میں آپ سے یہ عرض کروں گا کہ اگر آپ کا یہ ضابطہ تسلیم کرلیا جائے تو پھر قرآن مجید کی استنادی حیثیت سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ قرآنِ مجید میں گزشتہ اقوام (قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود،

قومِ مدین واصحاب الایکہ، قومِ ابراہیم، قومِ لوط، قومِ سباوغیرہ وغیرہ) کے واقعات ان کے وقوع کے ہزار ہا ہزار برس کے بعد قلم بند کیے گئے ہیں۔ پھر آپ کے مذکورہ بالا اُصول کی رو سے انہیں کیونکر مستند تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ ایک دشمن اسلام بالکل آپ ہی کے لب ولہجہ اور اندازِ گفتگو میں کہہ سکتا ہے کہ یہ سارے واقعات عرب قصہ گو اور داستان سرا اپنی شبانہ محفلوں، قومی میلوں اور بازاری اجتماعات میں دارا وسکندر اور رستم واسفندیار کے قصوں کی طرح گرمیِ محفل کے لئے بیان کیا کرتے تھے۔ یہ محض عرب کی دیومالائی کہانیوں کا حصہ تھے، ان کی کوئی حیثیت واہمیت نہ تھی۔ بلکہ یہ زید، عمرو، بکر کی زبان پر بے روک ٹوک گشت کیا کرتے تھے، لیکن ہزاروں برس بعد جب قرآن نے انہی قصوں کو قانونِ قدرت کے تاریخی تسلسل کی شہادت کی حیثیت سے پیش کیا تو کلامِ الٰہی بن گیا جس پر ایمان لانا واجب قرار پا گیا اور جس کا انکار کرنا کفر ٹھہر گیا۔ بھلا ان قصوں کا کیوں کر اعتبار کیا جائے جو ہزار ہا برس تک قصہ گویوں اور داستان سراؤں کا موضوعِ سخن بنے رہے، ہر کہ ومہ کی زبان پر بے روک ٹوک گشت کرتے رہے اور جنہیں ان کے وقوع کے ہزار ہا برس بعد ایک نبوت کے دعویدار نے قیدِ کتابت میں لا کر وحی الٰہی اور دین وایمان کا جزو قرار دے دیا۔

بتایئے! اگر آپ کے سامنے دشمن اسلام یہ سوال پیش کردے تو آپ اپنے مذکورہ بالا اُصول پر قائم رہتے ہوئے کیا جواب دے سکتے ہیں؟ اور اگر قرآن کی استنادی حیثیت ماننے اور منوانے کے سلسلے میں آپ اس اُصول کے پابند نہیں تو حدیث کی استنادی حیثیت کے معاملے میں اس اصول کی پابندی پر آپ کو اصرار کیوں ہے......؟

اصل حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کو محفوظ، مستند اور قابل اعتماد قرار دینے کے لئے اس کا قیدِ کتابت میں آیا ہوا ہونا ضروری نہیں ہے۔ یعنی یہ اُصول اور معیار ہی سرے سے غلط ہے کہ اگر کوئی بات اپنے وقوع کے وقت قیدِ کتابت میں آ گئی تو قابل اعتماد ہوگی، ورنہ نہیں۔ اس لئے یہ خیال صحیح نہیں کہ قرآن اس لئے قابل اعتماد واِستناد ہے کہ وہ لکھوا لیا گیا تھا۔ اور احادیث اس لئے قابل اعتماد واستناد نہیں کہ وہ عہدِ رسالت اور عہدِ خلافت میں لکھوائی نہیں گئی تھیں۔ بلکہ اس سلسلہ میں معاملہ کی جو صحیح نوعیت ہے، اسے ذیل کے الفاظ میں سنئے:

''اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ سمجھ لینی چاہئے کہ قرآن کو جس وجہ سے لکھوایا گیا، وہ یہ تھی کہ اس کے الفاظ اور معنی دونوں من جانب اللہ تھے۔ اس کے الفاظ کی ترتیب ہی نہیں، اس کی آیتوں کی ترتیب اور سورتوں کی ترتیب بھی اللہ کی طرف سے تھی۔ اس کے الفاظ کو دوسرے الفاظ سے بدلنا بھی جائز نہ تھا۔ اور وہ اس لئے نازل ہوا تھا کہ لوگ انہی الفاظ میں اسی ترتیب کے ساتھ اس کی تلاوت کریں۔ اس کے مقابل میں سنت کی نوعیت بالکل مختلف تھی، وہ محض لفظی نہ تھی بلکہ عملی بھی تھی، اور جو لفظی تھی، اس کے الفاظ قرآن کے الفاظ کی طرح بذریعہ وحی نازل نہیں ہوئے تھے بلکہ حضور نے اس کو اپنی زبان میں ادا کیا تھا۔ پھر اس کا ایک بڑا حصہ ایسا تھا جسے حضور کے ہمعصروں نے اپنے الفاظ میں بیان کیا تھا۔ مثلاً یہ کہ حضور کے اخلاق ایسے تھے، حضور کی زندگی ایسی تھی، اور فلاں موقع پر حضورؐ نے یوں عمل کیا۔
حضورؐ کے اقوال وتقریریں نقل کرنے کے بارے میں بھی یہ پابندی نہ تھی کہ سننے والے انہیں لفظ بلفظ نقل کریں۔ بلکہ اہل زبان سامعین کے لئے یہ جائز تھا اور وہ اس پر قادر بھی تھے کہ آپ سے ایک بات سن کر معنی ومفہوم بدلے بغیر اسے اپنے الفاظ میں بیان کردیں۔
حضورؐ کے الفاظ کی تلاوت مقصود نہ تھی بلکہ اس تعلیم کی پیروی مقصود تھی جو آپ نے دی ہو۔ احادیث میں قرآن کی آیتوں اور سورتوں کی طرح یہ ترتیب محفوظ کرنا بھی ضروری نہ تھا کہ فلاں حدیث پہلے ہو اور فلاں اس کے بعد۔ اس بنا پر احادیث کے معاملے میں یہ بالکل کافی تھا کہ لوگ اسے یاد رکھیں اور دیانت کے ساتھ انہیں لوگوں تک پہنچائیں۔ ان کے معاملے میں کتابت کی وہ اہمیت نہ تھی جو قرآن کے معاملے میں تھی۔

دوسری بات جسے خوب سمجھ لینا چاہئے، یہ ہے کہ کسی چیز کے سند اور حجت ہونے کے لئے اس کا لکھا ہوا ہونا قطعاً ضروری نہیں ہے۔ اعتماد کی اصل بنیاد اس شخص یا ان اشخاص کا بھروسے کے قابل ہونا ہے جس کے یا جن کے ذریعہ سے کوئی بات دوسرے تک پہنچے، خواہ وہ مکتوب ہو یا غیر مکتوب۔ خود قرآن کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے لکھوا کر نہیں بھیجا بلکہ نبی کی زبان سے اس کو بندوں تک پہنچایا۔ اللہ نے پورا انحصار اس بات پر کیا کہ جو لوگ نبی کو سچا

مانیں گے، وہ نبی کے اعتماد پر قرآن کو ہمارا کلام مان لیں گے۔ نبی ﷺ نے بھی قرآن کی جتنی تبلیغ واشاعت کی، زبانی ہی کی۔ آپ کے جو صحابہ مختلف علاقوں میں جا کر تبلیغ کرتے تھے، وہ قرآن کی سورتیں لکھی ہوئی نہ لے جاتے تھے۔ لکھی ہوئی آیات اور سورتیں تو اس تھیلے میں پڑی رہتی تھیں جس کے اندر آپ ﷺ انہیں کاتبانِ وحی سے لکھوا کر ڈال دیا کرتے تھے۔ باقی ساری تبلیغ واشاعت زبان سے ہوتی تھی اور ایمان لانے والے اس ایک صحابی کے اعتماد پر یہ بات تسلیم کرتے تھے کہ جو کچھ وہ سنا رہا ہے، وہ اللہ کا کلام ہے یا رسول اللہ ﷺ کا جو حکم وہ پہنچا رہا ہے، وہ حضور ہی کا حکم ہے۔

تیسرا اہم نکتہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ لکھی ہوئی چیز بجائے خود کبھی قابل اعتماد نہیں ہوتی، جب تک کہ زندہ اور قابل اعتماد انسانوں کی شہادت اس کی توثیق نہ کرے۔ محض لکھی ہوئی کوئی چیز اگر ہمیں ملے اور ہم اصل لکھنے والے کا خط نہ پہچانتے ہوں، یا لکھنے والا خود نہ بتائے کہ یہ اسی کی تحریر ہے، یا ایسے شواہد موجود نہ ہوں جو اس امر کی تصدیق کر دیں کہ یہ تحریر اسی کی ہے جس کی طرف منسوب کی گئی ہے تو ہمارے لئے محض وہ تحریر یقینی کیا معنی، ظنی حجت بھی نہیں ہو سکتی...... یہ ایک اصولی حقیقت ہے جسے موجودہ زمانے کا قانونِ شہادت بھی تسلیم کرتا ہے اور فاضل جج خود اپنی عدالت میں اس پر عمل فرماتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآنِ مجید کے محفوظ ہونے پر ہم جو یقین رکھتے ہیں، کیا اس کی بنیاد یہی ہے کہ وہ لکھا گیا تھا؟ کاتبین وحی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے صحیفے جو حضورؐ نے املا کرائے تھے، آج دنیا میں کہیں موجود نہیں۔ اگر موجود ہوتے تو بھی آج کون یہ تصدیق کرتا کہ یہ وہی صحیفے ہیں جو حضورؐ نے لکھوائے تھے۔ خود یہ بات بھی کہ حضورؐ اس قرآن کو نزولِ وحی کے ساتھ ہی لکھوا لیا کرتے تھے، زبانی روایات ہی سے معلوم ہوئی ہے، ورنہ اس کے جاننے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔ پس قرآن کے محفوظ ہونے پر ہمارے یقین کی اصل وجہ اس کا لکھا ہوا ہونا نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ زندہ انسان زندہ انسانوں سے مسلسل اس کو سنتے اور آگے زندہ انسانوں تک اسے پہنچاتے چلے آ رہے ہیں۔ لہٰذا یہ خیال ذہن سے نکال

دینا چاہئے کہ کسی چیز کے محفوظ ہونے کی واحد سبیل اس کا لکھا ہوا ہوتا ہے۔

ان اُمور پر اگر فاضل جج اور ان کی طرح سوچنے والے حضرات غور فرمائیں تو انہیں یہ تسلیم کرنے میں ان شاء اللہ کوئی زحمت پیش نہ آئے گی کہ اگر معتبر ذرائع سے کوئی چیز پہنچے تو وہ سند بننے کی پوری قابلیت رکھتی ہے خواہ وہ لکھی نہ گئی ہو۔

تمام منکرین حدیث بار بار قرآن کے لکھے جانے اور حدیث کے نہ لکھے جانے پر اپنے دلائل کا دارومدار رکھتے ہیں۔ لیکن یہ بات کہ حضورؐ اپنے زمانے میں کاتبانِ وحی سے نازل شدہ وحی لکھوا لیتے تھے۔ اور اس تحریر سے نقل کر کے حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں قرآن کو مصحف کی شکل میں لکھا گیا، اور بعد میں اسی کی نقلیں حضرت عثمانؓ نے شائع کیں، یہ سب کچھ محض حدیث کی روایات ہی سے دنیا کو معلوم ہوا ہے، قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ نہ حدیث کی روایات کے سوا اس کی کوئی دوسری شہادت دنیا میں کہیں موجود ہے۔ اب اگر حدیث کی روایات سرے سے قابل اعتماد ہی نہیں تو پھر کس دلیل سے دنیا کو آپ یقین دلائیں گے کہ فی الواقع قرآن حضورؐ کے زمانے میں لکھا گیا تھا؟

کسی کا یہ کہنا کہ عہدِ نبوی کے رواجات، روایات، نظائر، فیصلوں، احکام اور ہدایات کا پورا ریکارڈ ہم کو 'ایک کتاب' کی شکل میں مرتب شدہ ملنا چاہئے تھا، درحقیقت ایک خالص غیر عملی طرزِ فکر ہے اور وہی شخص یہ بات کہہ سکتا ہے جو خیالی دنیا میں رہتا ہو۔ آپ قدیم زمانے کے عرب کی حالت چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لئے آج اس زمانے کی حالت کو لے لیجئے جب کہ احوال ووقائع کو ریکارڈ کرنے کے لئے ذرائع بے حد ترقی کر چکے ہیں۔ فرض کر لیجئے کہ اس زمانے میں کوئی لیڈر ایسا موجود ہے جو ۲۳ سال تک شب وروز کی مصروف زندگی میں ایک عظیم الشان تحریک برپا کرتا ہے۔ ہزاروں افراد کو اپنی تعلیم وتربیت سے تیار کرتا ہے۔ ان سے کام لے کر ایک پورے ملک کی فطری، اخلاقی، تمدنی اور معاشی زندگی میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اپنی قیادت ورہنمائی میں ایک نیا معاشرہ اور ایک نئی ریاست وجود میں لاتا ہے۔ اس معاشرے میں اس کی ذات ہر وقت ایک مستقل نمونہ ہدایت بنی

رہتی ہے۔ ہر حالت میں لوگ اس کو دیکھ دیکھ کر یہ سبق لیتے ہیں کہ کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ ہر طرح کے لوگ شب و روز اُس سے ملتے رہتے ہیں اور وہ ان کو عقائد و افکار، سیرت و اخلاق، عبادات و معاملات، غرض ہر شعبۂ زندگی کے متعلق اُصولی ہدایات بھی دیتا ہے اور جزئی اَحکام بھی۔ پھر اپنی قائم کردہ ریاست کا فرمانروا، قاضی، شارع، مدبر اور سپہ سالار بھی تنہا وہی ہے۔ اور دس سال تک اس مملکت کے تمام شعبوں کو وہ خود اپنے اُصولوں پر قائم کرتا اور اپنی رہنمائی میں چلاتا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آج اس زمانے میں یہ سارا کام کسی ایک ملک میں ہو تو اس کا ریکارڈ 'ایک کتاب' کی شکل میں مرتب ہو سکتا ہے؟

کیا ہر وقت اس لیڈر کے ساتھ ٹیپ ریکارڈ لگا رہ سکتا ہے؟ کیا ہر آن فلم کی مشین اس کی شبانہ روز نقل و حرکت ثبت کرنے میں لگی رہ سکتی ہے؟ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کیا آپ کہیں گے کہ وہ ٹھپا جو اس لیڈر نے ہزاروں لاکھوں افراد کی زندگی پر، پورے معاشرے کی ہیئت اور پوری ریاست کے نظام پر چھوڑا ہے، سرے سے کوئی شہادت ہی نہیں ہے جس کا اعتبار کیا جا سکے؟ کیا آپ یہ دعویٰ کریں گے کہ اس لیڈر کی تقریر سننے والے، اس کی زندگی دیکھنے والے، اس سے ربط و تعلق رکھنے والے بے شمار افراد کی رپورٹیں سب کی سب ناقابل اعتماد ہیں، کیونکہ خود اس لیڈر کے سامنے وہ 'ایک کتاب' کی شکل میں مرتب نہیں کی گئیں اور لیڈر نے ان پر اپنے ہاتھ سے مہر تصدیق ثبت نہیں کی؟ کیا آپ فرمائیں گے کہ اس کے عدالتی فیصلے اور اس کے انتظامی احکام، اس کے قانونی فرامین، اس کے صلح و جنگ کے معاملات کے متعلق جتنا مواد بھی بہت سی مختلف صورتوں میں موجود ہے، اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ایک 'جامع و مانع کتاب' کی شکل میں تو ہے ہی نہیں؟''

(ترجمان القرآن: منصب رسالت نمبر، ص ۳۳، ۳۴، ۱۶۳، ۳۳۶ تا ۳۳۸)

اس وضاحت کے بعد یہ بھی عرض ہے کہ آپ ذخیرۂ حدیث کو فن تاریخ کے معیار پر پورا اُترتا ہوا تسلیم نہیں کرتے، اس لئے آپ کو چیلنج ہے کہ آپ دنیا کے کسی اعلیٰ سے اعلیٰ معیارِ تاریخ کو معیارِ حدیث کے ہم پلہ ہی ثابت کر دیجئے، صرف بڑا بول بول دینا کوئی کمال نہیں!!

الزام تراشی اور نگاری کلامی کے الزام کی حقیقت:

آپ نے منکرین حدیث کا اندازِ اِدّعا بلکہ اندازِ افترا اختیار کرتے ہوئے حدیث کے ایک اور 'تاریک پہلو' کی نشاندہی کی ہے جسے آپ کے بقول 'اسلامی تاریخ' کا 'المیہ' کہنا چاہئے کہ حدیث کے مجموعوں میں ایسی روایات بکثرت ملتی ہیں جو 'الزام تراشی'، 'دروغ بافی' اور 'فحش نگاری' کا مرقع ہیں۔

اور اس 'بکثرت' کی مقدار خود آپ لوگوں کی نشاندہی کے مطابق ایک فیصدی بھی نہیں۔ کیا اسی کو 'بکثرت' کہا جاتا ہے؟ پھر جہاں تک 'دروغ بافی' کا سوال ہے تو حقیقت کھل چکی ہے۔ جب تک آپ یہودی مستشرقین کی خردبین لگا کر دیکھیں گے، یرقان کے مریض کی طرح آپ کو ہر طرف دروغ ہی دروغ نظر آئے گا کیونکہ یہ مرض آپ کے رَگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ اس کا واحد علاج یہ ہے کہ آپ حقیقت پسندی اختیار کریں۔ اور معاملہ کو اس کی صحیح اور اصل شکل میں ملاحظہ فرمائیں۔ ورنہ جب تک آپ گھر کے مالک اور محافظ کو چور اور پولیس پارٹی کو ڈاکو سمجھیں گے، آپ کو اس بیماری سے نجات نہیں مل سکتی۔

باقی رہا 'الزام تراشی' اور 'فحش نگاری' کا دعویٰ تو یہ بھی سراسر زبردستی ہی ہے۔ آپ کے اشارے یا تو ان روایات کی طرف ہیں جن کے جھوٹ ہونے کی قلعی خود محدثین نے کھول دی ہے۔ لیکن آپ کمال ڈھٹائی سے ان چوری پکڑنے والوں ہی کو چور کہہ رہے ہیں یا پھر آپ نے ایسی باتوں کو 'الزام تراشی' اور 'فحش نگاری' قرار دے دیا ہے جن کی نظیریں خود قرآن میں موجود ہیں۔ تو کیا (نعوذ باللہ) آپ قرآن میں 'الزام تراشی' اور 'فحش نگاری' تسلیم کریں گے؟ اگر نہیں تو پھر حدیث اور روایات کی ویسی ہی باتوں کو آپ 'الزام تراشی' اور 'فحش نگاری' قرار دینے پر کیوں تلے بیٹھے ہیں؟ آپ نے جن روایات کی طرف اشارہ کیا ہے، آیئے اُنہیں میں سے ایک آدھ سے اس کی توضیح کرتے ہیں:

آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام لیا ہے۔ ان کی بابت صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ

اُنہوں نے اپنی زندگی میں تین کذبات کا ارتکاب کیا ہے۔کذب، جھوٹ، غلط اور خلاف واقعہ بات کو کہتے ہیں۔صحیح بخاری کی یہ روایت سنتے ہی آپ حضرات بھی، اور قائلین حدیث میں سے بعض عقلیت پسند بھی سیخ پا ہو جاتے ہیں۔لیکن آیئے ذرا سنجیدگی سے اس روایت پر غور کریں!!

اس روایت میں جن تین کذبات کا انتساب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کیا گیا ہے، ان میں سے دو کی تفصیلات خود قرآن میں مذکور ہیں۔قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ

''حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم سے باتیں کر رہے تھے۔اچانک انہوں نے تاروں پر ایک نظر ڈالی اور کہا کہ میں بیمار ہوں۔قوم چلی گئی اور حضرت ابراہیم نے جھٹ اُٹھ کر ان کے بتوں کو توڑ پھوڑ ڈالا۔قوم نے واپس آ کر معاملے کی تفتیش کی۔حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ تمہاری حرکت ہے؟ انہوں نے کہا: بلکہ اس بڑے بت نے یہ حرکت کی ہے، اگر تمہارے یہ معبود بولتے ہیں تو ان سے پوچھ لو......الخ''۔

اس میں دو باتیں قابل غور ہیں: (۱) ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیماری کا عذر جس سیاق وسباق میں کیا تھا، اس کا منشا یا تو یہ تھا کہ میں تمہارے ساتھ چلنے کے لائق نہیں۔یا یہ کہ بیماری کے سبب میرے لئے بات چیت کرنی مشکل ہے۔لیکن جوں ہی قوم ہٹی، وہ جھٹ اُٹھے اور بتوں پر پل پڑے۔اگر واقعتا وہ ایسے ہی بیمار تھے جیسی بیماری کا اظہار فرمایا تھا تو کیا وہ بت خانے تک پہنچ سکتے تھے؟ اور بتوں کو توڑ سکتے تھے؟ (۲) دوسری بات یہ ہے کہ انہوں نے بت شکنی کا الزام بڑے بت پر عائد کیا۔کیا واقعتاً اُسی نے باقی بتوں کو توڑا تھا؟ یقیناً نہیں۔ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دونوں باتیں خلاف واقعہ کہی تھیں، جسے عربی زبان میں 'کذب' کہتے ہیں۔

تیسرے واقعہ کی تفصیل صحیح بخاری میں ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ

''ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی سارہ کے ہمراہ ایک جابر حکمراں کے علاقے سے گزرے۔وہ حکمراں خوبصورت عورتیں چھین لیتا تھا۔اگر ساتھ میں شوہر ہوتا تو قتل کر دیا جاتا تھا۔حضرت سارہ کو بھی اس حکمران نے طلب کیا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ تم مجھے اپنا بھائی ظاہر کرنا''۔

متعدد مآخذ میں اس کی وضاحت بھی ہے کہ حضرت سارہ کچھ دور کے تعلق سے حضرت ابراہیمؑ کی بہن ہوتی تھی؛ یوں بھی وہ دینی بہن تھیں۔ لیکن جس سیاق میں وہ اپنے آپ کو بہن کہتیں، اس سے سننے والا یہ سمجھتا کہ وہ حقیقی بہن ہیں۔ اس لئے یہ بات خلاف واقعہ ہوئی۔

یہ تینوں معاملے ایک اور پہلو سے بھی قابل غور ہیں۔ پہلے اور دوسرے موقع پر خلاف واقعہ بولے بغیر بھی مقصد حاصل ہوسکتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کہہ سکتے تھے کہ آج مجھے معاف رکھیں، میں آپ حضرات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اسی طرح وہ بڑے بت کا نام لئے بغیر کہہ سکتے تھے کہ مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ اپنے ان معبودوں سے پوچھ لو، اگر بولتے ہوں۔ لیکن تیسرا موقع بڑا نازک تھا۔ بیوی اور جان دونوں خطرے میں تھے۔ ایسی صورت میں قرآن نے ارتکابِ کفر کی اجازت دی ہے: ﴿ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ ﴾ اس لئے یہ تیسرا واقعہ بھی قرآن کی نگاہ میں معیوب نہیں۔

یہ ہے ان تین کذبات کا خلاصہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں۔ ان میں سے پہلے دو کی نسبت خود قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کی ہے۔ صحیح بخاری میں ان کا صرف حوالہ دیا گیا ہے۔ البتہ تیسرا واقعہ صرف صحیح بخاری میں ہے۔ اب ظاہر ہے کہ آپ اس نسبت کو 'الزام تراشی' اور 'دروغ بافی' کا مرقع قرار دے رہے ہیں تو آپ کے اس الزام کا صرف ۱/۳ حصہ صحیح بخاری پر عائد ہوتا ہے جس کے جواز کا فتویٰ دینے میں خود قرآن بھی شریک ہے اور اس الزام کا باقی ۲/۳ حصہ قرآن پر عائد ہوتا ہے۔ غور فرمائیے کہ آپ نے کس جسارت اور دلیری کے ساتھ حدیث دشمنی کے جوش میں قرآنِ مجید ہی کو 'الزام تراشی' اور 'دروغ بافی' کا مرقع قرار دے دیا۔ فنعوذ بالله من شرور أنفسنا

☆ آپ نے حضرت یوسف علیہ السلام کا نام بھی لیا ہے۔ حالانکہ صحیح احادیث میں تو ان پر کوئی الزام نہیں۔ بلکہ انہیں کریم ابن کریم ابن کریم ابن کریم کہا گیا ہے اور قید خانے میں ان کی ثابت قدمی پر ان کی مدح وتوصیف کی گئی ہے۔

البتہ قرآن میں یہ بتلایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے حقیقی بھائی سے ساز باز کرکے ان کے غلے

میں شاہی برتن رکھ دیا۔ پھر اپنے بھائیوں کے قافلے پر چوری کا الزام عائد کرا کر ان کی تلاشی لی اور حقیقت چھپانے کے لئے پہلے دوسرے بھائیوں کی تلاشی لی، پھر اپنے حقیقی بھائی کے غلہ سے برتن نکال کر دوسرے بھائیوں سے لئے گئے اقرار کے مطابق اپنے حقیقی بھائی کو اپنے پاس روک لیا۔

غالباً آپ کے ذہن میں یہی واقعہ تھا۔ لیکن آپ کو یہ یاد نہیں رہا کہ اس کا ذکر بھی قرآن میں ہے۔ اسلئے آپ نے اسے شانِ انبیا کے خلاف سمجھ کر احادیث اور روایتوں پر 'الزام تراشی' کا الزام تراشنے میں اپنی چابک دستی کا مظاہرہ فرما دیا۔ لیکن آپ کی اس چابک دستی کی زد حدیث کے بجائے قرآن پر آ پڑی۔

قریب قریب یہی معاملہ ان بقیہ شخصیتوں کا ہے جن کے اسماءِ گرامی آپ نے ذکر کیے ہیں، اگر تفصیل میں آپ جانا چاہتے ہیں تو چلئے ہم بھی تیار ہیں۔

سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے!

ہماری اس توضیح سے یہ حقیقت بھی سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ آیا امام بخاریؒ کا نام سن کر جماعت اہلحدیث پر 'سہم کا دورہ' پڑ جاتا ہے، یا آپ حضرات پر جوشِ مخالفت میں سرسامی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، جس کے بعد آپ حضرات کو ہوش ہی نہیں رہتا کہ آپ کیا بک رہے ہیں اور کس کے خلاف بک رہے ہیں۔

آپ نے حدیث پر 'مثلہ معہ' کی پھبتی بھی چست فرمائی ہے۔ مگر بتایئے کہ جب قرآن مجید نے اُسوۂ رسول ﷺ کو مدارِ نجات قرار دے کر اپنے بنیادی احکام تک کی تفصیلات اسی پر چھوڑ دی ہیں، اور اس اُسوہ کو اس حد تک وسعت دی ہے کہ پیغمبروں کے خواب تک کو وحیِ الٰہی اور حکمِ الٰہی کا درجہ دے رکھا ہے اور جگہ جگہ ایسی وحی کے حوالے دیئے ہیں جن کا قرآن میں کہیں نام و نشان تک نہیں تو خود اس قرآن کے بارے میں کیا ارشاد ہوگا؟ حدیث سے پہلے آپ کی اس پھبتی کی زد تو خود قرآن ہی پر پڑ رہی ہے۔ اگر آپ اسے ماننے کے لئے تیار نہیں تو آئندہ ہم اس اجمال کی تفصیل بھی پیش کر سکتے ہیں۔

اَن گنت راویوں پر ایمان لانے کا معاملہ:

آپ نے یہ بھی سوال اٹھایا ہے کہ قرآن پر ایمان لانے کے لئے رسول کی رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ پس اسی طرح روایتوں کو حدیثِ رسولؐ ماننے کے لئے تمام راویوں پر ایمان لانا ضروری ہوگا۔ تو کیا ہمیں اللہ اور رسول کی طرف سے اَن گنت راویوں پر ایمان لانے کی تکلیف دی گئی ہے؟

اولاً: میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ نے حضور کو خود دیکھا ہے؟ اور حضورؐ پر قرآن کے نزول کا بذاتِ خود مشاہدہ کیا ہے؟ نہیں اور یقیناً نہیں۔ بلکہ آپ تو چودھویں صدی میں پیدا ہوئے ہیں۔ اب آپ بتائیے کہ آپ کو اس بات کا علم کیسے ہوا کہ حضور پیغمبر تھے؟ اور آپ پر یہی قرآن نازل ہوا تھا جو اس وقت ہمارے ہاں متداول ہے؟ آپ یہی کہیں گے کہ اس امت کے اجماعی نقل وتواتر سے یہ قرآن ہم تک پہنچا ہے، اس لئے ہم اس کی صحت کا یقین رکھتے ہیں۔

اب مجھے عرض کرنے دیجئے کہ آپ کے مقرر کئے ہوئے اُصول کے مطابق قرآن پر ایمان لانے کے لئے صرف حضور کی رسالت پر ایمان لانا کارآمد نہ ہو سکے گا، بلکہ اس چودہ سو برس کے دوران پیدا ہونے والے تمام مسلمان مردوں اور عورتوں پر (خواہ زاہد و متقی ہوں، خواہ فاسق و فاجر) ایمان لانا ہوگا تو کیا ہمیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اس اُمت کے اَن گنت نیک و بد انسانوں پر ایمان لانے کی تکلیف دی گئی ہے؟ انا للہ

ثانیاً: قرآن نے جو یہ حکم دیا ہے کہ اگر کوئی فاسق خبر لائے تو تحقیق کر لو، جس کا صاف تقاضا یہ ہے کہ اگر 'متقی' خبر لائے تو تحقیق کی بھی حاجت نہیں، یوں ہی مان لو۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اگر اُسوۂ رسولؐ کے متعلق کوئی شخص کوئی خبر دے تو قرآن کے اس اصول اور حکم پر عمل کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ اگر قرآن کے اس حکم پر عمل کیا گیا، اور اس کی بتائی ہوئی خبر قابل قبول ثابت ہوئی تو کیا اس خبر کو ماننے کیلئے اس شخص پر ایمان لانا پڑے گا؟ اگر ایمان لانا پڑے گا تو پھر ایسے جتنے بھی افراد پر ایمان لانا پڑے، لائیے؛ یہ تو عین حکم قرآنی کا اتباع ہوگا۔ اور اگر نہیں لانا پڑے گا تو پھر آپکے اس

چیخ و پکار کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے کہ روایتوں کو قبول کرنے کا مطالبہ کرکے درحقیقت ہم سے اَن گنت راویوں پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا جارہا ہے؟

اللہ کے بندے! اپنے تفقہ فی الدین اور تدبر فی القرآن کی کچھ تو لاج رکھنی تھی۔ ہماری پچھلی گزارشات سے واضح ہو چکا ہے کہ آپ جس چیز کو ایک 'ٹھوس حقیقت' سمجھے بیٹھے ہیں وہ درحقیقت ایک پھسپھسا تخیل ہے جس کی حیثیت ﴿كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ نِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَالَهَا مِنْ قَرَارٍ﴾ (ابراہیم:۲۶) سے زیادہ نہیں ہے۔

اگر کوئی ٹھوس حقیقت ہے تو صرف یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب پر ایمان لانا فرض ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان لانا، آپ کی اطاعت کرنا، آپ کے فیصلوں کو دل کی تنگی و ناگواری کے بغیر تسلیم کرنا اور ان فیصلوں کے مقابل میں اپنے آپ کو خودمختار نہ سمجھنا، آپ کے اُسوے اور طریق عمل کی پیروی کو رضائے الٰہی اور نجاتِ آخرت کا مدار سمجھنا اور آپ کے اوامر ونواہی کی پابندی کرنا فرض ہے۔ یہ سارا فرض خود قرآن نے عائد کیا ہے، اس فرض کو عائد کرنے کے بعد اس نے دین کے بڑے اہم اہم اور بنیادی قسم کے مسائل میں خاموشی اختیار کرلی ہے۔ نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم سینکڑوں جگہ دیا ہے مگر ان کی تفصیلات سے خاموشی ہے۔ اسی طرح اس نے زندگی کے بے شمار مسائل میں صرف بعض بنیادی اُمور کی طرف اشارہ کرکے خاموشی اختیار کرلی ہے۔ کیونکہ اس نے باقی تفصیلات کا دار و مدار اُسوۂ رسولؐ پر رکھ دیا ہے۔

اب جو لوگ یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ قرآن سے باہر اُسوۂ رسولؐ کہیں بھی محفوظ نہیں رہ گیا ہے، اور احادیث کے نام سے جو ذخائر اُمت کے ہاتھ میں متداول ہیں، ان کی کوئی حیثیت اور کوئی مقام نہیں، وہ درحقیقت قرآن کو ناقابل عمل اور اس کی رہنمائی کو سراپا لغو سمجھ رہے ہیں، اور انکارِ حدیث کا لبادہ اوڑھ کر قرآنی تعلیمات کو روندنے اور کچلنے کی کوشش کررہے ہیں۔

وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو عاجز و درماندہ اور مجبور و بے بس سمجھ رہے ہیں کہ اس نے اُسوۂ رسولؐ کی پیروی کا حکم تو دے دیا اور اسے مدارِ نجات تو ٹھہرا دیا، لیکن چند ہی برس بعد جب چند 'ایرانی سازشیوں' نے اس اُسوۂ رسولؐ کے خلاف 'سازش' کی تو اپنی تمام تر قوت و طاقت، ملک و جبروت

اور حکمت وقہرمانی کے باوجود ان کی 'سازش' کو ناکام نہ بنا سکا، اُمتِ مرحومہ کی دستگیری نہ کر سکا اور ہمیشہ کے لئے گمراہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیا۔

وہ لوگ اپنے یہودی مستشرقین کی پلائی ہوئی شراب 'حقیقت پسندی' کے نشے میں بدمست ہو کر ساری اُمت کو بیوقوت سمجھ بیٹھے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی شاہراہِ ہدایت سے کٹ کر اور لوگوں کو کاٹ کر اپنی عقلی تک بندیوں کے خارزار پر دوڑانا چاہتے ہیں، جو سراسر بے انصافی اور انتہائی زیادتی ہے اور جس کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَاتَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَ تْ مَصِيْرًا﴾

''جو شخص ہدایت واضح ہو جانے کے بعد رسول اللہ کی مخالفت اختیار کرے گا، اور مؤمنین کی راہ سے الگ تھلگ اپنی راہ بنائے گا، ہم اسے اسی راہ پر ڈال دیں گے جسے اس نے اختیار کیا ہے، اور اسے جہنم میں جلائیں گے اور وہ بد ترین ٹھکانہ ہے''(1)۔ (النساء:۱۱۵)

(1) ماخوذ از ماہنامہ محدث، لاہور، پاکستان۔ اشاعتِ خاص، فتنۂ انکارِ حدیث، ص:56، 86۔ البتہ اس نام سے مولانا کی ایک کتاب بھی ہے۔ یہ سارا مواد اس میں موجود ہے۔ مگر میں نے یہ مواد ماہنامہ محدث لاہور سے لیا ہے۔ اللہ جزائے خیر دے بھائی حافظ حسن مدنی ﷾ کو، جنھوں نے میرے ایک دو فون پر پاکستان سے سعودی عرب ہمیں یہ سارا مواد بذریعے انٹرنیٹ بھیج دیا۔ میں اس کے لیے موصوف کا تہِ دل سے مشکور ہوں۔

سخن ہائے گفتنی

(مقدمہ از کتاب: قادیانیت اپنے آئینے میں)

الحمد لله الذي بنعمته تتم الحسنات وهو يتولى الصالحين والصلاة والسلام على عبده ورسوله محمد آخر الرسل وخاتم النبيين الذي لا نبي بعده إلى يوم الدين وعلى صحابته الكرام البررة الذين هم قادة هذه الأمة وسادة المؤمنين وبعد:

1974ء کے وسط کی بات ہے کہ اچانک اخبارات کے اندر پاکستان میں قادیانی تصادم فسادات کی اطلاعات شائع ہونا شروع ہوئیں اور اس کے فوراً بعد اس خبر نے خصوصی اہمیت اختیار کر لی کہ پاکستان کے تمام مسلم فرقوں کے رہنما اور قائدین متفقہ طور پر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیے جانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس مطالبہ کی خبروں سے ہندوستان کے اندر مسلمانوں کی نئی پود اور تعلیم یافتہ طبقہ سخت نالاں اور برگشتہ نظر آتا تھا۔ خود مجھ سے بھی میرے بعض رفقاء نے اپنے نہایت شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ وہ اس مطالبہ کو اسی قسم کی تکفیری مہم کا ایک حصہ سمجھتے تھے، جیسی مہم پچھلے ڈیڑھ دو سو برس سے مختلف اسلامی فرقوں کے درمیان چل رہی ہے۔ اسی دوران ہندستان کی بعض مسلم اسلامی شخصیتوں کی طرف سے بعض کثیر الاشاعت ماہناموں میں ایسے مضامین بھی شائع ہوئے جن سے اس مطالبہ کے خلاف پیدا شدہ ردعمل کو بڑی تقویت ملی۔ اس مضمون سے یہ بے جا تاثر قائم ہوتا تھا کہ قادیانیوں کی تکفیر کا معاملہ محض علمائے کرام کی تنگ نظری و تنگ ظرفی کا رہین منت ہے جو اپنے نتائج و عواقب کے لحاظ سے امت مسلمہ کے لیے سخت مضرت رساں ہے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ یہ ردِعمل قادیانی مذہب اور قادیانی امت سے متعلق اصل حقائق سے محض بے خبری اور ناواقفیت کا نتیجہ تھا۔

دوسری طرف مختلف اسلامی فرقوں اور طبقوں کی نمائندگی کرنے والے رسائل و جرائد نے اس

وقت کے پیدا شدہ ماحول اور فضا کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک عجیب وغریب قسم کی روش بلکہ مہم کا مظاہرہ کیا۔ قادیانیوں کی تکفیر کے جو لوگ حامی تھے اور اس کی تکفیر سے جو لوگ برگشتہ تھے ان دونوں ہی طبقوں میں کم از کم اتنا احساس ضرور پایا جارہا تھا کہ قادیانیت ایک نہایت ہی سخت قسم کی ضلالت وگمراہی اور فتنہ ورخنہ ہے، جس کی جڑ اکھاڑ پھینکنی ضروری ہے۔ اس لیے وہ ایسی شخصیتوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے جنہوں نے اس فتنے کے استیصال میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ اس کیفیت یا ذہنی ردکا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر فرقے اور طبقے کے رسائل وجرائد نے عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ قادیانیت کے خلاف میدان کارزار کے سپہ سالار اور ہراول دستے کے سپاہی ہمارے ہی طبقے اور فرقے کے علما تھے۔ گروہی عصبیت اور شخصیت پرستی کے اس جوش میں ایسی شخصیتیں دب گئیں جنہوں نے واقعتاً اس میدان میں پوری بے لوثی کے ساتھ بے لاگ جدوجہد کی تھی، اور اسلامی دفاع کے علمبرداروں میں سب سے پیش پیش تھے۔ اور ایسی شخصیتوں کی بجائے رسائل وجرائد کے صفحات پر ایسے چہرے نمایاں ہوگئے جن کا اس سلسلہ میں یا تو سرے سے کوئی کارنامہ ہی نہ تھا یا تھا مگر بہت ہی معمولی اور نہایت درجہ محدود۔ ان رسائل وجرائد کی مہم پر شاعر کا ٹھیک یہی تبصرہ صادق آتا تھا کہ:

وَكُلٌّ يَدَّعِي وَصْلاً بِلَيْلَى
وَلَيْلَى لا تُقِرُّ لَهُمْ بِذَاكَا

ان دونوں صورتِ حال کا تقاضا تھا کہ ایک طرف قادیانیت کے حقیقی خط وخال کو منظر عام پر لاکر ان لوگوں کی غلط فہمی دور کی جائے جو اس دین جدید...... قادیانیت ...... اور اس کے حاملین کو فروعی اختلافات رکھنے والے اسلامی فرقوں کی طرح ایک فرقہ سمجھتے ہیں اور دوسری طرف ان شخصیات کا حق تعارف ادا کیا جائے جنہوں نے اس میدان میں اسلامی دفاع کے علم بردار بن کر بے لوث اور بے لاگ خدمات انجام دی ہیں۔

1974ء کے اواخر میں میں اوّل الذکر موضوع پر قلم اٹھانے کے لیے پر تول ہی رہا تھا کہ اچانک میرا تقرر جامعہ سلفیہ (مرکزی دارالعلوم) بنارس ہوگیا۔ یہاں آکر مجھے حکم ملا کہ میں اس سلسلہ میں

اسلامی دفاع کے سب سے بڑے علم بردار اور امت مسلمہ کے سب سے بڑے قادیانیت شکن سپہ سالار شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمتہ اللہ علیہ کی مساعی، جدوجہد اور تگوتاز کی تفصیلات قلم بند کروں۔ میں نے فوری طور پر کسی قدر بے ترتیبی کے ساتھ اس کام کا آغاز کر دیا۔ مگر اپنی گوناگوں مصروفیات ومشاغل کے سبب سال بھر تک کوئی قابل ذکر کام نہ کرسکا۔

دوسرے سال یعنی 1975ء کے اواخر میں میں نے از سر نو اس کام کا باقاعدہ آغاز کیا، اس وقت ارادہ تھا کہ ابتدائے کتاب میں قادیانیت کے متعلق ایک جامع اور مختصر تعارف کے طور پر چند صفحات کا ایک نوٹ شامل کر دیا جائے گا، لیکن جب اس مقصد کے لیے میں نے موافق ومخالف مصادر وماخذ کھنگالنے شروع کیے تو ایسے ایسے حقائق سامنے آئے کہ میں خود دنگ رہ گیا اور میں نے محسوس کیا کہ قادیانیت کی تردید اور اس کے مکروہ چہرے اور گھناؤنے عزائم کو بے نقاب کرنے کے سلسلے میں لمبے چوڑے استدلالات کی زحمت اٹھانے کی بجائے صرف اتنی سی بات کافی ہوگی کہ خود ان ہی کے آئینہ میں ان کا چہرہ دکھلا دیا جائے اور خود اس ملت کے بانی اور اس کے عمائدین کی تحریرات میں جن حقائق کا بار بار اقرار اور اعتراف کیا گیا ہے انہیں بلا کم وکاست ہدیہ قارئین کر دیا جائے۔ مجھے یقین تھا اور ہے کہ ان حقائق کے سامنے آجانے کے بعد کوئی بھی ایسا شخص جو کسی بھی درجہ میں اسلامی مبادیات کا شعور رکھتا ہو اور طبیعت کی سلامتی سے آراستہ ہو قادیانیوں کے سلسلے میں کسی غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہ سکتا اور نہ ایک لمحہ کے لیے یہ گوارا کرسکتا ہے کہ اس خطرناک ترین گروہ کو امت مسلمہ کا جزو تسلیم کر کے اس امت کے اندر اسے در آنے اور اپنی فتنہ سامانیوں سے اس امت کا گلا گھونٹنے کی اجازت دی جائے۔ اس یقین اور اس احساس کے تحت میں نے قادیانیت سے متعلق حاصل شدہ حقائق کو جمع کرنا شروع کر دیا اور اختصار کی تمام تر کوششوں کے باوجود یہ سلسلہ اتنا طویل ہو گیا کہ تنہا اس موضوع پر ایک مستقل کتاب تیار ہوگئی۔ پھر بھی کئی گوشے ایسے رہ گئے جن کی طرف یا تو صرف اشارہ کیا گیا ہے یا ان پر سرے سے گفتگو ہی نہیں کی گئی ہے۔

باقی رہا شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کی شخصیت اور رد قادیانیت کے سلسلہ میں ان کی مساعی کا تعارف جو آغاز کار کے وقت میرا اصل موضوع تھا تو اس کے لیے ایک دوسری مستقل

کتاب مخصوص کرنی پڑی۔ الحمد للہ کہ ایک سال سے کچھ زائد عرصہ کی جدوجہد کے بعد دسمبر 1976ء تک ان دونوں موضوعات پر میری کوششیں اپنے تمام و کمال کو پہنچ گئیں۔

کتاب کے حوالوں کے سلسلے میں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ اقتباسات بالعموم ان ہی ماخذ سے لیے گئے ہیں جن کا حوالہ دیا گیا ہے، لیکن بعض بعض ماخذ دستیاب نہ ہو سکے۔ ایسے ماخذ کے حوالے بالواسطہ دیئے گئے ہیں، لیکن اس سلسلے میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ یا تو اس واسطے کی نشان دہی کر دی گئی ہے جس سے حوالہ ماخوذ ہے یا اتنے کثیر واسطوں سے اس حوالہ کی صحت کی تحقیق وتصدیق کر لی گئی ہے کہ شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے۔

کہیں کہیں اقتباس لیتے وقت اصل عبارت کی تلخیص کر دی گئی ہے، لیکن کسی عبارت کو اس کے سیاق وسباق سے کاٹ کر، تلخیص کی خراد پر چڑھا کر اس کا مفہوم بدلنے اور اس کے منشاومقصود کا برادہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ ہر عبارت کا صرف وہی مفہوم لیا گیا ہے جو عبارۃ النص، اشارۃ النص، دلالۃ النص یا اقتضاء النص سے ثابت ہوتا ہے۔

حوالہ جات کی صحت کا بڑی سختی کے ساتھ التزم کیا گیا ہے، تاہم ممکن ہے کہ نظر کی چوک سے صفحہ نمبر، جلد نمبر یا اس طرح کی کسی چیز کی نشان دہی میں غلطی ہو گئی ہو، لیکن کسی عبارت کا حوالہ بلا تحقیق نہیں دیا گیا۔ نہ تقاضائے دیانت وامانت کے خلاف کوئی چیز قلم بند کی گئی ہے اور نہ حقائق کی نشان دہی اور تفصیل کے سلسلے میں کسی قسم کی جانب داری سے کام لیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس حقیر کوشش کو شرف قبول بخشے کہ امت مسلمہ کے لیے مشعل حق بینی وحق شناسی ثابت ہو اور مصنف کے لیے ذخیرہ آخرت اور توشۂ معاد کا کام دے۔ آمین۔

یارب تقبله بقبول حسن وانبته نباتاً حسناً

صفی الرحمن الاعظمی

جامعہ سلفیہ بنارس (ہند)

چہارشنبہ ۱۳ صفر ۱۳۹۷، 2 فروری 1977ء

سخن اولین

(مقدمہ از کتاب: فتنہ قادیانیت اور مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ)

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی انْزَلَ عَلَی عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا. فَأَكْمَلَ بِهِ دِيْنَهُ وَأَتَمَّ بِهِ نِعْمَتَهُ وَأَنْقَذَ بِهِ مِنْ حَفْرَةِ النَّارِ مَنْ كَانَ عَلَى شَفَا. وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى أَفْضَلِ الْخَلِيقَةِ مُحَمَّدِ الَّذِی بَعَثَهُ إِلَى الْخَلْقِ أَجْمَعِينَ، فَأَنْهَى بِهِ الرُّسُلَ وَخَتَمَ بِهِ الْأَنْبِيَاءَ. وَهَدَى بِهِ مِنَ الضَّلَالَةِ وَبَصرَ بِهِ مِنَ الْعَمَى وَفَتَحَ بِهِ أَعْيُنًا عُمْيًا وَآذَانًا صُمًّا وَقُلُوبًا غُلْفًا. ثُمَّ وَرَّثَ عَلَيْهِ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عَدُولَهُ يَنْفُونَ عَنْهُ تَحْرِيفَ الْغَالِّينَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِينَ وَتَأْوِيلَ الْجَاهِلِينَ وَأُولَئِكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلَى. وَجَعَلَ مِنْ رواد الدَّجَّالِ وَأَشْيَاعِهِ مَن ادَّعَى النُّبُوَّةَ وَالرِّسَالَةَ بَعْدَهُ، وَأُولَئِكَ هُمُ الْأَشْقِيَاءُ. أَمَّا بَعْدُ:

پیش نظر کتاب کا موضوع مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ کے ان کارناموں اور خدمات کا تعارف ہے جو موجودہ صدی میں ملت اسلامیہ کے خلاف اٹھنے والی خطرناک ترین تحریک ''قادیانیت'' کے ردوابطال میں آپ نے انجام دی تھیں۔ قادیانی تحریک کیا ہے؟ اس کے ظاہری خدوخال کیا ہیں؟ اور پس پردہ حقائق کیا ہیں؟ اس کی بھرپور اور مدلل تفصیلات خود قادیانی حوالوں کے ذریعہ ہم نے ایک علیحدہ تصنیف میں پیش کر دی ہیں۔ یہاں اصل موضوع سے پہلے ان کا صرف ایک اجمالی خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔ تاکہ مولانا کی خدمات کا پس منظر اور ان کی صحیح نوعیت واہمیت سمجھی جاسکے۔

قادیانیت کے باوا آدم مرزا غلام احمد صاحب قادیانی ہیں۔ جن کی پیدائش 1839ء یا 1840ء میں ہوئی۔ موصوف بچپن میں چڑیاں پھنسانے کے شوقین تھے۔ دیگر کھیل کود سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ضدی مزاج تھے۔ بچپن ہی میں تعلیم کا آغاز ہو گیا تھا۔ تقریباً بیس سال کی عمر تک

تحصیل علم کیا۔ 1864ء میں اپنے والد کی پنشن کی ایک بھاری رقم لے کر فرار ہو گئے۔ اور پندرہ روپیہ ماہوار پر سیالکوٹ کچہری میں ملازمت اختیار کر لی۔ چار سال بعد 1868ء میں مختاری کے امتحان میں بیٹھے لیکن فیل ہو گئے۔ اس ''حادثہ ناکامی'' سے بددل ہو کر ملازمت سے استعفاد ے دیا۔ اور وطن واپس آگئے۔ یہاں زمینداری اور مقدمہ بازی کے شغل میں ایک عرصہ گزارنے کے بعد 1877ء میں مذہبی اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ اور ایک مناظر اسلام کے روپ میں اسلام کی پرزور اور جذباتی وکالت کر کے عام مسلمانوں کو بہت جلد اپنی طرف مائل کر لیا۔ اسی دوران آپ نے تصوف کا روپ دھار کر مختلف حکمتوں اور تدبیروں سے خلق خدا پر اپنی بزرگی وخدارسیدگی کا سکہ بھی بٹھانا شروع کیا۔ پنجاب کی زمین اس مقصد کے لیے بڑی زرخیز ثابت ہوئی۔ چند برسوں میں آپ کا ایک وسیع حلقۂ ارادت تیار ہو گیا۔ اب آپ نے پر نکالنے شروع کیے۔ اور 1884ء تک اپنے آپ کو مامور من اللہ، مجدد وقت اور خدا کا الہام یافتہ قرار دیتے ہوئے مختلف نوع کے بہت سارے الہامات شائع کر دیے۔ یہی موقع تھا جب پہلی بار علمائے اسلام چونکے۔ اور انہوں نے محسوس کیا کہ مرزا صاحب اپنی ان کاروائیوں کے ذریعہ نبی بننے کی تیاری کر رہے ہیں۔ مگر مرزا صاحب نے ان کے اس قسم کے اندیشوں کی بڑی سختی کے ساتھ نفی کی۔ موصوف نے ختم نبوت کے عقیدہ پر بڑی پختگی کے ساتھ اپنے اٹل یقین کا اظہار کیا اور اسے تسلیم نہ کرنے کو کفر قرار دے کر لوگوں کو تقریباً مطمئن کر دیا۔

اس کے بعد مارچ 1889ء میں مرزا صاحب نے اپنے دام افتادگان سے ایک دس نکاتی شرائط نامہ پر بیعت لے کر ایک باقاعدہ تنظیم کی داغ بیل ڈالی۔ اور اس تنظیم کو محکم بنیادوں پر استوار کر لینے کے بعد جنوری 1891ء میں اپنے مسیح موعود ہونے کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی ایک پانچ نکاتی منصوبہ بھی شائع کیا جس کا مقصد تنظیم کے افراد کے درمیان باہمی ربط، مالی نظام اور تبلیغی کوششوں کو مزید وسعت اور استحکام دینا تھا۔ پھر 1894ء میں آپ نے اپنے مہدی معہود ہونے کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ اور آخر کار 1901ء میں نبوت ورسالت کا دعوی کر بیٹھے۔ جس پر مرتے دم تک قائم رہے۔

مرزا صاحب کے دعوے ان ہی دائروں میں محدود نہ تھے بلکہ آپ نے مختلف اوقات میں مختلف خدائی صفات کے بھی دعوے کیے۔ کبھی دعوی کیا کہ مجھے مارنے اور جلانے کی قدرت دی گئی ہے۔

کبھی کہا کہ میں نے آسمان وزمین پیدا کیے ہیں۔ کبھی ارشاد ہوا کہ میں تقدیر کا لکھنے والا ہوں۔ اور کبھی دوٹوک لفظوں میں فرمادیا کہ بعینہ خدا ہوں۔ حد یہ ہے کہ اپنے آپ کو ابن مریم ثابت کرنے کے لیے ارشاد فرمایا کہ دو سال تک آپ پر نسوانی کیفیت یعنی صفت مریمیت طاری رہی۔ اس دوران آپ کو حیض بھی آیا۔ پردے میں نشوونما ہوئی۔ خدا سے ایک نہانی تعلق قائم ہوا۔ یعنی خدا نے آپ کے ساتھ رجولیت کا اظہار فرمایا۔ اس تصرف سے آپ حاملہ ہوئے۔ اور پھر اپنے حمل سے آپ خود ہی پیدا ہو کر ابن مریم ہوگئے۔

ان دعووں کے ساتھ ساتھ مرزا صاحب اپنے پیروکاروں کو مسلمانوں سے بالکل الگ تھلگ اور جُداگانہ امت بنانے کی تیاریاں بھی کرتے رہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ انہوں نے ان کی امت کے اکابر نے اپنا خدا، رسول، کتاب، شریعت، عبادات، قانون، مناکحت، دین اور شعائر دین مقامات مقدسہ، تاریخی شخصیتیں، تقویم وکلنڈر، جنت ودوزخ اور سزا وجزا کا معیار سب کچھ مسلمانوں سے الگ کر دیا۔ اور وہ ہر حیثیت سے ایک جداگانہ امت بن گئے۔

اس پورے عرصہ میں علماء اسلام کے ساتھ تصادم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ تاہم مرزا صاحب اپنے شعبدوں اور چلتر بازیوں کی بنیاد پر اپنے دام افتادوں کو اپنے پنجہء حیلہ دفن کے اندر جکڑے رہنے میں خاصے کامیاب رہے۔ مخالفین میں سے مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ کا دار مرزا صاحب کے لئے سب سے زیادہ پُر خطر اور صبر آزما ہوا کرتا تھا۔ اس لئے مرزا صاحب نے 15 اپریل 1907ء کو ایک طولانی اشتہار شائع کیا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مرزا صاحب اور مولانا ثناءاللہ میں سے جو جھوٹا ہے وہ سچے کی زندگی ہی میں ہلاک ہو جائے گا۔ اس اشتہار کے مطابق مرزا صاحب 26 مئی 1908ء کو انتقال کر گئے اور مولانا امرتسری اس کے بعد کوئی چالیس برس (مارچ 1948ء) تک زندہ رہے۔

مرزا صاحب کی تحریک جہاں اپنے ظاہری رخ کے لحاظ سے محض ایک مذہبی تحریک تھی وہیں اپنی خفیہ سرگرمیوں اور بنیادی مقاصد کے لحاظ سے ایک خطرناک سیاسی تحریک تھی۔ یہ وہ دور تھا جب برطانوی استعمار، عالم اسلام کے ایک بہت بڑے حصے پر مضبوطی کے ساتھ اپنا پنجہ گاڑ چکا تھا۔ اور

بچے کھچے عالم اسلام کو اپنے پنجۂ اقتدار میں جکڑنے کے لیے طرح طرح کی سازشوں کے تانے بانے تیار کر رہا تھا۔ لیکن ابھی مسلم حلقوں سے جہاد کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ یورپ کا ''مرد بیمار'' ترکی نئی طاقت وتوانائی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ سامراج کے زیر اقتدار مسلم ریاستوں میں آئے دن بغاوت کے لاوے پھوٹ رہے تھے، اور نہتے باغیوں کی مثالی جرأت وشجاعت اور بے نظیر فوجی کارناموں پر بڑے بڑے جرنیل اور کرنل انگشت بدندان رہ جاتے تھے۔ ان کے جوش جہاد اور شوق شہادت کے لیے یہ تصور آگ پر تیل کا کام دے رہا تھا کہ ظہور مہدی اور نزول مسیح کا زمانہ قریب آچکا ہے۔ ان حالات کے پیش نظر انگریزوں کو اپنی جرأت وشجاعت اور فوجی حکمت عملی کے بجائے اپنی عیاری ومکاری اور روباہی وچالبازی پر زیادہ بھروسہ کرنا پڑ رہا تھا، اور اس مقصد کے لیے انہیں مختلف قوموں کے مقابلے میں خود انہیں قوموں کے افراد آلہ کار کی حیثیت سے مطلوب تھے۔

ہندستانی مسلمانوں کے مقابل میں انہوں نے اپنے لئے جس آلہ کار کا انتخاب کیا تھا وہ تھے مرزا صاحب قادیانی اور احمد رضا خاں صاحب بریلوی۔ مرزا صاحب نے انگریزوں کے خلاف جہاد کو زبردست حرامکاری اور گناہ کبیرہ بتلایا۔ کسی جنگجو اور فاتح مہدی اور مسیح کی آمد کے تصور اور انتظار کو دماغی فتور قرار دیا۔ انگریزوں کی وفاداری وحمایت کو فریضۂ شرعی ٹھہرایا اور ان مقاصد کی اشاعت کے لیے اس قدر لٹریچر شائع کیے جن سے بقول ان کے پچاس الماریاں پُر ہوسکتی تھیں۔ ادھر اپنی ان مساعی کو ہندوستان کی حدود تک محدود رکھنے کی بجائے عراق وعرب اور روم ومصر وشام تک پہنچا دیا۔ اور اس طرح مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت کو انگریزوں کے لیے ہموار کر دیا۔ اور اسی دوران اپنے پیروکاروں کو انگریزی گورنمنٹ کی ایسی جاں نثار فوج بنا دیا جس کا ظاہر وباطن جذبہ خیر خواہی ووفاداری سے بھرا ہوا تھا۔

مرزا صاحب نے مسلمانوں کے خلاف جاسوسیاں کیں اور جذبہ ''بغاوت'' رکھنے والوں کی تفصیلات، رازہائے سربستہ کی طرح گورنمنٹ کی خدمت میں پیش کیں، دیگر مسلم ممالک میں بھی ان کے جاسوس سرگرم رہے۔ اسی جرم میں کابل کے اندر مرزا صاحب کی زندگی میں ان کے بعد متعدد قادیانی سنگسار کیے گئے۔ ماریشیش کے مسلمانوں کے خلاف بھی ان کی ریشہ دوانیاں چلتی

رہیں۔ جنگ عظیم اول کے دوران انگریزوں کو قادیانی امت مالی اور فوجی امداد دیتی رہی۔ پھر ان کی فتح اور عالم اسلام کے سقوط پر قادیان میں مثالی جشن منایا گیا۔ ہندستان کی ہر سیاسی تحریک میں قادیانیوں نے مسلم دشمن موقف اختیار کیا۔ آزادی کے بعد پاکستان میں قادیانیوں نے فوج کے اندر اور باہر اپنا تسلط قائم رکھ کر وہاں کے عوام کو مسلسل اذیت پہنچائی۔ انہیں کچلتے اور ان کی حق تلفی کرتے رہے، اور اپنے سامراجی آقاؤں کے اشارے پر ہمیشہ ایسے حالات برپا کرنے کے لیے کوشاں رہے جس سے ملک میں عدمِ استحکام بلکہ تباہی و بربادی اور شکست وریخت کی صورت رونما ہو۔ اور اس میں انہیں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ ان کی سازش سے پاکستان کے دو ٹکڑے ہوئے۔ پھر بچے ہوئے پاکستان پر قادیانی اقتدار مسلط کرنے کے لیے انہوں نے طرح طرح کی گھناؤنی سازشیں کیں۔ ہوائی فوج پر چھا گئے۔ بری اور بحری فوج کے کلیدی مناسب پر اپنے پنجے گاڑنے کی بھرپور کوشش کی اور اس کے ساتھ ہی توڑ پھوڑ کا آغاز کر دیا۔ مسلمان چونکے اور ان کے عام مطالبے کے بعد پاکستانی پارلیمنٹ نے قادیانی عقائد کی مکمل تحقیق کر کے انہیں 7 ستمبر 1974ء کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔

اسرائیل میں قادیانیوں کا ایک اہم مشن ہے جو 1956ء اور 1967ء کی عرب اسرائیل جنگوں میں اسرائیل کی حمایت اور عربوں کی مخالفت میں متعدد اہم اقدامات کر چکا ہے۔ عالم اسلام کو ہر ممکن طریق سے نقصان پہنچانا اور کمزور کرنا قادیانیوں کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔

یہ ہے قادیانیوں کی اصل تصویر، جس پر پردہ ڈال کر وہ بڑے معصومانہ انداز میں ناواقف مسلمانوں سے ملتے ہیں اور بہ سہولت شکار کر لیتے ہیں۔

چونکہ اپنی مستقل تصنیف میں ہم قادیانیت کی اس تصویر سے نقاب کشائی کر چکے ہیں اس لئے یہاں ان ہی چند اشارات پر اکتفا کر رہے ہیں۔ وباللہ التوفیق

صفی الرحمن الاعظمی

یوم دوشنبہ، ۸ ربیع الآخر ۱۳۹۷ھ 18 اپریل 1977ء

جامعہ سلفیہ۔ ریوڑی تالاب بنارس (یوپی)

جوہر شناس

(اشاعتِ خاص ہفت روزہ الاعتصام، لاہور)

ہماری طالب علمی کا دور بھی کچھ عجیب تھا(1)۔ غیر درسی کتابوں ورسائل وجرائد کا مطالعہ شجرۂ ممنوعہ تو نہیں لیکن استعداد وصلاحیت کے لیے مضرت رساں ضرور باور کرایا جاتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبہ کی لائبریری جو اپنی کم وکیف کے لحاظ سے یوں ہی نیم یتیم ہوا کرتی تھی۔ اپنے اکلوتے زائرین (طلبہ) کی بے التفاتی بلکہ کم نگہی کا داغ اپنے سینے میں جمائے کسی غم خانۂ یاس وقنوط کا منظر پیش کیا کرتی تھی۔ جہاں کبھی کبھی چند ایک تعزیت کنندگان آبیٹھتے ہوں۔ ہم بھی تنوع حاجات اور ذوق جستجو کی کشش وکش مکش کے باوجود اس شجر پر آسیب کے زیرِ سایہ آنے میں محتاط ہوا کرتے

(1) مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے پاکستان کے معروف سلفی عالم مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کی وفات حسرت آیات کے بعد جب ان کے فرزند ارجمند حافظ محمد شاکر رحمہ اللہ نے ہفت روزہ الاعتصام کا مولانا بھوجیانی نمبر نکالنے کا ارادہ کیا تو مولانا صفی الرحمٰن صاحب کی خدمت میں بھی یہ درخواست کی کہ آپ ان کے بارے میں جو کچھ تاثر رکھتے ہیں، لکھیں۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے ''جوہر شناس'' کے عنوان سے یہ مضمون لکھا۔ میں نے اس مضمون کو یہاں اپنی کتاب میں شامل کر دیا۔ ایک مرتبہ رات ڈیڑھ دو بجے میں ہفت روزہ الاعتصام کا یہ خصوصی نمبر مطالعہ کر رہا تھا۔ اس میں مولانا مرحوم کا یہ مضمون پڑھا تو بہت زیادہ متاثر ہوا۔ اور یہ مضمون پڑھنے کے بعد اسی صفحہ پر میں نے اپنا تاثر لکھا جس کا مفہوم تھا کہ اف! یہ ہے دھوکے باز دنیا!! جس نے کسی کے ساتھ وفا کا ثبوت نہیں دیا۔ کل مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کی وفات پر مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے اپنا تاثر لکھا۔ اور آج خود ان کے انتقال کے بعد میں ان کی سوانح حیات لکھنے بیٹھا ہوں۔ اور کل کو جب میں یہ دنیا چھوڑ کر چلا جاؤں گا تو اگر اس قابل ہوا تو میرے بارے میں بھی لوگ اپنے تاثرات کا اظہار کریں گے۔ اللہ اکبر...... اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولانا بھوجیانی صاحب کو، اور مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری صاحب کو اور دیگر علماء ومحدثین اور تمام مسلمانوں کو بخش دے اور مرنے کے بعد ہمیں بھی ان کے ساتھ جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

تھے۔خوش قسمتی سے ہمارے تایا مولانا عبدالصمد صاحب مبارک پوری رحمہ اللہ کے ذوق علم وعمل کی بدولت گھر پر اردو اور عربی زبان میں دینی، علمی، فنی اور مسلکی کتابوں کا ایک مختصر مگر قیمتی مجموعہ موجود تھا۔تعطیل کے زمانہ میں ذوق جستجو اور شوقِ مطالعہ کے ہاتھوں مذکورہ تصور کے تارہ و پود بکھر جاتے اور دنیائے علم کے بعض نئے زاویوں کی زیارت نصیب ہو جاتی۔اسی سلسلے میں ایک بار اردو کتابوں اور رسائل وجرائد کے غیر منظم ڈھیر کو الٹتے ہوئے امام شوکانیؒ کے حالات زندگی پر ایک کتابچہ دستیاب ہو گیا۔جس کا مطالعہ قلب ونظر کی دنیا پر گہرا اثر چھوڑ گیا۔ٹھوس اور پر کشش اسلوب بیان، بچے اور رَچے ہوئے الفاظ نپے تلے جملے، معانی سے بھرپور اور حشو وزوائد سے پاک فقرے، مرتب اور مربوط نکات، مدلّل اور دل پذیر باتیں، جڑے ہوئے نگینوں جیسے اقتباسات، ایک طالب علم کی بساط سے باہر تھا کہ ایسے جوئے گوہر دار گوہر بار کو ایک جست میں عبور کر جائے۔ چھوٹے سے رسالے نے توجہ اور وقت دونوں اندازے زیادہ لیا۔مگر قلب ونظر کی دنیا پر ایسی چھاپ چھوڑ گیا کہ تیس سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود آج تک گویا سارے نقوش تازہ ہیں۔

ہر چند ہوا راہ نوردی کو زمانہ
یادوں کا مگر آج بھی ہر نقش نیا ہے

مذکورہ کتابچہ مولانا عطاء اللہ محمد حنیف مرحوم کے خامۂ تحقیق کا ایک چھوٹا سا نقش ہے۔اور میرے لئے مولانا کی شخصیت سے واقفیت کا پہلا ذریعہ۔ کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ لاہور سے ''رحیق'' نام کا ایک نہایت معیاری ماہنامہ رسالہ جاری ہوا ہے جس میں اکابرین جماعت کے بڑے قیمتی مضامین ومقالات شائع ہو رہے ہیں۔اور مولانا موصوف اس کے مدیر اعلیٰ ہیں۔مزید کچھ عرصہ بعد جب طالب علمی کے معروف دور سے ''فراغت'' حاصل ہوگئی اور مسند تدریس پر بیٹھ کر حقیقی طالب علمی کا دور شروع کیا تو سب سے پہلے جو کتابیں زیر درس آئیں اُن میں سُنن نسائی بھی تھی۔گو سُنن نسائی کا جو نسخہ مولانا مرحوم کی التعلیقات السلفیة کے ساتھ پاکستان سے شائع ہوا تھا وہ ہندوستان میں نایابی کی حد تک کم یاب تھا مگر خوش قسمتی سے ہمیں اس کا ایک نسخہ دستیاب ہو گیا تھا، اور ہم نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔چنانچہ تدریسی سال ختم ہوا۔تو ہم اس کا لفظ لفظ چاٹ

چکے تھے۔ اس اثناء میں ہمیں رحیق کے تینوں سال کی پوری فائل المکتبۃ السلفیۃ لاہور کے زیر اہتمام شائع شدہ ''مرعاۃ المفاتیح'' جلد اول اور ''حیات امام احمد بن حنبل'' بھی دستیاب ہو چکی تھیں۔ جن کے مطالعہ سے مولانا مرحوم کی قد آور شخصیت، علمی گہرائی، تحقیقی ذوق، تصنیفی نفاست پسندی، خدمت کتاب وسنت کا پرسوز جذبہ، مسلک سلف کی بے لاگ ترجمانی اور طباعت واشاعت کے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار کی خواہش وکوشش کے بہت واضح نقوش ابھر کر سامنے آئے۔ اور میں نے وہ کچھ سیکھا جو کسی باذوق استاد کی طویل تربیت کے طفیل بمشکل حاصل کیا جا سکتا ہے۔ پھر ذوق جستجو نے مہمیز لگائی۔ اور مولانا سے یکا دکا خط وکتابت بھی ہوئی۔ شوق کا تقاضا ہوا کہ نقل مکانی کر جاؤں اور مولانا سے استفادہ کروں۔ مگر قضاوقدر کا فیصلہ یہ تھا کہ ہندستان کی سرزمین ہی پر اس کی تکمیل ہو۔

چنانچہ مولانا کی باقی تحریریں بھی وہیں رہ کر پڑھی گئیں۔ حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، حیات حضرت امام ابوحنیفہؒ وغیرہ کی تعلیقات واصول میں مولانا کے بکھرے ہوئے علمی جواہر پارے اور ان کی نشر واشاعت اور تقدیم وتصدیر وغیرہ میں مولانا مرحوم کے علمی دفنی ذوق نے قند مکرر کا لطف دیا۔ اور اپنے طالب علمانہ ذوق کو مولانا کے جدید شاہکاروں کا برابر انتظار رہنے لگا۔ اور یہ آرزو بھی جڑ پکڑتی گئی کہ ایک بار حاضرِ خدمت ہو کر شرف ملاقات حاصل کرلوں اور بالآخر قدرت نے اس آرزو کی تکمیل کے اسباب فراہم کر دیے۔

جب راقم کی کتاب ''الرحیق المختوم'' کو سیرت نبویؐ کے عالمی مقابلے میں اولیت کا شرف حاصل ہوا تو برادرم حافظ احمد شاکر صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ مولانا موصوف اس کا اردو ترجمہ نہایت اعلیٰ اور نفیس معیار پر شائع کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ اس آرزو کی تکمیل میرے لئے سعادت کا درجہ رکھتی تھی، مگر مشاغل کے ہاتھوں ترجمے کا کام کئی سال مؤخر ہو گیا۔ اور اس دوران مولانا کی صحت کے بارے میں تشویشناک خبریں آنے لگیں۔ بالآخر ہجوم کار کے باوجود ترجمے کا آغاز کر دیا۔ اور تسوید وتبییض سے فارغ ہو کر گردوپیش کی گرفتیں توڑتا ہوا چند دنوں کے لیے پاکستان جا پہنچا۔

مولانا مرض کی شدت سے بڑی حد تک افاقہ ضرور پا چکے تھے مگر جسم اور زبان دونوں اس حد تک متاثر تھے کہ نیم معذوری کی کیفیت تھی۔ گفتگو کے بہت سے اجزاء کا سمجھنا مشکل ہوا کرتا تھا اور اس

طرح بعض بڑی قیمتی، معلوماتی اور تاریخی باتوں کا تسلسل اور رابطہ کٹ کٹ جاتا تھا۔ تاہم مولانا کی ملاقات اور صحبت نے جماعت کی تاریخ اور جہد وعمل کے بہت سے مستور گوشوں سے پردہ ہٹایا۔

سفر سے کچھ عرصہ پہلے میں نے صلاح الدین یوسف صاحب کی کتاب ''خلافت وملوکیت کی تاریخی وشرعی حیثیت'' شروع سے آخر تک نہایت ذوق وشوق سے پڑھی تھی جو مولانا مودودیؒ کی کتاب خلافت وملوکیت کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اور سنجیدگی اور علمی وتاریخی تحقیقات کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس کتاب سے صرف یہی نہیں کہ مولانا مودودی کے نقطۂ نظر کی مکمل تردید تغلیط ہو جاتی ہے بلکہ علمی خیانت وفریب دہی، عبارتوں میں ہیرا پھیری، واقعات کے سلسلے میں غلط بیانی، فنون حدیث اور نقدِ رجال میں اناڑی پنی کی شکلوں میں مولانا مودودی کے مختلف چہروں سے بھی پردہ ہٹتا ہے۔ جس کے بعد اس گنجائش کا دائرہ انتہائی تنگ ہو جاتا ہے کہ جو انسان محض ایک تاریخی قضیے میں کسی مخاصمے اور مجادلے کے ابھرنے سے پہلے محض اپنی ذاتی تحقیق کے مرحلے میں اپنے نقطۂ نظر کے اسباب کے لیے قصداً تحریف وفریب کاری جیسے کارناموں کا ارتکاب ڈالتا ہو، اور اس ناروا حرکت کے ذریعہ بعض چوٹی کے صحابہ کرام کو جاہلیت کا درآمد کنندہ یا جاہلیت کا ٹھیٹھ نمائندہ قرار دیتا ہو۔ اور اسی پر اپنے فہم اسلام اور اصول تحریک کی بنیاد رکھتا ہو۔ اس کی علمی واسلامی اور اس کی برپا کردہ اسلامی تحریک پر اعتماد کیا جا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ موصوف سے عقیدت کے باوجود جب ان کی تحریر کا یہ چونکا دینے والا پہلو سامنے آیا تو میں بڑی حد تک مضطرب اور متزلزل ہو گیا۔ اور پھر جا وبے جا اس کے متعدد ثبوت مل جانے کے بعد طبیعت نے کسی طرح گوارا نہ کیا کہ بایں ہمہ موصوف سے عقیدت ووابستگی برقرار رکھی جائے۔

خیر یہ بات تو یوں ہی مقطع میں آپڑی تھی ورنہ عرض یہ کر رہا تھا کہ حافظ صلاح الدین یوسف صاحب کا یہ شاہکار جہاں ان کے جوہر قابل ہونے کا ایک نمایاں ثبوت ہے وہیں مولانا کی جوہر شناسی اور ان کے باکمال انداز تربیت کا بھی آئینہ دار ہے۔ کیونکہ یہ کتاب مولانا کی سرپرستی اور رہنمائی میں لکھی گئی ہے۔ حافظ صاحب کی دوسری تمام تحریریں بھی جس قدر سنجیدہ اور زورِ استدلال سے بھرپور ہوتی ہیں۔ ان سے بھی مولانا کے انداز تربیت اور کمال جوہر شناسی پر روشنی پڑتی ہے۔

اس مناسبت سے مولانا کے مزید ایک وصف کا علم مجھے ملاقات کے دوران ہوا۔ میں جب ذرا پرسکون ہو کر مولانا کی خدمت میں بیٹھا تو موصوف نے مجھے ایک طولانی تحریر مطالعہ کے لیے عنایت فرمائی جس کا کم وکیف دیکھ کر یہ شعر یاد آ گیا۔

ملے تو حشر میں لے لوں زبان ناصح کی
عجیب چیز ہے یہ طول مدعا کے لیے

صاحب تحریر کی شخصیت میرے لیے غیر معروف نہ تھی، اس لئے میں نے تحریر پڑھنی چاہی، نہ اس بارے میں کوئی گفتگو کرنی چاہی۔ مگر مولانا کے اصرار پر چند صفحات پڑھنے ہی پڑے۔ پھر میں نے معذرت کر دی۔ مجھے مولانا کی گفتگو سننے اور ان سے مستفید ہونے کا اشتیاق تھا۔ مگر مولانا نے موضوع نہ بدلا اور نپے تلے جملوں میں بتایا کہ اس تحریر کو پڑھ کر صاحب تحریر کے بارے میں ان کے تاثرات کیا تھے اور میں ان تاثرات کو سن کر حیرت زدہ تھا۔ مولانا کی فراست مومنانہ کس غضب کی تھی کہ اس تحریر نے اپنی تمام تر سلامت روی اور جذبۂ خیر کے مظاہرہ کے باوجود صاحب تحریر کی پوری حقیقت مولانا پر منکشف کر دی۔ ایسے ہی مواقع کے لیے کہا گیا ہے:

الأَلْمَعِي الَّذِي يَظُنُّ بِكَ الظَّنَّ
كَأَنْ قَدْ رَأَى وَقَدْ سَمِعَا

روشن دماغ دُور اندیش جو تمہارے بارے میں کوئی گمان کرے اس نے گویا واقعتاً دیکھا اور سن لیا۔

مسلک سلف سے مولانا کو نہایت ٹھوس اور پختہ وابستگی تھی۔ اور عقائد کے باب میں وہ دوسرے علمائے اہلحدیث کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی حساس تھے۔ اس کا اندازہ مولانا کی عام تحریروں کے علاوہ بالخصوص ان حواشی سے لگایا جا سکتا ہے جو موصوف نے ''حیاۃ شیخ الاسلام ابن تیمیہ'' پر رقم فرمائے ہیں۔ اس تعلق سے مولانا نے سنن نسائی کے حواشی کے نام کے بارے میں ایک نہایت لطیف بات بیان فرمائی۔ فرمایا کہ عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ حواشی چونکہ چند علمائے اہلحدیث کے حواشی کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہیں۔ اس لئے ''التعلیقات السلفیۃ'' نام رکھا گیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان حواشی میں میں نے جہاں عقائد اور بالخصوص اسماء وصفات پر گفتگو کی ہے وہاں سلف کے

نقطۂ نظر کی ترجمانی کی ہے۔ اس لئے اس کا یہ نام منتخب کیا گیا ہے۔

اس موقع پر اس بات کا ذکر بھی بجا نہ ہوگا کہ اس باب میں شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری رحمہ اللہ اور متعدد دوسرے علمائے اہلحدیث کے درمیان خاصا اختلاف پایا جاتا تھا۔ جس نے مختلف اوقات میں خاصی اہمیت اور شدت اختیار کر لی تھی اور بعض ایسے معاملات وجود میں آگئے تھے جنہیں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ہمارے محترم مولانا عطاء اللہ حنیفؔ صاحب رحمہ اللہ کا نقطۂ نظر مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ سے مختلف تھا۔ لیکن اس کے باوجود جب بھی مولانا امرتسریؒ کا تذکرہ فرماتے تھے، کمال ادب واحترام سے فرماتے تھے۔ اور یہ ادب واحترام عام تحریروں سے لے کر نجی مجالس تک ممتد تھا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مرحوم فضائل اخلاق کے کس درجہ پر فائز تھے۔ غالباً انہیں اخلاق عالیہ کا نتیجہ تھا کہ خاموشی اور گوشہ گیری کے باوجود مقبول خاص وعام تھے اور ہردلعزیزی کے حظ وافر سے بہرہ مند سرافروز۔

نادر کتابوں، قدیم مسودات اور مخطوطات سے مولانا کو عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ اس کا اندازہ اس جدوجہد اور ان قربانیوں سے لگایا جاسکتا ہے جو آپ نے مختلف مسودات اور نوادرات کے حصول کے لیے کی تھیں۔ اور جن کا کسی قدر تذکرہ ان کے مقدمات طبع میں آگیا ہے۔ اس باب میں مولانا ......صاحب مکتبہ ہونے کے باوجود...... مادی سودوزیاں کی فکر سے قطعی بالاتر تھے۔ ان کی ہر ممکن کوشش یہ ہوا کرتی تھی کہ صحیح علم وتحقیق پر مبنی کوئی بھی نادرۂ روزگار چیز اگر موجود ہے تو اسے کسی نہ کسی طرح منظرِ عام پر آجانا چاہیے۔ مولانا کے بلندی کردار کا یہ پہلو ہے جس کے نمونے آج کی دنیا میں حددرجہ نادر ہیں۔ کثر الله فينا أمثاله۔

دعا ہے کہ اللہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور آپ کے درجات بلند سے بلندتر کرے(1)۔

نور الله ضريحه وحشره مع الذين أنعم الله عليهم من النبيين والصّديقين والشّهداء والصالحين وحسن أولئك رفيقًا۔

---

(1) دیکھئے: ہفت روزہ الاعتصام لاہور پاکستان کا خصوصی شمارہ، مارچ 2005ء۔

رخصت اے بزمِ چمن

[ماہنامہ محدث ستمبر 1988ء کے حوالے سے]

قارئینِ محدث کے لیے غالباً یہ اطلاع نئی نہ ہوگی کہ میں جامعہ سلفیہ سے رخصت ہو کر مدینہ منورہ جا رہا ہوں اور میرے ہاتھوں ترتیب پانے والا محدث کا یہ آخری شمارہ ہے، اسے ترتیب دیتے ہوئے لازماً نگاہ پلٹ کر پیچھے کی طرف جاتی ہے، خوب اچھی طرح یاد ہے کہ ہماری طالب علمی کے اواخر کا زمانہ جب جماعت کے بلند ایوانوں سے یہ بشارت سنائی پڑی کہ ایک عرصہ دراز سے جماعت کو جس مرکزی درس گاہ کا انتظار تھا، اب وہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے کو ہے، ہم طلبہ کے لیے ایسی کسی درس گاہ کی خوشخبری کوچہء جاناں کے تصور سے کم نہ تھی، چنانچہ ہم سراپا شوق بن کر اس گھڑی کا انتظار کرنے لگے، جب یہ خواب شرمندہ تعبیر ہونے والا تھا، ہمارے وجود کا ایک ایک ذرہ پکار رہا تھا کہ ۔

اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفل ما باز آئی

لیکن اس وقت کے آنے سے پہلے ہماری طالب علمی کی بساط لپٹ گئی۔ اور ہم زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کرنے کے لیے ذمہ داریوں کے ایسے لق و دق صحرا میں پھینک دیے گئے جہاں سے پلٹ کر دوبارہ یہ بساط بچھانی ممکن نہ تھی، تاہم احساس وشعور کے دائرہ میں ایسی کسی درس گاہ کے ساتھ عقیدت ومحبت کے جو شرارے روشن تھے، ان کی تپش بڑھتی ہی گئی، یہی وجہ تھی کہ تاسیس افتتاح کی ہر دو تقریبات میں نہایت ذوق وشوق سے حصہ لیا گیا اور پروگراموں کے ایک ایک حصہ پر متجسسانہ اور عقیدت مندانہ نظر ڈالی گئی، تاسیس کے موقع پر مولانا عبدالمتین صاحب مرحوم (نور الله مرقده وأسكنه فسيح جناته) نے جو تاریخی تقریر فرمائی تھی، اس کے عالمانہ اور گرانقدر

مشمولات، پر جلال انداز بیان اور پر شکوہ لب ولہجہ آج تک یاد ہے، افتتاحی تقریب میں درس بخاری کی جو مجلس سجی، وہ بھی نظروں کے سامنے ہے۔

ہر چند ہوا ترک تعلق کو زمانہ

یادوں کا مگر آج ہر زخم ہرا ہے

اپنے مرکز سے عقیدت کی اس تپش نے پورے وجود کو جذبہ خدمت سے سرشار رکھا تھا، مگر ایسے مرکز کی فلک پیما بلندی کے تصور اور اپنی علمی بے مائیگی کے احساس کے درمیان فاصلہ اتنا طویل نظر آتا تھا کہ امید نہ تھی کہ کبھی اس جذبہ خدمت کو جامہ عمل پہنانے کی سعادت نصیب ہو سکے گی۔ لیکن ایک دن ایسا آیا جب اس سعادت نے خود بڑھ کر ہاتھ تھام لیا۔ یہ شوال ۱۳۹۴ھ (اواخر 1974ء) کا زمانہ تھا۔ پر ہجوم زندگی سے نکل کر یہاں قدم رکھا تو فراغت و کتاب و گوشہ چمن کا سماں تھا، مگر فراغت کے یہ لمحات تیزی سے پر ہوتے گئے اور گوشہ چمن سے جلد ہی نکل کر موجوں کے بیچ میں آنا پڑا، پھر کیا قدم قدم پر نشیب وفراز سے سابقہ پیش آیا۔ سرد وگرم فضاؤں سے دوچار ہونا پڑا، بہار وخزاں کی رنگینیوں اور ویرانیوں کے تماشے دیکھے۔ طوفان کے جھونکوں سے سابقہ پیش آیا، جنہوں نے قدم ڈگمگانے اور اکھاڑنے کی کوشش کی مگر تعمیر وچمن بندی کے جن جذبات واحساسات نے دل ودماغ کو معمور کر رکھا تھا، ان کی تازگی وبالیدگی میں اللہ کی توفیق سے کوئی فرق نہ آیا، اور وہ دوسرے تمام احساسات پر غالب رہے، نہ پاؤں صراط مستقیم سے ڈگمگایا نہ رخ منزل کی جہت سے کسی اور طرف مڑا، ادائیگی فرض جیسی تیسی کوشش ممکن ہو سکی کرتا رہا۔ پھر 1982ء کے آغاز سے محدث کی ایڈیٹر شپ اور ترتیب بھی ذمہ داریوں میں شامل ہو گئی اور اس طرح قوم وجماعت کے ذہن ومزاج کی گہرائیوں تک تاکنے اور جھانکنے کا بھی موقع ملا۔ اور اسلام امت اسلامیہ اور عالم اسلام کے سلسلے میں دوسروں کے احساسات سننے اور اپنے احساسات سنانے اور بتانے کے بھی مواقع نصیب ہوئے۔ ان مصروفیات میں وقت اس تیز رفتاری سے گزرا کہ مدت کے طول وعرض کا احساس ہی نہ ہو سکا تا آنکہ قسمت کے ساربان نے بانگ رحیل دی، پیچھے مڑ کر

دیکھا تو معلوم ہوا کہ چودہ بہاریں گزر چکی ہیں اور قافلہ وقت کہیں سے کہیں جا نکلا ہے۔ اور نوع بہ نوع روابط کی ایک دوسری دنیا میں قدم رکھنے کی تیاری ہو رہی ہے، خفتہ جذبات کا طوفان پھر امنڈ پڑا ہے اور درو بام کہ عہد رفتہ یاد دلا رہے ہیں اور دل عہد شناس ہے کہ جواب میں کہہ رہا ہے:

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

وللہ الأمر من قبل ومن بعد[1].

---

(1) دیکھئے: ماہنامہ محدث، ستمبر 1988ء بنارس۔ مولانا مرحوم کا تحریر کردہ آخری اداریہ۔

طلاق کے بارے میں مولانا مرحوم کے فتاوے

(یہاں چند فتاوے نقل کیے جارہے ہیں جو مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے مختلف اوقات میں طلاق کے بارے میں دیے تھے۔ ان میں سے بعض کے اصلی صفحات میرے پاس موجود ہیں جنھیں مولانا نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ از مرتب)

☆ سوال: ایک صاحب نے آپ سے کوئی چار سال پہلے مذاق مذاق میں کسی قصد وارادہ کے بغیر اپنی بیوی کو تین طلاقیں بیک وقت دیدیں۔ کیا یہ طلاق واقع ہوگئی؟ اگر واقع ہوگئی تو اب کیا کیا جاسکتا ہے؟ عورت اور شوہر ایک ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ اس کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟

الجواب بعون الله وتوفيقه: ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

'ثلاث جدهن جد، وهزلهن جد، النكاح والطلاق والرجعة''.

(رواہ ابوداود، والترمذی، ابن ماجہ وصحجہ الحاکم)

یعنی تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر واقعی کی گئی ہوں تو واقعی ہیں۔ اور اگر مذاق کے طور پر کی گئی ہوں تو بھی واقعی ہیں۔ نکاح اور طلاق اور رجعت۔

مذکورہ صاحب نے جو طلاق دی ہیں اس لئے صرف ایک طلاق واقع ہوئی۔ (اس کی دلیل علیحدہ ورقے پر آپ کو بھیج دی گئی ہے)۔ چونکہ اس ایک طلاق کو واقع ہوئے چار سال گزر چکے ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ عورت کی عدت گزر چکی ہے جو صرف تین حیض ہوتی ہے۔ لہذا نکاح ختم ہو چکا ہے۔ اور اب رجعت کی کوئی گنجائش نہیں۔ اب اگر دونوں ایک ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو آپس میں پھر سے نئی مہر کے ساتھ نیا نکاح کر کے ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔ طلاق رجعی میں عدت کے خاتمے کے بعد دونوں کے یکجا ہونے کی یہی شکل رہتی ہے۔ یاد رہے کہ مذکورہ صورت میں تین طلاق موثر نہیں ہے۔ اور بعض لوگ جو حلالہ کرانے کا فتوی دیتے ہیں تو یہ حلالہ مروجہ قطعاً جائز نہیں ہے۔

هذا ما عندي والله أعلم بالصواب

صفی الرحمن المبارکپوری

☆ الجواب بعون اللہ وتوفیقہ:

صاحب معاملہ اگر حنفی المذہب ہے، اور حنفی ہی رہنا چاہتا ہے تو اس کی بیوی کو تین طلاق مغلظہ بائنہ ہوگئی۔ اور وہ بغیر حلالہ کے اس کے عقد میں نہیں آسکتی۔ اور اگر کتاب وسنت پر عمل کرنا چاہتا ہے تو صرف ایک طلاق واقع ہوئی۔ طلاق میں دراصل یہ ہے کہ جب آدمی اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاق دیدے تو اسے ایک ہی طلاق شمار کریں گے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جسے امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں، اور دیگر ائمہ نے اپنی کتابوں میں ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ: طلاق رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں، اور حضرت ابوبکر کے زمانے میں، اور حضرت عمر کے عہد خلافت کے دو برسوں میں تین طلاق ایک تھی۔ پھر حضرت عمرؓ نے کہا کہ لوگوں نے ایک ایسے معاملے میں جلدی اختیار کرلی ہے جس میں ان کے لیے مہلت تھی۔ لہٰذا ہم ایسا کیوں نہ کریں کہ اسے ان پر نافذ کردیں۔ اس کے بعد انہوں نے اس کو نافذ کردیا۔

(حوالہ کے لیے دیکھئے صحیح مسلم مع شرح نووی مطبوعہ مصر ج ۱۰ ص ۷۰، مسند احمد ج ۱ ص ۳۱۴ سنن دار قطنی ج ۴ ص ۴۶، مستدرک حاکم ج ۲ ص ۱۹۶)

یہ حدیث بتلاتی ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق کے بارے میں نبی ﷺ سے یہی مشروع ہے کہ وہ ایک ہے۔ پھر حضرت ابوبکر نے اپنی زندگی بھر اسی کا التزام کیا۔ حضرت عمر بھی دو سال یا اس سے زیادہ اسی پر عمل پیرا رہے۔ پھر حضرت عمر نے اس مسئلہ میں تصرف کیا۔ اور اسے تین قرار دے دیا۔ اور یہ کہ ان کا یہ تصرف اجتہاد پر مبنی تھا۔ کوئی نص نہ تھی۔ اس کی دلیل خود ان کا یہ ارشاد ہے:

"لوگوں نے ایک ایسے معاملے میں جلدی کرلی ہے...... لہٰذا ہم ایسا کیوں نہ کریں کہ اسے ان پر نافذ کردیں"۔

معلوم ہے کہ دین وہ ہے جسے رسول ﷺ لے کر آئے تھے، کوئی اور نہیں۔ اور مسلمان آپ ہی ﷺ کی پیروی کا پابند ہے۔ اور کسی کی بات اگر آپ کی بات کے مخالف ہو تو اس کی پیروی نہیں کرسکتا۔ ہاں اس مخالف نے اگر اجتہاد کیا تھا تو اسے معذور سمجھا جاسکتا ہے۔

سابق حدیث کی شاہد اور اس کے معنی کی تعیین کرنے والی ایک اور حدیث بھی ہے جسے امام احمد

وغیرہ نے صحیح سند کے ساتھ ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے۔ اور اس کا تعلق حضرت رکانہؓ سے ہے انہوں نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاق دیدی۔ پھر انہیں سخت افسوس ہوا۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ اس سے رسول اکرم ﷺ نے پوچھا کہ تم نے کیسے طلاق دی ہے؟ اس نے کہا تین طلاق دی ہے۔ فرمایا: ایک مجلس میں؟ کہا: ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تو ایک ہی ہے۔ اگر چاہو تو رجعت کرلو۔ چنانچہ اس نے رجعت کرلی۔

(حوالہ کے لیے دیکھیے مسند احمد ج ۱ ص ۲۶۵ مسند ابو یعلیٰ موصلی ج ۴ ص ۳۷۹)

یہ حدیث نص صریح ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق ایک ہے۔ اس کے خلاف نبی ﷺ سے ایک حرف بھی ثابت نہیں۔

چونکہ سائل مذکور نے اپنی بیوی کو ایک بار طلاق دی ہے۔ تو تین طلاق دی ہے۔ لہٰذا یہ ایک طلاق ہوئی۔ اور وہ عدت کے اندر رجعت کرسکتا ہے۔ البتہ عدت کے بعد وہ عورت بائنہ ہو جائے گی۔ اور وہ دونوں دوبارہ پھر سے نکاح کرکے ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔ اس دوسرے نکاح کے لیے پھر سے مہر بھی مقرر کرنی اور دینی ہوگی۔ آج کل حلالہ کا جو رواج ہے وہ شرعاً حرام ہے۔ اس کے قریب بھی نہیں جانا چاہیے۔ حضرت جابر کا بیان ہے کہ ہم اسے زنا سمجھتے تھے۔ اور حضرت عمر نے اس پر رجم کرنے کا اعلان فرمایا تھا۔ هذا ما عندي والله أعلم بالصواب۔

صفی الرحمن المبارکپوری

۱۴۲۱/۸/۳ھ

☆ محترم جناب شیخ صاحب ہمارے ہاں ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت بارہ طلاقیں دے دی۔ اس واقعہ پر آٹھ مہینہ گزر چکا ہے۔ میاں بیوی دونوں ایک ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ کیا شرعاً اس کی کوئی صورت ہے؟ اگر ہے تو مہربانی کرکے دلیل کے ساتھ لکھ دیں۔ بہت بہت شکریہ۔

الجواب بتوفیق اللہ سبحانہ وتعالیٰ:

شخص مذکور نے بیک وقت بارہ طلاق دے کر سخت غلطی اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور شریعت اسلام کے ساتھ ایک طرح سے کھیل کیا ہے۔ لہٰذا اسے اپنی اس حرکت سے توبہ کرنی چاہیے

اور اس پر افسوس اور شرمندگی کرنی چاہیے۔ شریعت میں بیک وقت صرف ایک طلاق دینے کی اجازت ہے۔ اگر کوئی ایک سے زیادہ طلاق دیتا ہے تو وہ اللہ کے رسول کے حکم کی صریحاً خلاف ورزی کرتا ہے۔

ہاں اگر کسی نے اس طرح کی غلطی اور خلاف ورزی کرتے ہوئے بیک وقت ایک سے زیادہ طلاق دیدی تو اس کا حکم یہ ہوگا کہ صرف ایک طلاق مانی جائے گی۔ باقی لغو اور بے کار اور باعث گناہ ہوگی۔ اس کی واضح اور صاف دلیل حسب ذیل ہے۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں اور دوسرے ائمہ حدیث نے اپنی کتابوں میں ابن عباسؓ سے حدیث روایت کی ہے:

"كان الطلاق على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم و أبي بكر وسنتين من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدة، فقال عمر بن الخطاب: إن الناس قد استعجلوا في أمر كانت لهم فيه أناة فلو أمضينا عليهم، فأمضاه عليهم".

"یعنی طلاق رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اور ابوبکر کے زمانے میں اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں اور حضرت عمر کے عہد خلافت کے دو برسوں میں تین طلاق ایک تھی۔ پھر عمرؓ نے کہا کہ لوگوں نے ایک ایسے معاملے میں جلد بازی اختیار کر رکھی ہے جس میں ان کے لیے مہلت تھی۔ لہٰذا ہم ایسا کیوں نہ کریں کہ اسے ان پر نافذ کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے اس کو نافذ کر دیا"۔

(مسلم مع نووی، مطبوعہ مصر ۷۰/۱۰، مسند احمد ۳۱۴/۱، سنن دارقطنی ۲۶/۴، مستدرک حاکم ۱۹۶/۲)

یہ حدیث بالکل صاف ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق کے بارے میں نبی ﷺ سے یہی مشروع ہے کہ وہ ایک ہے۔ پھر ابوبکر نے اپنی زندگی بھر اسی کا التزام کیا۔ حضرت عمرؓ بھی دو سال بلکہ کچھ زیادہ عرصہ اسی پر قائم رہے۔ پھر انہوں نے اس میں تصرف کیا۔ مگر اپنے اجتہاد سے کیا۔ ان کے پاس کوئی نص نہیں تھی۔ اور معلوم ہے کہ دین وہ ہے جسے رسول اللہ ﷺ لے کر آئے تھے۔ اور

مسلمان آپ ہی کی پیروی کا پابند۔ آپ کے خلاف کوئی بات قبول نہیں کی جائے گی۔ البتہ اجتہاد کرنے والا اپنی غلطی کے لیے معذور مانا جائے گا۔

مذکورہ حدیث کی تائید ایک اور حدیث سے ہوتی ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

" طلق رُكانة بن عبد يزيد أخو بني مطلب امراته ثلاثافي مجلس واحد، فحزن عليها حزناً شديدًا، قال: فسأله رسول الله صلى الله عليه وسلم، كيف طلقتها؟ قال: طلقتها ثلاثا: قال: فقال في مجلس واحد؟ قال: نعم، قال: فإنما تلك واحدة فارجعها إن شئت، قال: فرجعها".

"یعنی رکانہؓ بن عبد یزید مطلبی نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دی۔ پھر اس پر سخت غمگین ہوئے، تو ان سے رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ تم نے کیسے طلاق دی ہے؟ انہوں نے کہا: میں نے اسے تین طلاق دی ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ ایک مجلس میں؟ انہوں نے کہا ہاں! آپؐ نے فرمایا کہ یہ تو ایک ہی ہے۔ لہذا اگر تم چاہو تو اس سے رجعت کرلو۔ چنانچہ انہوں نے رجعت کرلی"۔

(مسند احمد ۲۶۵/۱ یہ سند صحیح ہے، مسند ابی یعلی الموصلی ۳۷۹/۴)

یہ حدیث نص صریح ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق ایک ہے۔ اس کے خلاف نبی ﷺ سے ایک حرف بھی ثابت نہیں۔ چونکہ شریعت میں تین سے زیادہ کا کورس ہی نہیں اس لیے اگر زیادہ طلاق بھی دے تو تین کی طرح وہ بھی ایک ہی ہے۔ ان احادیث سے معلوم ہوا کہ سوال میں مذکور شخص نے جو طلاقیں دی تھیں، ان میں سے ایک واقع ہوئی اور اسے عدت کے اندر بیوی سے رجعت کا حق تھا۔ لیکن چونکہ عدت تین حیض ہے جو بالعموم تین مہینے میں گزر جاتی ہے اس لئے آٹھ مہینہ گزر جانے پر ظاہر ہے کہ عدت ختم ہوگئی۔ لہٰذا اب رجعت کی گنجائش نہیں رہی۔ البتہ اگر دونوں ایک ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو پھر سے نیا نکاح کر کے ایک ساتھ حسب سابق پھر میاں بیوی ہو جائیں۔ نئے نکاح کے ساتھ نئی مہر بھی مقرر کرنی اور دینی ہوگی۔

نوٹ! کچھ لوگ حلالہ کا راستہ بتاتے ہیں۔ یہ شرعاً حرام ہے۔ اس پر اللہ اور رسول اللہ ﷺ نے

لعنت کی ہے۔صحابہ زنا شمار کرتے تھے اور حضرت عمر نے زنا کی سزا یعنی رجم کرنے کا اعلان کر رکھا تھا۔لہٰذا اس حرام کاری کے نزدیک ہرگز نہ پھٹکیں۔

صفی الرحمن المبارکپوری

مرکز خدمۃ السنۃ، مدینہ یونیورسٹی (سابقاً) ۱۴ صفر ۱۴۲۰ھ

☆ الجواب، وباللہ التوفیق:

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی عبدہ ورسولہ محمد وعلی آلہ وصحبہ، وبعد:

طلاق میں اصل یہ ہے کہ جب آدمی اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاق دیدے تو اسے ایک ہی طلاق شمار کریں گے۔اس کی دلیل وہ حدیث ہے جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں، اور دیگر ائمہ نے اپنی کتابوں میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ طلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں، اور ابوبکر کے زمانے میں، اور حضرت عمر کے عہد خلافت کے دو برسوں میں تین طلاق ایک تھی۔پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ لوگوں نے ایک ایسے معاملے میں جلدی اختیار کر لی ہے جس میں ان کے لیے مہلت تھی۔لہٰذا ہم ایسا کیوں نہ کریں کہ اسے ان پر نافذ کر دیں۔اس کے بعد انہوں نے اس کو نافذ کر دیا۔

(حوالہ کے لیے دیکھئے صحیح مسلم مع شرح نووی مطبوعہ مصر ج ۱۰ ص ۷۰، مسند احمد ج ۱ ص ۳۱۴ سنن دار قطنی ج ۴ ص ۴۶، مستدرک حاکم ج ۲ ص ۱۹۶)

یہ حدیث بتلاتی ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی مشروع ہے کہ وہ ایک ہے۔پھر حضرت ابوبکر نے اپنی زندگی بھر اسی کا التزام کیا۔حضرت عمر بھی دو سال یا اس سے زیادہ اسی پر عمل پیرا رہے۔پھر حضرت عمر نے اس مسئلہ میں تصرف کیا۔اور اسے تین قرار دے دیا۔اور یہ کہ ان کا یہ تصرف اجتہاد پر مبنی تھا۔کوئی نص نہ تھی۔اس کی دلیل خود ان کا یہ ارشاد ہے کہ "لوگوں نے ایک ایسے معاملے میں جلدی کر لی ہے۔لہذا ہم ایسا کیوں نہ کریں کہ اسے ان پر نافذ کر دیں"۔

معلوم ہے کہ دین وہ ہے جسے رسول صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔کوئی اور نہیں۔اور مسلمان آپ ہی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا پابند ہے۔اور کسی کی بات اگر آپ کی بات کے مخالف ہو تو اس کی پیروی نہیں کر

سکتا۔ہاں اس مخالف نے اگر اجتہاد کیا تھا تو اسے معذور سمجھا جا سکتا ہے۔

سابق حدیث کی شاہد، اور اس کے معنی کی تعین کرنے والی ایک اور حدیث بھی ہے جسے امام احمد وغیرہ نے صحیح سند کے ساتھ ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے۔اور اس کا تعلق حضرت رکانہ نے اپنی بیوی کو جو طلاق دی تھی اس سے ہے۔ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رکانہ بن عبد یزید مطلبی نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاق دیدی۔ پھر اسے سخت افسوس ہوا۔ابن عباس کہتے ہیں کہ اس سے رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ تم نے کیسے طلاق دی ہے؟ اس نے کہا: تین طلاق دی ہے۔فرمایا: ایک مجلس میں؟ کہا: ہاں۔آپ نے فرمایا کہ یہ تو ایک ہی ہے۔اگر چاہو تو رجعت کرلو۔چنانچہ اس نے رجعت کر لی۔

(حوالہ کے لیے دیکھئے مسند احمد ج ا ص ۲۶۵، مسند ابو یعلی موصلی ج ۴ ص ۳۷۹)

یہ حدیث نص صریح ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق ایک ہے۔اس کے خلاف نبی ﷺ سے ایک حرف بھی ثابت نہیں۔ چونکہ سائل مذکور نے اپنی بیوی کو ایک بار طلاق دی۔تو تین طلاق دی۔اور اس کے بعد رجعت کر لی۔لہذا یہ ایک طلاق ہوگئی۔پھر رجعت کے بعد اور بیوی کے ساتھ کچھ عرصہ رہنے کے بعد ایک مرتبہ پھر طلاق دی، گو یہ بھی تین تھی۔لہٰذا یہ دوسری طلاق ہوگئی۔اور چونکہ پہلی اور دوسری بار شوہر کو عدت کے اندر رجعت کا حق ہوتا ہے، اور عدت گزر جائے تو نکاح کر سکتا ہے۔ اس لئے سائل کے لئے جائز ہے کہ اپنی بیوی سے ایک بار پھر نکاح کر لے۔اور دونوں ایک ساتھ رہیں، اور خوشگوار ازدواجی زندگی گزاریں۔یہ نیا نکاح نئے مہر کی رقم کے ساتھ کرنا ہوگا۔

تنبیه:

نئے نکاح سے جب یہ دونوں اکٹھا ہوں گے تو پچھلی دونوں طلاقیں شمار میں باقی ہوگی۔لہٰذا اس کے بعد شوہر کو پھر طلاق دینے سے سخت پرہیز کرنا ہوگا۔کیونکہ اب جو طلاق دے گا وہ تیسری طلاق ہو جائے گی۔اور عورت اس پر قطعی حرام ہو جائے گی۔اور اس کے بعد اسی وقت حلال ہو سکے گی جب وہ کسی دوسرے انسان سے صحیح شرعی نکاح کرے، اور اس کے ساتھ زندگی گزارنے کی نیت سے کرے۔لیکن وہ دوسرا آدمی مر جائے یا کسی وجہ سے اس طرح طلاق دیدے جیسے پہلے نے دی تھی، تو اب پہلا شخص اگر چاہے تو عدت گزرنے کے بعد اس سے نکاح کر سکتا ہے۔

باقی رہا حلالہ والا نکاح جو بعض معاشروں میں موجود ہے۔ تو یہ حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پر لعنت کی ہے۔ حلالہ کرنے والے کو ادھار پر لیا ہوا بکرا کہا ہے۔ صحابہ اس کو زنا شمار کرتے تھے۔ اور حضرت عمرؓ نے اعلان کر رکھا تھا کہ میرے پاس جو بھی حلالہ کرنے والا اور حلالہ کرانے والا لایا جائے گا اسے پتھر مار مار کر ختم کر ڈالوں گا۔ (جو شادی شدہ زنا کار کی سزا ہے) لہٰذا اس طرف قدم ہرگز نہ بڑھے۔ وباللہ التوفیق.

وصلى الله على نبيه محمد وآله وصحبه وبارك وسلم.

صفی الرحمن المبارکپوری

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

هیرا

(از: جناب حیرت بستوی)

اے عیش جہاں کے متوالو! محبوب جہاں کا کہنا ہے
تا روز قیامت لحد میں ہی ہر شاہ و گدا کو رہنا ہے

کیوں آہ بھروں؟ 'ہیرا' جو حسین آباد کا ہم سے دور ہوا
امید بجا، وہ قبر میں بھی مقبول ہوا، مشہور ہوا

یہ بات حقیقت کی ہے اسے سمجھے نہ زمانہ افسانہ
انیس سو اڑسٹھ[1] میں ان سے محظوظ ہوا ہے یارانہ

توحید و سنن کے ساغر سے سرشار صفی الرحماں تھے
باطل کی ریا کی گردن پر تلوار صفی الرحماں تھے

یوں سارے جہاں میں چمکائے توقیر حدیث و قرآں کو
شہرت نے بٹھایا آنکھوں پر ذی شان صفی الرحماں کو

محبوب[2] خدا کی سیرت کی تصنیف کو ایسا چمکائے
بھارت ہی نہیں وہ دنیا میں تحسین کا پرچم لہرائے

جس دیش کے اندر وہ پہنچے اسلام کا سورج چمکائے
تکفیر و ضلالت کی ظالم ظلمت کا کلیجہ سلگائے

جب کوئی مقالہ لکھتے تھے یہ کام نرالا کرتے تھے
ہر قول میں کنواری خوشبو کی مسکان سجایا کرتے تھے

فرسودہ خطابت والوں کو انداز نیا یہ دکھلائے
پر لطف و تبسم پاش بیاں کو حسن بیاں تک پہنچائے

مانا کہ گئے اس دنیا سے، تصنیف نہ ان کی جائے گی
وہ پیش نظر آ جائیں گے جب یاد حسیں للچائے گی

ہے ایک[3] دسمبر بیس سو چھ تاریخ چھبیلی رحلت کی
اے محفل حیرت مانگ دعا فردوس بریں کی الفت کی

---

(1) 1968ء میں حضرت مولانا صفی الرحمٰن صاحب سے مئو میں شرف ملاقات حاصل ہوا۔ (2) الرحیق المختوم
(3) یکم دسمبر 2006ء۔

ایسی "مۓ مختوم" تھی وا بھی نہیں آئی

(از: جناب حمّاد انجم)

ایسا بھی نہیں ہے کہ قضا بھی نہیں آئی! || اب تک ہمیں جینے کی ادا بھی نہیں آئی
وہ سلسلۃ الذہب تھا جو پاؤں کی زنجیر || ٹوٹا ہے کچھ ایسے کہ صدا بھی نہیں آئی
بس عمر تھی چوسٹھ کی مگر وائے شتابی || اے زندگی تجھ کو تو وفا بھی نہیں آئی
وہ عالم دیں ایسا کھرا تھا، کہ نہ پوچھو || کھوٹ اس زر خالص میں ذرا بھی نہیں آئی
یک دانہ تھا وہ سیرت نبوی کا مصنف || ایسی "مۓ مختوم" تھی وا بھی نہیں آئی
سرخیل تھا وہ اہل حدیثان عجم کا!! || کچھ اس کی قیادت میں خرابی نہیں آئی
شاہیں سے وہ دو چند تھا پرواز میں اپنی || یاروں کو تو ہلکی سی ہوا بھی نہیں آئی
چلتا تھا قلم بُرشِ شمشیر کی صورت! || روباہی تو ضیغم کو ذرا بھی نہیں آئی
لبیک کہا کس نے داعیِ اجل کو || پھر کنج قفس میں وہ ہوا بھی نہیں آئی
مرنا تو بہر حال ہے سب کو یہاں لیکن || ہر ایک کو مرنے کی ادا بھی نہیں آئی

اس موت پہ سو زندگی قربان ہے انجم!
آئی ہے قضا اور قضا بھی نہیں آئی!!

کب گزرے ماہ وسال رلایا نہیں گیا

(از: عتیقؔ اثر ندوی، جامعہ اسلامیہ، دریاباد، یوپی)

ہے کون جو جہان میں آیا، نہیں گیا؟
آئے، گئے، دوبارہ بلایا نہیں گیا

چاہا سجائیں باغ بہشت اِرم کوئی
تھے ایسے بے ثبات سجایا نہیں گیا

چاہا کہ حکم دارا وفغفور چل سکے
حکم اجل کے آگے چلایا نہیں گیا

چاہا دکھائیں سطوۂ علم و آگہی
پر کیا دکھاتے خود کو دکھایا نہیں گیا

اک سلسلۂ بود وعدم کی کڑی ہیں ہم
آمد ہوئی، ہنوز بلایا نہیں گیا

کچھ ایسی بے یقینی رہی ہے یقیں کے ساتھ
موت آنی تھی، کب آئی؟ بتایا نہیں گیا

لوٹا اجل نے راہ میں سامان زندگی
سامان کیا کہ جاں کو بچایا نہیں گیا

لائے گئے بساطِ ہنر پر عجیب لوگ
پھر ان کا سا کمال دکھایا نہیں گیا

آہٹ ہوئی کہ گزرے ابھی صاحبِ رحیق
جی بھر ابھی تو جام پلایا نہیں گیا

قسمت نے یاوری نہ کی، تدبیر کیا کرے
آخر بجھا چراغ، بجھایا نہیں گیا

کس کس کو اے عتیقؔ اثر آپ روئیے
کب گزرے ماہ وسال، رلایا نہیں گیا

آگہی ریشے ریشے میں مستور تھی

(از: جناب وفاؔ صدیقی، بھوپال)

شرافت، حمیت کا پیکر تھا وہ | مروت کا گویا سمندر تھا وہ
ہائے افسوس نظروں سے اوجھل ہوا | ہر نظر ڈھونڈتی ہے کہاں کھو گیا
بے کرانی بہت اس کی مشہور تھی | آگہی ریشے ریشے میں مستور تھی
ہم کہاں تک گنائیں سبھی خوبیاں | وہ تو افکار و کردار سے تھی عیاں

مثل خورشید روشن رہے گا وفاؔ
بے گماں ہر ورق اس کی تحریر کا

وہ صاحب کمال!

(از: حامدؔ سراجی، جھنڈانگر، نیپال)

وہ بخت یار دہر وہ علامۂ زماں
اہلِ حدیثِ ہند کا عالم میں ترجماں

بن کے رہا وہ اپنی جماعت کی آبرو
دراصل تھا زمین پہ وہ مثلِ آسماں

دانش تھی جس کی نورِ بصیرت سے ہمکنار
وہ صاحب کمال، معارف کا نکتہ داں

کچھ ایسی بزم گاہِ فقاہت تھی عطر بیز
خوشبوئے گفتگو سے معطر مشامِ جاں

اک طرز نو کی جیسے وہ تشکیل کر گیا
پوشیدہ ہر ادا میں تھا حیرت کا اک جہاں

جو کچھ بھی اس نے لکھ دیا وہ معتبر ہوا
ہر ہر ورق پہ نقشِ ذہانت کا گلستاں

''اتحاف''[1] و''الرحیق''[2] کی سوغات دے گیا
ملت کے حق میں ہے وہی سرمایۂ گراں

راس آگئی تھی اس کو فضائے حجاز ونجد
لے کے چلی تھی رغبت علمی کشاں کشاں

حرمین کے شیوخِ فضیلت مآب نے
تسلیم کر لیا تھا اسے بحرِ بیکراں

اس کی جفاکشی تو ہمیں درس دے گئی
ثابت قدم رہا تھ اوہ ہنگامِ امتحاں

اظہارِ حق میں اس کو ذرا بھی نہ باک تھا
باطل پرست کرتا رہے گو چنیں چناں

اس کی گرفت سے کوئی بچ کر نہ جا سکا
ہو بطلِ عصر یا ہو کوئی رستم زماں

کچھ اپنی منزلت پہ نہ اس کو غرور تھا
اپنے تلامذہ سے ملا مثلِ دوستاں

خالی ہوئی ہے مسندِ تحقیق و شرحِ دیں
عالم کی موت بن گیا ایک جان کا زیاں

ہم کو وہ بحرِ غم میں ڈبو کر چلا گیا
ہر کوئی ہے نڈھال تو بیکل ہے اپنی جاں

حامدؔ نصیب ہو اسے فردوس کی بہار
کروٹ بدل رہا ہو وہ سایۂ جناں

۱۔ ''اتحاف الکرام'' حدیث کی معروف کتاب بلوغ المرام مصنفہ حافظ ابن حجر عسقلانی کی بصیرت افروز شرح۔

۲۔ سیرت النبی کے موضوع پر تحریر کردہ شہرۂ آفاق کتاب ''الرحیق المختوم''۔

نگارشاتِ غم

(از: سالک بستوی، جامعۃ الاصلاح، غوری)

ہائے ہم سے دور وہ مہر درخشاں ہوگیا   جو صفی رحمان کا تھا محبوبِ رحماں ہوگیا
وہ وقارِ علم جس پر ہند نازاں ہوگیا   ضوفگن آنکھوں میں اس کے باغِ رضواں ہوگیا
غیر ممکن ہے کہ اب وہ گوہرِ تاباں ملے
موت سے مل کر ہوئے ہیں ختم سارے سلسلے

جذبۂ قرآن وسنت کا علمبردار تھا   مثلِ گلشن اس بشر کا خوشنما کردار تھا
وہ فدائے افتخار سید الابرار تھا   کوثر وتسنیم کا اس کے جگر میں پیار تھا
کیا ہوا؟ گر مل نہ پائے گی خوشی دیدار کی
بس گئی ہے دل میں خوشبو "روضۃ الانوار" کی

اے "حسین آباد" گو وہ دور تجھ سے ہوگیا   بانٹتا ہے "الرحیق" اب بھی زمانے کو مزا
کیا یہ کم ہے تیرے قصبے کا فقیہ دلربا   عالمی انعام کی روشن نظر میں بس گیا
اس کی تحریر شگفتہ میں ہے خوشبو دین کی
خوش بیانی پر فدا ہے زندگی کی بہتری

"منة المنعم" کی فرخندہ صراحت دیکھئے   رحمت عالم کی سیرت کی نفاست دیکھئے
حق نے دکھلائی ہے جو بے مثل جرأت دیکھئے   وہ شکست "رزمِ باطل" کی خجالت دیکھئے
زندگی ان کی رہی مدحت سرا اسلام کی
فکر عالی گردن طاغوت پر صمصام تھی

سچ ہے یہ سالک کہ وہ تھے قدر دانِ علم وفن   مسکراتا ہے جگر میں ان کا اسلوبِ سخن
بزمِ انساں کو لبھائے کیوں نہ ان کا بانکپن   خوب سیرت آدمی تھے خوبصورت انجمن
ربِ عالم یہ مرے دل کی دعا منظور کر
باغِ رضواں کی بہاروں سے انہیں مسرور کر

ساغرِ ہستی مئے عرفاں سے خالی ہوگیا

(از: زاہدؔ آزاد جھنڈانگری)

جوہر علم و صداقت گوہرِ یکتائے فن | تھے چراغ آگہی سوز و گدازِ انجمن
مشعلِ اسلاف تھے وہ شمع تہذیبِ کہن | پھوٹتی تھی جن سے انوارِ تبسم کی کرن
مردِ میدانِ صحافت پاسبانِ عقل وہوش | تھے صفی الرحمٰن بیشک سرفراز و سرفروش
خلق کے پیکر تھے وہ اور کامل ایمان تھے | محفلِ اہلِ سلف کی جان تھے وہ شان تھے
وہ حسین آباد کے اک حسیں انسان تھے | ہو گئے دنیا سے رخصت جو صفی رحمٰن تھے
رندِ حق آگاہ وحق بیں میکدے سے کیا گیا | ساغرِ ہستی مئے عرفاں سے خالی ہو گیا
وہ مساوات واخوت کے علم بردار تھے | مسلکِ انسانیت کے خوب واقف کار تھے
کس قدر بے داغ تھے وہ صاحب کردار تھے | بادۂ توحید پی کر کس قدر سرشار تھے
آہ! اب وہ عالمی ایوارڈ والے سو گئے | گوہر یکتا تھے جو، آنکھوں سے اوجھل ہو گئے
منة المنعم بھی ہے تیری فصاحت کی سفیر | کر دیا بے داغ تو نے ہر مسلماں کا ضمیر
روضة الانوار ہے ہر ابن آدم کے لئے | ایک نقشِ جاوداں ہے بزمِ عالم کے لئے
شہرۂ آفاق تصنیفات میں ہے الرحیق | ڈالتے ہیں صاحبانِ معرفت نظرِ عمیق
اٹھ گئے زاہدؔ جہاں سے حق نما مردِ حقیق | طالبانِ علمِ دیں پر ذات تھی ان کی شفیق

ہائے پھر علم وادب کا اک ستارہ چھپ گیا

(از: راشدؔ سراجی، غوری بازار، سدھارتھ نگر)

اپنے اسلاف و اکابر کے حسیں کردار تھے ۔۔۔ آبروئے سلفیت تھے قوم کے غم خوار تھے

ہوگئے نظروں سے اوجھل بے سہارا کر گئے ۔۔۔ مضطرب رنجور دل کو پارہ پارہ کر گئے

ایک درخشندہ ستارہ آسمان ہند کا ۔۔۔ اپنا محور چھوڑ کر مرکز کی جانب چل بسا

عالمِ اسباب میں پھر آگیا اک زلزلہ ۔۔۔ منتشر شیرازۂ بزم سکوں پھر ہو گیا

ان کی فرقت سے پریشاں دہر کا ماحول ہے ۔۔۔ سوگ کے عالم میں ڈوبا شہر کا ماحول ہے

اس ''حسین آباد'' کی دھرتی سے عالم کیا گیا ۔۔۔ بے حسی کی گود میں سارا زمانہ سو گیا

تھی زوالِ قوم مسلم پر تری گہری نظر ۔۔۔ تیری تحقیقات کا انداز بھی تھا معتبر

پھوٹ کر تیرے قلم سے روشنی کی اک لکیر ۔۔۔ ''بادۂ مختوم'' بن کر ہو گئی ہے بے نظیر

تشنگانِ علم کو سیراب اس نے کر دیا ۔۔۔ ذرۂ نا چیز کو مہتاب اس نے کر دیا

سن لے راشدؔ وہ امیرِ کارواں جاتا رہا ۔۔۔ منزلِ خود آگہی کا رازداں جاتا رہا

اَرمغانِ محبت

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ کے اعزاز میں استقبالیہ، 9 دسمبر 1985ء لاہور

دور دستانِ محبت کو سلام پیہم!
جن سے ملنے کی تمنائیں جواں رہتی ہیں
فاصلے ہیں کہ ہوئے رہتے ہیں اکثر حائل
ان سے ملنے کی نکل آتی ہے جب کوئی سبیل
ہم کو اک دولت نایاب سی مل جاتی ہے!
دید کو جن کی ترستی تھیں ہماری آنکھیں
آج لاہور میں پھر صبح بنارس پھوٹی
راحت قلب بنے آج صفی الرحمٰن
علم وحکمت کے وہ پیکر وہ سراپا عرفان
زہد وتقویٰ میں مکارم میں' محاسن میں جمیل
حُسنِ تحریر کی مظہر ہے ''رحیقِ مختوم''
ہر نئے چاند کا لاتا ہے ''محدث بھی پیام
یاد آتی ہے ہمیں ارضِ مبارک پور کی
ہمہ خدمات حدیث ان کی ہیں خورشید آثار
آج اُسی چرخِ ہدایت کا یہ نجم ثاقب
ان کی آمد کے ہیں جملہ سلفی شکر گزار

جن کی یادوں سے ہوئی رہتی ہیں آنکھیں پرنم
دل کے ارماں ہوئے رہتے ہیں درہم برہم
دردِ فرقت سے وہ بے تاب ہیں اور بیکل ہم
دل کے ہر زخم کو آتی ہے میسر مرہم
جیسے ہاتھ آگئی ہو سلطنت خسرو دجم
للہ الحمد ہوئے دید کے اسباب ہم
موجِ گنگا نے سنایا سرِ راوی سرگم
ان کی آمد سے مری روح پہ اتری شبنم
گفتگو ساز خوش آہنگ میں مدہم مدہم
حسن سیرت میں ہمہ لطف وغنا کا عالم
رُخ قرطاس پہ پھیلی ہوئی خوشبوئے قلم
ایک روحانی ملاقات کو اٹھتا ہے قدم
جہاں پیدا ہوئے اسلام کے خدام اہم
کھاتی ہیں ان کی کتب ان کی بصیرت کی قسم
بزم لاہور میں اترا ہے لئے نورِ شیم
ان کے اعزاز میں ہے میرے قلم کا سرخم

تا حقِ مدح وکمالات بقدر ارر سد
ازلب ناطقہ اظہارِ عقیدت کردم

علیم ناصری

مولانا مرحوم سے میرا تعلق

(از: رضوان اللہ ریاضی، باحث ومترجم مکتبہ دارالسلام ریاض)

(مولانا مرحوم سے قلبی وروحانی تعلق کی مکمل تفصیل اس کتاب کے آغاز میں میرے مضمون میں مذکور ہے؛ البتہ میں نے مولانا کے قریب رہ کران سے جو استفادہ کیا اور جو خوبیاں ان کے اندر دیکھیں، اس کا ایک عکس مندرجہ ذیل سطروں میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے)

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ سے میری تفصیلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں ریاض کے ایک علمی ادارہ مرکز علامہ ابن باز اسلامک اسٹڈیز سنٹر اور مکتبہ دارالداعی للنشر والتوزیع میں تقریباً چار سال کام کرنے کے بعد مکتبہ دارالسلام میں آیا۔ مکتبہ دارالسلام جو کہ اسلامی کتب کی اشاعت کا ایک بین الاقوامی ادارہ ہے اور دنیا کی مختلف اور معروف زبانوں میں صحیح اسلام کی تبلیغ واشاعت میں اس کا نمایاں کردار ہے، اس میں میری بحالی بحیثیت باحث ومترجم 11/ اکتوبر 2003ء کو ہفتہ کے دن ہوئی۔ میں نے پہلے سن رکھا تھا کہ شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ اس ادارے میں قسم البحث والتالیف کے مسئول وانچارج ہیں۔ اس لیے خواہش یہی تھی کہ ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کروں گا۔ مگر یہاں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ مولانا پر فالج کا دوسری مرتبہ حملہ ہوا ہے جس کے سبب کافی کمزور ہو گئے ہیں اس لیے وہ فی الحال ہندستان تشریف لے گئے ہیں۔

اس دوران میں ایک منظر کبھی نہیں بھول سکتا ہوں اور شاید میں نے اپنی کسی ڈائری میں بھی اس کی روداد لکھی ہوگی۔ ہوا یہ کہ ایک دن ہمارے ایک سنیئر ساتھی جناب حافظ عبدالمتین صاحب نے کہا کہ رضوان صاحب! مولانا کی ٹیبل کی دراز میں جو ان کے کاغذات ہیں، انہیں نکال کر میرے حوالے کردیں تاکہ میں انہیں کارٹن میں رکھ کر کسی محفوظ مقام پر رکھ دوں، ان دنوں میں مولانا کی ہی میز کرسی پر کام کر رہا تھا۔ حافظ عبدالمتین راشدی صاحب مکتبہ دارالسلام میں پچھلے دس بارہ سالوں

سے بحیثیت باحث و محقق خدمات انجام دے رہے ہیں اور الحمد للہ بڑے نیک طبیعت اور خیر خواہ ساتھی ہیں۔ کم از کم میں نے اپنی زندگی میں ایسا آدمی نہیں دیکھا ہے جو کہ ایام بیض کے علاوہ ہفتہ میں پابندی کے ساتھ دوروز سوموار اور جمعرات کو روزہ رکھنے والا ہو اور اگر کوئی ایسا نظر بھی آجائے تو ان کی ایک صفت بہت ہی کم لوگوں میں مل سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ حافظ صاحب کبھی کسی کی غیبت نہیں کرتے !!......آج کے دور میں خاص کر علماء کے طبقہ میں اس کی مثال خال خال ہی نظر آئے گی!!

حافظ صاحب کا یہ معمول ہے کہ وہ ہر جمعرات کو صبح سویرے مکتبہ دارالسلام کے قسم التحقیق والتالیف والترجمۃ میں کتابوں کے علاوہ سارے موظفین کی ٹیبل کی بھی صفائی کر دیتے ہیں اور ہمارے بکھرے اوراق کو بھی نظم ونسق کے ساتھ رکھ دیتے ہیں، جس کی وجہ سے ہمیں بہت آسانی مل جاتی ہے۔ اور اسی صفائی ستھرائی کے تناظر میں حافظ صاحب نے مجھ سے شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ کے کاغذات نکالنے کی بات کہی تھی۔

میں نے شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کی میز کی دراز جب کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شیخ مرحوم کے نام دنیا کے کئی ایک ممالک سے خطوط آئے ہیں۔ چونکہ مولانا مرحوم دارالسلام میں فی الوقت موجود نہ تھے، بغرض علاج ہندستان جا چکے تھے اور لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ ''مرکز خدمۃ السنۃ والسیرۃ النبویۃ'' مدینہ سے دارالسلام منتقل ہو چکے ہیں اور وہیں سروس شروع کر دی ہے، اس لیے لوگ ان کی خدمت میں دارالسلام کے پتے پر ہی خطوط بھیجتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ مولانا کی دراز میں خطوط کا انبار تھا اور کوئی بھی خط کھلا ہوا نہیں تھا۔ میں نے ان خطوط پر لکھے ہوئے ایڈریس پڑھے تو معلوم ہوا کہ کوئی خط کینیڈا سے آیا ہے، کوئی امریکہ سے، کوئی افریقہ سے، کوئی کینیا سے، کوئی ہندستان سے، کوئی پاکستان سے اور کوئی یورپ کے کسی ملک سے۔ غرض دنیا کے بہت سارے ممالک سے خطوط پہنچے تھے۔

مجھے معلوم نہیں کہ ان خطوط میں کیا لکھا ہوا ہے اور کس نے مولانا سے کن جذبات کا اظہار کیا ہے۔ مگر ان خطوط کے انبار سے اس مضمون پر ضرور روشنی پڑتی تھی کہ مولانا کے محبین اور چاہنے والوں کی فہرست بہت طویل ہے اور پوری دنیا میں ان کے عقیدت مندوں کا جال بچھا ہوا ہے۔

میں دراز سے ان خطوط کو نکال کر باہر رکھتا جا رہا تھا اور کفِ افسوس ملتا جا رہا تھا۔ اس وقت غم و افسوس کا جو حال تھا وہ میرے بیان سے باہر ہے۔ میں تصورات کی دنیا میں مولانا کی حقیقی تصویر دیکھ رہا تھا۔ میں خود سے سوال کر رہا تھا:

''کیا وہ عظیم ہستی اب بوڑھی ہو چکی ہے، جس کی جوانی کے ایام انتہائی جذبۂ ایثار و محبت میں گزرے ہیں!! کیا سیرت کے امام اب فالج کے حملے کا شکار ہیں!! کیا سیرتِ نبوی کے موضوع پر پوری دنیا میں اول آنے والے مؤلف اس وقت ہندستان میں زیرِ علاج ہیں اور عقیدت مندوں کے خطوط یہاں سعودی عرب میں آئے دن پہنچ رہے ہیں!! کیا الرحیق المختوم جیسی عظیم الشان کتاب کے مصنف اپنی عمر کی آخری سرحد میں پہنچ چکے ہیں!! وغیرہ وغیرہ''۔

اس دوران میں نے کئی دفعہ اپنے ساتھی جناب شکیل احمد سلفی وکی سے مولانا کے متعلق اپنے غم وافسوس کا اظہار کیا اور انہوں نے بھی ہمارے اس غم وافسوس میں شرکت کی۔ اور پھر انہوں نے شیخ صاحب کی جامعہ سلفیہ بنارس کی بارعب زندگی کا تذکرہ بھی کیا۔ چونکہ شکیل صاحب بھی مولانا مرحوم کے شاگرد رہ چکے ہیں اور انہوں نے جامعہ سلفیہ بنارس میں مولانا کی زندگی اپنی آنکھوں سے دیکھ رکھی ہے۔

اس وقت مجھے کافی تکلیف ہوئی تھی جب حافظ عبدالمتین راشد نے مولانا کے سارے خطوط اور کاغذات ایک کارٹن میں پیک کر کے اسٹور میں رکھنے کے لیے اٹھایا تھا، اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ مولانا کا جنازہ ہے!! بلکہ سچی بات یہ ہے کہ مجھے مولانا کی وفات حسرت آیات کے موقع پر جو تکلیف ہوئی تھی اس سے کہیں زیادہ تکلیف مولانا کے کاغذات کے کارٹن کو اسٹور میں ڈالتے ہوئے ہوئی تھی!!

میرے مکتبہ دارالسلام میں کام کرتے چند ماہ گزرے تھے کہ مولانا ہندستان سے سعودی عرب تشریف لائے اور وہ اب اپنی کرسی پر براجمان تھے۔ میرے لیے غرفہ تحقیق میں دوسری کرسی لگا دی گئی۔ اس وقت مولانا سے میری تفصیلی ملاقات ہوئی۔ مولانا کی زبان اتنی صاف نہیں تھی مگر پھر بھی

دھیان سے سننے پر بات سمجھ میں آجاتی تھی۔ عمر کے اس حصے میں اور بیماری کے اس عالم میں مولانا تصحیح و مراجعہ کا کام کر رہے تھے۔ میں نے مولانا کا حلیہ کچھ اس طرح پایا:

''میانہ قد، نہ زیادہ طویل نہ زیادہ قصیر، گندمی رنگ، خوبصورت، سر پر گول ٹوپی، سر اور داڑھی کے تقریباً سارے بال سفید، سعودی لباس میں ملبوس، مسکراتا چہرہ، سفید دانت، اونچی ناک، جسمانی بناوٹ بالکل مناسب، نہ زیادہ موٹے نہ زیادہ پتلے۔ فالج کا اثر غالب آچکا تھا اس لیے زبان میں تتلاہٹ آگئی تھی۔ چلتے وقت ایک پاؤں جھاڑ کر چلتے جیسے اس میں طاقت کم ہو، بحث و تحقیق کے کمرے میں ساتھیوں کی بحث بغور سنتے اور ہلکی سی مسکان بھرتے۔ بسا اوقات ہمارے سیکشن کے موجودہ رئیس جناب قاری محمد اقبال صاحب مولانا سے کسی مسئلہ میں ان کی رائے پوچھتے تو مولانا دوٹوک الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کر دیتے؛ مثبت یا منفی''۔

کچھ ماہ بعد مولانا گھر چلے گئے اور دوبارہ ریاض تشریف لائے تو وہ کافی کمزور ہو چکے تھے اس لیے ان کے ساتھ ان کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر فیض الرحمٰن سلفی بھی رہا کرتے تھے۔ مولانا کی سب سے چھوٹی صاحبزادی اپنے شوہر کے ساتھ ریاض کے علاقہ حارہ میں قیام پذیر تھیں۔ مولانا بیٹی کے گھر ہی رہ کر دارالسلام آتے جاتے تھے۔ اور انہیں لے جانے اور لانے کا فریضہ ان کے داماد جناب انعام الحق رحمانی انجام دیا کرتے تھے۔ میں نے اس موقع کو مولانا مرحوم کی خدمت کے لیے غنیمت سمجھا اور خود ہی بڑھ کر پیشکش کی کہ شیخ صاحب! اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں یہ خدمت انجام دے دوں کہ آپ کو آپ کے داماد کے گھر لیجا کر چھوڑ دوں اور وہاں سے آفس لاؤں۔ مولانا نے میری پیشکش قبول فرمالی اور میں صبح و شام دونوں وقت کی ڈیوٹی میں مولانا کو ان کے داماد کے گھر سے آفس لاتا اور آفس سے ان کے داماد کے گھر لے جاتا۔ جب تک مولانا دارالسلام میں کام کرتے رہے میں ان کی خدمت کرتا رہا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مولانا جیسی عظیم شخصیت میری گاڑی میں بیٹھتی تھی۔ اور ویسے بھی علمائے کرام کی خدمت سے مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔

اس دوران میں میں نے مولانا مرحوم سے کافی استفادہ کیا۔ میں نے ان کے بارے میں طرح

طرح کے سوالات کیے اور مولانا نے شرحِ صدر کے ساتھ ان کے جوابات دیے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ باوجود یہ کہ مولانا کافی ضعیف ہو چکے تھے اور تھوڑا بہت نسیان کا بھی شکار ہو چکے تھے، مگر ایسی حالت میں بھی ان کی علمی صلاحیت ماننے کے قابل تھی۔ ایک مرتبہ وہ میری گاڑی میں اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے، سگنل پر میری گاڑی رکی ہوئی تھی۔ گاڑیوں کا ازدحام تھا۔ اسٹیرنگ ہی پر میں نے اپنی ایک تحریر کا مراجعہ شروع کر دیا۔ میں نے اس تحریر میں ایک عربی جملہ لکھا تھا جو بآسانی سمجھ میں آنے والا نہیں تھا۔ میں نے مولانا سے اس جملہ کا مفہوم جاننا چاہا۔ مولانا نے فوراً اس کا مطلب سمجھا دیا اور معنی بھی بتا دیا۔ عبارت مجھے بھی سمجھ میں آ گئی اور میری تحریر مکمل ہوگئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کی علمی صلاحیت ان کی آخری عمر تک بحال تھی۔

چونکہ مولانا ایک بین الاقوامی شخصیت تھے اور ان کی تحریر ایک معیار رکھتی تھی۔ اس لیے میری خواہش تھی کہ مولانا میری کتابوں پر تقدیم وغیرہ لکھ دیں۔ چنانچہ مولانا نے میری دو تین کتابوں پر تقدیم لکھ کر میری ہمت افزائی کی۔ جبکہ میں نے ان سے قبل ایک صاحب سے تقدیم لکھنے کی درخواست کی تھی تو انھوں نے نہ تو لکھا اور نہ ہی ہمت افزائی کے لیے دو الفاظ ہی کہے؛ بلکہ الٹے لام قاف سنانے لگے اور ہمت توڑنے والی بات کہنے لگے۔ اس سلسلے میں قدرے تفصیل میرے مضمون ''شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ یادوں کے سفر میں'' گزر چکی ہے۔

مولانا مرحوم سے ہم چند ساتھیوں نے تزکیات وتوصیات کی خواہش کا اظہار کیا تو آپ نے ہماری خواہش کی تکمیل فرمائی؛ بلکہ ہمیں سند اجازہ سے بھی نوازا۔ مولانا کی یہ وہ خوبیاں تھیں جو انھیں دوسروں سے دوچند کرتی تھیں۔

مولانا کو آخری ایام میں ڈاکٹروں نے گرم تاثیر رکھنے والی چیزیں کھانے کی ہدایت کی تھی؛ چنانچہ آپ کبوتر اور بٹیر کھانا بہت پسند فرماتے تھے۔ جب مجھے اس بات کا علم ہوا تو میں مولانا کو گاڑی پر بیٹھا کر ریاض کے اس مارکیٹ میں لے جاتا جہاں صرف چرندوں اور پرندوں کی خرید وفروخت ہوتی ہے۔ میں مولانا کے لیے وہاں سے کبوتر اور بٹیر خرید کر لاتا اور مولانا کے صاحبزادے ڈاکٹر فیض الرحمٰن پکا کر اور کبھی اس کا شوربہ نکال کر مولانا کو پیش کرتے۔ آخری دنوں میں چونکہ

مولانا بہت زیادہ کمزور ہو چکے تھے، اس لیے ان کے یہ صاجزادے بھی ساتھ ساتھ رہنے لگے تھے۔

ایک دفعہ میں مولانا کے لیے بٹیر خرید کر لایا۔ ان کے صاجزادے نے اسے گرم مصالحوں کے ساتھ پکایا۔ جب مولانا دستر خوان پر براجمان ہوئے تو مجھے بھی کھانے کو کہا۔ مجھے کھانے کی خواہش نہ تھی مگر ان کی خواہش کی تکمیل کے لیے دو ایک لقمے کھا کر رک گیا۔ مولانا نے بار بار مجھ سے کھانے پر اصرار کیا۔ آخر میں انھوں نے کہا: کم از کم پھل ہی کھالیں۔ گو مولانا اس بڑھاپے میں بھی مہمان نوازی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔

مولانا جن دنوں میرے ساتھ میری گاڑی پر آتے جاتے تھے، میری فیملی سعودی عرب میں نہیں آئی تھی۔ ان دنوں میں اپنی کتاب ''پردیس کی زندگی'' لکھ رہا تھا۔ اس سلسلے میں اور چند وجوہات کی بنا پر امریکہ جانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ امریکن ایمبیسی سے فارم لا کر ضروری کارروائی کی تکمیل کر رہا تھا کہ میں مولانا سے امریکہ جانے کے بارے میں پوچھا کہ میرے لیے وہاں جانا کیسا رہے گا؟ مولانا نے دریافت فرمایا: وہاں کس غرض سے جانے کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا: میں نے ''پردیس کی زندگی'' نامی ایک کتاب لکھی ہے، میں امریکہ میں اس کا تتمہ کر کے اس کا مقدمہ لکھوں گا۔ سعودی عرب میں تو میں پردیسیوں کے حالات دیکھ چکا ہوں، وہاں بھی پردیسیوں کے حالات قریب سے دیکھنے کا موقع ملے گا اور پھر جو کچھ لکھنا مناسب ہوگا، لکھوں گا۔

مولانا مسکرانے لگے اور فرمایا: جب یہ آپ کی خواہش ہے تو جانے میں کوئی حرج نہیں۔

میں نے اسی دوران مولانا سے پوچھا تھا کہ آپ جامعہ سلفیہ بنارس کی زندگی میں رابطہ عالم اسلامی مکہ کا مندوب بن کر امریکہ گئے تھے تو آپ نے اس دورہ کا کیا نتیجہ اخذ کیا؟ فرمانے لگے: پروگرام بہت ہی عمدہ اور دلچسپ تھا اور وہاں کے لوگ بھی با اصول اور با اخلاق و با ادب ملے۔

مولانا نے اپنے اس سفر کی روداد ماہنامہ 'محدث' فروری ۱۹۸۳ء کے شمارے میں ''امریکہ میں چند دن'' کے عنوان سے لکھی ہے۔ اور مارچ ۱۹۸۳ء کے اداریے میں ''بحر ظلمات کے اُس پار'' کے عنوان سے ایک دلچسپ اداریہ لکھا ہے۔ جس میں امریکی قوم کی تعریف میں دلچسپ ضمنی عناوین بھی

قائم کیے ہیں؛ جیسے: ''سہل اور چست نظام''، ''شائستگی''، ''مفید سسٹم''، ''ڈسپلن کی پابندی''، ''سادگی و جفاکشی''، ''ایمانداری''، ''ایماندار مشینیں''، ''صلاحیت کی بنیاد پر انتخاب''۔

مولانا نے آرینج کاؤنٹی کیلیفورنیا (امریکہ) میں مورخہ ۹/۱۱/ربیع الاول ۱۴۰۳ھ کو منعقدہ اس سیرت کانفرنس میں سیرت نبوی کے موضوع پر جو تقریر تیار کی تھی، موضوع کی تبدیلی اور وقت کی تنگ دامانی کے سبب پورا مقالہ پڑھنے کا موقع نہیں مل سکا، صرف بعض اجزاء قدرے تصرف کے ساتھ پیش کر سکے۔ وہ پوری تقریر ماہنامہ 'محدث' اپریل ۱۹۸۳ء کے شمارے میں ''سیرتِ نبوی کے چند جلوے'' کے عنوان سے ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

ایک مرتبہ میں نے مولانا سے پوچھا تھا کہ آپ کو اطمینان کہاں ملتا ہے، سعودی عرب میں یا انڈیا میں؟ فرمانے لگے: سعودی عرب میں۔

آخری بار مولانا جب سعودی عرب سے ہندستان جا رہے تھے، میں نے ان کے سفر سے ایک دو روز قبل ۱۷/دسمبر ۲۰۰۵ء کو اپنی ایک کتاب پر ان سے تقدیم لکھنے کی گزارش کی تھی۔ مولانا نے فوراً میری بات مان لی اور مجھے اپنے بستر پر بیٹھا کر مقدمہ املا کرایا۔ اس کے بعد جب ہندستان گئے تو پھر سعودی عرب نہیں آسکے اور یکم دسمبر ۲۰۰۶ء کو اپنی بستی حسین آباد میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون

مولانا کے بارے میں تفصیلی معلومات اسی کتاب کے آغاز میں میرے مضمون ''شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ یادوں کے سفر میں'' میں پڑھی جاسکتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیز محترم جناب غازی عزیر صاحب زید فضلکم [illegible]

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ بحمد اللہ بخیریت ہوں اور آپ کی بخیریت کے لئے دعاگو ہوں۔
عرصہ بعد آپکا جواب آیا ہے۔ بڑی خوشی ہوئی۔ اللہ آپ کو مزید توفیق دے۔ اور علم وعمل کے میدان میں
آپکے مزید خدمات لے۔ اور بے [illegible] قبول بخشے۔ آمین۔

آپ نے مقالہ کے لئے جو موضوع منتخب کیا ہے بہت موزوں ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کی طلب پر خطۃ البحث [illegible]
جو تجویز میرے ذہن میں آرہی ہے اس کا خاکہ یہ ہے کہ پوری بحث چار اجزاء پر تقسیم کر دی جائے۔ پہلا جزو تمہید
یا دیباچہ ہو جسکے دو ذیلی عنوان ہوں۔ پہلے عنوان کے تحت حدیث وسنت کی تشریعی اہمیت پر روشنی ڈالی جائے۔ اور اسکی حجیت
کے قرآنی آیات سے بالخصوص مدلل کیا جائے۔ اس سلسلے میں میری مختصر کتاب "انکار حدیث حق یا باطل؟" میں خاصا مواد موجود ہے۔
دوسرے ذیلی عنوان کے تحت انکار حدیث کے آغاز و اسباب پر روشنی ڈالی جائے جسکی بنیاد درحقیقت شیعہ اور خوارج کے فتنے کے ظہور کے
ساتھ پڑ گئی تھی۔ مگر واضح نہ تھی۔ معتزلہ (زیادہ وضاحت) اور جہمیہ، فلاسفہ اور متکلمین نے اسکی آبیاری کی۔ اور اہل الرائے [illegible] اپنی عقلیت
پسندی کی وجہ سے اسکو باقاعدہ فن بنا دیا۔ امام شافعی کے الرسالہ میں اس کا رد کافی ملتا ہے۔

تمہید یا دیباچہ کے بعد دو باب ہوں [illegible] فاتحہ۔ پہلے باب میں برصغیر پاک وہند میں انکار حدیث کے آغاز وارتقاء پر
بحث کی جائے۔ اور مختلف مراحل کا ذکر کرتے ہوئے اس پر پہلو بہ پہلو تنقید بھی کی جائے۔ اس سلسلہ میں چند اہم گروپ اور ان
کے نقطۂ نظر کا جائزہ سب سے اہم ہوگا۔ مثلاً (۱) سرسید گروپ (۲) مسلم جیراجپوری گروپ (۳) چکڑالوی گروپ (۴) پرویزی گروپ

دوسرے باب میں انکار صریح کے بغیر حدیث اور اصول محدثین کا انہدام جو استخفاف ہو رہا ہے اس کا جائزہ لیا جائے۔
اس میں مولانا مودودی اور ان کے رفقاء کا طریقہ [illegible]، حمید الدین فراہی اور اصلاحی گروپ کا نقطۂ نظر، دیگر
[illegible] ڈاکٹر اسرار احمد [illegible] اور احادیث رجم کے تمام منکرین و متشرقین کا نقطۂ نظر اور
اخیر میں مذہب حنفی کی تقلیدی شدت کے سبب ترک احادیث کا جائزہ لیا جائے گا۔

خاتمہ بحث میں، خلاصۂ مباحث اور اختتامی کلمہ تحریر کیا جائے۔ (بہ ظاہر مجوزہ خطہ بعنوان البحث یہ ہوگا)

(۱) تمہید:
سنت کی تشریعی اہمیت
انکار سنت کا آغاز اور اسکے اسباب

(۲) باب اول:
برصغیر پاک وہند میں انکار سنت کا آغاز وارتقاء (مختلف چہرے، مختلف نظریے)
سرسید اور ان کے اتباع (شبلی صاحب کی سیرۃ النعمان اور سیرۃ النبی کے بعض اجزاء بھی زیر بحث آ جائیں)

[illegible] اہل الذکر کا [illegible] ہیں۔ اہل الذکر [illegible] قابل بحث ہیں نیز
بخاری کی حدیث کا انکار (مرض [illegible]) لائق بحث ہے۔

یہ خط بھی مولانا مرحوم نے جناب غازی عزیر کو لکھا تھا۔ اسے پڑھ کر قارئین کرام اندازہ
لگائیں کہ مولانا مرحوم اپنے کسی عزیز کی ہمت افزائی اور رہنمائی میں کس قدر وسیع القلب =

ص ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محترم جناب شیخ صاحب ۔ ہمارے یہاں ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت بارہ طلاقیں دیدیں ۔ اس واقعہ پر ایک مہینہ گذر چکا ہے ۔ میاں بیوی دونوں ایک ساتھ رہنا چاہتے ہیں ۔ کیا شرعاً اس کی گنجائش ہے ؟ اگر ہے تو مہربانی کرکے دلیل کے ساتھ لکھ دیں ۔ بہت بہت شکریہ ۔

الجواب بتوفیق اللہ سبحانہ وتعالیٰ

شخص مذکور نے بیک وقت بارہ طلاق دے کر سخت غلطی اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور شریعت اسلام ایک طرح سے کھیل کیا ہے ۔ لہذا اسے اپنی اس حرکت سے توبہ کرنی چاہئے ۔ اور اس پر افسوس اور شرمندگی کرنی چاہئے ۔ شریعت میں بیک وقت صرف ایک طلاق دینے کی اجازت ہے ۔ اگر کوئی ایک سے زیادہ طلاق دیتا ہے تو وہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی صریح خلاف ورزی کرتا ہے ۔

ہاں اگر کسی اس طرح کی غلطی اور خلاف ورزی کرتے ہوئے بیک وقت ایک سے زیادہ طلاق دیدیں تو اس کا حکم یہ ہوگا کہ صرف ایک طلاق مانی جائے گی ۔ باقی لغو اور بیکار اور باعث گناہ ہوگی ۔ اس کی واضح اور صاف دلیل حسب ذیل ہے ۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں اور دوسرے ائمۂ حدیث نے اپنی کتابوں میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے : كان الطلاق على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وأبي بكر وسنتين من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدة، فقال عمر بن الخطاب إن الناس قد استعجلوا في أمر كانت لهم فيه أناة فلو أمضيناه عليهم، فأمضاه عليهم

(مسلم مع نووی، مصری ۱۰/ ۷۱ مسند احمد ۱/ ۳۱۴ سنن الدارقطنی ۴/ ۴۶ مستدرک الحاکم ۲/ ۱۹۶)

یعنی طلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور ابوبکر کے زمانے میں اور حضرت عمر کے عہد خلافت کے دو برسوں میں تین طلاق ایک تھی ۔ پھر عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ لوگوں نے ایک ایسے معاملے میں جلد بازی اختیار کر رکھی ہے جس میں ان کے لئے مہلت تھی ۔ لہذا ہم ایسا کیوں نہ کر دیں کہ اسے ان پر نافذ کر دیں ۔ چنانچہ انہوں نے اسکو نافذ کر دیا ۔

یہ وہ فتویٰ ہے جسے مولانا مرحوم نے طلاق کے بارے میں سوال کرنے والے کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیا تھا۔ طلاق کے بارے میں شیخ صاحب کا بھی مسلک وہی تھا جو شیخ الاسلام =

ص ۲

یہ حدیث بالکل صاف ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں یہی شروع ہے کہ وہ ایک ہے۔ پھر ابوبکرؓ نے اپنی زندگی بھر اسی کا التزام کیا۔ حضرت عمرؓ بھی دو سال بلکہ کچھ زیادہ عرصہ اسی پر قائم رہے۔ پھر انہوں نے اس میں تصرف کیا۔ مگر اپنے اجتہاد سے کیا۔ ان کے پاس کوئی نص نہیں تھی۔ اور معلوم ہے کہ دین وہ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔ اور سب مسلمان آپ ہی کی پیروی کا پابند ہے۔ آپ کے خلاف کسی کی بات قبول نہیں کی جائے گی۔ البتہ اجتہاد کرنے والا اپنی غلطی کے لئے معذور مانا جائے گا۔

مذکورہ حدیث کی تائید ایک اور حدیث سے ہوتی ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں: طلق ركانة بن عبد يزيد أخو بني مطلب امرأته ثلاثا في مجلس واحد فحزن عليها حزنا شديدا، قال: فسأله رسول الله صلى الله عليه وسلم كيف طلقتها؟ قال: طلقتها ثلاثا، قال: فقال: في مجلس واحد؟ قال نعم، قال: فإنما تلك واحدة فارجعها إن شئت، قال: فرجعها.

(مسند احمد ۱/۲۶۵ بسند صحیح، مسند ابی یعلی الموصلی ۴/۳۷۹)

یعنی رکانہ بن عبد یزید مطلبی نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاق دیدی۔ پھر اس پر سخت غمگین ہوئے۔ تو ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تم نے کیسے طلاق دی ہے؟ انہوں نے کہا: میں نے اسے تین طلاق دی ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ ایک مجلس میں؟ انہوں نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا کہ یہ تو ایک ہی ہے۔ لہٰذا اگر تم چاہو تو اس سے رجعت کر لو۔ چنانچہ انہوں نے رجعت کر لی۔

یہ حدیث نص صریح ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق ایک ہے۔ اس کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حرف بھی ثابت نہیں۔ چونکہ شریعت میں تین طلاق سے زیادہ کا کوئی سوال ہی نہیں اس لئے اگر زیادہ طلاق بھی دے تو تین کی طرح وہ بھی ایک ہی ہے۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ سوال میں مذکور شخص نے جو طلاقیں دی تھیں ان میں سے ایک واقع ہوئی۔ اور عدت کے اندر بیوی سے رجعت کا حق تھا۔ لیکن چونکہ عدت تین حیض ہے جو بالعموم تین مہینے میں گزر جاتا ہے اور اب آٹھ مہینے گذر جانے سے ظاہر ہے کہ عدت ختم ہو گئی۔ لہٰذا اب رجعت کی گنجائش نہیں رہی۔ البتہ اگر دونوں ایک ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو پھر سے نیا نکاح کر کے ایک ساتھ حسب سابق پھر میاں بیوی ہو جائیں گے۔ نئے نکاح کے ساتھ نئی مہر بھی مقرر کرنی اور دینی ہوگی۔

نوٹ: کچھ لوگ حلالہ کا راستہ بتاتے ہیں۔ یہ شرعاً حرام ہے۔ اس پر اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے۔ صحابہ اسے زنا شمار کرتے تھے۔ اور حضرت عمرؓ نے زنا کی سزا یعنی رجم کرنے کا اعلان کر رکھا تھا۔ لہٰذا اس حلالہ کے نزدیک ہرگز نہ پھٹکیں۔

هذا ما عندي والله أعلم بالصواب

صفی الرحمن المبارکفوری
مرکز خدمة السنة بالمدينة المنورة (سابقا)
۱۴/صفر ۱۴۲۱ھ

صفی الرحمن المبارکفوری

= ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے شاگرد رشید علامہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا تھا، کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوں گی۔

صـ ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محترم جناب قاری محمد اقبال صاحب / حفظہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے بخیر ہوں گے۔
المصباح المنیر کی جو سورتیں پریس۔ مکتبہ دارالسلام میں رہتے ہوئے دیکھ لی تھیں۔ ان پر نشان لگا کر آپ کے سامنے رکھ دیا تھا۔ یہاں آ کر باقیماندہ سورتیں بھی دیکھ لی ہیں۔ یعنی سورہ الانفال سے ختم قرآن تک مکمل دیکھا جا چکا ہے۔ اس دوران جو حذف اور تصحیحات سامنے آئی ہیں ان کی فہرست ذیل میں دی جا رہی ہے۔ اسے دیکھ کر اصل میں اصلاح کر دیں۔ والسلام

صفی الرحمن المبارکفوری

صفحہ	کالم	سطر	غلط	صحیح
✓ ص ۷٤۱	کالم ۱	سطر ١٤	الذی	للذی
✓ ص ۷٤۱	کالم ۱	سطر ١٩ سے کالم ۲ سطر ١١ تک کاٹ دیں۔		
✓ ص ۷٤٤	کالم ۱	سطر ٣٢	﴿إِذْ تَدَّعُوْنَهُ	﴿إِذْ تَدَّعُوْنَهُ
✓ ص ۷٤۸	کالم ۱	سطر ٢٧	أيدكم	أيديكم
✓ ص ۷٥٤	کالم ۱	سطر نیچے سے چوتھی	سالم	رومی سالم
✓ ص ۷۸٥	کالم ۲	سطر ٦	حالقة	حالفة
✓ ص ۷۹۰	کالم ۱	سطر ١٢	أعلاها جر	أعلاها حجرا
✓ ص ۷۹۸	کالم ۲	سطر ٣	الفسقة	الفسقة
✓ ص ۸۰۳	کالم ۱	سطر ١٥	رله من سے سطر ٣٢ تک کاٹ دیں۔	
✓ ص ۸۰۳	کالم ۱	سطر ٣١	ووراء الإمام سے سطر ٣٤ تک کاٹ دیں۔ حاشیہ نمبر ٩٧، ٩٩، ١٠٠ کاٹ دیں	
✓ ص ۸۰٦	کالم ۲	سطر ٣٣	تقدم	ورد۔ لفظی سورۃ طٰہٰ کاٹ دیں۔
✓ ص ۱۰۰٦	کالم ۱	سطر ٢٠	غثيان	غثيان
✓ ص ۱۰۰٥	کالم ۱	سطر ١٧	﴿كُلَّ شَيْءٍ﴾	﴿كُلَّ شَيْءٍ﴾
✓ ص ۱۱٤٤	کالم ۱	سطر ٥ سے سطر ٢٥ تک کاٹ دیں		
✓ ص ۱۱٤٤	کالم ۲	نجمہ والا حاشیہ کاٹ دیں۔ یعنی دو سطریں کاٹ دیں۔		
✓ ص ۱۱٥۹	کالم ۱	سطر ٢٠	التفت (٥)	التفتا (٥)
✓ ص ۱۱٦۲	کالم ۲	سطر ٢٨	﴿ثُمَّ﴾	﴿ثُمَّ﴾

مولانا مرحوم کی اس تحریر سے اندازہ لگائیں کہ وہ اپنی ذمہ داری کس قدر حسن وخوبی اور محنت ولگن کے ساتھ انجام دیتے تھے۔

MARKAZI JAMIAT AHL-E-HADEES HIND
AHLE HADEES MANZIL, 4116, URDU BAZAR, JAMA MASJID, DELHI-110006

Ref. No. ________ Dated ________

محترم جناب مولانا عبدالوہاب صاحب خلجی / حفظہ اللہ
ناظم اعلیٰ جمعیۃ اہل حدیث ہند / دہلی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

وبعد میں آج ۳۰/ نومبر ۹۹ء کو جدہ، مکہ اور مدینہ ہو کر واپس ریاض پہنچا تو آپکا فیکس جواب الجواب موصول ہوا۔ اور اندازہ ہوا کہ میرے فیکس والے خط سے آپ خاصے متاثر ہیں۔ اللہ کرے یہ تاثر خیر ہو۔ اور اس کے مفید اور کارآمد نتائج برآمد ہوں۔ آپ سے عرض ہے کہ آپ اخراجات کا ایک جامع میزانیہ تیار کر لیں۔ اور یہ لے کر آجائیں۔ آپ کی خواہش کے مطابق اسکی بھرپور تائید وحمایت کر دی جائے گی۔ اور تمام اداروں کے نام خطوط اور گزارشات لکھ دی جائیں گی۔ میزانیہ ترتیب دینے کا انداز حسب ذیل ہونا چاہئے۔

۱۔ تنخواہ ملازمین وموظفین (سال بھر کا پورا حساب جوڑ کر یہاں لکھیں۔ جس میں چھانٹ کرنے کی صورت میں جو خرچ بڑھتا ہو اسے شامل حساب رکھیں۔)

۲۔ سفر دعوت وتنظیم (اس کا پورا تخمینہ لگا کر یہاں لکھیں۔)

۳۔ نشر واشاعت (جریدہ ترجمان سمیت جتنی کتابیں چھاپنی مقصود ہوں سبکے مکمل خرچ کا تخمینہ نوٹ کریں۔)

۴۔ عمارت میں ترمیم ومرمت (جو جو ترمیم مقصود ومطلوب ہو ان کا مجموعی خرچ نوٹ کریں۔)

۵۔ تجہیز غرف الجمعیۃ (مطلوبہ سامان کی قیمتوں کا اندازہ لگا کر خرچ نوٹ کریں۔)

۶۔ الأجہزۃ المطلوبۃ للجمعیۃ (مطلوبہ اجہزہ کی فہرست تیار کر کے ان کی مجموعی قیمت درج کریں۔)

۷۔ متفرقات (مہمانوں وغیرہ کے استقبال میں مجلس عاملہ وشوریٰ کے ممبران کی آمد ضیافت میں جو خرچ آئے گا اسے نوٹ کریں۔)

مزید کوئی مد سمجھ میں آئے تو اسے بھی نوٹ کریں۔ اور ایک چارٹ تیار کر کے خازن صاحب سے اور حافظ یحییٰ صاحب سے دستخط کرا لیں۔ اور یہ لے کر سفر کے دوسرے انتظامات کے ساتھ آجائیں۔ اگر پہلے سعودیہ آنا مناسب ہو تو یہاں کا رخ کریں۔ ورنہ کویت کا رخ کریں۔ اور آمد کے پروگرام سے مطلع کر دیں۔ بقیہ الحمد للہ سب خیریت سے ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
صفی الرحمن المبارکفوری
یکم دسمبر ۱۹۹۹ء

صفی الرحمن المبارکفوری

مولانا کی اس تحریر سے ان لوگوں کے نظریے کی زبردست تردید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ آپ کو جمعیت کے کاز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ جناب حافظ محمد الیاس مدنی ﷾ کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے کتاب کی طباعت سے صرف ایک ہفتہ قبل تلاشِ بسیار کے بعد یہ خط مجھے عنایت فرمایا۔

بسم الله الرحمن الرحيم

سند الإجازة

الحمد لله الذي أنزل الكتاب هدى للمتقين، وأكرم به رسوله فأسند إليه البلاغ والتبيين، ثم أورثهما المصطفين من عباده الذين ينفون عنه تحريف الغالين، وانتحال المبطلين، وتأويل الجاهلين، اللهم فصل وسلم وبارك عليه، وعلى من آمن به من الصحابة والتابعين، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين. أما بعد، فيقول العبد الضعيف المفتقر إلى مولاه صفي الرحمن بن عبد الله المباركفوري، عفا الله عنه وعافاه: إن الأخ العزيز: رضوان الله بن شيخ نسيم محمد الرياضي طلب مني الإجازة لرواية كتب الحديث ووصل سنده بسند الأئمة الأعلام فأجبته لما أراد، وإن كنت لست أهلاً لذلك، ولكن تشبهًا بالأئمة السابقين الكرام، وتأسيًا بهم في سلوك تلك المسالك. فأقول وبالله التوفيق:

إني قد أجزت الفاضل المذكور أن يروي عني جميع ما تصح لي روايته من الكتب الستة والموطأ وغيرها، وإني قد قرأت أطراف الكتب الستة على المحدث الكبير الشيخ أبي الحسن عبيد الله الرحماني المباركفوري فأجازني برواية جميع مروياته وبرواية كتابه "مرعاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح"، وهو حصل القراءة والسماعة والإجازة عن شيخيه الجليلين الإمام المحدث أبي العُلى عبد الرحمن المباركفوري صاحب "تحفة الأحوذي شرح جامع الترمذي" والمحدث الشيخ أحمد الله البرتاب كرهي، كلاهما عن الإمام الهمام السيد نذير حسين المحدث الدهلوي رحمه الله.

قلت: وقد قرأت صحيح البخاري والنصف الأخير من جامع الترمذي وأطراف بقية الكتب الستة وغيرها على فضيلة الشيخ شمس الحق السلفي رحمه الله. فأجازني برواية جميع مروياته، وقد حصلت له القراءة والسماعة والإجازة عن المحدث الشيخ أحمد الله المذكور، وعن المحدث الشيخ محمد إسحاق الآروي، كلاهما عن الإمام الهمام السيد نذير حسين المحدث الدهلوي رحمه الله.

ح وقد قرأت جزءًا من الصحيحين على العلامة المحدث نذير أحمد الأعظمي، وجزءًا من صحيح مسلم على الشيخ محمد بشير المباركفوري، كلاهما عن الشيخ أحمد الله المذكور.

ح وقرأت الصحيح لمسلم والسنن للنسائي على الشيخ عبد الرحمن المئوي، كما قرأت النصف الأول لكل من سنن أبي داود وجامع الترمذي على فضيلة المفتي الشيخ حبيب الرحمن الفيضي، كلاهما عن جد الأخير المعروف بالشيخ الكبير الشيخ محمد أحمد المئوي عن الإمام الهمام السيد نذير حسين المحدث الدهلوي رحمه الله.

ويروي الإمام السيد نذير حسين عن عمدة المحدثين الشاه محمد إسحاق رحمه الله عن جده لأمه المحدث الجليل الشاه عبد العزيز الدهلوي عن أبيه المحدث الإمام الشاه ولي الله الدهلوي رحمه الله بإسناده المذكور في كتابه "الإرشاد إلى مهمات الإسناد".

قلت: ويروي الإمام المحدث أبو العُلى عبد الرحمن المباركفوري والشيخ أحمد الله البرتاب كرهي عن المحدث الجليل والفقيه النبيل الشيخ حسين بن محسن الأنصاري الخزرجي اليماني، وقد أجازهما برواية جميع ما حواه كتاب "إتحاف الأكابر بإسناد الدفاتر". وهو يروي عن الشيخين الجليلين العلامة الشريف محمد بن ناصر الحسني الحازمي والقاضي العلامة أحمد بن الإمام محمد بن علي الشوكاني، كلاهما عن الإمام الحافظ محمد بن علي الشوكاني مؤلف "إتحاف الأكابر" والباقي السند مكتوب فيه.

ح وقد روى الشيخ حسين بن محسن الأنصاري اليماني رحمه الله عاليا بدرجة عن شيخيه المذكورين، وعن العلامة حسن بن عبد الباري الأهدل. ثلاثتهم عن العلامة المحدث وجيه الإسلام ومفتي الأنام عبد الرحمن بن سليمان بن يحيى بن عمر بن مقبول الأهدل عن والده العلامة سليمان بن يحيى الأهدل. وباقي السند مكتوب في "إتحاف الأكابر".

فللفاضل المذكور أن يروي عني جميع ما أرويه عن مشايخي الكرام بأسانيدهم المتصلة إلى الأئمة المصنفين. وأوصيه بتقوى الله في السر والعلن، وبالتمسك بكتاب الله العزيز والمأثور الثابت من السنن، وأن يتبع السلف الصالح في فهم المراد ويلتزم بإحياء السنن، وإماتة البدع ولا يخاف في الله لومة لائم، وأن لا ينساني ومشايخي في صالح دعواته في جلواته وخلواته، وفقنا الله جميعًا لما يحبه ويرضاه.

وصلى الله على خير خلقه محمد وآله وصحبه وبارك وسلم.

صفي الرحمن المباركفوري

١٣/١١/١٤٢٦هـ

یہ سندِ اجازہ کا وہ نمونہ ہے جسے مولانا مرحوم نے مجھے اپنے دستخط کے ساتھ بڑے پیار سے عنایت فرمایا تھا۔ جزاه الله خيراً ونوّر مرقده وأدخله فسيح جناته

صاحب الرحيق المختوم
هذا الكتاب الذي هو عبارة عن مجموعة مقالات قام بإعدادها
نخبة من طلبة العلم، جمعها ورتبها الأخ / رضوان الله الرياضي،
يشتمل على:
• ١- حياة صاحب الكتاب الشيخ العلامة صفي الرحمن
المباركفوري (رحمه الله)
• ٢- جهوده في التعليم والتدريس، والتصنيف والتأليف
• ٣- جهوده في نشر السنة النبوية والدفاع عنها، وجهوده
في خدمة السيرة النبوية
• ٤- جهوده لنشر التوحيد الخالص والعقيدة السلفية
• ٥- إحصائية لمؤلفاته القيمة التي نشرت بلغات متعددة
• ٦- جهوده في الدفاع عن الإسلام، ونقضه للفرق الباطلة
كالقاديانية والهندوسية وغيرهما
هذا الكتاب يشجع قارئه على التمسك بالكتاب والسنة،
ويجعله يحمل هَمّ إيصال الدعوة السلفية الصحيحة إلى
البشرية أجمع، لذا نرجو من القارئ أن يهدي هذا الكتاب
بعد قراءته لغيره، لعل الله ينفع به المسلمين، ويهديهم
إلى صراطه المستقيم.
الناشر
ISBN: 9960-57-800-3